اسلامی ڈائجسٹ

از اول تا آخر رنگین فوٹو فلم کی
نظر افروز طباعت اور نادر و
نایاب تصاویر سے آراستہ

دلچسپ ادبی، علمی اور تفریحی
مضامین کا خزانہ

اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب،
اسلامی روایات، اسلامی فتوحات،
اسلامی علوم، عظیم مسلم شخصیتیں
اور ماضی و حال کی مسلم اقوام کے
کردار و حالات کا حقیقی عکاس

بلا شک و شبہ
اسلامی ڈائجسٹ ھُدیٰ
علمی، ادبی اور اسلامی رسالوں
کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے

ھما سائز - جو سامنے ہے
فی کاپی ۱/۷۵ سالانہ ۳۰ روپے
(جس میں سالنامے اور خصوصی نمبروں کی
قیمت اور فیس رجسٹری بھی شامل ہے)

ہما پبلیکیشنز کی مطبوعات میں سے آ
ہما
اردو ڈائجسٹ
اردو نمبر
مدیر
عبدالوحید صدیقی
اپریل ۱۹۷۲ء
اردو نمبر کی قیمت پانچ روپے۔ عام شمارہ کی قیمت ۔
ایک روپیہ پچھتر پیسے۔ سال بھر کی قیمت تیس روپے
جس میں سالنامے کی قیمت اور بارہ روپے رجسٹری فی
ڈاک خرچ کے لیے بھی شامل ہیں۔ ہر شمارہ رجسٹری
سے بھیجا جاتا ہے

معذرت :۔ اس نمبر کے مضامین کی فہرست بہت طویل ہے۔ جگہ کی تنگی اجازت نہیں دیتی کہ پوری فہرست شائع کی جائے اس لئے اس مرتبہ "ہمارے بال و پر" کے تحت صرف ان حضرات کے اسمائے گرامی شائع کئے جا رہے ہیں جن کے نتائجِ قلم اس نمبر میں منتخب یا ملخص کئے گئے ہیں۔ (مدیر)

ہمارے بال و پر

۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی
۲ مفتی عتیق الرحمن عثمانی
۳ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی
۴ حکیم عبدالقوی بی اے
۵ مولوی عبدالغنی ڈار
۶ محمد جمیل الرحمن (ایم پی)
۷ مولانا محمد سالم قاسمی
۸ کامریڈ ایس اے ڈانگے
۹ سید محمد ازہر شاہ قیصر
۱۰ ایس اے محی الدین (ایم پی)
۱۱ ایس ایم محمد شریف (ایم پی)
۱۲ محمد اکرام اللہ خاں
۱۳ ڈاکٹر سلامت اللہ
۱۴ پروفیسر اختر قادری
۱۵ پروفیسر گنگا دھر تسنیم
۱۶ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
۱۷ پروفیسر محمد رشید اللہ
۱۸ ڈاکٹر قیصر جہاں

۱۹ پیلو مودی (ایم پی)
۲۰ میر مشتاق احمد
۲۱ علی محمد طارق
۲۲ سید مظفر حسین طاہر
۲۳ ڈاکٹر کبیر کوثر ایم اے
۲۴ مقیم الدین فاروقی
۲۵ انور علی دہلوی
۲۶ حکیم محمود احمد خاں
۲۷ شاہد احمد دہلوی
۲۸ حامد اللہ افسر
۲۹ عبداللطیف اعظمی
۳۰ شوکت تھانوی
۳۱ خواجہ عبدالمجید
۳۲ عبدالقوی دسنوی
۳۳ حسین احمد نادری
۳۴ لکشمی نرائن تابش
۳۵ اے۔ آر۔ رشدی
۳۶ کرامت علی کرامت
۳۷ صابر علی بستوی
۳۸ قطب النسار ہاشمی
۳۹ عبدالمجید قریشی

۴۰ عصمت چغتائی
۴۱ واجدہ تبسم
۴۲ عفت موہانی
۴۳ ناز انصاری
۴۴ احمد مصطفیٰ صدیقی
۴۵ وحید الدین خاں
۴۶ یونس جعفری
۴۷ شاہد صدیقی
۴۸ فاروق ارگلی
۴۹ علیم الدین سالک
۵۰ حمیدہ سلطان
۵۱ خالد ہندی
۵۲ بصیر نعیمی
۵۳ ضیا بانی
۵۴ اختر بستوی
۵۵ ایم اے وحید خاں
۵۶ شاہد ساگری
۵۷ تلوک چند محروم
۵۸ سراج انور
۵۹ رونق دکنی سیمابی
۶۰ خالد صدیقی
۶۱ ڈاکٹر سید عبداللہ
۶۲ جاوید اے ناظم

ان کے علاوہ
دوسرے سیکڑوں
جن کی اردو کے سلسلے میں آراء شامل ہیں

ترتیب
احمد مصطفیٰ صدیقی
تزئین کار
ای، روز • بہزاد الٰہی
ناظم اعلیٰ
خالد مصطفیٰ صدیقی
مطبوعہ
مترا آفسٹ پریس، چاوڑی بازار دہلی
پرنٹر پبلشر
عبدالوحید صدیقی
مالکان
ہما پبلیکیشنز، نئی دہلی ۱۴
مقام اشاعت
جے ۱۷، اجیپورہ ایکسٹنشن، نئی دہلی ۱۴
بائنڈنگ
نفیس بائنڈنگ ہاؤس، لال کنواں دہلی

دکھی کی پکار
نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں ، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے ، میں وہ ایک مشت غبار ہوں
مرا رنگ و روپ بگڑ گیا ، میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا ، میں اسی کی فصل بہار ہوں
نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں ، نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں ، جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں ، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں ، میں وہ بے کسی کا مزار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا ، مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا ، میں بڑے دکھی کی پکار ہوں
(بہادر شاہ ظفر مرحوم)

۸۱ویں منزل

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

جب ہم نے ہما کا اردو نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا ہمیں اسی وقت احساس تھا کہ اس ہفت خواں کو سر کرنا کتنا دشوار ہوگا لیکن اس احساس کے باوجود ہم نے یہ فیصلہ کر لیا اور کام شروع کر دیا گیا۔ پھر جیسے جیسے کام آگے بڑھتا رہا مشکلات کے احساس میں بھی اضافہ ہوتا رہا، نئے نئے گوشے اور عجیب عجیب وادیاں سامنے آتی رہیں اور ہم ان سبھی کو سمیٹ کر اردو نمبر میں سمو دینے کی کوشش میں ہمہ تن لگ گئے۔ ہمارے سامنے ایک طرف تو اردو کی لامحدود وسعتیں تھیں جنہیں اس نمبر کی زینت بنانے کا عزم تھا اور دوسری طرف اس نیکنامی اور ہمہ گیر مقبولیت کی حفاظت کا مسئلہ تھا جو غالب نمبر اور مسلم یونیورسٹی نمبر نے ادارۂ ہما کو عطا کیا تھا۔ اور ہمیں گوارا نہ تھا کہ اردو نمبر میں کوئی ایسی خامی رہ جائے جو اس شہرت و نیکنامی کے دامن پر خفیف سا دھبا بھی بن سکے۔ اسلئے کام مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا گیا ـــــ لیکن اسے اردو کا اعجاز کہئے کہ ان مشکلات نے ہماری ہمت شکنی کی بجائے ہمارے ولولوں اور حوصلوں کے لئے مہمیز کا کام کیا اور ہم زیادہ جوش و خروش سے ان دعووں اور وعدوں کو پورا کرنے میں منہمک ہو گئے جو ہم نے اردو نمبر کے اعلانات کے سلسلے میں کئے تھے، اور خدا کا شکر ہے کہ ہم قلیل ترین وقت میں ان تمام دشوار گذار مراحل کو طے کر کے اردو نمبر آپکی خدمت میں پیش کر رہے ہیں ـــــ اب یہ فیصلہ اہل نظر کریں کہ یہ خاص شمارہ ان کی توقعات اور ہماری خواہشات کو پورا کر رہا ہے یا نہیں ـــــ آیئے اس شمارے پر تفصیلی نظر ڈالنے سے پہلے اس کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ کیجئے ـــــ اس نمبر میں ہما کی عام ڈگر سے ہٹ کر، ہم اردو کے ایک نامور ادیب اور کل ہند انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور سے انٹرویو پیش کر رہے ہیں تاکہ ہما کا انٹرویو والا اختصاص بھی باقی رہے اور اردو نمبر کا امتیاز بھی ـــــ پھر اس نمبر میں تین ہزار سے زائد اردو کے معروف اور گمنام شاعروں۔ ادیبوں۔ صحافیوں۔ ناول نگاروں ۔افسانہ نویسوں۔ مزاح نگاروں اور طنز نگاروں کا تفصیلی، اجمالی یا ضمنی تذکرہ آیا ہے، جن کا اس سے قبل یکجا ملنا مشکل ہی ہے ـــــ اردو کی گیارہ بہترین تصانیف کا انتخاب ـــــ تین سو سے زیادہ نادر و نایاب تصویریں جو اس سے پہلے کم نگاہوں سے گذری ہوں گی ـــــ دو ہزار سے زیادہ بہترین اشعار کا انتخاب ـــــ اردو کی کہانی ابتدا سے اب تک ـــــ شاہی درباروں سے طوائفوں کے بالا خانوں تک اردو کے معرکوں کی تفصیلی داستانیں ـــــ ادیبوں اور شاعروں کے معاشقے ـــــ گاندھی جی سے لیکر اٹل بہاری

باجپئی تک تمام سیاست کاروں اور دانشوروں کے اردو کے متعلق خیالات ـــــ اردو کے متعلق پچھتر سے زیادہ تما شخصیتوں کے جذبات ہمارے گشتی سوالنامہ کے جواب میں، جن میں یونیورسٹیوں کے ہیڈ آف دی اردو ڈپارٹمنٹ۔ پروفیسر، ادیب اور اخبار نویس سبھی شامل ہیں ـــــ ایک ہزار سے زیادہ اردو کے اخبارات و رسائل کی کہانی۔ اردو شاعروں اور ادیبوں کے لطائف و ظرائف ـــــ شاعروں اور ادیبوں کے انوکھے مشغلے ـــــ جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے اردو کی تخلیقات و تصانیف ـــــ آج بھی کتنا اردو ادب ضبط ہے ـــــ صدر جمہوریہ ہند۔ نائب صدر جمہوریہ۔ مرکزی وزیروں اور گورنروں کے پیغامات ـــــ بے شمار مضامین ـــــ ایک سو سے زیادہ اصحاب قلم۔ چھوٹی چھوٹی خالی جگہوں میں معلومات کا خزانہ جیسے اردو کا پہلا ناول۔ پہلا ادیب۔ اور پہلا دیوان وغیرہ ـــــ اس شمارے کی ترتیب میں چار سو سے زیادہ کتابوں، اخباروں اور رسالوں سے مدد لی گئی ہے۔

ادارہ ان تمام اصحاب کا شکر گذار ہے جنہوں نے اس نمبر کے لئے اپنے مضامین عنایت فرمائے ـــــ اور ان کرمفرماؤں سے عفو خواہ ہے جن کے قلمی شاہپارے جگہ کی تنگی یا بتاخیر موصول ہونے کی وجہ سے اس شمارے میں شریک نہ کئے جاسکے۔ ان مضامین کو آئندہ اشاعتوں میں شریک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہم ان اصحاب کی خدمت میں بھی معذرت پیش کرتے ہیں جنہوں نے ہمارے سوالنامے کے جوابات بتاخیر عنایت فرمائے یا جواب اتنا طویل تھا کہ جگہ کی تنگی اس کی متحمل نہ ہوسکی ـــــ اسی کے ساتھ ہم یہ معذرت کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ممکن ہے اس شمارے میں بہت سے قابلِ ذکر اصحاب کے تذکرے شامل نہ ہوسکے ہوں۔ کیونکہ اس قلیل وقت اور بشری سہو و لاعلمی میں ایسا ہونا کچھ بعید نہیں ہے۔

"درست فرمالیجئے" کے تحت اس نمبر کے کسی ایک ابتدائی صفحہ پر بعض غلطیوں کی تصحیح شائع کیجارہی ہے جو طباعت کے دوران ہمارے علم میں آئیں۔ ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ اسکے مطابق اپنی کاپیوں میں غلطیاں درست فرمالیں۔

اس شمارے کی تدوین و ترتیب میں جن کرمفرماؤں نے قلمی اور سخنے تعاون فرمایا ہے ادارہ ان سب کا شکر گذار ہے۔ خصوصاً پروانہ ردولوی، کبیر کوثر۔ بہار الہ آبادی۔ فاروق ارگلی۔ ناز انصاری۔ پروفیسر شارب ردولوی (دیال سنگھ کالج) صابر علی بستوی اور شاہد صدیقی کا جنہوں نے انتہائی خلوص اور لگن کے ساتھ ہمیں اپنا تعاون دیا ـــــ اور پھر میں (عبدالوحید صدیقی) ذاتی طور پر اپنے رفیق عزیز احمد مصطفیٰ صدیقی کو بصدق دل دعائیں دیتا ہوں جنہوں نے اس عظیم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں نہ جانے کتنی راتوں کی سیاہی کو دن کی سفیدی میں تبدیل کیا۔ خدا ان کی صلاحیتوں اور عمل کی قوتوں کو المضاعف کرے۔ بڑی ناانصافی ہوگی اگر میں خالد صدیقی، ناظم اعلیٰ ہما پبلیکیشنز۔ ای روز آرٹسٹ۔ لقاء الرحمٰن اور صغیر احمد خوشنویس و کارکنان انتظامیہ کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے اردو نمبر کے بال و پر کو سنوارنے اور اس کے انتظامی و دفتری امور کو بروقت اور قابلِ اطمینان طور پر انجام دینے میں اپنی بہترین صلاحیتیں پُرخلوص طور پر صرف کیں ـــــ مختصر یہ کہ یہ اردو نمبر نہیں ہمارے دلِ صدچاک کی قاشیں ہیں جنہیں ہم آپ کی خدمت میں پیش کررہے ہیں۔ خدا کرے آپکو اچھی لگیں۔

خادم ہما

عبدالوحید صدیقی

انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری آل احمد سرور سے ملاقات

• خالد ہندی

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی کا سورج طلوع ہوا لیکن اس زبان کا سورج غروب ہوگیا جس نے ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ حصّہ لیا تھا ــــــ اب پھر اس امر کی کوشش ہو رہی ہے کہ اردو کو جیسے اپنے ہی وطن میں بے وطن بنا دیا گیا تھا۔ اگر پورا حق نہیں تو تھوڑا بہت حق دے ہی دیا جائے تاکہ اردو کے خیر خواہوں کے دلِ بے قرار کو کچھ قرار آجائے ــــــ چونکہ ہندوستان میں ۲۵ سال سے اردو کو اس کا حق دلانے کی جدوجہد میں انجمن ترقی اردو ہند پیش پیش رہی ہے اور اردو پرست آبادی کے کافی بڑے حصّہ کا یہ خیال بھی ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند نے اردو کے کیس کو بنانے کی بجائے بگاڑا ہے۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمارے اردو نمبر میں انجمن کے جنرل سکریٹری آل احمد سرور کا انٹرویو شائع کیا جائے ــــــ اسی خیال کو لے کر میں علیگڑھ پہنچ گیا۔

آل احمد سرور پہلے لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر تھے اور آجکل مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ہیں۔ انہوں نے دنیا کے بہت سے ملکوں کا دورہ کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے انداز فکر میں بین الاقوامی رجحانات کو کافی دخل حاصل ہے اور کسی بھی مسئلہ پر بحث کرتے وقت ان کا ذہن بین الاقوامی تحریکات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اپنی ملاقات کے دوران میں نے یہ محسوس کیا کہ اردو کے سوال پر بھی ان کا ذہن بین الاقوامی تحریکات اور جدید فلسفوں کا اثر قبول کر چکا ہے۔ شاید اسی لئے انہوں نے اردو کے مستقبل کے متعلق میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں کہا ــــــ "اردو کا مستقبل نہ بالکل روشن ہے نہ بالکل تاریک ــــــ آجکل کے زمانے میں کوئی چیز یکساں روشن اور یکساں تاریک نہیں ہوتی۔ مستقبل کا انحصار حال کی سرگرمیوں پر ہوتا ہے۔ حال میں جو چیزیں ہو رہی ہیں ان کی بنا پر مستقبل کے متعلق قیاس آرائی تو کی جا سکتی ہے لیکن کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی ــــــ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس وقت اردو کے حق میں فضا تمام تر اچھی ہے ــــــ اردو کا سوال جمہوریت اور سوشلزم سے جڑا ہوا ہے۔ ملک میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو جمہوریت اور سوشلزم کا استحکام چاہتے ہیں لیکن کچھ عناصر ان کے دشمن بھی ہیں۔ جوں جوں ملک میں جمہوریت

سیکولرزم اور سوشلزم کو استحکام حاصل ہوگا اردو کے لئے حالات بہتر ہوتے جائیں گے۔"

"کیا آپ اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں؟"

میں نے سرور صاحب سے سوال کیا۔ اور انہوں نے اعداد و شمار کا سہارا لیتے ہوئے کہا ——— "۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی آبادی ۲ کروڑ ۳۸ لاکھ تھی جبکہ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری میں اردو بولنے والوں کی آبادی ۲ کروڑ ۸۶ لاکھ ہوگئی۔ لیکن میرے خیال میں اردو بولنے والوں کی آبادی ۳½ کروڑ تک ہو سکتی ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کے اعداد و شمار کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ آدھے سے زیادہ مسلمانوں کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن مجھے اس سے انکار نہیں کہ اردو تمام مسلمانوں کی ایک تہذیبی زبان ہے کیونکہ مسلمانوں کے مذہبی مسائل کے سلسلے میں اردو میں اتنا لٹریچر ہے جتنا فارسی اور عربی میں بھی نہ ملے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے تمام پڑھے لکھے مسلمانوں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ ان کے بچے اپنی مادری اور علاقائی زبانوں کے علاوہ اردو بھی سیکھیں چونکہ جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے ان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اس لئے اس کے فروغ کی فکر مسلمانوں سے زیادہ کسی اور کو نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک اردو کے مسئلہ کا تعلق ہے اسے میں قومی مسئلہ سمجھتا ہوں کیونکہ اردو ہماری قومی زبانوں میں سے ایک ہے ہندوستان کی کوئی ریاست ایسی نہیں جس میں اردو بولنے والے نہ ہوں اس اعتبار سے اردو کل ہند زبان بھی ہے۔ اس میں ہر مذہب کا لٹریچر ملتا ہے اور یہ ہماری مشترکہ تہذیب کا شاندار ورثہ ہے۔"

"یو۔پی کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کے سلسلہ میں سرکاری احکامات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے سرور صاحب سے پوچھا اور انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا کہ "یہ ایک اچھی بات ہے اور اس سے ہمیں خوشی بھی ہوئی ہے لیکن ہم مطمئن اُس وقت ہوں گے جب ان تمام بچوں کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظام اردو میں کیا جائے جو اردو پڑھنا چاہیں ——— " انہوں نے مزید کہا ——— "۱۰۔ ۴ کے فارمولے پر ٹھیک طریقے سے عمل نہیں ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ اب اردو کے ذریعہ تعلیم دینے والے اسکولوں کا انتظام آبادی کے تناسب سے کیا جائے۔ اگر کسی علاقہ میں اردو بولنے والوں کی آبادی ۱۵ فیصد ہے تو اس علاقے میں اردو کے ذریعہ تعلیم دینے والے ۱۵ فیصدی اسکول بھی ہوں۔" انہوں نے مثال دیتے ہوئے کہا: "فرض کیجئے کہ لکھنؤ میں ۱۰۰ اسکول ہیں اور اردو والوں کی آبادی ۳۳ فیصدی ہے تو ان ۱۰۰ اسکولوں میں سے ۳۳ اسکول اردو کے ضرور ہونے چاہئیں۔"

سرور صاحب اپنا جواب ختم کرنے کے بعد خاموش ہو گئے اور میں نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے ان سے پوچھا ——— "کیا آپ اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ لسانی اعتبار سے اردو، ہندی کی شیلی ہے؟" انہوں نے برجستہ جواب دیا: "نہیں ——— ! لسانی اعتبار سے ہندی کی شیلی اردو نہیں بلکہ اردو کی شیلی ہندی ہے۔"

اب میں نے سرور صاحب سے ایک ایسا سوال کیا جس کے جواب میں ان کا برہم ہو جانا میرے خیال میں یقینی تھا۔ یہ سوال تھا انجمن ترقی اردو کی ظاہری بے عملی کا لیکن میری توقع کے خلاف وہ برہم نہیں ہوئے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ انجمن ترقی اردو کے جے پور کے اجلاس کے بعد برسوں سے اس کا کوئی اجلاس کیوں نہیں ہوا اور کیا اس بات سے اس کی بے عملی کا اظہار نہیں ہوتا؟ تو انہوں نے بڑی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ مجھے سمجھاتے ہوئے کہا: "جے پور کے بعد ہم یہ کوشش کرتے رہے کہ انجمن کا اجلاس ہو۔ کل آنند نرائن ملا صاحب سے بھی اسی موضوع پر بات چیت ہو رہی تھی۔ ہماری کوشش ہے کہ اس

سال انجمن کا سالانہ اجلاس ضرور منعقد کریں۔ اردو کو سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا یو۔پی میں اس کے بعد بہار میں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ انجمن کا اجلاس یو۔پی یا بہار میں ہو لیکن ہماری یہ خواہش بھی ہے کہ کانفرنس صرف "نشستند و گفتند و برخاستند" کی شکل میں نہ ہو بلکہ اس کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد ہو اور ہمارا معاملہ آگے بڑھے۔"

جب اردو کے لئے عملاً کچھ کرنے کی بات چلی تو میں نے سرور صاحب سے پوچھا ــــ "آپ کے خیال میں اردو کو سب سے زیادہ نقصان کن علاقوں میں پہنچا اور کیوں؟"ــــ

سرور صاحب نے جواب دیا: "یو۔پی، بہار، راجستھان اور ہریانہ پسماندہ ریاستیں ہونے کے ساتھ ہی رجعت پسند طاقتوں کا گڑھ بھی ہیں۔ ان ریاستوں میں اردو کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا۔ یو۔پی میں جہاں اردو کا چلن تھا، اردو کو ختم کرنے میں ڈاکٹر سمپورنانند اور ٹنڈن جی کا رول خاص طور پر رہا۔ بہار میں یہ بات نہیں ہوئی۔ وہاں یو۔پی کے مقابلے میں بہتر حالت ہے لیکن کسی بھی ریاست میں حکومت کی طرف سے اردو کی ہمت افزائی نہیں ہوئی۔"

سرور صاحب نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ اردو کے حامیوں میں بددلی اور مایوسی پیدا ہو گئی ہے لیکن انہوں نے کہا کہ "اردو کے حامیوں کو مایوسی، بددلی اور ہراس کی دلدل سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے ــــ گجرال کمیٹی اور ترقی اردو بورڈ کا قیام ہی اردو کے لئے سب کچھ نہیں ہے لیکن ان اقدامات کو ہمیں بے کار بھی نہ قرار دینا چاہئے بلکہ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ جو کچھ مل رہا ہے اسے لے لیں اور جو کچھ نہیں ملا اسے حاصل کرنے کے لئے جدوجہد جاری رکھیں۔"

انہوں نے اردو یونیورسٹی کے مطالبہ کی بھی پرزور تائید کی اور کہا کہ ایک اردو یونیورسٹی شمالی ہند میں اور دوسری جنوبی ہند میں ہونی چاہئے۔

کچھ عرصہ قبل ترقی پسندوں کے ایک گروہ نے اردو

انٹرویو۔ ہمارے شائع ہونے والی ملاقاتوں کا
مقصد آپ کو مختلف اور متضاد نظریات رکھنے والے
ممتاز اور نمایاں افراد سے متعارف کرانا اور ان کے
خیالات سے باخبر کرنا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ان
کے خیالات سے ہمیں یا آپ کو اتفاق بھی ہو
ان ملاقاتوں کے ذریعے آپ کو جماعت کے نمائندہ
رہنماؤں کے دلوں کے حق تک رسائی حاصل ہوتی ہے کہ انہیں
سمجھنے اور پہچاننے کا موقع ملتا ہے اور یہ ایک بڑا فائدہ ہے
یاد رکھئے کہ جس شخص سے انٹرویو لیا جاتا ہے
ہم اس سے صرف سوالات ہی کر سکتے ہیں۔ ضروری
نہیں ہے کہ وہ ہمارے ہر سوال کا جواب دے یا
کسی اختلافی جواب پر ہم اس سے بحث کریں۔
(ادارہ)

کی بقا کے لئے اس کا رسم الخط بدل دینے کی تجویز پیش کی تھی میں نے سرور صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ اس تجویز کی تائید کرتے ہیں؟ انہوں نے قدرے برہمی کے انداز میں کہا: "یہ بالکل غلط بات ہے جس چیز کو دستور میں طے کر لیا گیا ہے اسے بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دستور نے ہر زبان کے رسم الخط کی ضمانت دی ہے جو لوگ اس قسم کی تجویز پیش کرتے ہیں، میرے خیال میں ان کا ایمان کمزور ہے۔ میں اسے نہیں مانتا کہ ہندی رسم الخط صوتی اعتبار سے اچھا ہے ہمارا کہنا یہ ہے کہ اردو کا رسم الخط قدرے مکمل اور اصولی ہے اس میں وقت بھی کم لگتا ہے اور جگہ بھی کم صرف ہوتی ہے اسے ایک قسم کا شارٹ ہینڈ بھی کہا جا سکتا ہے۔"

اپنے موقف کو قدرے مدلل بناتے ہوئے انہوں نے کہا: "علمی حیثیت سے تو یہ صحیح ہے کہ ہر زبان ہر رسم الخط میں لکھی جا سکتی ہے لیکن کسی زبان کے رسم الخط کو بالکل ختم کر دینے کا مطالبہ کرنے والے ناسمجھ، ضعیف الاعتقاد اور بہکے ہوئے

لوگ ہیں ان کی وجہ سے ہم اپنا معاملہ کیوں بگاڑیں — اگر ہندوستانی زبانوں کے رسم الخط کو بدلنے ہی کی بات کرنی ہے تو پہلے ان ہندوستانی زبانوں کے رسم الخط کو بدلنا چاہئے، جو ہندی سے بالکل ملتے جلتے ہیں مثلاً بنگالی رسم الخط ہندی سے بہت قریب ہے، کیوں نہیں اسے بدلا جاتا؟ میں بڑی صفائی کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اس معاملہ میں کسی سے مرعوب نہ ہونا چاہئے۔ زبان کا رسم الخط سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور رسم الخط سے زبان کی پوری تقدیر وابستہ ہوتی ہے۔ اس لئے جو بھی رسم الخط بدلنے کی بات کہتا ہے وہ حماقت اور جہالت کی بات کرتا ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ اردو رسم الخط میں کچھ خامیاں ہیں۔ اسے میں مان سکتا ہوں کیونکہ کسی بھی زبان کا رسم الخط خامیوں سے پاک نہیں ہے، اس لئے رسم الخط میں اس حد تک اصلاح کی جا سکتی ہے جو خامیاں ہیں وہ دور کر دی جائیں۔"

"ترقی اردو بورڈ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے سرور صاحب سے اگلا سوال کیا اور انہوں نے زیر لب مسکرا کر جواب دیا "اگر بورڈ ہمارا مطالبہ مانتا ہے تو ہم اس کی تعریف کریں گے ——— دراصل ہم بنیادی معاملات کو دیکھتے ہیں۔ جزوی سے متاثر نہیں ہوتے اس وقت تو بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہم دیکھنے والوں کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔"

"کیا یہ حقیقت نہیں کہ اردو کو کسی قیمت پر بھی بہار اور یو پی کی سرکاری زبان نہ بنایا جائے گا۔ اس لئے انجمن ترقی اردو ان صوبوں میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کے مطالبہ پر برابر اصرار کرنے کی بجائے ایسا مطالبہ کیوں نہیں کرتی جسے تسلیم کئے جانے کا زیادہ امکان ہو اور جس کی منظوری کے بعد اردو کے فروغ کی راہ ہموار ہو سکے؟" یہ تھا آخری سوال جو میں نے سرور صاحب سے کیا اور انہوں نے جواب دیا ——— "ہم اردو کے لئے جو کچھ چاہتے ہیں وہ بغیر سرکاری زبان کے ہو نہیں سکتا۔ یہ بات نہیں کہ ہم اردو کے لئے عوامی تحریک نہیں چلا سکتے لیکن "ماس ایجی ٹیشن" سے ہمارے گریز کا سبب یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ بلوہ ہو سکتا ہے اور اس سے اردو کے کاز کو مزید نقصان پہنچ سکتا ہے۔" اس ضمن میں انہوں نے اختصار کے ساتھ انجمن کے مطالبات کا تذکرہ بھی کیا اور کہا کہ انجمن چاہتی ہے کہ:-

(۱) پرائمری سطح پر ان تمام بچوں کو اردو میں تعلیم دی جائے جن کی مادری زبان اردو ہے اور اسکولوں کا قیام آبادی کے تناسب سے کیا جائے۔ (۲) ہر دس پرائمری اسکولوں میں اردو کا ایک سکنڈری اسکول ہو۔ (۳) ضلعی اور ڈویژنل سطح پر ابتدائی اور ثانوی اردو اسکولوں کے لئے اساتذہ کی ٹریننگ کا انتظام کیا جائے (۴) اردو میں تمام مضامین کی درسی کتابوں کی طباعت اور فراہمی کا انتظام کیا جائے۔ (۵) مذکورہ بالا انتظامات پر پوری طرح عملدرآمد کرانے کے لئے ریاستی سطح پر نگراں عملہ مقرر کیا جائے (۶) ضروری قانون، قواعد اور احکامات اردو میں شائع ہوں۔ تمام دفاتر اور عدالتوں میں اردو میں درخواستیں قبول کی جائیں (۷) انتخابی فہرستیں اردو میں چھاپی جائیں۔ اور سڑکوں اور دفاتر پر اردو میں بورڈ لگائے جائیں (۸) مجالس قانون ساز میں اردو میں تقریریں کرنے اور حلف لینے کی اجازت ہو اور انکی کارروائی بھی اردو رسم الخط میں لکھی جائے۔ (۹) ریاست، ضلع اور تحصیل کی سطح پر انتظامیہ کے تمام افسروں کے لئے اردو کا علم ضروری ہو۔ (۱۰) اردو بولنے والوں کے تسلیم شدہ اداروں کے ذریعے قائم کئے جانے والے اردو کالجوں کو مناسب گرانٹیں دی جائیں۔ (۱۱) پہلی بار دو اردو یونیورسٹیاں قائم کی جائیں۔ ایک شمال میں اور دوسری جنوب میں۔ (۱۲) اردو کی تسلیم شدہ تنظیموں کو فروغ اردو کے لئے زیادہ امداد دی جائے۔ (۱۳) اردو لائبریریوں اور ریڈنگ روموں کو فراخدلی سے امداد دی جائے اور نئی اردو لائبریریاں اور ریڈنگ روم کھولے جائیں۔ (۱۴) ریاستوں اور مرکز میں ترقی اردو کا ایک محکمہ قائم کیا جائے جو ان تمام اقدامات پر عملدرآمد کرائے جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے۔ ■

صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری

کا پیغام

محترم صدیقی صاحب

صدر جمہوریہ کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ
ہما اردو ڈائجسٹ کا اردو نمبر شائع کر رہے ہیں۔ صدر اس
نمبر کے لئے اپنی بہترین خواہشات کا اظہار کرتے ہیں اور
امید کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کو پڑھ کر فیضیاب
ہوں گے۔

آپکا
راگھوا راؤ
سکریٹری صدر جمہوریہ ہند

۶ مارچ ۱۹۷۳ء

نائب صدر جمہوریہ شری گوپال سروپ پاٹھک

کا پیغام

محترم

نائب صدر کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ
مارچ کے آخری ہفتے میں ھما کا اردو نمبر نکال رہے ہیں
شری پاٹھک اپنی بہترین خواہشات کا اظہار اور نمبر کی
کامیابی کی دعا کرتے ہیں۔

آپکا
دی۔ پھڈکے
سکریٹری نائب صدر جمہوریہ

۵ مارچ ۱۹۷۳ء

اردو نمبر

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ ہما اردو نمبر
نکال رہا ہے میں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔
آئی۔کے۔گجرال

TRIVANDRUM

March 7, 1973.
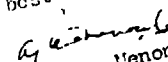
C ACHUTHA MENON
CHIEF MINISTER, KERALA

No 679/CM/73

MESSAGE

I am happy to learn that Huma 'Urdu Digest' is bringing out a special issue on "Urdu" by the last week of March 1973.

I send my best wishes.

C Achutha Menon
Chief Minister

Shri Abdul Waheed Siddiqui,
Editor - Huma Urdu Digest,
J-17, Jangpura Extension,
New Delhi-14.

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ہما اردو نمبر نکال
رہا ہے میں اپنی بہترین خواہشات بھیج رہا ہوں۔
اچوت مینن
وزیراعلیٰ

age.

d to know that the Urdu

ging out a special issue of

ith a view to indicating to

ou. r . ity, richness and historical importance of this language.

HUMA has been rendering valuable service to the lovers of Urdu language in our country a has already played a role in building up a consciousness of the importance of national integration. I am very glad, therefore, to associate myself with this special issue by extending to the HUMA my very best wishes for its continued success.

New Delhi;
March 9, 1973.

(Swaran Singh)

مجھے یہ جان کر بہت مسرت ہوئی ہے کہ اردو ڈائجسٹ
ہما اردو کی خوبصورتی، عظمت، تاریخ اور موجودہ مسائل پر
روشنی ڈالنے کے لئے ایک خاص نمبر نکال رہا ہے۔
ہما کافی عرصے سے اس ملک میں اردو سے محبت
رکھنے والوں کی بیش بہا خدمت کر رہا ہے۔ ملک میں قومی
یکجہتی کا ذہن تعمیر کرنے میں ہما نے بہت اہم کردار نبھایا ہے
اس لئے مجھے ہما کے اس خاص نمبر میں شامل ہوتے ہوئے
بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ میری خواہش ہے کہ ھما
مستقبل میں بھی اسی طرح کامیابی حاصل کرتا رہے۔
سورن سنگھ

اردو ڈائجسٹ ہما اپریل ۱۹۷۳

شری بنسی لال ۔ وزیر اعلیٰ، ہریانہ

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ہما اردو ڈائجسٹ اردو نمبر نکال رہا ہے۔

اردو ہندوستان کی بہت ترقی یافتہ زبان ہے۔ اردو کے ادیبوں، عالموں اور شاعروں نے ہمارے تہذیب و تمدن کو بہت کچھ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو سے محبت رکھنے والے مستقبل میں بھی ہماری زندگی اور ہمارے ادب کو خوبصورت بنانے میں حصہ لیتے رہیں گے۔

اس نمبر کی کامیابی کے لئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

بنسی لال

وزیر اعلیٰ تامل ناڈو شری کرونانذھی کا پیغام

"مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ہما اردو ڈائجسٹ اردو زبان کی تاریخ اور خوبصورتی، اس کی ترقی اور موجودہ مسائل پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک خاص نمبر نکال رہا ہے میں ان تمام لوگوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جن کا تعلق اس جریدے سے ہے اور ان کی اس کوشش کے کامیاب ہونے کی خواہش کا اظہار کرتا ہوں۔

ایم ۔ کرونانذھی
وزیر اعلیٰ تامل ناڈو

۵ مارچ ۱۹۷۳ء

وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش جناب پی ۔ سی سیٹھی کا پیغام

اردو جائز طور پر اور فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ وہ ایک مالدار زبان ہے اور اس نے کئی عظیم ادبی شخصیتوں کو جنم دیا ہے جنہوں نے ہندوستان کی ثقافتی زندگی کو بڑی حد تک مالامال کیا ہے۔ میں اردو پر خصوصی نمبر کی اشاعت کے لئے آپ کے فیصلے پر اظہار پسندیدگی کرتا ہوں اور اپنی اس دلی خواہش کا اظہار کرتا ہوں کہ یہ شمارہ اس زبان کے مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالیگا اور اسے اپنے جائز مقام پر لانے کے لئے راہ ہموار کرے گا۔

پی ۔ سی سیٹھی

گورنر اتر پردیش جناب اکبر علی خاں کا پیغام

راج بھون۔ لکھنؤ

یکم مارچ ۱۹۷۳ء

محترم صدیقی صاحب

آپ کے ۲۸ فروری کے خط کے لئے بہت بہت شکریہ۔ میں ہمارا اردو ڈائجسٹ کے بارے میں اور بھی بہت کچھ جاننا چاہوں گا۔

جہاں تک اردو کی ترقی کا سوال ہے' اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی میں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں روا رکھا گیا۔ لیکن میرے خیال میں حکومت نے ترقی اردو بورڈ قائم کرنے اور اسے ایک کروڑ روپے دینے کا جو قدم اٹھایا ہے' اس کے لئے اردو سے محبت رکھنے والے تمام لوگوں کو ہماری محبوب وزیر اعظم اور ان کی مرکزی حکومت کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ آپ کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ اتر پردیش میں میری حکومت نے بھی ایک اردو اکاڈمی قائم کی ہے، میں نے اس کے ساتھ ذاتی رابطہ قائم کر رکھا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ یہ اپنا فرض کافی سلیقے سے نبھا رہی ہے۔ اس کے علاوہ میری حکومت کچھ دوسرے اقدام بھی کر رہی ہے جن کے ذریعے ان لوگوں کو آسانی فراہم کی جاسکے جو اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ کا رسالہ اردو کی ترقی کے سلسلے میں ٹھوس تجاویز پیش کرے گا۔ ایک تجویز یہ ہو سکتی ہے کہ ہر بڑے قصبے میں رضاکارانہ طور پر اردو سکھلانے کی کلاسوں کا اہتمام کیا جائے۔ یہ کلاسیں ہر روز ایک گھنٹے سے زیادہ کی نہیں ہونی چاہئیں۔ میں نے تقریباً چھ ماہ قبل حیدرآباد میں اسی قسم کی ایک کلاس شروع کی ہے' اس کورس کی مدد سے ان لوگوں کو جو اردو سیکھنا چاہتے ہیں تین ہفتے یا زیادہ سے زیادہ چھ مہینے میں اردو سکھائی جا سکتی ہے میرے خیال میں اگر محبانِ اردو اس قسم کے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائیں تو یہ اردو کی ترقی کی راہ میں بہت بڑا قدم ہوگا۔

نیک خواہشات کے ساتھ آپ کا

اکبر علی خاں

گورنر اتر پردیش

درست فرمائیے

صفحہ ۱۲۹ پر۔ جو فوٹو شائع ہوا ہے وہ داستان گو میر باقر علی کا نہیں ہے بلکہ دہلی کے مشہور صحافی میر ناصر علی مرحوم کا ہے۔

صفحہ ۱۵۵ پر "حامد اللہ افسر میرٹھی" حامد اللہ افسر ادیب اور شاعر جو اپنے دور کے نثر نگاروں میں امتیازی شان کے حامل رہے ہیں۔ ان کے افسانے کسی زمانے میں بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے اس کے علاوہ آپ شاعری میں بھی ایک امتیاز رکھتے ہیں۔ آپ کی اردو عام فہم اور دلکش ہے۔

صفحہ ۱۵۶ پر۔ جو فوٹو شائع ہوا ہے وہ فلان محمد خاں شہیر کا نہیں ہے بلکہ حکیم محمد اشفاق حسین زکی شاگرد مرزا غالب کا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کے آخری ۲۲ سال بھوپال میں گذارے تھے۔

صفحہ ۱۹۱ پر۔ مانی جائسی۔ آخری سطریں اس طرح پڑھیں۔ افسوس ہے کہ اتنے عظیم شاعر کا آخری مجموعۂ کلام ابھی تک شائع نہ ہو سکا جسے مرحوم نے خود اپنی تحریر میں آفسٹ پر شائع کرنے کا عزم کیا تھا۔ کاش کوئی اس طرف توجہ کرتا اور اردو ادب میں جو خلا سا رہ گیا ہے اسے پُر کر سکتا۔ مرحوم کے دو مجموعے ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکے تھے۔

اُردو

منکرین اور منصفین کی نظر میں

ضیا مجاہد

مہاتما گاندھی :۔ میں اُردو کی ترقی چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سب ہندو جو ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اُردو سیکھیں۔ اور مسلم ہندی سیکھیں۔ (ماخوذ)

ڈاکٹر راجندر پرساد :۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے حامی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان دونوں زبانوں کی ترقی میں ہندو اور مسلمان دونوں کا حصہ ہے (ماخوذ)

پنڈت جواہر لال نہرو :۔ اُردو ایک ایسی زبان ہے جس میں زندگی کی دھڑکنیں موجود ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ مختلف اسباب کی بنار پر اردو کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کی جانی چاہیے۔ یہ ان زبانوں میں سے ایک زبان ہے جس کا ذکر دستور میں موجود ہے اور یہ بالکل ٹھیک ہے کیونکہ بے شک وہ ایک ہندوستانی زبان ہے۔ اُردو پاکستان کی زبان نہیں ہے۔ پاکستان تو کیا ہندوستان کے علاوہ کوئی ملک اس زبان کے متعلق اپنا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

(پریس کانفرنس منعقدہ ۲۵ ر اکتوبر ۵۶ء نئی دلی)

مولانا ابوالکلام آزاد :۔ اب یہ سوال اٹھتا ہی نہیں کہ پورے ملک کی زبان کونسی ہوگی۔ کیونکہ ہندی کو جو جگہ ملنا تھی وہ اسے مل گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکائے لیکن اس کے ساتھ اُردو کی جو جگہ ہے وہ اسے ملنی ہی چاہیے (آخری تقریر)

ڈاکٹر ذاکر حسین :۔ اُردو کو مختلف علاقوں میں سرکاری زبان کا درجہ دینے کا میں ہمیشہ سے حامی رہا ہوں۔ حدودِ دستورِ ہند کے اندر رہ کر جو کچھ میں کوشش کر سکتا ہوں اس میں انشاء اللہ دریغ نہیں کروں گا۔

بی۔ پی موریا ممبر پارلیمنٹ :۔ اردو ہندوستان کی زبان ہے وہ کسی دوسرے ملک میں نہیں بولی جاتی جس طرح ہندی، مراٹھی، بنگالی اور پنجابی ہندوستانی زبانیں ہیں اسی طرح اردو بھی ہندوستانی زبان ہے۔ اردو اسی ملک میں پیدا ہوئی، اسی سرزمین میں اس کی نشو و نما ہوئی۔ (خالد سہروردی کی ملاقات ہما اردو ڈائجسٹ نومبر ۱۹۶۷ء)

مس مردولا سارا بھائی :۔ اردو مسلمانوں کی

زبان نہیں ہے اور نہ وہ پاکستان ہی کی زبان ہے، اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ وہ یہیں پیدا ہوئی، یہیں اس نے ترقی کی۔ اگر ہم نے زبان کا مسئلہ نہ چھیڑا ہوتا تو آج ہندوستانی زبان (اردو) ہی قومی زبان بنتی، گاندھی جی کی بھی یہی خواہش تھی۔

(اردو ڈائجسٹ ہما مارچ ۶۸ء)

سردار گوردیال سنگھ ڈھلوں (اسپیکر لوک سبھا) "میرا ذاتی خیال ہے کہ اردو زبان کو وہ اہمیت، وہ مقام اور وہ مرتبہ نہیں دیا جا رہا ہے جس کی وہ حق دار ہے۔ میں تو اردو کا دلدادہ ہوں، بی اے تک اردو پڑھی ہے، ایک اردو اخبار کا ایڈیٹر بھی رہا ہوں، میرے والد اردو اور فارسی کے جید عالم تھے، بہرحال جوں جوں وقت گزرتا ہے اس زبان کو پیچھے ہٹتے اور نیچے گرتے ہوئے دیکھ کر مجھے کافی رنج ہوتا ہے، لیکن پچھلے دنوں اس سلسلہ میں جو رپورٹ آئی اور پارلیمنٹ میں اس پر بحث ہوئی اس سے کچھ امید بندھتی ہے۔ اس بحث میں اردو کا کافی چرچا ہوا اور اس کے لیے کچھ ممبروں نے آواز اٹھائی، مجھے خوشی ہے کہ سرکار نے اس سلسلہ میں کافی یقین دلایا اور ممبروں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ میرے خیال میں ہمیں ان وعدوں اور یقین دہانیوں کو آزمانا چاہیے۔"

(خالد ہندی کی ملاقات ہما جنوری ۷۲ء)

پروفیسر شبن لال سکسینہ (ممبر پارلیمنٹ مشرقی یوپی) "اردو کو یوپی کی دوسری زبان ابھی نہیں بنایا جا سکتا۔ ترپاٹھی جی جیسی تنگ ذہنیت کے آدمی ہیں وہ اردو کو ہرگز ترقی نہ دیں گے۔ ایک عرصہ تک وہ یوپی کے وزیر تعلیم رہے اور ان کے زمانہ ہی میں راتوں رات اردو کو اسکولوں، کالجوں، دفتروں اور عدالتوں سے نکالا گیا تھا اس لیے اردو کے سلسلہ میں ان سے کوئی امید نہیں

کی جا سکتی جب وہ یوپی کے چودھری نہ رہیں گے اور ان کی جگہ پر کوئی بھلا آدمی آئے گا۔ اس وقت اردو کے لیے کوئی بہتر صورت نکل سکے گی۔ میرا خیال یہ ہے کہ مسلمان اردو کے لیے جتنا شور و غل کریں گے اردو کو اسی قدر نقصان ہوگا۔ اردو ایک جاندار اور خوب صورت زبان ہے کسی زبان کو مارنا بہت بڑی بے وقوفی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ چکبست، فراق، اور ملا کی زبان کو ختم نہ کیا جا سکے گا۔ اردو کو فروغ حاصل ہوگا اور ایک دن ایسا آئیگا جب خود اردو کے مخالفین اس کی حمایت کریں گے۔"

(اردو ڈائجسٹ ہما مئی ۱۹۷۲ء صفحہ ۱۴ و ۱۵)

ایس ایم جوشی (سابق صدر سوشلسٹ پارٹی) "اردو نہ مسلمان کی زبان ہے نہ پاکستان کی۔ آزادی سے پہلے پاکستان میں کہاں تھی یہ زبان۔ یہ تو ہندوستان کے شمالی صوبوں کی زبان ہے۔ یہیں پیدا ہوئی یہ ہندو

اردو اسی ملک کی زبان ہے —— جے پرکاش نرائن

مسلمان دونوں کی زبان ہے۔ میں اس بات کے حق میں ہوں کہ یہ زبان جن علاقوں میں بولی جاتی ہے، وہاں اس کو دوسری زبان کی حیثیت سے مان لینا چاہیے۔" (ہما مئی ۶۸ء)

سردار سورن سنگھ: "اردو بڑی پیاری اور شیریں زبان ہے میری تو یہ مادری زبان ہے۔ اردو کو زندہ اور قائم رکھنے کی ذمہ داری تو خود اردو والوں پر زیادہ ہے۔ آپ خود ہما جیسا خوبصورت ڈائجسٹ نکال کر اردو کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حکومت کی طرف سے بھی اس کے پڑھانے کا انتظام ہونا چاہیے۔ اگر یہ کسی اسٹیٹ کی سرکاری زبان بن سکے تو بہت ہی اچھا ہے۔" (مرکزی وزیر خارجہ سے مولانا عبدالوحید صدیقی کی ایک ملاقات۔ ہما فروری ۶۸ء)

مرارجی بھائی ڈیسائی: "اردو کسی علاقے کی زبان ہے نہ تھی نہیں تھی۔ یہ زبان نہ مسلمانوں کی ہے نہ ہندوؤں کی، یہ تو یہیں کی زبان ہے۔ مگر مسلمانوں نے اس کو اپنی زبان بنا کر غلطی کی ہے۔ سارا جھگڑا اسی سے پیدا ہوا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اُردو ایک اچھی، میٹھی اور پیاری زبان ہے اس کو سیکھنا اور سکھانا چاہیے۔ مگر یہ کسی علاقہ کی زبان نہیں بن سکتی۔ یہ یوپی اور دہلی کی بھی زبان نہیں رہ گئی ہے۔ اب ان علاقوں میں بھی بہت کم لوگ اس کے بولنے والے ہیں۔" (مرارجی ڈیسائی سے مولانا عبدالوحید صدیقی کی ملاقات اس وقت مرارجی نائب وزیراعظم تھے۔ ہما جولائی ۶۸ء)

جے پرکاش نرائن: "بے شک اس میٹھی زبان کو ضرور زندہ رہنا چاہیے اور میرے خیال میں یہ زبان ضرور زندہ رہے گی اسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔ یہ اسی ملک کی زبان ہے۔ یہیں پیدا ہوئی، یہیں پروان چڑھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کو انصاف ضرور ملے گا۔ بہار کی حکومت کچھ کر رہی تھی، مگر وہ معاملہ پارٹی بندی کا شکار ہوگیا۔ مرکزی حکومت بھی کچھ سوچ رہی ہے۔ اور شاید اردو کے حق میں کوئی پالیسی بھی بن گئی ہے، جس پر جلدی عمل ہوگا۔ میں نے انجمن ترقی اردو والوں سے بات کی تھی۔ میں اس سلسلہ میں دوسری پارٹیوں کے لیڈروں سے بھی ملا تھا۔ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ اردو کو باقی رکھنا اور اس کی ترقی کے لیے اُپائے (طریقے) اختیار کرنا بہت دشوار تو نہیں ہے۔ یہ مسئلہ آسانی سے طے ہو سکتا ہے لیکن میں مبہم VAGUE باتوں کو نہیں مانتا۔ اردو سیکنڈ اسٹیٹ لینگویج نہیں ہو سکتی۔ اگر اس کو یہ درجہ دیا جائیگا تو ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی زبانوں جیسے میتھلی یا بھوجپوری کا جھگڑا کھڑا ہو جائے گا۔ وہ کہیں گے ہمیں بھی کوئی درجہ دو۔" (جے پرکاش نرائن سے خالد ہندی کی ملاقات ہما نومبر ۶۸ء)

اے۔ کے گوپالن کمیونسٹ رہنما: "کسی بھی زبان کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اور اردو جیسی عوامی زبان

کو ختم کرنا مشکل ہے۔ یہ زبان اسی ملک کی زبان ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کی ہی زبان نہیں ہے۔ یہ ایک مشترکہ زبان ہے۔ میری رائے میں اس زبان کو نہ صرف اس ملک میں باقی رہنا چاہیے بلکہ اس کی ترقی کے مواقع بھی فراہم کرنے چاہئیں۔ اس زبان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کیرالا جیسے دور دراز علاقوں میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مرکزی حکومت سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اس کو اس کا جائز مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

(خالد ہندی سے ملاقات۔ ۱۴ جنوری ۶۹ء)

اشوک مہتہ (سابق مرکزی وزیر) "اردو ہندوستانی زبان ہے، وہ دستور کی زبان ہے وہ نہ ہندو کی زبان ہے نہ مسلمان کی۔ وہ کیرالا جیسے دور دراز حصوں میں بھی بولی جاتی ہے۔ اردو ایک مالدار، ترقی یافتہ، نہایت شیریں اور جوشیلی زبان ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کو اس کا صحیح مقام نہ دینا بہت بڑا ظلم ہے۔ اگر اردو کو صرف مسلمانوں سے وابستہ کیا گیا اور اس کو زیادہ عربی و فارسی آمیز بنایا گیا تو اس کو نقصان پہنچے گا۔"

(خالد ہندی کی ملاقات ۱۴ فروری ۶۹ء)

اشوک مہتہ

مدھو لمے (سوشلسٹ پارٹی) "اردو نہ پاکستان کی زبان ہے اور نہ مسلمانوں کی۔ بلاشبہ یہ ایک ہندوستانی زبان ہے۔ یہ زبان ان علاقوں میں بھی بولی جاتی ہے جہاں مسلمان نہیں ہیں۔ میں اس زبان کو بہت پرانی زبان نہیں مانتا۔ ہندی اور اردو کا تو کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ اردو کا رسم الخط اگر تبدیل کر دیا جائے تو یہ مسئلہ ختم ہو جائے، دونوں

فرینک اینتھونی:۔ "اردو ہی درحقیقت شمالی ہندوستان کی عام زبان ہے۔ میں اردو بخوبی سمجھ لیتا ہوں اور ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں اپنا کام بھی چلا لیتا ہوں لیکن پارلیمنٹ میں جب سیٹھ گوبند داس یا پرکاش ویر شاستری اپنی عجیب و غریب زبان میں فصاحت کے دریا بہاتے ہیں تو مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس مسئلے پر بات کر رہے ہیں لیکن ان کی زبان کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑتا۔" (اینگلو انڈین رہنما سے خالد ہندی کی ملاقات۔ ۱۴ مئی ۷۰ء)

فرینک اینتھونی ◄

اردو نمبر

زبانوں کی لغت ایک ہے۔ قواعد ایک ہیں۔ یہ دونوں ایک طرح بولی جاتی ہیں صرف لکھنے کی بات ہے۔ اردو کو اگر دیوناگری رسم الخط میں لکھا جائے تو یہ سارا جھگڑا ختم ہو سکتا ہے۔" (اردو ڈائجسٹ ہما اپریل ۶۹ء)

ناتھ پائی (پرجا سوشلسٹ) "جس زبان میں ہما جیسا مقبول ترین ڈائجسٹ نکلتا ہو اس کا مستقبل کیسے تاریک ہو سکتا ہے۔

"اردو پاکستان کی مادری زبان تو ہے ہی نہیں، وہاں کی مادری زبان سندھی، بنگالی اور پنجابی ہو سکتی ہے مگر اردو بالکل نہیں ہے۔ یہیں سے گئے ہوئے لوگ وہاں اردو بولتے ہوں گے۔ یہ زبان تو ہندوستان کی اپنی زبان ہے یہیں پر پیدا ہوئی اور یہیں پر اس کی نشوونما ہوئی۔" (ہما جون ۶۹ء)

راج نرائن سنگھ (سوشلسٹ لیڈر) "اردو ایک زندہ اور شیریں زبان ہے، ہم نے ہمیشہ اردو کے کاز کی حمایت کی ہے۔ شیر گھاٹی میں سوشلسٹ پارٹی کے قومی اجلاس نے ایک قرارداد منظور کر کے اردو کو ملک کی ایک زندہ زبان قرار دیتے ہوئے اسے علاقائی زبان مانا تھا۔" (ہما مارچ ۷۲ء)

تارکیشوری سنہا (سابق ممبر پارلیمنٹ) "اردو کے بارے میں شمالی ہند کے مسلمانوں کی شکایت بالکل بجا ہے۔ آخر ہمارے آئین میں اسے ایک قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے اور آئینی انتظام کے مطابق اسکول میں ۴۰ اور جماعت میں ۱۰ طلبا کے مطالبے پر اردو معلم کا مہیا کیا جانا لازمی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک اس کا سرکاری طور پر استعمال نہ ہو اور مقابلے کے امتحانوں اور ملازمتوں وغیرہ میں اس کا کوئی مقام نہ ہو۔ تب تک محض اس کی تعلیم کے انتظام سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ سب سے پہلی ضرورت اس کی سرکاری قبولیت اور سرکاری استعمال کی ہے۔ آخر اتنے سارے لوگ اسے بولتے اور اس میں لکھتے پڑھتے ہیں۔ بمبئی کے کچھ اردو ادیبوں، احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور سردار جعفری وغیرہ نے حال ہی میں صدر جمہوریہ کو جو عرضداشت پیش کی ہے۔ اس کے مطابق ایسے لوگوں کی تعداد تقریباً ۹ کروڑ ہے۔ یہ کوئی معمولی تعداد نہیں ان

زبان کے سلسلہ میں حکومت کی پالیسی حقیقت پسندانہ نہیں ہے، ہمیں بھاشاؤں سے کوئی اختلاف نہیں ـــــ"
(دہا ستمبر ۷۲ء)

تربھون نرائن سنگھ (سابق چیف منسٹر یوپی) "اردو

کروڑوں کو یقیناً یہ سہولت ہونی چاہیے کہ وہ حکومت کے ساتھ اپنے معاملات میں بھی اس زبان کا استعمال کر سکیں۔ میں اردو ادیبوں کے ان تمام مطالبات کی پوری قوت کے ساتھ تائید کرتی ہوں"۔ (خالد ہندی کی ملاقات ہما نومبر ۷۲ء)

ہیم وتی نندن بہوگنا (مرکزی وزیر مواصلات) "ہندوستان کی تمام زبانوں نے سوراجیہ کی لڑائی میں اپنا کردار ادا کیا ہے اگر جنگ آزادی کے دنوں میں 'بندے ماترم' نے دلوں کو گرمایا تو "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" نے بھی جادو کیا۔ اگر نرالا اور ینت نے حب الوطنی کے نغمے گائے تو حسرت اور جوش نے بھی غضب ڈھایا۔ اکبر الہ آبادی کے طنزیہ اشعار آج بھی حالات پر صادق آتے ہیں"۔ انھوں نے قدرے جوش کے ساتھ کہا "کونسا ملک ہے جس کی صرف ایک زبان ہے۔ زبانوں کی کثرت سے اگر کوئی ملک کمزور ہوتا تو آج روس دنیا کا سب سے کمزور ملک ہوتا جس کی ۱۲۵ زبانیں ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ زبانیں کسی قوم کا بہت بڑا اثاثہ ہوتی ہیں اور جہاں بھی کسی ایک زبان کو مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں انتشار پیدا ہوتا ہے"۔ (خالد ہندی سے ملاقات ہما اکتوبر ۷۲ء)

پروفیسر رنگا (سوتنتر پارٹی) اردو ایک تہذیبی زبان ہے، اس کو برقرار رہنا ہے۔ یہ دستور کی چودہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس مسئلہ کا حل ایک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اردو اور ہندی کے لیے ایک مشترکہ رسم الخط ہو۔ کچھ لوگ رومن کی بات کرتے ہیں۔ مگر میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کا فیصلہ عوام کریں گے۔
(ہما اردو ڈائجسٹ مئی ۶۹ء)

حکم چند کچھوائی (جن سنگھ) "اردو ہماری بھاشا ہے۔ دیش کی جتنی بھی بھاشائیں ہیں ان سب کی ترقی ہونی چاہیے

صادق علی ــــــ اردو انتہائی جاندار زبان ہے

ــے یے جو کچھ بھی ہو وہ بہت خوب صورتی سے ہونا چاہیئے۔ مجھے اردو کے پُرجوش حامیوں اور ہندی پریمیوں دونوں کی طرف سے شکایتیں ہیں۔ میں اردو کا نعرہ بھی غلط سمجھتا ہوں اور ہندی کا بھی نعرہ میرے خیال میں غلط ہے۔ نہ تو اردو کو کسی تحریک کی شکل دینی چاہیے نہ ہندی کو۔ ہم اور آپ اسی ملک کے رہنے والے ہیں یہیں پیدا ہوئے ہیں یہیں مریں گے۔" (ہما دسمبر ۷۲ء)

مس مردولا سارا بھائی

صادق علی (صدر تنظیمی کانگریس) اردو انتہائی جاندار زبان ہے۔ اس کو ترقی دینے کے لیے ہر ممکن سہولت ملنی چاہیے۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ اس زبان نے قومی ارتقا اور سیاسی تحریکوں میں روح پھونکنے کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ یہ ہمارا قومی سرمایہ ہے۔ اس کی حفاظت کرنا اور اس کو ترقی دینا بلا امتیاز دین و مذہب رنگ و نسل سب کا ہی فرض ہے۔ (ہما اگست ۷۱ء)

یس نجلنگپا (سابق صدر کانگریس) ــــ جہاں تک میسور کا تعلق ہے اور جب تک وہاں کا وزیر اعلیٰ رہا مجھے اردو کے بارے میں کبھی کوئی شکایت سننے کو نہیں ملی۔ اور اس ملک کے دستور اساسی میں تسلیم شدہ چندرہ قومی زبانوں میں سے اردو بھی ایک ہے۔ اس کا عظیم ادب ہے۔ جو لوگ اسے اپنی زبان سمجھتے ہیں انھیں اس زبان کو پڑھنے پڑھانے اور ترقی دینے سے کوئی نہیں روکتا۔ (ہما ڈائجسٹ)

این۔ جی۔ گورے (سوشلسٹ لیڈر) اردو ہمارے ہی ملک کی ایک خوب صورت زبان ہے۔ خود میں نے جدوجہد آزادی کے دنوں میں جیل میں رہ کر درجۂ ہفتم تک اردو پڑھی تھی۔ اس وقت میرا یہ خیال تھا کہ آزاد ہندوستان میں اردو سے واقفیت ضروری ہوگی لیکن پھر میں نے اردو نہیں پڑھی۔ میں بھول گیا اس زبان کو۔ اب صرف اردو میں دستخط کر سکتا ہوں۔ (ہما فروری ۷۲ء)

فخر الدین حسین محسن (ڈپٹی ہوم منسٹر) میں مسلمان ہو کر بھی اردو نہیں جانتا اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں میں اس نظریہ کا سختی سے مخالف بھی ہوں اور حقیقت بھی اس کے برعکس ہے کہ اردو کو مسلمانوں ہی کی زبان قرار

دیا جائے۔ یورپ میں فرانسیسی کی طرح اردو ہندوستان کی LINGUA FRANCA یعنی ایسی مخلوط زبان ہے جو مختلف قوموں میں اظہار خیالات کا سب سے آسان ذریعہ ہے۔ آسام، بنگال، گجرات اور جنوبی ہندوستان کے بہت سے مسلمان صرف صوبائی زبانیں جانتے ہیں اس کے برعکس مدراس، میسور اور آندھرا پردیش، پنجاب، یوپی، بہار، مہاراشٹر وغیرہ میں ہزاروں ایسے غیر مسلم موجود ہیں جو اردو کی تحریر و تقریر کے میدان میں کروڑوں مسلمانوں سے زیادہ نمایاں اور ممتاز ہیں۔ اس لیے اردو زبان کو محض مسلمانوں کی زبان سمجھنا اردو کی ترقی کا جھٹکا کر دینے کے مترادف ہے۔"

(ہما نومبر ۱۹۷۲ء)

ششی بھوشن (ایم پی) "میں خود اردو جانتا ہوں اس زبان کی عظمت سے بخوبی واقف ہوں۔ مجھے اردو شاعری سے قلبی لگاؤ ہے۔ بلکہ جب تقریر کے دوران مجھے زور بیان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو میں فراٹے کے ساتھ اردو بولنے لگتا ہوں۔ میں یہ ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں کہ ہندی زبان ہندوؤں کی اور اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ جن لوگوں کو اس ڈھنگ سے سوچنے کی عادت پڑ گئی ہے وہ اپنی زبان سے خود کشی کرانے پر تلے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ ہندی والے ہوں یا اردو والے۔ زبانیں کبھی بھی حکومت کی سرپرستی سے آگے نہیں بڑھتیں۔ آپ اچھا ادب تخلیق کر کے پیش کریں تو عوام خود اس کی سرپرستی کرنے لگتے ہیں اور عوام کی سرپرستی ہی کسی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے سب سے بڑی ضمانت ہے۔ کالی داس اور عمر خیام کو پڑھنے کے لیے ہالینڈ، جرمنی، انگلستان، فرانس اور بلجیم میں نہ جانے کتنے لوگوں نے سنسکرت اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ فرانسیسی زبان کی شیرینی اور مٹھاس سے متاثر ہو کر سارے یورپ کے لوگوں نے اسے اپنی زبان

ششی بھوشن — زبانیں کبھی بھی حکومت کی سرپرستی سے آگے نہیں بڑھتیں

پر ترجیح دی، یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آیا کہ ہالینڈ اور بلجیم وغیرہ کی حکومتوں نے فرانسیسی زبان سیکھنے پر پابندی عائد کر دی لیکن وہاں آج بھی ۵۰ فیصدی تعلیم یافتہ اشخاص فرانسیسی جانتے ہیں" سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے پر خلوص لہجہ میں کہا کہ "اردو ہندوستان کا سرمایہ ہے۔ جب ہم آرکائیوز، آرکالوجی اور نیشنل میوزیم میں صدیوں پرانی چیزوں کو محفوظ رکھنے کے لیے کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ کرتے ہیں تو اپنی زندہ چیز کا تحفظ کیوں نہیں کریں گے۔ زبان ہی ایسی چیز ہے جسے دنیا کی بڑی سے بڑی حملہ آور فوج قبضہ نہیں کر سکتی۔ زبان کے معاملہ میں محض نعرے بازی سے کام نہیں چل سکتا۔ ہریانہ میں ہندی ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں ایک لاکھ آدمی جیل گئے لیکن تعجب کی بات ہے کہ سارے ہریانہ میں نہ کوئی قابلِ ذکر شاعر ہے نہ مصنف۔"

(ہما اردو ڈائجسٹ مئی ۱۹۷۱ء)

جنرل شاہ نواز خاں (مرکزی وزیر سپلائی حکومت

منہ ڈال کر دیکھیں تو تصویر کا رخ کچھ اور ہی نظر آئے گا۔
ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو اپنے بچوں کو اردو زبان پڑھانے میں دل چسپی لیتے ہیں، کتنے ایسے ہیں جو اردو رسائل اور اخبارات خرید کر پڑھتے ہیں۔ مجھے تو بسا اوقات بڑی حیرانی اور افسوس ہوتا ہے جب میں اردو کے دلدادگان کی جانب سے انگریزی میں دعوت نامے وصول کرتا ہوں"۔
(ہما جون ۷۱ء)

ڈاکٹر شنکر دیال شرما (صدر آل انڈیا کانگریس)

"ہندوستان میں اردو کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ یہ زبان یہیں کی پیداوار ہے اور اگر آج اس کی ترقی میں کچھ موانع حایل ہیں تو وہ گزشتہ دنوں کی تاریخ کا ردعمل ہے لیکن وہ تیل جو دل و دماغ میں اردو کے خلاف عناد اور بغض کے دیے جلا رہا تھا اس کا ذخیرہ اب رفتہ رفتہ ختم ہو رہا ہے۔ ۱۹۴۱ء میں جب میں لکھنؤ یونیورسٹی کی اردو یونین کے جرنل "علم و نور" کا ایڈیٹر تھا تو میں نے اپنے ایک اداریہ میں لکھا تھا کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے اور اس کی ترقی میں ہندو مسلمان اور سکھ عیسائی سب نے ہی حصّہ لیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی زلفوں کو ہندوؤں نے زیادہ سنوارا ہے۔ اس لیے میں اردو کے مسئلہ کو کسی طرح سے بھی مسلمانوں کا مسئلہ نہیں مانتا۔
انہی دنوں سر تیج بہادر سپرو نے ہمیں ایک پیغام ارسال کیا تھا جس میں انھوں نے تحریر کیا تھا کہ "زبان کے مسئلہ کو رواداری سے ہی حل کیا جا سکتا ہے اور میں اردو زبان کو ایک طرح سے ہندوستان کی رواداری کا سمبل (نشان) تسلیم کرتا ہوں"۔ ماضی میں منشی پریم چند، پنڈت رتن ناتھ سرشار، چکبست اور نسیم نے اس چمن زار ادب کو اپنے خون جگر سے سینچا اور آج فراق گورکھپوری، کرشن چندر وغیرہ اردو ادب کی زرخیز کیاریوں کو اپنے لہو سے سرسبز اور شاداب بنانے میں سرگرم کار ہیں۔ میں نہیں مانتا کہ

اردو زبان کی ترقی کے لیے نئی راہیں استوار کرنے کے وعدے پرچھائیں کی طرح اٹل ہے اور اس سلسلے میں ہدایات بھی جاری کی جا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو زبان کی فصاحت و بلاغت، تخیل کی نفاست اور بیان کی ندرت خود اس کی بقائے دوام کی ضامن ہیں اردو ادب ہندوستان کا مایۂ ناز سرمایہ ہے۔ اس سرمایہ کو وسعت دینا ہمارا فرض ہے اور ہم اپنے فرائض کی انجام دہی میں کسی کوتاہی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔
گزشتہ دنوں کے مقابلہ میں اب کانگریس سرکار زیادہ مضبوط اور طاقت ور ہے۔ اس لیے اپنے وعدوں کو نبھانے میں ہمیں کسی رکاوٹ کا کوئی خطرہ نہیں لیکن خود اردو داں طبقہ کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی زبان کی توسیع میں اسی اسپرٹ سے کام لے جس سے وہ حکومت سے اس کے تحفظ اور توسیع کے مطالبات منوانے کی جدوجہد میں مشغول ہے۔ اس معاملہ میں اگر ہم اپنے گریبان میں

زبانیں محض حکومت کی سرپرستی سے زندہ رہتی ہیں "۔
(۱۲ جولائی ۷۱ء)

ڈاکٹر سید محمود: "اردو شاعری اور صحافت نے جنگِ آزادی میں بڑا رول ادا کیا ہے۔ آج بھی ہزاروں کی تعداد میں وہ نظمیں اور مضامین موجود ہیں جنھوں نے ہماری آزادی کے جذبات کو ابھارا اور ہمیں قربانیوں پر آمادہ کیا۔ آج بھی ہندوستان میں سنیما کی مقبولیت میں بھی اردو زبان و شاعری کا بڑا حصہ ہے۔
(خطبۂ افتتاحیہ بہار اسٹیٹ اردو کنونشن ۶۵ء پٹنہ)

پنڈت سندر لال: "ہم لوگ بحیثیت اردو بولنے والوں کے اپنے ہم وطنوں کی راشٹر بھاشا ہندی کی تشکیل میں دخل دینا نہیں چاہتے۔ ہمارے حاکم اور ملک کے بڑے لوگ اس بھاشا کو جیسا چاہیں بنالیں ہم صرف یہی کہیں گے کہ "سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے" جس طرح کی ہندی وہ گڑھیں گے ہر اردو بولنے والا اسے خوشی سے پڑھے گا۔ اور اس کو اس جگہ پر استعمال بھی کرے گا۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنی اس پیاری مادری زبان اردو کے تحفظ، استعمال بہبودی اور ترقی کا جو حق دستورِ ہند نے صاف الفاظ میں دے رکھا ہے وہ ہمیں ملنا چاہیئے "۔

اٹل بہاری واجپائی (جن سنگھ): "جن سنگھ اردو کو ایک (ہندوستانی) بھارتیہ بھاشا مانتی ہے اور اسے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہے جن سنگھ چاہتی ہے کہ جو لوگ اردو پڑھنا چاہتے ہیں اردو پڑھنے کی انھیں پوری سہولتیں دی جائیں، اردو میں درخواستیں دینے اور ان کے جواب پانے کا حق بھی منظور ہونا چاہیے "۔
(۱۴ مارچ ۷۳)

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا: اردو ہندی کی لڑائی

نا سمجھوں کی لڑائی ہے۔ اردو والوں کو ہندی اور ہندی والوں کو اردو پڑھ کر بدیسی زبان انگریزی کو بے دخل کرنا چاہیے تاکہ ملکی زبانیں ترقی کریں اور انگریزی "غلامانہ ذہنیت" ختم ہو۔

پروفیسر نورالحسن (مرکزی وزیر تعلیم) اردو زبان کے بارے میں پارٹی کی پالیسی پر عملدرآمد میں دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ جہاں بھی اردو زبان میں تعلیم کا مطالبہ ہو مناسب اساتذہ فراہم کیے جائیں اردو کی نصابی کتب کی تیاری میں عجلت کی جائے۔

سبھدرا جوشی —— اردو کو ایک اچھا مقام ملنا چاہیے۔

پنڈت آنند نرائن ملا

اس سلسلے میں ضروری ہدایت دی جا چکی ہے۔ (کل ہند کانگریس کمیٹی کی اقلیتی کانفرنس۔ منعقدہ پٹنہ)

پروفیسر رام سنگھ ہندو مہا سبھا:۔ میں اردو لکھتا پڑھتا اور بولتا ہوں۔ اردو میری زبان ہے۔ میں مدراس اور بنگلور گیا تو وہاں مسلمانوں کے کتنے ہی اردو اخبارات دیکھے۔ مقامی کارکن مجھ سے شکایت کرنے لگے کہ دیکھئے یہ لوگ یہاں بھی اردو ہی چلانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا شکر کیجئے، آپ لوگ برسوں کی محنت کے بعد بھی ہندی کو یہاں مقبول نہ کر سکے۔ جب کہ یہ تھوڑے سے مسلمان اردو کے ذریعہ ہندی کو ان لوگوں کے نزدیک چلا رہے ہیں چلئے اردو کے ذریعہ ہی ہندی کا پرچار ہونے دیجئے۔ اس لیے اگر اردو پھیلتی ہے تو مجھے خوشی ہی ہوگی۔ (۱۲ ستمبر ۶۷ء)

رام نرائن ترپاٹھی (جنرل سکریٹری یوپی جن۔ کانگریس) اردو اس ملک کی پہلی زبان ہے جسے عام لوگ سمجھتے اور بولتے ہیں۔ اس کا اپنا ایک ادب ہے۔ یہ تہذیب اور تمدن کی جیتی جاگتی نشانی ہے جو ہندوستان کا عظیم ورثہ ہے۔ اردو سے آج بھی اس ملک کو اتحاد، یگانگت اور یکجہتی کے جو جذبات وخیالات مل سکتے ہیں وہ کسی دوسری زبان کے ذریعے مشکل سے ملیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اسے علاقائی یا دوسری زبان کے خانے میں بند کرنے کے بجائے اردو تعلیم کی تمام سہولتیں اس کے استعمال کا عام چلن اور اس کی ترقی کے تمام مواقع ملنا چاہیئے اور ان سب کا تحفظ ہونا چاہیے۔

میر مشتاق احمد:۔ آج کون اس حقیقت سے چشم پوشی کر سکتا ہے کہ ایک طرف اس دربار معلیٰ میں اگر عبدالماجد دریاآبادی، قاضی عبدالودود، خواجہ احمد عباس، سید سجاد ظہیر، پروفیسر رشید احمد صدیقی، امتیاز علی عرشی، آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، روش صدیقی اور ہزاروں مسلمان ادیب، شاعر جلوہ گر ہیں تو دوسری طرف کرشن چندر، سردار راجندر سنگھ بیدی، پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار، پنڈت لبھورام، جوش ملسیانی، پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، پنڈت سندر لال، مالک رام، آنند نرائن ملّا، گوپی ناتھ امن، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، بشیشر پرشاد منور، بال مکند عرش، جگن ناتھ آزاد، دلگیر پرشاد، جبین گوہر، کنول پرشاد کنول، اور ہزارہا غیر مسلم ادیب اور فن کار ملک کے گوشے گوشے میں رونق افروز ہیں۔

(خطبۂ صدارت اُردو کنونشن ۱۲ مئی ۶۵ء)

کے۔ این پردھان (سابق وزیر محنت مدھیہ پردیش) جہاں تک میرا خیال ہے اردو دنیا کی بہترین اور طاقتور زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس میں لوچ ہے، جان ہے،

دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور ایسی زبان کبھی نہیں مٹ سکتی۔ اردو زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ (ہما دسمبر ۶۷ء)

سید میر قاسم (وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر) اردو میری ریاست کی سرکاری زبان ہے اور خود مجھے شکایت ہے کہ اردو کی اس ریاست میں بھی اردو کی ترقی کا خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا ہے۔ اردو ہمارے ہی ملک کی ایک زبان ہے اس کی ترقی کے سلسلے میں جو کمی رہ گئی ہے وہ پوری ہونی چاہیے لیکن میں اس خیال سے متفق نہیں کہ اردو مر جائے گی یا ختم ہو جائے گی۔ کوئی زندہ زبان نہیں مرتی، اردو بھی نہ مرے گی۔ یہ بہت سخت جان زندہ زبان ہے۔

(ہما اردو ڈائجسٹ کو ایک انٹرویو فروری ۷۲ء)

سی۔ پی۔ شیلانی (ایم۔ پی) میرا اپنا خیال ہے کہ اردو کا جو مرتبہ ہے وہ اس کو ملنا چاہیے۔ اس کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ میں اردو کو مسلمانوں کی زبان نہیں مانتا۔ یہ یوپی کے ڈیڑھ کروڑ لوگوں کی مادری زبان ہے۔ (ہما کو انٹرویو جولائی ۷۲ء)

ڈاکٹر فریدی (ایم، ایل، سی۔ قائد مسلم مجلس) مجھکو دستور کی دفعہ ۲۱۰ کے مطابق میری مادری زبان اُردو ــــ میں بولنے کی اجازت دیں کیونکہ میں ہندی میں اپنے خیالات کا اظہار ٹھیک طرح سے نہیں کر سکتا۔ اور میرا ایوان میں جانا اس وقت تک بے کار ہے جب تک کہ مجھے اپنی مادری زبان میں بولنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ میں اب تک جو زبان ایوان میں بولتا رہا ہوں وہ ہندوستانی یا اردو ہی کہی جا سکتی ہے اس کو کسی طرح بھی سرکاری ہندی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اگر آپ کی گورنمنٹ ایوان کے ایک ممبر کو وہ سہولت دینے سے انکار کرتی

میر قاسم ــــ کوئی زندہ زبان نہیں مرتی

ہے جو دستورِ ہند کے اعتبار سے قانوناً اس کا حق ہے تو بھلا دوسرے محکموں میں اردو دانوں کو کیسے سہولت ہو سکتی ہے؟

مولانا شاہد فاخری (نائب صدر جمعیۃ علماء ہند) میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ــــ اردو کا مطالبہ کریں گے ــــ ضرور کریں گے ــــ سختی سے کریں گے اور

کچھ نامور اردو شاعروں اور ادیبوں کے دستخطوں کا البم

ایسی زندگی کی قیمت پر کریں گے۔ کوئی حکومت یا طاقت ہم کو اس مطالبہ سے نہیں روک سکتی۔ ہندی ہماری نیشنل زبان ہے۔ دوسری طرف اردو کو باقی رکھیں گے۔ اور انشاء اللہ باقی رہے گی۔ اگر ہم باقی رہیں گے تو اردو بھی باقی رہے گی۔ اگر ہم زندہ ہیں تو اردو بھی زندہ رہے گی۔ ہم نہ رہیں گے تو اردو بھی نہ رہے گی۔ ہمارے بعد خدا کے ہاتھ اس کا معاملہ ہے۔

بابو ترلوکی سنگھ (ایم پی) "میں بھی اردو زبان کا دلدادہ ہوں، اس کی شیرینی اور پاکیزگی پر قربان، لیکن میں بہت صفائی کے ساتھ یہ کہوں گا کہ اردو کا چلنا اب اس ملک میں ممکن نہ ہوگا۔ اس لیے کہ لوگ کسی زبان کو پڑھتے ہیں سرکاری نوکری کے لیے، اور اب سرکاری کے لیے اردو کی ضرورت نہیں رہ گئی، پھر کاہے کو کوئی اُردو پڑھے گا۔ ۱۹۴۶ء تک یوپی میں سرکاری نوکری حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ امیدوار اردو اور ہندی دونوں زبانیں جانتا ہو۔ ۱۹۰۲ء میں اردو اور ہندی دونوں کو یوپی کی زبان قرار دیا گیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ سارا کام اردو ہی میں ہوتا تھا اور ہندی میں نہیں ہوتا تھا،

گاندھی جی کی اردو تحریر کا ایک نمونہ

مولانا صاحب!
آپکا محبت سے بھرا ہوا خط مجھے ملا ہے
محبت کا راستہ ہی یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو کھوٹے
دل سے نکو سکے، دونوں علی بھائی یہاں دو دن سے
رہی ہندو مسلم سوال کے متعلق ہم نے بہت باتیں
کہیں میں اس بارے میں کچھ لکھنے کی کوشش کرونگا
میں چاہتا ہوں کہ ہم جلدی سے ملے
آپکا مجاز اچھا ہوگا آپکو عید مبارک ہو
آپکا خادم
گاندھی

اندھیری سی ۴ اتوار

Moulana Abdul Bari Saheb
Ferungi Mahal
Lucknow

ذوق دہلوی کی تحریر کا نمونہ

مگر ۱۹۴۷ء میں راتوں رات اردو کو ختم کر کے ہندی لے آئی گئی۔ ۲۵ سال گزر گئے اب نہ اُردو جاننے والے رہے نہ پڑھنے والے ـــــ خود وہ لوگ بھی اپنے بچوں کو اُردو نہیں پڑھاتے جو اردو کے غم میں گھلے جا رہے ہیں۔ میں تین ہائر سیکنڈری اسکول چلاتا ہوں۔ لکھنؤ ہائر سیکنڈری اسکول میں جو میرا قائم کیا ہوا ہے ابتدا سے لے کر انتہا تک صرف ۲۷ لڑکے ایسے ہیں جو اردو بھی پڑھتے ہیں۔ کاکوری میں ۱۹۶۰ء میں میں نے ایک ہائر سکنڈری اسکول قایم کیا تھا اس وقت تک سہ لسانی فارمولہ بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن میں نے اسکول میں اردو کی تعلیم کا انتظام کیا، مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ اس اسکول کے لیے کاکوری میں جو اردو کا گہوارہ تھا، اُردو پڑھانے کے لیے کوئی ٹیچر نہیں ملا۔ اودیلی بھیت سے اردو ٹیچر لانا پڑا؟"

(خالد ہندی سے ملاقات ۱۴ جنوری ۷۲ء)
اردو ڈائجسٹ ۱۴ اپریل ۷۲ء ص ۳۵

کے۔ کے شاہ سابق مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات :- "یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے ہندوستان کے زیادہ تر لوگ اس زبان کو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اصل میں یہ شمالی ہندوستان کی زبان ہے۔ شمالی ہند میں بھی خاص طور پر یہ یو۔پی کی زبان ہے۔ یوپی میں اس کو بلاشبہ سرکاری زبان کا درجہ دیا جانا چاہیے میں نہیں سمجھتا کہ وہاں وہ لوگ اسے کیوں نہیں مان لیتے۔ یہ تو سٹیٹ کا مسئلہ ہے۔ اس میں مرکز کیا کرسکتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرے پاس نشریات و اطلاعات کا قلمدان ہے اس محکمہ میں اردو خوب چلتی ہے۔ ریڈیو پر اردو چلتی ہے، فلموں میں اردو چلتی ہے۔ اردو کے بارے میں ایک صاف اور سچی بات کہوں۔ یہ پیاری زبان سیاسی مصلحتوں کا شکار ہو گئی ہے۔ اردو کے حق کو سبھی تسلیم کرتے ہیں اور اس شیریں زبان سے کسی کو بھی دشمنی نہیں ہے لیکن حکومت ہندی والوں کا دباؤ قبول کرلیتی ہے۔ یہ سب ووٹ لینے کی بات ہے۔"

(کے۔ کے شاہ سے مولانا عبدالوحید صدیقی ایڈیٹر ہما کی ایک ملاقات۔ ہما جون ۶۹ء)

پروفیسر محمد مجیب :- "اردو زبان کو مسلمان لے ڈوبیں گے۔ وہ صرف دوسروں کو الزام دینا جانتے ہیں۔ خود کچھ نہیں کریں گے۔ انھوں نے آج تک اردو کے لیے کچھ نہیں کیا۔ انجمن ترقی اردو بھی اُردو کے لیے کچھ نہیں کر رہی ہے۔ میں کہتا ہوں اگر مسلمانوں کو واقعی اردو کا درد ہوتا تو وہ کم سے کم انھیں مراعات سے فائدہ اٹھاتے جو حکومت نے اردو کے لیے دی ہیں۔ حکومت نے رعایت دی ہے کہ جن اسکولوں میں ۱۰ طلبا اردو پڑھنے والے ہوں گے وہاں ایک استاد اردو کے لیے مقرر کیا جائے گا۔ کوئی مثال ایسی نہیں ملتی جہاں مسلمانوں نے اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو۔ وہ خود اپنے اسکول کیوں نہیں کھولتے۔" (اردو ڈائجسٹ ہما جنوری ۶۸ء)

باقی صفحہ ۲۵۰ پر

◄ شرما آنسٹ پریس کے منتظمین مسٹر اوم پرکاش اور مسٹر جگدیش شرما اور (پیچھے کھڑے ہوئے) استاد نور احمد جن کی نگرانی میں تمام کارکنانِ پریس نے ہما کے اردو نمبر کی طباعت کے سلسلہ میں ادارۂ ہما کیساتھ پورا تعاون کیا

اُردو کی کہانی اُردو کی زبانی

تحریر: فاروق ارگلی

جنم اور بالاپن ۔۔ میں اردو ہوں!۔

آریہ پتا اور بھارت ماتا کی بیٹی ہوں۔

بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ عیسیٰؑ سے دو ہزار سال پہلے میری ماں کی بارات ایران کی اور سے اتنی دھوم دھام کے ساتھ آئی تھی کہ چھوٹی موٹی پربتوں کا سماں بندھ گیا تھا۔ ہندوکش کی پہاڑیوں سے لے کر اترا کھنڈ میدانوں تک باراتی پھیلے ہوئے تھے۔ ہمالیہ پر وواہ کا منڈپ تھا۔ اگوائی کرنے والے تھے۔ دراوڑی، براوری والے جنہیں گرو تھا کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ کہاں پان، وستر سب میں انگاؤ۔ بیٹی تو بیاہ دی، پر میری ماں بڑا ہو کر سسرال جانے کو تیار نہ ہوئی۔ جھگڑا ہو گیا۔ پنچ پرمیشور کو کون مانے، تلوار اور بھالوں نے فیصلہ کیا۔ میرے بابا دادا گھر جمائی بنے۔ میری ماں

امیر خسرو دہلوی

ابوالحسن نام، خسرو تخلص ۱۲۵۳ء/۶۵۱ھ میں مقام پٹیالی اتر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد امیر سیف الدین محمود شمسی، ترکوں کے ایک قبیلے "لاچین" سے تھے چنگیز خاں کے حملہ ۱۲۱۶ء/۶۱۶ھ کے بعد سلطان شمس الدین التمش کے عہد سلطنت میں بلخ سے ہندوستان آئے اور شاہی اعزاز و اکرام سے سرفراز ہوئے۔ امیر خسرو کے نانا عماد الملک شاہ بلبن کے وزیر جنگ تھے۔ امیر خسرو کی عمر نو سال کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ نانا کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت پائی بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا، انیس سال تک کا فارسی کلام "تحفۃ الصغر" میں موجود ہے بیس سال کی عمر میں تمام علوم سے فارغ ہو گئے۔ خوش قسمتی سے شاہزادہ محمد علی عہد سلطان غیاث الدین بلبن جیسا مربی مل گیا۔ اور اسی وسیلہ سے دربار شاہی میں باریابی حاصل ہوئی۔ امیر خسرو نے بلبن سے محمد تغلق تک گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کے درباروں میں معزز عہدوں پر فائز رہے۔ سلطان جلال الدین خلجی نے ان کے علم و فضل کی اس درجہ قدردانی کی کہ انہیں "ندیم خاص" بنایا، اور "مصحف داری" اور "امارت" کا عہدہ دیا۔ اور "امیر لاچین" کا موروثی فوجی منصب بھی عطا کیا، جس کے سبب خسرو کو "امیر" کا خطاب ملا۔

امیر خسرو ایک جید عالم، بے مثل ادیب، اور بے بدل شاعر تھے۔ انہیں عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں پر پوری قدرت اور فن موسیقی میں خاص مہارت تھی، طبیعت بلا کی موجد اور مخترع پائی تھی راگ راگنیوں میں اَن گنت اختراعیں کیں۔

اردو الفاظ کے استعمال اور انہیں شعر کے قالب میں ڈھالنے کی سب سے پہلے امیر خسرو نے کوشش کی۔ انکے ہاں ایسے الفاظ بکثرت ملتے ہیں جن کا ایک مصرع فارسی اور دوسرا اردو ہے۔ امیر خسرو کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ ان کے فارسی اشعار کا اندازہ لاکھوں تک کیا گیا ہے۔ ان کا ہندی کلام بھی فارسی کے کلام سے کم نہ تھا لیکن ہم تک نہ پہنچ سکا۔ انہوں نے جملہ اصناف سخن یعنی غزل، مثنوی، قطعہ، مرثیہ، مکرنیاں، انمل، دو سخنے اور قسم قسم کے گیتوں اور پہیلیوں میں اپنے کمال کے جوہر نمایاں کئے ہیں۔

۱۳۲۴ء/۷۲۵ھ میں جب حضرت محبوب الٰہیؒ نے رحلت فرمائی

اور میرے اب میں پہلے تو کھینچا تانی رہی۔ بعد میں گڑ اور مدھو کے سمان دونوں ایک ہو گئے۔ شریر ہی نہیں آتمائیں بھی گھل مل گئیں۔ گھر کے آنگن میں پریم کے پشپ کھلے تو بیوں اور شانتی کا واتاورن ہوا۔ اپون میں پکشی بھانت بھانت کی بولیاں بولتے۔ جھرنے کل کل سوروں میں ملن کے گان الاپتے۔ میری ماں اور باپ دونوں کی جاتی الگ۔ بولی الگ کھان پان میں انتر۔ پر آتمائیں مانو ودھاتا نے ایک کر کے بھیجی تھیں۔ آتمائیں سب ایک سمان ہوتی ہیں چاہے آتما منش کی ہو یا دھرتی کی، برکشوں کی ہو یا پربتوں کی یا کچھ پرماتما کی۔ ہر آتما میں پرماتما براجتے ہیں۔ دو آتماؤں کا ملن ہوا تو ان کے گھرشن یا ٹکراؤ سے جو کرن پریہ سنگیت نکلا جو سنتان ہوئی اس کا نام کرن سنگھ۔

تو امیر خسرو محمد تغلق کے ہمراہ بنگالہ کی مہم پر گئے ہوئے تھے کسی خاص کیفیت کے ماتحت بادشاہ سے اجازت لے کر یکایک دہلی پہنچے اور مرشد کے وصال کی خبر سنی۔ اسی وقت تمام دولت و ملکیت مرشد کے ایصالِ ثواب کے لئے فقرا و مساکین میں تقسیم کردی۔ ماتمی لباس پہن کر مزارِ پُرانوار پر پہنچے۔ آستانہ سے سر ٹکرا کر ایک چیخ ماری کہ "سبحان اللہ آفتاب در زیر زمین و خسرو زندہ" یہ کہہ کر بیہوش ہوگئے۔ جب ہوش آیا تو یہ شعر پڑھا اور روح پرواز کرگئی۔

گوری سوئے سیج پر مُکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو دیس

حضرت محبوب الٰہیؒ کی پائنتی دفن کئے گئے۔ مہدی خواجہ نے سب سے پہلے ۱۴۹۱ء ۸۹۷ھ بعہد بابر بادشاہ مقبرہ تعمیر کرایا۔

نمونۂ کلام

(حمد باری) سب کوئی اسکو جانے ہے پر ایک نہیں پہچانے ہے
آٹھ دھڑی میں بیکھا ہے، فکر کیا اَن دیکھا ہے

اردو کی سب سے پہلی غزل

زحالِ مسکیں مکن تغافل، دُرائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو، بصد فریبم برد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں، ز مہر آں ماہ گشتم آخر
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحق روزِ وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
پیت منکے دوائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی
آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی
از ہر دو لبت، شہد و شکر می ریزد
ہر گاہ بگوئی کہ دہی لیہو دہی

یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من
بے گنہ ہم ساتھ عجب روٹھتا ہے (روٹھا ہے)
رُوئے تو رونق شکن آفتاب
سرو بہ پیش قد تو بوٹا ہے (بوٹا ہے)

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

(پہیلی)

سر کاٹوں تو امن بنے اور پاؤں کاٹوں تو پیالا
امیر خسرو یوں کہے رنگ ہے اس کا کالا (جامن)
بیسوں کا سر کاٹ لیا
نا مارا نا خون کیا (ناخن)

(دوسخنے)

انار کیوں نہ چکھا وزیر کیوں نہ رکھا (دانا نہ تھا)
گوشت کیوں نہ کھایا ڈوم کیوں نہ گایا (گلا نہ تھا)

ہوا، اُس کو مسل اور انویم سنجی کا نام پراکرت رکھا گیا۔ جو کھی اتیست سندر کنیا پراکرت سے بھارت ماتا واری واری جاتی، پیتا پران نچھاور کرتے خون پسینہ ایک کر کے پُتری کو پالتے سجاتے سنوارتے۔ پیار کے پالنے میں کنیا کا لالن پالن ہونے لگا۔
پراکرتی یودن کی سیما میں پرویش کرنے لگی۔

کیا راجہ کیا پرجا کیا رشی کیا منی کیا دیوتا کیا دیویاں سب بھارت اور آریہ راج کی سپتری کے دیوانے تھے جو مست ہرنی کے سمان اتر کے میدانوں میں کللیلیں بھرتی اٹھلاتی رہتی۔ گنگا جمنا کے پاون جلوں میں اسنان کرتی گندھارا سے برہماورت تک اس کے رس میں ڈوبے ہوئے گیتوں کی جھنکار گونجتی۔ سندھو کے آنچل سے لے کر بندھیا

ولی دکنی

خال بھی مکھ پہ ترے حولیوں رہے جیوں کہ بیٹھا زاغ آ گلشن بھیتر

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو
کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی
کہ دل سے تاب، جی سے صبر، سر سے ہوش لیجاوے

ولی اُس گوہر کان حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

تری یہ زلف ہے شام غریباں جبیں تیری مجھے صبح وطن ہے

طاقت نہیں کسی کو جو اک حرف سن سکے احوال گر کہوں مَیں، دل بے قرار کا

ترک کر اے رقیب فرعونی آہ، میری عصائے موسیٰ ہے

اردو زبان کے محسن ولی محمد المتخلص بہ ولی ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء میں بمقام اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں

چل کے پاکھنڈ تک اس کے شریر کی مادک سگندھ رچ جاتی۔ کوئی اس چونکھی کامنی اور موہنی کو پراکرتی دیوی کہتا، کوئی اسے سنسکرتی کہہ کر سمبودھت کرتا ہر ایک کو اس کے من چاہے روپ میں دکھائی دیتی۔

پریم اور پوجا میں انتر نہیں ہوتا۔ دیوتاؤں کی دلاری اس کنیا کے جوڑے میں ایک پریمی نے بھاؤ دیش میں آکر "رگ وید کے پھول لگا دیئے" (ہندوؤں کی پہلی کتاب رگ وید تو آج بھی الہامی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔) یہ اپہار بہت مولیہ وان تھا پھولوں کی ایک ایک پانکھڑی میں دیوتاؤں کی پوتر آتما کے چتر تھے۔ جیتے جاگتے چتر تھے۔ پریمی اور پجاریوں نے ان پھولوں سے سرودں اور اچارنوں گیتوں اور کہاوتوں کی مالائیں پروئیں۔ مدھیہ دیشیہ، اور دکھنیہ، پراچیہ بولیوں میں روپ سندری کا گزر دکان کیا۔ پریم اور پوجا میں پرماتما کا ہی پربھاؤ ہوتا ہے۔ پریم سے ہی بھگتی اور شردھا کا دھرم جنم لیتا ہے۔ چونکھی کنیا ارتھات میں بھگتی اور شردھا کا کیندر بن گئی۔ ایشور تک پہنچنے کا سادھن بن گئی۔ راجاؤں کے ایوانوں میں مری ہی چرچا تھی۔ ودوانوں کے آشرموں میں میرا ہی روپ تھا۔ میں ہی میں تھی۔ سروویاپی میں۔

بدلتا ہے بدلتا روپ ۔ میں بڑی چنچل اور نٹ کھٹ تھی۔ یگوں سے بھارت کے ایوان میں اٹھلاتی پھر رہی تھی۔ بھارت ماں کے آنچل کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں۔ رتیں مجھے مست کر دیتیں۔ اتنی مست کہ کچھ سدھ نہ تھی۔ پریمیوں کی کمی نہ تھی پر مجھے تو کچھ سہاتا ہی نہ تھا۔ کس سے پیار کروں چونکھی تھی نا۔ رشی منی اپنی اور بلاتے میں ایک چھن کو ٹھہر جاتی۔ پنڈت گیانی سمجھاتے، "اری سنسکرتی ہماری باہوں میں آجا۔ تجھ پر شودروں کی چھایا بھی پڑنے نہ دیں گے۔ تجھے سدا یوگیان کے مندروں میں چھپا کر رکھیں گے۔" میں ہنس دیتی۔ کہیں سگندھ کو بندی کے سمان رکھا جا سکتا ہے؟ میری ہنسی کھلکھلاہٹ لے کر مست وا آ دل

احمد آباد (گجرات) میں وفات پائی۔ بیس برس کے سن میں تحصیلِ علم کے لئے گجرات گئے، جو اُس زمانے میں علوم و فنون کا مرکز تھا۔ اور شاہ وجیہہ الدین علوی کے مدرسہ میں تعلیم پائی۔ وہیں شاہ نورالدین صدیقی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سیر و سیاحت کے سلسلے میں دو مرتبہ دلّی آئے پہلی بار اورنگ زیب عالمگیر کے آخری عہد ۱۷۰۰ء (۱۱۱۲ھ) میں اور دوسری دفعہ محمد شاہ کے دورِ سلطنت ۱۷۲۲ء (۱۱۳۵ھ) میں پہلی بار شاہ سعد اللہ گلشن، دہلی کے مشہور شاعر و درویش کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کے فارسی کلیات میں دو لاکھ کے قریب شعر تھے۔ انہوں نے ولی کو مشورہ دیا کہ ریختہ میں فارسی کے مضامین رنگیں استعمال کریں جب دوسری مرتبہ دلّی آئے تو اپنا دیوان ساتھ لائے۔ چونکہ شاہ گلشن کے مشورہ سے پورا استفادہ کر چکے تھے اُن کا کلام دلّی میں مقبول ہوا۔ دلّی کے اردو شعراء کے کلام میں فارسیت غالب تھی، لیکن ولی نے فارسی کے ساتھ بھاشا الفاظ کو اپنے کلام میں سمو کر ایک نئے دَور کی داغ بیل ڈالی۔ انہوں نے ہر صنفِ سخن اور مختلف زمینوں اور بحروں میں دادِ سخن دی ہے لیکن ان کے کلام میں تغزل کا رنگ غالب ہے۔ ان کا دَور اردو زبان کا ایک عبوری دَور ہے۔ اہلِ دکن اور اہلِ شمال کے میل جول سے نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے الفاظ زبان میں داخل ہونے لگے۔ ولی نے اس دَور کی زبان کو اپنے کلام میں محفوظ کر کے ایک تاریخی فرض انجام دیا۔ الفاظ کی موزونی، ان کا برمحل استعمال؛ اچھوتے استعارے اور تشبیہیں؛ جاذبِ نظر ترکیبیں اور رعایاتِ لفظی کلامِ ولی کی جان ہیں۔ دیوانِ ولی پیرس سے ۱۸۳۳ء میں شائع ہوا اور کلیات ۱۹۲۷ء میں ہندوستان میں چھپی۔

یں گونج جاتی۔ ملیچھ میری جے جے کار کرنے لگے۔ تو سورن کرودھ سے جل جاتے۔ "گھن" اور "گھرنا" کے شبد کہتے۔

پر میں تو چونکھی تھی۔ میری نس نس میں پیار بھرا تھا۔ پیار بھرا ہردے چھاتی میں دھڑکتا تو میری مستی اور بڑھ جاتی مجھے کہیں کل نہ آتا۔ کس کے لئے بیاکل تھی میں۔ کیا چاہتی تھی میں؟ اپنی ہی سُدھ نہ تھی۔ کبھی راجاؤں کے بھونوں کی پرکرما کرتی۔ کبھی یدھ کے میدانوں میں گرجن کرتی۔ کبھی دیوتاؤں کی پرتھنا اور مہاتما میں براجتی۔ کبھی رشیوں کی کٹیاؤں کے درشن کرتی۔ پنڈت اور گیانی پیچھے پڑے تھے میرا اپ ہرن کر کے بندی بنانے کا جتن کرتے۔ پر میں تو چونکھی تھی۔ سگندھ سے بنا تھا میرا شریر اور سگندھ کبھی بندی نہیں ہو سکتی۔ مندروں کے بند دواروں سے نکل کر جنتا جناردن میں چلی جاتی۔ ملیچھوں سے بھی پیار کی باتیں کرتی۔ پنڈت گیانی جل کر مجھے اپ بھرنش کہنے لگے۔ (اپ بھرنش سنسکرت اور مقامی بولیوں کی بگڑی ہوئی شکل کو کہتے ہیں۔)

میں جلنے والوں کو اور چڑاتی۔ بن ٹھن کر اپنی ایک چانڈال جاتی کی سہیلی شورشینی کے ساتھ کھیلتی، اٹھلاتی۔ شورشینی سانولی رنگت والی بڑی طرحدار سندری تھی۔ میں اس کے سنگ میتھلا کے آنگن میں اٹھلاتی رہتی۔ ہمیں کسی وقت قرار نہیں تھا۔ سگندھ کے شریر، پانی کے شریر ہواؤں کے شریر بہت جلد آپس میں مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔

اب پتہ نہ چلتا کہ شورشینی کون ہے اور سنسکرتی کون ہے۔ رنگ ایک، بانا ایک، روپ ایک، اُٹھانے کا ڈھنگ ایک، میری یوون مدرا چھلک رہی تھی۔ جدھر نکل جاتی نشہ پھیل جاتا۔ دو گھڑی ودیاپتی کی کٹیا میں رکتی (ودیاپتی اپ بھرنش زبان کا مشہور شاعر) اس سے پیار جتاتی وہ ہر جاتی رے کہہ کر چھیڑتا، بانہیں پسارتا اور میں اپنی سگندھ چھوڑ کر پچھم کی اور نکل جاتی۔ کبھی پورب کو کبھی اتر میں دھما چوکڑی مچاتی۔ کبھی دکھن میں روپ رس کی مدرا سے لوگوں کو آنمت کرتی۔ جدھر جاتی، نیا نام ملتا۔ کوئی شورشینی کہتا۔ کوئی

محمد قلی قطب شاہ

نخی، ساؤلی، پرہوئی کیا نظر | خبر سب گنوا کر ہوا بے خبر
پیا باج پیالا، پیا جائے نا | پیا باج یک تل جیا جائے نا
خورشید مکو، آپر دسے ابرو ہلال عید | اس ابرو داں کو سجدہ کیا ہے جمال عید

سدا تو مدح نبیؐ و علیؑ کی کہتا ہے
معانی شعر ترا تو لکھے ہیں دست بدست

سلطان محمد قلی قطب شاہ، والی گولکنڈہ ۹۷۳ھ میں پیدا ہوئے ۹۸۸ھ میں اپنے والد محمد ابراہیم قطب شاہ کی وفات پر ، عہد اکبر بادشاہ تخت نشین ہوئے اور ۱۰۲۰ھ میں انتقال کیا۔ یوں تو دکن میں علمی و ادبی سرگرمیوں کا آغاز آٹھویں صدی ہجری سے ہوچکا تھا لیکن شاہان گولکنڈہ کا دور، اردو ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصاً سلطان محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ اس دور کے شعراء ادباء ان کے دربار میں جمع تھے قلی قطب شاہ کو شعر و شاعری کے علاوہ فنون معینہ اور فن تعمیر سے بھی خاص شغف تھا۔ دکنی، تلنگی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ قطب شاہ و معانی تخلص تھا۔ ایک ضخیم دیوان اُن کی یادگار ہے۔ علاوہ ان چند شاعروں کے ان کا رتبہ دنیائے شاعری میں بہت بلند ہے۔ قلی قطب شاہ کا کلام بجز، زبان کے تغیر و شستگی کے کسی دوسرے شاعر سے کم نہیں عشق، مستی، اور تصوف سے کلام معمور ہے آپ نے اردو میں غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ لکھا، بلکہ اس محدود دائرے سے نکل کر آزادروی اور جدت کا مسلک اختیار کیا اپنے مشاہدات کو کام میں لاکر انسانی معاشرت اور مناظر قدرت پر بھی نظر ڈالی۔ ان کی دیوان میں جہاں پھولوں، میووں، سبزی ترکاری اور شکاری پرندوں کا بیان ہے، وہاں شاہی محلوں، شادی بیاہ، ایسی ہی تقاریب، شب برات، عید، ہولی، دیوالی وغیرہ تیوہاروں کا بھی ذکر موجود ہے۔

سنسکرتی، کوئی ماگدھی، کوئی اردھ (آدھی)، ماگدھی کوئی مہاراشٹری، کوئی پراچیہ اپ بھرنش، کہیں کیلیئی اپ بھرنش تو کہیں پراچیہ، گوز اور دکھنی یا تنگلی اور مگھی کہلائی میری جوانی پیراست کر دینے والا یوون کس کس کے دل پر بجلیاں نہیں گرایا میں نے سمراٹ اشوک نے مجھ سے پیار جتایا میرے روپ کی جھبی کو لاٹوں پر اکت کروایا میں بدھ کی وانی بن کر سنسار میں گھوم چکی تھی۔ دو آبے کے ہرش وردھن نے مجھے بانہوں پاش میں لے کر پیار جتایا تھا ہستناپور کے راج محلوں اور جھونپڑوں میں میری ہی مالا جپنے والے رہتے تھے۔ راجپوتانے سے نالندہ تلک کہیں راج بھاشا، کہیں بندیلی، کہیں اودھی، کہیں مگھی، کہیں پنجابی کے ناموں سے مجھے بلایا جاتا تھا میں جو مگھی تردنی تھی، سگندھ سے بنی اور سگندھ کو بندی نہیں بنایا جاسکتا تھا۔

ملیچھوں سے پیار

سوامی کہتے ہیں گرو گوسائیں ؛ ابھی سے سکھ سبد لیک بوجھیا

میرزا رفیع سودا

اے لالہ، گو فلک نے دیئے تجھ کو چار داغ
چھاتی مری سراہ! کہ اک دل ہزار داغ

رنگِ گل کچھ بے طرح دیکھے ہے اے ابرِ بہار
آشیاں میرا چھڑک، لگتی ہے اب گلشن میں آگ

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤنگا

مجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سودا	ساغر کو مرے ہاتھ سے لیناکہ چلائیں
سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ	کیا جانئے تُو نے اسے کس آن میں دیکھا
گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی	اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

مرزا محمد رفیع نام، سودا تخلص ۱۱۲۵ھ ۱۷۱۳ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ والد مرزا محمد شفیع بسلسلہ تجارت کابل سے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام کیا۔ سودا نے لائق استادوں سے تعلیم حاصل کی۔ بچپن سے شاعری کا شوق تھا پہلے سلیمان قلی داؤد اور پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ خان آرزو سے بھی کسبِ فیض کیا، اور انہی کے مشورے سے اردو میں مشقِ سخن شروع کی۔ طبیعت میں شوخی اور جودت تھی، بہت جلد شہرت کا غلغلہ بلند ہوا۔ نواب شجاع الدولہ کے طلب کرنے پر ۱۷۷۱ء میں فیض آباد گئے، نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ نے بہت قدر کی سودا ۱۱۹۳ھ ۱۷۷۹ء میں آصف الدولہ کے ہمراہ فیض آباد سے لکھنؤ آئے اور وہیں ۱۱۹۵ھ ۱۷۸۱ء میں انتقال کیا۔

نراور مجھے جیاکرن ودھی رہے ۞ ست گرو ہوئی سا پوچھیا کہے!
میرے گیت دایومنڈل میں گونج رہے تھے۔ اکتارے کی جھنکاروں کے ساتھ میری مدھر بانی جب الاپتی:

بانہہ چھڑائے جات ہو جان کر نبل موئے
ہردے میں سے جاؤگے تو مرد بدھونگی توئے

تو میرے پریمی سوم پربھ سوری، ودیادھر، شارنگ دھر جیسے تیج وان تڑپ تڑپ اٹھتے اور ان کے کنٹھ سے میرے ہی روپ کی مہما مکھر ہو اٹھتی تھی۔ پھر ایک ہاہاکار مچ گئی۔ دھرتی ڈول گئی۔ پربت ہل گئے۔ بھونچال سا آگیا پہلے آگئی مالو بھارت ماں نے کہا جب تمہارے باوا دادا لوگ آئے تھے تب ایسی ہی پرلے آئی تھی۔ ہمیرا سوم کا کوی چلاّ اٹھا:۔

ڈھولا ماریا ڈھلی ماں چھیو ملیچھ سرے
(دہلی میں ڈھول بجا اور مسلمان ملیچھوں کے سر پر بے ہوش ہوگئے)

کبھی پنڈتوں سے پوچھتی دیو کا ہوئی گنو، کبھی بھاٹو

سے پوچھتی، بھی ہیردں جو ہواؤں سے معلوم کر لی۔ ایک نیا نام سنا، کانوں کو دو تیر لگا۔ بدیسی۔ مسلمان ہم سب ملیچھ کہتے تھے۔ جو طوفانوں کے سمان بونڈر کے سمان پچھم کی اور سے آئے تھے، اور بجرس کر رہے تھے وہ شترو۔

بھارت واسی بھاٹ اور کوی ملیچھوں کو للکارتے گھناؤنے شبدوں سے سمبودھت کرتے یہ میں تو سگندھ سے ہی تھی جو مکھی تھی۔ ایسی سندری کہ جس کے روپ کی چھٹا سے رہا دیو کچھ پر آنگن میں اُجیارا تھا۔ سنگیت کسی سے چھپا نہیں کرتا، سب کے کانوں میں رس گھولتا ہے۔ سگندھ کسی کو نہیں پہچانتی۔ عرب سے آتے ہوئے آکرمن کاریوں کو دیکھا تو من کو بھائے۔ ماں کہتی تھی میرا اتہاس دہرایا جا رہا ہے۔ مانوں میرے ماں بھارتی کے سمان وہ عربی گھڑسوار میرے سامنے کو آئے تھے۔ جیسے ایک بار پھر گھرشن ہونا تھا اور میرا تھا میرے پریوار کے لوگوں کا کھان پان۔

میر درد

دین و دنیا میں تُو ہی ظاہر ہے
دونوں عالم کا ایک عالم ہے

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا

دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

خواجہ میر نام، درد تخلص ۱۷۲۰ء ۱۱۳۳ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ان کے دادا بخارا سے عہد عالمگیر میں دلّی میں آئے۔ ان کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب بھی صوفی اور شاعر تھے۔ خواجہ میر درد مشہور عالم اور درویش تھے۔ ان کو تصوف اور شاعری ورثے میں ملی تھی۔ والد کے آغوشِ تربیت میں پرورش پائی اور شاعری میں انہیں سے اصلاح لی۔ میر درد فن موسیقی کے بھی بڑے ماہر تھے اور موسیقی و شاعری کے امتزاج نے ان کی طبیعت میں زاہدانہ خشکی کے بجائے ایک خاص قسم کی شگفتگی پیدا کر دی تھی۔ جب دلّی پر تباہی آئی اور علم و فضل اور شعر و سخن کا مرکز لکھنؤ میں منتقل ہوا اُس وقت بھی خواجہ صاحب کے پائے استقلال میں لغزش نہ ہوئی۔ اس دورِ پُر آشوب میں بھی دلّی کو چھوڑنا گوارا نہ کیا اور ۱۷۸۵ء ۱۱۹۹ھ میں وہیں انتقال کیا۔

خواجہ میر درد پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اردو غزل کی بنیاد خالص عشقِ حقیقی پر رکھی اور یہی ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔

مصحفی

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

حسرت یہ اس مسافرِ بیکس کے رویئے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

آسنے دو اسے جس کے لئے چاک کیا ہے
ناصح سے گریباں کو سلانے کے نہیں ہم

کنج قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر
فصلِ بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

شیخ غلام ہمدانی نام، مصحفی تخلص سنہ ۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۰ء میں بمقام امروہہ ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ ولی محمد تھا۔ جوانی ہی میں تحصیل علم کا شوق دلی کھینچ لایا۔ بزرگوں کی صحبتوں سے مستفیض ہوئے۔ دوسرے شعراء کی طرح یہ بھی دلی کو خیرباد کہہ کر نواب آصف الدولہ کے زمانے ۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ گئے۔ مصحفی "تذکرۂ ہندی" میں لکھتے ہیں کہ "سید انشا شہزادہ سلیمان شکوہ (بن شاہ عالم ثانی) کے دربار میں پہلے سے موجود تھے۔ وہی شہزادے کے حکم سے مجھ کو دربار میں لے گئے"۔ لیکن آخر میں سید انشا مصحفی کے لئے وبالِ جان بن گئے۔ شعر و شاعری میں خوب خوب معرکے رہے۔ اپنے پیش روؤں کی طرح دلی کی یاد انہیں بھی ستاتی رہی۔ ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ آٹھ دیوان اردو کے اور بیس مثنویاں (جو اب تک مل سکی ہیں) یادگار چھوڑیں۔ مصحفی کی استادی کا لوہا تقریباً سبھی نے مانا ہے۔

جیون یا پن بدلنا تھا۔ ہونی کو کون ٹالے۔ مسلمان ملیچھ مانس بھگشتی تلوار کے دھنی پر ہر دے کے اُدار پریمی اور دور درشٹی۔ میرے روپ کا جادو انہیں پر بھاوت کئے بنا نہ رہا۔ میری ماں کے آنچل کی ہوا نے دیوانہ بنایا یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

ہم ناجی بے تو ردوار چھانڑی کے

چندر بردائی میرا پریمی میرے نام کی مالا جپنے والا البیلا کوی پرتھوی راج راسو میں "مت چوکے چوہان" کہتا ہی رہ گیا (پرتھوی راج کے دربار کا خاص شاعر جس نے مسلمانوں کے مقابلے کے لئے ہندو راجپوتوں کو اپنے کلام کے ذریعہ بھڑکایا، اکسایا تھا۔ چندر بردائی کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے اولین شعراء میں سب سے نمایاں شاعر کہا جا سکتا ہے) پر وہی ہونا تھا جو ہوا۔ بدیسیوں نے اپہار میں شبدوں کے گہنے بولیوں کے رتن، ریتی رواجوں کے وستروں کے اپہار میرے پاؤں تلے نوں کو ارپت کئے تو میں پھولی نہ سمائی۔ یہ نیا بانا بدل جب میں نکلی تو کیا دیسی کیا بدیسی میرے روپ کی چھٹا دیکھ واہ واہ کر اٹھے۔ جب پریم کا کیندر ایک ہو تو نکھرنا پریم میں بدل جاتی ہے۔ میں تو سنگندرہ تھی۔ سنگیت تھی جو ہر ایک کے ہونٹوں پر مکھرت ہوتا ہے۔ راجاؤں کی دہاڑ میں سپاہیوں کی للکار میں، کسانوں کے گیتوں میں، کویوں کے چھندوں میں، بڈھے بوڑھوں کے محاوروں میں بھگتوں کی بھگتی میں پریمیوں کے پریم لاپ میں ہر جگہ میں ہی میں۔

شکر — میرا روپ نکھر آیا تھا۔ عربی بانات کا لبادہ کھارتی سونے کے کرن پھول چندن ہار، پائل اور جھومر سے سجی میں پہلے بجلی تھی۔ اب قیامت بن گئی تھی۔ فارسی اور ترکی غازے اور سامانِ آرائش نے دو آتشہ کر دیا۔ چندن سا

میر تقی میر

پتا پتا، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

آگے تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا ہے یہ

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز

بدن اور نکھر آیا۔ شباب کی ملاحتیں اور بڑھ گئیں۔ میرے چاہنے والوں میں دیسی پردیسی سبھی تھے۔ دلی سے بنگالہ تک پنجاب سے قندھار اور غزنی سے لے کر عربوں کے ریگستانوں اور بخ و بخارا کے باغات تک میری مہک پہنچی تھی۔ ہجوم عاشقاں تھا اور میں بھی گورے کالے سانولے ہندو، مسلمان آتش پرست مجوسی، شاہ و گدا، رشی، صوفی ایک لشکر تھا۔ میں اردو تھی گویا لشکر۔

ایک آئینہ تھی میں۔ جس میں ہر لشکری کی صورت دکھائی دیتی تھی۔ بس مجھے ہی "اردو" کہا جانے لگا۔ مسلمان آئے تو تھے شاید لوٹ مار کرنے، پر بھارت ماں کے سبز بنفشی آنچل کی خنک ہوا ایسی بھائی کہ یہیں کے ہو رہے۔ میرے حسن و جمال کی چمک نے دیوانہ بنا دیا۔ میں جو پراکرتی تسلسل کی اور شورسینی کے خطابات فراموش کر کے حسینہ اردو بن گئی تھی۔ میرا بن بہن ملا۔ شاہوں نے مجھے اپنا وقار بنایا۔ عالموں نے مجھے گلے لگایا۔ صوفیا نے مجھے ذریعہ تصوف بنایا۔ عاشقوں نے اپنے جذبے کی گرمی کو میرے الفاظ کا تکیہ بنایا۔ مرد میدان لشکریوں نے اپنے خون سے مجھ سے

حضرت پیدا کی۔ میرے ایک چاہنے والے نے دلی سے دکن تک لشکری زبان کو رواج دیا۔ ملک کافور مجھے کبھی نہ بھولے گا جس کی سعی مسلسل نے سرزمین دکن کی چٹیل اور سنگلاخ پہاڑوں سے قلی قطب شاہ، سراج، وجہی قطبی اور ولی جیسے ہیرے نکال کر وقت کے ہاتھوں میرے آنچل میں ٹانک دیے۔ میں کیا تھی، کیا بنتی جا رہی تھی مجھے ہوش نہ تھا۔

میرا وجود پھیلا ہوا کی طرح سمندر کے دائروں کی طرح آفتاب کی کرنوں کی طرح پھیلتا جاتا تھا۔ خانقاہوں میں، درباروں میں ہی نہیں عوام کی جھونپڑیوں میں جگہ جگہ جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ تلسی داس، نانک، کبیر، رس خان میرا اور رحیم نے میری اوڑھنی ستاروں سے بھر دی تھی۔ کبھی پنجاب سے ایک مہربانی گونجتی :۔

اک رب وے سب بندے

عوام جوق در جوق میری طرف دوڑ پڑتے۔ نانک کی مقدس آواز میں میری کھنک تھی۔ میں ذریعہ تھی اک رب والے پیغام اور عوام کے رابطے کی۔ کبیر میسانہ

اردو نمبر

آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر
مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی، زنجیر نظر آئی
یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

محمد تقی نام، میر تخلص، پردادا حجاز سے دکن آئے۔ وہاں سے احمد آباد (گجرات) میں آکر قیام کیا۔ آخر اکبر آباد (آگرہ) میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ میر تقی ۱۷۲۲ء (۱۱۳۵ھ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد علی تھا۔ علی متقی کے لقب سے مشہور تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد اور سید امان اللہ سے حاصل کی۔ بچپن ہی میں یتیم ہوگئے تھے، اس لئے اپنے سوتیلے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس دلی چلے آئے اور انہی کے دامن تربیت میں پرورش پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ دلی میں آئے دن کی خانہ جنگیوں اور بدامنیوں نے میر صاحب کو دل برداشتہ کردیا تھا۔ نواب آصف الدولہ کی دعوت پر ۱۷۸۲ء (۱۱۹۷ھ) میں لکھنؤ گئے۔ کسی بات پر نواب سے اَن بَن ہوگئی اور دربار کا تعلق منقطع ہوگیا۔ ۱۸۱۰ء (۱۲۲۵ھ) میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ اردو شعراء کا سب سے پہلا تذکرہ "نکات الشعرا" (۱۱۶۵ھ) و "ذکر میر" (فارسی) (۱۱۸۲ھ) اور "کلیات میر" اُن کی یادگار ہیں۔

مجھے اپنی کٹیا میں مہکاتا:۔
"جن ڈھونڈھا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھ
میں باوری ڈوبن ڈری رہی کنارے بیٹھ
اور
ایکے سادھے سب سدھے اور سب سادھے سب جائے
جو گہی سوے مول کو پھولے پھلے اگھائے
میرا پریم دوانی کی پکار گونجتی:۔
میں تو پریم دوانی میرو درد نہ جانے کوئے
گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئے
درد کی ایک لہر دلوں میں پیار کھلکتی اور سوز دروں پیدا کررہی تھی، ایکتا کا ماحول، بھگتی، محبت، پریم پریم اور شانتی تھیں امن کی ٹھنڈی پھوار بن کر برصغیر کی فضاؤں پر برس رہی تھی۔ برج کی رنگین دھرتی میں کرشن کنہائی کی مہا.....کر بہ سانے اور گوکل کے مندروں میں گونج رہی تھی۔ اس سمے کوئی مجھے دیکھتا۔ اگر سندر تھی تو میں۔ اگر کومل تھی تو میں، جھنکار تھی تو میں، کھنک تھی تو میں، پیار تھی تو میں، ایکتا تھی تو میں۔ کبھی میوات میں کھڑی بولی کا چولا پہن لیتی۔ کبھی اترا کھنڈ میں کیسریا ساری باندھ شبدوں کی کردھنی پہن کر اتراتی تو کبھی راجپوتانے میں پگڑی لہنگا مٹکاتی اور پھر دلی کے گگن چمبی (فلک بوس) شاہی محلات میں جھانکتی۔ بادشاہوں کو رجھاتی اور عوام کی طرف بھاگ جاتی۔
دوشیزہ فارسی کا رنگ روپ میری چھب سے ماند پڑ گیا تھا۔ پر سمجھدار تھی۔ دامن میں صائب، نظیری، عرفی، خیام، سعدی، حافظ، جامی، رومی جیسے رتن چھپائے تھی۔ نوشیروان اور آریہ مہر کے درباروں کی تربیت یافتہ تھی۔ نرم مزاج اتنی کہ باتوں سے پھول جھڑتے تھے پہ شاہوں کے منہ لگی مگر مجھے دیکھ جان گئی کہ میں کیا ہوں۔ میری سہیلی بن گئی عربی، ترکی، عبرانی بھی میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا چکی تھیں میرا عاشق صادق امیر خسرو دلیوں کا ولی رندوں کا رند صورت سے فقیر دل کا سلطان۔ میں اسے بھاگئی وہ مجھے بھاگیا۔ ہائے! کتنا دلدار آدمی تھا۔ کیسا باغ و بہار۔ میں ہمہ وقت اپنی فارسی سہیلی کے ساتھ اس کے جلو میں رہتی۔ خسرو مجھے زیادہ پیار کرتے تھے پر فارسی بیگم سے بھی اخلاقاً ہنس بول لیتے تھے۔ کیا کیا پہیلیاں——

بھجواتے تھے۔

ایک تھال موتی بھرا ۔ سب کے سر پر اوندھا دھرا

میں خوب ہنستی، پہیلی کہہ والی جب شیخ المشائخ حضرت نظام الدین اولیا تشریف لاتے۔ میرے خسرو کے مرشد، ہائے انہیں جیسے بزرگوں کا تو دست شفقت ہے مجھ پر، یہ نہ کہیے گا کہ خود ستائی کر رہی ہوں۔ دیوتاؤں نے رشیوں نے منیوں نے، شہیدوں نے انصاف پسندوں نے مظلوموں نے، ولیوں نے، کس نے مجھ پر دست شفقت نہیں رکھا۔ شیخوں کے شیخ، خدا کے خاص مقرب بندے جب معرفت کی منزلیں طے کر کے قادر حقیقی سے واصل ہوتے ہیں، خسرو میری آواز میں بولے ۔

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چہوں دیس

برج رانی عرف ریختہ بیگم ۔

میرا دامن اب وسیع تر ہو گیا تھا۔

میرا حسن اب اور نکھر چکا تھا۔ صوفیوں کی قوالیاں نانک کی بانیاں، کویوں کے دوہے اور چوپائیاں ملک جوا ہر، گرنتھ صاحب، پدماوت، بابا فرید کی کافیاں اور خسرو کا بھاشا اور فارسی بیگم سے والہانہ پیار ۔ جیسے لاکھوں پھول میرے آنچل میں مہک رہے تھے۔ فارسی بیگم میری رفیق بنی رہی اللہ کی بندی کو ایک طرح سے سوت ہو کر بھی مجھ سے ڈاہ نہیں رہی۔ ہائے میرے چاہنے والے

ناسخ

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

بُتوں کے پردہ میں ہم دیکھتے ہیں نورِ خدا
خدا کے دیکھنے کی اے کلیم، تاب نہیں

محشر میں ہم کو نامۂ اعمال دیکھ کر
قاصد خیال آئے گا خط کے جواب کا

عمر بھر وحشت میں گر صحرا نوردی کی تو کیا
سیر کے قابل جو تھا دل کا بیاباں رہ گیا

امام بخش نام، ناسخ تخلص، ۱۷۸۷ء (۱۲۰۲ھ) میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندانی حالات تاریکی میں ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی دولت مند سوداگر نے انہیں متبنیٰ کر لیا تھا۔ اسی نے تعلیم و تربیت دی۔ فارسی اور عربی کی تعلیم علمائے فرنگی محل سے پائی اور لکھنؤ کو وطن بنا لیا۔ شاعری میں کسی سے تلمذ نہ تھا۔ ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ) میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ رشک نے تاریخ کہی "ہلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے"۔ شاگردوں کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ تین دیوان ان کی یادگار ہیں پہلا دیوان الٰہ آباد میں، دوسرا اور تیسرا لکھنؤ میں مرتب کئے۔

خواجہ آتش

سن تو سہی، جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تکلف سے بری ہے حُسنِ ذاتی
قبائے گل میں، گُل بوٹا کہاں ہے

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

خواجہ حیدر علی نام۔ آتش تخلص، دلی کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد خواجہ علی بخش نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد چلے گئے تھے وہیں ۱۷۷۸ء (۱۱۹۲ھ) میں آتش پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے، اس لئے معقول تعلیم سے محروم رہے۔ جوانی کی ترنگ، مزاج میں شوریدہ سری اور انداز میں بانکپن ساتھ لائی۔ ضعیفی تک بانکپن اور سپاہیانہ وضع کو بڑی خوبی سے نباہا۔ انشا اور مصحفی کے معرکوں نے شعر و شاعری کا شوق دلایا۔ مصحفی کے شاگرد ہوئے اور صاحبِ طرز استاد کہلائے۔ ساری عمر خودداری اور فقیرانہ انداز سے گذار دی، ۱۸۴۶ء (۱۲۶۲ھ) میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ شعر گوئی میں ناسخ سے خوب خوب معرکے رہے۔

دونوں کو میری وقعت کی زیادتی کے باوجود ایک نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ۔

مجکا نہ ہوس مانک و موتی
فقرآ علیفہ، بس بولنو سید و پانی، روتی

فارسی بیگم کون۔ برج رانی کون! ہندو نہ مسلمان دونوں کا تال میل، محبت اور یگانگت کا مجسمہ پیار اور پریت کی دیوی۔ نہ اِدھر کی نہ اُدھر کی، اُدھر میں لٹکی ہوئی یعنی ریختہ بیگم۔

زرگر پسرے چو ماہ پارا ٭ کچھ گھڑیئے، سنواریے پکارا
نقدِ دلِ من گرفت و بشکست ٭ پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

میں اب ریختہ بیگم کہی جانے لگی۔ کبھی فارسی بیگم کا معصوم اور پُر وقار چہرہ چومتی کبھی اس پر پیچ و تاب کھاتی میرا اصل روپ تو بدل گیا تھا۔ ہندی دوشیزہ، فارسی غرارہ، ایرانی و عربی پیراہن سے آراستہ۔ کون پہچانے

میں آگے بڑھتی گئی ۔

"اکبر ساہ جی عام کھاس میں تکھت کے اوپر براجمان ہو رہے۔ دربار کھاس بھرنے لاگا ہے امرا آئے، کورنش بجائے جہار کرکے تاجیم کرکے؟ پات ساہی، بادشاہی بنی۔ تاجیم، تعظیم بنی۔ کھاس خاص ہو گیا۔

یہ چاہنے والے غضب کے ہوتے ہیں۔ محبوب کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ اب یہی کھڑی بولی بولنے والی اجڈ گنوارن نہ رہی تھی۔ میرا روپ صیقل ہو گیا تھا۔ بناؤ سنگھار کر کے فارسی بیگم جیسا چوغہ پہنا تو درباروں میں رسائی ہوئی۔ چندر بھان برہمن نے مجھے جو یہ دوا اڑھائی تھی ؎

خدا جانے یہ کس چمن اندر ہمن کو لا کے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے
پیا کے نام کی سمرن کیا چاہوں کروں کیسے
نہ تسبیح ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
پیا کے ناؤں عاشق قتل باعجب دیکھے ہوں
نہ برچھی ہے نہ کرچھی ہے، نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے
برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا میں
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

اور میرے پیارے عاشق محمد افضل جھنجھانہ والے نے جو پریم بھرا تحفہ دیا تھا ؎

پڑی ہے گل میں میرے پیم پھانسی
مرن اپنا ہے اور لوگوں کی ہانسی

اور میرے دیگر چاہنے والے کی دی ہوئی یہ سوغات ا ہائے سید برکت اللہ پیمی (پریمی) ؎

گھر تج کے جا جنگل میں یری تب بجھ پری

میر حسن

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ	بس آج کی شب بھی سو چکے ہم
نہ تھوتی تھیں آہیں نہ رکتے تھے آنسو	حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا

جب قفس میں تھے تو تھی یادِ چمن ہم کو حسن
اب چمن میں ہیں تو پھر یادِ قفس آتی ہے

رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا
بس اے زندگی ! ایسی ہستی سے گذرے

تو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں
لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائے گا
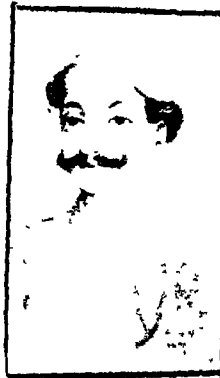
میر غلام حسن نام، حسن تخلص ۱۱۴۰ھ میں دلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر غلام حسین ضاحک تھا۔ جدِ امجد میر امامی ایران سے دہلی آئے۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ میر حسن فطری شاعر تھے شروع میں والد سے اصلاح لیتے رہے بعد میں خواجہ میر درد سے استفادہ کیا۔ آغاز شباب میں والد کے ہمراہ فیض آباد گئے بعد میں لکھنؤ آئے اور ضیاء الدین ضیاء کے شاگرد ہوئے لیکن میر و سودا کا رنگ مرغوب تھا۔ شاعری بزرگوں سے میراث میں پائی تھی۔ زندگی ہی میں بام شہرت پر پہنچ گئے اور بقول آزاد "زمانے نے ان کی سحر البیانی پر تمام تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا"۔ ۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ "شاعر شیریں زبان" سے مصحفی نے تاریخ وفات نکالی۔ ایک دیوان جو جملہ اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔ گیارہ مثنویاں اور فارسی زبان میں "تذکرہ شعرائے اردو" جو ۱۱۸۸ھ و ۱۱۹۲ھ کے درمیان لکھا، یادگار ہیں۔

نظیر اکبرآبادی

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا، بھینسا، بیل، شتر، کیا گونیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں چانوں موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

اس کے شرارِ حسن نے شعلہ جو اک دکھا دیا
طور کو سر سے پاؤں تک پھونک دیا جلا دیا

ولی محمد نام، نظیر تخلص، ۱۷۳۵ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد فاروق تھا۔ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے جب دلی پر حملہ کیا تو نظیر آگرہ چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے ۱۸۳۰ء میں آگرہ میں انتقال کیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ نظیر کا کلام کتنا تھا کیونکہ انہوں نے زندگی میں کبھی اپنا کلام جمع نہیں کیا۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی نثر میں نو کتابیں لکھیں نظیر ایک نغزگو، بذلہ سنج اور رمز شناس شاعر تھے شاعری میں کسی کے مقلد یا پیرو نہ تھے، بلکہ خود ہی اپنے رنگ کے موجد تھے۔ ان کا موضوع انسان اور اس کی معاشرت ہے۔

تن من میں پیم کی آگ بری تب سمجھ پری

اور کبیر۔

پیا باج پیالہ پیا جائے نا!۔

وہ بھی میرا پیارا شاعر، سچی میں نے اس سے بہت پیار کیا ہے
ہائے اب دلی یاد آنے لگا ہے

آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

مگر اب زمانہ اور تھا۔

مادرِ ہندوستان ہندو مسلم تہذیبوں کے ٹکراؤ سے ایک نئی سرزمین بن چکی تھی میں، ریختہ بیگم عوامی رابطے کی سب سے بڑی زبان کے روپ میں جانی جا رہی تھی —— شاہ حاتم، مبارک آبرو، جانِ جاناں، رفیع سودا، اور میرا عاشقِ صادق میر تقی میر ریختے کا استادِ سخن کا ناخدا، سوختہ آتشِ عشق جس کا دین و مذہب کیا تھا:

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

مجھے سجانے سنوارنے اور تراشنے میں ساری عمر صرف کر دی۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اور وہ سودائی!۔

رفیع سودا

مجھ سے عشق کیا کرتا تھا، نٹ کھٹ بنا کرتا تھا، بڑا شورہ پشت چاہنے والا تھا۔ مجھ میں شوخی، طنز اور نشتریت بھر دی۔ اب میرے پاس سب کچھ تھا۔ کیا نہیں تھا حسن و شباب کی رعنائیاں، تصوف و معرفت کی سرمستیاں، طنز و مزاح کی شوخیاں، غلو و ایہام کی قیامت خیزیاں، عالمانہ بصیرتوں کی بلند خیالیاں، صوری اور معنوی دونوں طرح

سے مرقع ہنگراب بھی کسر تھی، بیچ میں سوکن فارسی کا اوج تو ستم انگیز برق کا اکھڑپن اکھڑتا تھا مگر یہ گنگا جمنی روپ ہی تھا، جو مجھے ۔ ایلی و ادنیٰ شیخ و برہمن کو اپنا دیوانہ بنائے دے ، [illegible] مرا عاشق صادق جب اپنے حسن میاں کے جادو نگار [illegible] ایک لڑکا ننھا سا دیکھا تو بولا :۔

"کوئی استاد کامل اسے مل گیا تو بڑا شاعر ہوگا ورنہ مہمل بکے گا۔"

غالب۔ وہی غالب تھا! نام کا غالب، کلام سے سب پر غالب فارسی پر غالب، اسجع پر غالب، نثر پر غالب نظم پر غالب، رموزِ معرفت پر غالب، شوخیٔ عشق پر غالب۔ میرا آنچل فن پاروں سے جگمگا اٹھا۔ وہ فلسفیانہ بلند آہنگی وہ شانِ تغزل، وہ شاعرانہ گھن گرج، ہمیں یہ سب پاکر اترانے لگی۔ قلعے میں بیگمات کی منہ لگی تھی تو بازاروں میں پھیری والوں، مزدوروں، سپاہیوں، جواریوں، شرابیوں، اور بھکاریوں کی دلاری تھی۔

بالاخانوں میں موسیقی کے ترنم کی لہروں میں بہی تھی اور صوفیاء کے روحانی محفلوں میں ہی تھی۔ اب مزید ہرجائی پن چھوڑ کر اسی پیار کے گہوارے میں رہنا چاہتی تھی کبھی دلی میں نظر آتی، کبھی لکھنؤ میں چمکتی اور اندر سبھا میں

سیّد انشا

اس سے خلوت کی ٹھہر جاتی تو میں اللہ سے
واسطے دو دن کے عرشِ کبریائی مانگتا

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے لا
جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا

سید انشاء اللہ خاں نام انشا تخلص ۱۷۵۶ء/۱۱۷۰ھ اور ۱۷۵۸ء/۱۱۷۲ھ کے درمیان مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ بزرگ نجف اشرف سے آکر دلی میں بس گئے تھے۔ انشا کے والد میر ماشاء اللہ خاں صدر بڑے عالم و فاضل اور حاذق طبیب تھے۔ باپ کے دامن تربیت میں پرورش پاکر انشا بھی عالم، فاضل، طبیب اور شاعر ہوئے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ ابتدا میں والد سے اصلاح لی۔ عربی فارسی اور ہندی زبانوں میں نظم کی یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ہندوستان کی متعدد زبانوں پر عبور تھا۔ مرشد آباد سے دلی آئے اور شاہ عالم ثانی کے درباریوں میں جگہ پائی۔ شعراء کی چشمک اور حالات کی ناسازگاری سے بددل ہو کر ۱۷۹۱ء/۱۲۰۶ھ میں لکھنؤ چلے گئے مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رہے پھر نواب سعادت علی خاں کے دربار میں رسائی حاصل کی اور ظرافت، بذلہ سنجی اور شوخ مزاجی سے نواب کو اس قدر گرویدہ بنا لیا کہ ان کے بغیر اسے ایک دم چین نہ آتا تھا۔ آخر میں نواب سے کسی بات پر ان بن ہو گئی اور عمر کا آخری زمانہ گوشہ نشینی اور کس مپرسی کی حالت میں گذار کر بمقام لکھنؤ ۱۸۱۷ء/۱۲۳۳ھ میں وفات پائی۔

ابراہیم ذوق

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے
کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوئے پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا انہیں کیا اضطراب میں

سب کو دیکھا اُس سے اور اس کو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

محمد ابراہیم نام، ذوق تخلص، ۱۷۸۹ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا۔ جو ایک غریب سپاہی تھے۔ ابتدائی تعلیم اگرچہ معمولی ہوئی تھی۔ مگر کثرتِ مطالعہ نے ان کی فطری صلاحیتوں کو اُبھار دیا۔ شروع میں حافظ غلام رسول شوق سے اصلاح لی بعد میں شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے تمام عمر دلی میں رہے اور وہیں ۱۸۵۴ء میں انتقال کیا۔ اکبر شاہ ثانی نے "خاقانیٔ ہند" کا خطاب عطا کیا۔ بہادر شاہ ظفر شہزادگی کے زمانے سے ہی ذوق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔

چی۔ بانکوں کی بولیوں اور گالیوں میں جھومتی اینٹھتی لکھنؤ
ں نزاکت کا جادو جگاتی۔ جوبن دکھاتی لوگوں کو رجھاتی
ور لوگ باگ میرے پیچھے پیچھے گھومتے۔

ہائے کیا نزاکت تھی، چمیلی کا ایک پھول کسی نے سر
رکھ دیا تو کمر سو سو بل کھاتی۔

دلی میں آتی تو متانت کی بھاری جڑاؤ چادر سر پر
الے ہوتی، سنجیدہ ہونا پڑتا۔ بھاری بھرکم بننا پڑتا۔

بوئے گل، نالۂ دل، پاسِ وفا، شاہانہ وقار اور
عالمانہ شائستگی۔

ہائے وہ دلی کی گلیاں!
جہانِ رنگ و بو تھا۔
میری علینِ جوانی کے دن تھے۔

میری بھارتی ماں کی تاریخ ایک بار پھر دہرائی جانے والی تھی۔ وہ چمن اجڑنے والا تھا جہاں میں محوِ گلگشت رہتی تھی۔ جہاں ذوق، مومن، غالب جیسے باکمال جمع تھے جہاں کے ہندو لالہ لوگ بھی میری رفاقت کا دم بھرتے تھے ہندو دیویاں مجھے گلے لگاتی تھیں۔

فرنگی آئے :۔ جیسے آریے آئے تھے جیسے عرب کے غازی آئے تھے۔ بھارتی ماں کے آنچل میں چھپی دولتوں کو پانے کے لئے بلادِ مشرق کی دلہن سرزمینِ ہند کی بانکی چھبی انھیں کشاں کشاں کھینچ لائی تھی۔ ایشیائی تھے وہ یہیں کے ہو رہے۔ بلخ و بخارا، سمرقند و حجاز، غزنین اور غور کے باشندے ہندوستانی ہو گئے تھے۔ فرغانہ کا بابر اس سرزمین کو فردوس

بر روئے زمین کہہ کر حب الوطنی کی داغ بیل ڈال گیا تھا۔ ہمایوں، شیر شاہ، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب اور جانے کتنے بڑے بڑے تاجدار اسی خاک میں دائمی نیند سو چکے تھے۔ حجازی شہسوار تھے جو ہندی دہقان بن چکے تھے۔ ان کی نسلوں سے میرے چاہنے والے سچے ہندوستانی پیدا ہو چکے تھے مجھے بھی تو ہندوستانی کہا جانے لگا تھا۔

اچانک طوفان آ گیا۔

سفید فام قوم کا تسلط قائم ہو گیا۔

مجھے ایسا لگا جیسے میں بے آبرو ہو گئی، اپنے گھر میں ہی جو ہر کرنا ہو گا۔ میں لٹ گئی۔ دلی مٹ رہی تھی۔ میرا گھر لٹ رہا تھا میرا سہاگ مٹ رہا تھا۔ خون، خون ۔۔! آگ، آگ ۔۔۔؟ لٹا تھا۔ اب دلی نہ رہے گی۔ دلی نہ رہے گی تو دلی والے کہاں! اردو کہاں؟۔ خدایا جنگ آزادی پھر وہی ہونی کی بات یاد آتی ہے۔ ہونی جسے فیصلہ قدرت کہتے ہیں انقلاب نہ ہوں تو دنیا یکسانیت کا شکار ہو جائے کائنات بڑھاپے کا شکار ہو جائے، زندگی جو ہر آن نئے قالب چاہتی ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تا نہ کہیں خلل پڑے آپ کے خوابِ ناز میں
ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

مومن خاں نام، مومن تخلص، ۱۸۰۰ء (۱۲۱۵ھ) میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حکیم غلام نبی تھا، دادا حکیم نامدار خاں۔ شاہ عالم کے عہد میں کشمیر سے دلی آئے اور شاہی طبیبوں میں شامل ہوئے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے مومن نام رکھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد شاہ عبدالقادر دہلوی سے تعلیم حاصل کی شاہ ولی اللہ کا خاندان مدتوں دلی میں اپنے علم و فضل کے لئے مشہور رہا ہے اور اس لحاظ سے مومن بڑے خوش نصیب تھے کہ انہیں ایسے گھرانے میں تحصیل علم کا موقع ملا۔ والد اور چچا سے فن طب کی تکمیل کی۔ نجوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لی۔ مومن کو طبابت ورثہ میں ملی۔ بے چین طبیعت نے اختر شناسی سے روشناس کیا۔ مزاج کی رنگینی اور نے عاشق مزاج بنایا اور حسن و عشق کی گود میں پلی ہوئی زندگی نے انکی شاعری کو رنگین تغزل سے سرفراز کیا تصنیفات میں کلیاتِ اردو، دیوانِ فارسی، انشائے فارسی ان کی یادگار ہیں۔ ۱۸۵۱ء (۱۲۶۸ھ) میں دہلی میں انتقال کیا۔

طاقت دکھاؤں میں جو رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا
طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں
کانپے طبق زمین کے، ہلا چرخ لاجورد
مانند کہربا ہوا، مٹی کا رنگ زرد
پرتو فگن تھا نور رسالت مآب کا
سر پر لگا تھا چتر بندی آفتاب کا
کیا جانے کس نے روک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے، یہ غصہ ہے شیر کو
دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

میر ببر علی نام، انیس تخلص ۱۸۰۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ میر مستحسن خلیق کے بیٹے میر حسن دہلوی صاحب مثنوی سحر البیان کے پوتے تھے۔ جد امجد میر امامی ایران سے دلی آئے لیکن زمانہ کی نا مساعدت نے میر حسن کو ترکِ وطن پر مجبور کیا۔ پہلے فیض آباد گئے پھر لکھنو آکر بود و باش اختیار کی۔ میر انیس کی تعلیم و تربیت لکھنو ہی میں ہوئی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں والد کے ارشاد پر مرثیہ گوئی کی طرف توجہ فرمائی اور اس میں چار چاند لگا دیئے۔ میر انیس نے ۱۸۷۴ء میں لکھنو میں انتقال کیا۔ مرثیہ گوئی ورثہ میں ملی تھی۔ خود فرماتے ہیں ؎

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

میر انیس نے مداحِ آلِ رسول کی حیثیت سے اردو شاعری میں وہ نام آوری حاصل کی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔

فرنگی نہ آتے تو کچھ نہ ہوتا۔
فرنگی آگئے تو بہت کچھ ہو گیا۔
ہند کی آزاد فضاؤں میں پلی بڑھی اور باحیا دوشیزہ سلاست، فصاحت اور شائستگی کا پیکر اردو ملک کو غلام ہوتا دیکھ رہی تھی۔

دشمن چالباز، دغا باز، بے حیا، خود غرض اور خلوص سے عاری تھا۔ یورپ کی سرزمین کا انسان نما جانور مگر۔ واہ ری میری ماں کی آغوش! اور واہ ری میں، انگریزی جیسی آہنی زبان والے آہن گر، کلیں اور مشینیں بنانے والے صنعت کار، سیاستداں سب کچھ جاتز تصور کرنیوالے

ٹیڑھ لگ گیا۔

میری بیاضی یا ملیح صورت۔

میری شام اودھ جیسی گھیری زلفیں۔

صبح بنارس جیسا میرا وجیہ مکھڑا۔

فرنگی کو تاب ضبط نہ رہی، دو قدم آگے بڑھا۔ میری حجاب محبت کا ہاتھ بڑھاتی رہا۔ میں سرشار ہی تھی — لمبی رتی تھی۔ اس کا اکھڑا لہجہ کانوں کو بار تھا اور اندام گنہگار سماعت۔ بھاری مگر مصلحت۔ میرا ایسا عاشق بے ڈھنگے جذبات انسان اظہارِ محبت کرنے لگا۔

وِل انڈیا کا اردو لینگویج بیسٹ اولی
ہے ہم اردو کو سرکاری لینگویج بنانا مانگتا۔
فورٹ ولیم کالج میں ہم سب جمع تھے

اس وقت تو میں مارے شرم کے زمین میں گڑ گئی۔
جب کسی دیدہ دلیر نے مجھے جانچا، میں خود کو مکمل خیال کرتی تھی۔ مگر یہاں تو خامیاں باقی تھیں۔ دوشیزہ اردو کا دامن نثر سے خالی تھا۔ جو کچھ تھی وہ فارسی بیگم سے مستعار لی ہوئی تھی بے عیب خدا کی ذات تھی، انگریز بوالہوس تھے۔ غرض کے بندے مجھے جدید نوک پلک سے سنوارنا ان کا پیار نہیں تھا وہ تو ان کی تجارتی غرض تھی۔ طوطا مینا، حاتم طائی، گل صنوبر اور طلسم ہوشربا جیسی بھاری بھرکم لغو داستانیں میرے پلّو سے باندھ دیں۔ بڑا ناگوار گزرتا تھا شروع شروع، کہاں محلوں اور بادہ دروں میں سبک خرامی کرنے والی عاشقوں کے دلوں سے محبت کے نغمے بنکر پھوٹ نکلنے والی نرم و نازک میں جو لطیف جذبات کی آئینہ دار تھی۔ لطافت حس کی گھٹی

دیا شنکر نسیم

(گل بکاؤلی، جاگی مرغ سحر کے غل سے
اٹھی نکہت سی فرش گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پُرآب وہ چشمِ حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہُوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

تغزل، لائے اس بت کو التجا کر کے کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے
ساقی قدحِ شراب دیدے مہتاب میں آفتاب دیدے

پنڈت دیا شنکر نام، نسیم تخلص ۱۸۱۱ء (۱۲۲۶ھ) میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول نسیم ایک معزز کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اردو اور فارسی کی اچھی تعلیم پائی تھی بعہد امجد علی شاہ فوج کی تنخواہ تقسیم کرنے پر مامور تھے۔ شعر و سخن کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ آتش کے شاگرد ہوئے۔ لکھنؤ میں میر حسن کی مثنوی "سحرالبیان" کا اُس زمانے میں بڑا چرچا تھا نسیم کو یہ طرز کچھ ایسا پسند آیا کہ ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ) میں (میر حسن کی تصنیف کے نصف صدی بعد) گل بکاؤلی کے مقبول عام قصے کو عملی جامہ پہنایا۔ اور مثنوی "گلزار نسیم" نام رکھا۔ عالم شباب میں بمقام لکھنؤ ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) میں انتقال کیا۔

میرزا دبیر

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی
پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطعِ زلفِ لیلیٰ زہرہ لقب ہوئی
مجنوں صفت قبائے سحر چاک شب ہوئی

فکرِ رفو تھی، چرخِ ہنر مند کے لئے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لئے

یوسف غریقِ چاہ سیہ ناگہاں ہوا
یعنی غروب، ماہِ تجلّی نشاں ہوا
یونسؑ دہانِ ماہیِ شب سے عیاں ہوا
یعنی طلوع، نیرِ مشرق ستار ہوا

میرزا سلامت علی نام، دبیر تخلص، والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ ملا ہاشم شیرازی شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں دہلی آئے۔ دبیر ۱۸۰۳ء میں یہیں پیدا ہوئے سات سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ چلے گئے اور فارسی و عربی کی کتابیں وہاں کے نامور علماء سے پڑھیں۔ علمی استعداد فاضلانہ رکھتے تھے شعر و شاعری سے فطرتی مناسبت تھی۔ مرثیہ میں مظفر حسین ضمیر لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ اُنہی نے دبیر تخلص رکھا۔

میرزا دبیر نے پندرہ سال کی عمر سے مرثیہ گوئی شروع کی جو کچھ اُستاد سے پایا اسے بقول آزاد "بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا" بیان کرنے کے نئے اسلوب اردو شاعری میں بکثرت پیدا کئے، ایک ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوتِ متخیلہ کی جولانیوں کے لئے نیا میدان صاف کر دیا، وہ ساری عمر لکھنؤ میں رہے۔ آخری عمر میں آنکھ کے علاج کے لئے واجد علی شاہ کے ایما پر کلکتہ گئے اور مرشد آباد، عظیم آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ واپس آئے اور وہیں ۱۸۷۵ء ۱۲۹۲ھ میں وفات پائی۔

میں پڑی تھی وہ نہ میں منشیوں کی عدالتی کارروائیوں، بنیوں کے حسابات اور بھاری وادق تاریخ و جغرافیہ کے چکر میں پھنس گئی۔

دنیا نہ دیکھو تو کائنات ننھی سی لگتی ہے۔

محلوں اور محفلوں کی جان رہی تب تک کچھ پتہ نہ تھا انگریزی میم کو دیکھا تو اس کی گٹ پٹ بڑی لگی تھی مگر قریب سے دیکھا تو جانا کہ ہاتھ میں تو یونہی رہی۔ یہ لوہا کوٹنے والے گورے لو ہار میرے دامن میں لفظوں، استعاروں اور تشبیہات کے ستارے تو نہیں ٹانک سکتے تھے مگر تھے تو عاشق ہی چاہے بوالہوس تھے۔ بڑی بڑی دیدہ پیکر کلیں تحفے میں لائے تو پتہ چلا کہ یہ انگریزی میم کیوا) مٹک مٹک کر چلتی ہے۔ مل کر اس سے بہیلیا یا جوڑ کر بیٹھی تب پتہ چلا کہ اس کے پاس تاریخ ہے، ہیئت ہے، علم ہندسہ ہے۔ فلسفہ ہے ٹیکنالوجی ہے علم الجراحت و علم الحیوان ہے۔ میں نے سیدھے سبھاؤ اپنی کم مائیگی کا اعتراف کر لیا۔

گوری میم جیسی تک۔ چڑھی دکھائی دیتی تھی ویسی

کمی نہیں۔

میں تو عام آتی مگر گورے عاشقوں کی کمی نہ تھی
شاعروں میں شریک ہوتے، شعر کہتے، کتابیں لکھتے، لکھواتے
عالموں کو نوازتے، تعلیم عام کر دی۔ میں ہی تھی ذریعہ تعلیم
میں ہی تھی رابطے کی زبان۔

غلامی میں پنپتی رہی خود رو پودے کی طرح میرے
پاس علم و عمل کا خزانہ بڑھتا جا رہا تھا۔ انگریزی میم کی
معیت میں اس کی دیکھا دیکھی میں بھی اپنے طور اطوار
بدلنے لگی میرا رنگ و روپ اس موضوع پر کچھ ایسا تھا۔

پہلے اس سے یہ خاکسار اس کہانی کو خاص و
عام کی بول چال کے مطابق واسطے صاحبانِ نوآموز
کے تحریر کر چکا۔ اس داستانِ شیریں کو کہ فی الحقیقت
قصۂ شیریں سے شیریں تر ہے اس رویئے سے
شکروں کی زبان میں ان عش عش کریں اور یہ بھی دوران
رہتی دنیا تک یادگار رہے۔"

یا

پہلو میں میرے دل کو نہ اے دردکر تلاش
مدت ہوئی غریب' وطن سے نکل گیا
ہر جگہ جوشِ محبت کا نیا عالم ہوا
آنکھ میں آنسو، جگر میں داغ، دل میں غم ہوا
مرغانِ باغ تم کو مبارک ہو سیرِ گل
کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا
دَیر کی تحقیر کر اتنی نہ اے شیخِ حرم
آج کعبہ بن گیا، کل تک یہی بت خانہ تھا

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

منشی امیر احمد مینائی نام، امیر تخلص، لکھنؤ وطن، مخدوم شاہ مینا کے خاندان سے ہیں، مولوی کرم احمد کے صاحبزادے سنہ ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مولانا مفتی محمد سعد اللہ وغیرہ سے تعلیم حاصل کی اور شاعری میں اسیر لکھنوی سے اصلاح لی۔ جو مصحفی کے شاگرد تھے سنہ ۱۸۵۲ء میں واجد علی شاہ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ "ارشاد السلطان" اور "ہدایۃ السلطان" کتابیں ان کے دربار میں پیش کیں، اس پہ خلعتِ فاخرہ عطا ہوا۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد رام پور گئے۔ نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں نے قدردانی کی اور اپنا کلام دکھایا۔ اس وقت رامپور میں اہلِ کمال کا جمگھٹا تھا۔ نواب کے انتقال کے بعد سب سے پہلے مرزا داغ حیدر آباد دکن گئے۔ پھر امیر مینائی بھی پہنچے لیکن چند روز کے بعد سنہ ۱۹۰۰ء میں وہیں وفات پائی۔ "مرآۃ الغیب" اور "صنم خانۂ عشق" کلام کے مجموعے ہیں۔ "امیر اللغات" کی صرف دو جلدیں شائع ہوئیں۔ اگر یہ لغت مکمل ہو جاتی تو اردو زبان کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہو جاتا۔ امیر و داغ، دورِ آخر میں آسمانِ شاعری کے مہر و ماہ تھے۔

امید کرم، ہو کر ہم مے سے کریں توبہ
دوزخ میں پڑے زاہد بے لطف ثواب لیا

خدا کریم ہے یوں تو، مگر ہے اتنا رشک
کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا، کسی کی نگاہ میں

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

نواب مرزا خاں نام، داغ تخلص، فصیح الملک، بلبل ہندوستان، جہان استاد وغیرہ خطابات۔ نواب شمس الدین خاں (خاندان لوہارو) کے صاحبزادے تھے۔ سنہ ۱۸۳۱ء/۱۲۴۷ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ ان کی والدہ نے شاہزادہ فتح الملک عرف مرزا فخرو (ولیعہد بہادر شاہ ظفر) سے نکاح کر لیا۔ اور "شوکت محل" کا خطاب پایا۔ اسی بنا پر داغ کی تعلیم و تربیت لال قلعہ میں ہوئی۔ شعر و سخن میں ذوق کے شاگرد ہوئے، کیونکہ بہادر شاہ ظفر اور مرزا فخرو دونوں انہی کو اپنا کلام دکھلاتے تھے۔ سنہ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا تو داغ کو بھی لال قلعہ چھوڑنا پڑا۔ یہ مصیبت کیا کم تھی کہ ۱۸۵۷ء میں غدر ہو گیا۔ اس ہنگامے کے بعد رام پور آئے۔ نواب کلب علی خاں نے بڑی قدر کی، اُن کے انتقال کے بعد حیدر آباد دکن گئے۔ اور خسرو دکن میر محبوب علی خاں نے مشورۂ سخن سے اعزاز بڑھایا۔ سنہ ۱۹۰۵ء/۱۳۲۲ھ میں بلبل ہندوستان کی شیوا بیانی ختم ہو گئی۔

"یہاں کی ہر بستی میں گھما گھم جا بجا ایک نئی طرح کا عالم ہر شہر و قصبہ میں ستھری پاکیزہ پختہ متعدد سرائیں مسافر کے واسطے ہر قسم کے اوڑھنے بچھونے و اقسام کی غذائیں ــــ بڑے بڑے دریاؤں میں کشتیاں نواڑے بیشمار شاہراہوں کے ندی نالوں پر پل بے شمار۔"

یہ قافیہ پسندی میرے حسن ظاہر میں ایک کجی تھی میں گویا طاؤس تھی جس کے پاؤں بد نما تھے۔ اکثر رنجیدہ رہتی تھی۔ مگر!

میرے عشاق مشاطگیٔ فن کی ریاضت کیساتھ شب و روز میری نوک پلک سنوارنے میں معروف تھے۔ چھاپے خانوں اور رسائل نے مجھے نئی زندگی عطا کرنی شروع کر دی تھی۔

میرا بوڑھا عاشق جو ہنوز جوان تھا۔ مجھے اپنے عود ہندی سے مہکا چکا تھا پہچانا آپ نے وہی غالب جو زندگی بھر مجھ پر غالب رہا۔ آج بھی غالب ہے ہمیشہ تا ابد غالب رہے گا۔

کس کس کا نام لوں۔

سرسید، شبلی، نذیر احمد، میر ناصر، مولوی سید احمد، راشد الخیری، حسن نظامی۔ ادھر اودھ میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، ہادی رسوا، سجاد حسین جیسے کامل میری زلفِ دراز کے اسیر ہو چکے تھے۔ میں مالا مال تھی۔ آتش، ناسخ، انیس و دبیر یہ پہلوان تھے۔ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوتے۔ تو حیرت ہوتی ہے میں اس کی ٹھہروں مگر میں تو سب ہی کی تھی۔ جو میرے قریب آنے کے لائق ہو۔ اس کی بھی اور جو نہ قریب آنے کے لائق ہو۔ اس کی بھی۔ ہر ایک کی محبوبہ چاہے وہ فرہنگ آصفیہ کا مؤلف ہو یا کبیر نخاس کا گنڈے دری والا، یا گھر گھر خط بانٹنے والا ڈاکیہ۔

میرا نیا روپ۔ نیا ادب۔ میرے جوبن میں ترکیب و معانی کی دلکشی، اب مادرِ ہند کے پیاروں نے مجھ میں بھر دی۔ صہبائے خیال کے نشے میں چور چور تھی مگر وائے ہوس! اور پانے کی ہوس ابھی میرے لئے تنگنائے ادب بقدر ظرف نہ تھا۔ ابھی تو میرے بیان کے لئے اور وسعت درکار تھی اور گیرائی کی ضرورت تھی۔

میں اردو ہوں لشکر — ایک سمندر جس کا شکم کبھی پُر نہ ہو۔

قومی شاعری کے موجد خواجہ حالی

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غُل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

خواجہ الطاف حسین نام، حالی تخلص، ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت ابوایوب انصاری تک جاتا ہے۔ آباؤ اجداد شاہ بلبن کے عہد میں ہرات سے آ کر پانی پت میں مقیم ہوئے۔ خواجہ حالی بچپن ہی میں والدین کے سایہ سے محروم ہو گئے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے دہلی چلے آئے اور شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی مصاحبت میں رہنے کا موقع ملا، اور ان کے فیضِ صحبت میں حالی کی شاعری چمکی۔ نواب شیفتہ کے انتقال کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت کی۔ یہاں ان کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت درست کرنی پڑتی تھی اس سے ان کو انگریزی خیالات اور انگریزی طرزِ ادا سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی تھی۔ لاہور سے اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس ہو کر چلے آئے اور یہیں ۱۸۷۹ء میں مسدس لکھا۔ ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا اور ۱۹۱۴ء (۱۳۳۳ھ) میں پانی پت میں وفات پائی۔ آپ اردو میں سیرت نگاری، تنقید، قومی شاعری اور نیچرل شاعری کے موجد ہیں۔

مضمون نگاری کی ابتدا

سرسید احمد خاں نام۔ دہلی وطن۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے اور ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ میں وفات پائی۔ والد کا نام میر تقی تھا۔ سید احمد خاں کی والدہ عزیز النسا بیگم' خواجہ فرید کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ بچوں کی تربیت میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی کردار نے سید احمد خاں کی زندگی اور انداز فکر پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ عزم و استقلال کا جو جوہر سید احمد خاں میں تھا یہ انہیں اپنی والدہ سے ہی ورثہ میں ملا تھا اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ ۱۸۳۸ء میں والد کے انتقال کے بعد سرسید کو معاش کی فکر دامن گیر ہوئی سب سے پہلے انہوں نے عدالت میں کام کیا۔ اس کے بعد کچہری میں سر رشتہ دار مقرر ہوئے۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مسٹر سیمر رابرٹ نے ان کو عدالت میں سیشن کا سر رشتہ دار مقرر کرنا چاہا لیکن جب انہوں نے اس کو مشکل جان کر انکار کر دیا تو نائب منشی کے عہدے پر انہیں مامور کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۲۴ دسمبر ۱۸۴۱ء کو وہ مین پوری کے منصف مقرر ہوئے مگر ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء کو وہاں سے تبدیل ہو کر فتح پور سیکری آ گئے۔ سید احمد خاں یہاں چار سال تک منصف رہے۔

سرسید کو لکھنے پڑھنے کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ 'آثار الصنادید' ان کا ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہے اس کتاب میں انہوں نے دلی کی تاریخی عمارتوں کا حال تحریر کیا ہے۔ اس کتاب کا انگریزی کے علاوہ ۱۸۶۱ء میں فرانسیسی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد جب مسلمانوں پہ مردنی چھا گئی تھی اور قوم کا شیرازہ بکھر گیا تھا، اس وقت سرسید نے مایوس اور افسردہ قوم میں نئی روح پھونکی۔ سرسید نے مسلمانوں کے لئے تعلیم کو ترقی کا زینہ قرار دیکر ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ایک درسگاہ 'مدرستہ العلوم' قائم کی، جو آج مسلم یونیورسٹی کے نام سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں مشہور ہے۔ وہ قوم کے سچے خادم، ملک کے خیر خواہ اور اپنی دھن کے پکے انسان تھے۔ سرسید اردو کے بھی بڑے محسن ہیں۔ انہوں نے اردو میں سب سے پہلے 'مضمون نگاری' کی ابتدا کی اور انشا پردازی کو ایک نیا اسلوب بخشا۔

نئے اسالیب کی تلاش تھی مجھے، نیا اسلوب جیسے کوئی خون جگر سے جنم دے! محمد حسین آزاد، آہ! یہی نکلا میرا محبوب قلمکار۔ میرا مزاج بدل گیا، میری روش بدل گئی۔ انشا پردازی کی نئی لہر۔ ایک نیا فیشن، مگر میرے دوسرے چاہنے والے بگڑ گئے۔ یہ خبطی دوشیزہ اردو کو بدنما کر دیا۔ سرسید آڑے آئے، آزاد کی ہمت افزائی کی۔

نئی قدر (دا) کے لئے میدان ہموار ہو رہا تھا۔

سرسید کا علی گڑھ کالج۔

جہاں ملیں، اور فرنگی میم اطمینان اور سکون سے

رہ رہی تھی۔ یہ گہوارۂ علوم، رومانی تحریک کا مرکز
ماحرن میں شیدائی عبدالقادر چیار رہے تھے۔ علی گڑھ
سے ایک ہوا علیمی اور مخرن کے ذریعہ مشرق سے مغرب
تک پہنچ جاتی۔ علیگڑھ کے میرے عاشق جذب صادق رکھتے
تھے۔ فرنگی میم کی معیت میں رہتے ہوئے رومانی، شہوانی،
نفسیاتی، صوفیانہ، جمالیات، سیاست، مذہب سب
باتوں میں کھل کر اظہار رائے کرنے لگی تھی۔ سر سید میرا
عاشق صادق تھا مگر وہ محبوبائیں مباح سمجھتا تھا۔ پہلے
میں اس سے ناک چڑھاتی تھی پر اب سوچتی ہوں کہ انگریزی
میم سوکن بن کر نہ آتی تو میں کیا ہوتی!

حالی نے مسدس اور یادگار غالب حیات سعدی
دیکر مجھے سوانح عمری اور پیغامیہ شاعری دی۔ نذیر احمد
نے قرآن کریم کا ترجمہ قانون کی کتابیں اور بچوں، عورتوں
کے لیے اصلاحی موضوع کے علاوہ ایک اور چیز دی جو
موگوڑی نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ "ناول" نذیر احمد
نے یہ شے انگریزی میم سے مانگ کر مجھے دے دی تو ہر طرف
واہ واہ ہوگئی۔
ذکاء اللہ!
ہائے میرا دلدادہ مگر کتنا خشک طبع، ریاضی، تاریخ
سوانح، سیاست اور جانے کیا کیا تحفے لئے میرے جلو

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہوتا ہے انبساط غذائے لطیف سے
غنچے کو دیکھئے کہ ہوا کھا کے کھل گیا

اِک عکس ناتمام پہ عالم کو وجد ہے
کیا پوچھنا ہے آپ کے حسن و جمال کا

پُرانی روشنی میں اور نئی میں فرق ہے اتنا
اسے کشتی نہیں ملتی اسے ساحل نہیں ملتا

سید اکبر حسین نام، اکبر تخلص، لسان العصر لقب۔ خان بہادر خطاب۔ ولادت ۱۸۴۶ء / ۱۲۶۲ھ، وطن الٰہ آباد، والد کا نام سید تفضل حسین رضوی تھا۔ مورثِ اعلیٰ سید علی عرب نیشاپور (ایران) سے ۹۲۲ھ / ۱۲۲۲ء میں ہندوستان آئے تھے۔ اکبر کی ابتدائی تعلیم اُن کے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ اس لئے فلسفہ اور تصوف کا غلبہ ہوگیا۔ انگریزی کی استعداد انہوں نے خود پیدا کر لی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد نائب تحصیلدار ہوئے۔ ۱۸۸۱ء میں منصف ہوگئے۔ پھر ۱۸۸۸ء میں ججی پر ترقی دی گئی۔ ۱۸۹۴ء میں سیشن جج ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں پنشن لی اور ۱۹۲۱ء / ۱۳۴۰ھ میں الٰہ آباد میں انتقال کیا۔ لسان العصر سید اکبر حسین بذلہ سنج اور ظریف تھے شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ مولوی وحید الدین وحید شاگردِ مصحفی سے تلمذ تھا۔ اکبر اردو شاعری میں ایک نئی طرز کے موجد تھے۔

اب اپنی عمر شیشۂ نازک کا جام ہے

بس اک ذرا سی ٹھیس میں قصہ تمام ہے

شاد ایسے میں نہ توڑا تھا کسی نے

پھول پر ہاتھ بڑھایا تھا کہ دل یاد آیا

چشم بینا میں کہاں جچتی ہے دو دن کی بہار

گل جو کھلتے ہیں تو ہنس دیتا ہے شیدا اُس کا

دیکھا تو ہو گا ہم نے ازل میں ترا جمال

لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

جب کسی نے حال پوچھا رو دیا   چشم تر تو نے تو مجھ کو کھو دیا

سید علی محمد نام، شاد تخلص ۱۸۴۶ء/۱۲۶۲ھ میں عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد ان کے بزرگ دہلی سے پٹنہ چلے گئے تھے۔ والد کا نام سید عباس مرزا تھا۔ ادبی تربیت میر سید محمد کے ذمہ تھی جو اردو زبان کے محقق تھے۔ انہی کی تربیت کا اثر تھا جس نے آئندہ چل کر شاد کی زبان کو اس قدر فصیح و بلیغ کر دیا۔ شاد کی شاعری کا دور پندرہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے۔ کلام کی اصلاح شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی نے کی جو آتش کے شاگرد تھے اور ان کو خواجہ میر درد دہلوی سے تلمذ تھا۔ شاد نے اپنی تمام عمر اردو ادب کی خدمت میں گذاری "خان بہادر" کا خطاب اور ایک ہزار روپیہ سالانہ گورنمنٹ سے وظیفہ ملتا رہا۔ ۳۲ سال تک آنریری مجسٹریٹ رہے۔ ۱۹۲۷ء/۱۳۴۶ھ میں پٹنہ میں انتقال کیا۔

میں پھرتا تھا۔ پھر محسن الملک تھا۔ تہذیب الاخلاق کا مقالہ نگار، سرسید کا دست راست۔ مولوی چراغ علی، عبدالحلیم شرر ناول کا بادشاہ، نذیر احمد نے مجھے خیالی اور ناپختہ ناول دیئے تھے مگر شرر نے تاریخی موضوع کے مزے دار ناول پیش کئے۔ میری خوشیوں میں اضافہ کیا۔

میرے یہ جاں نثار۔ میرے متوالے

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو

کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

ابراہیم ذوق جیسے عالم کا شاگرد، نواب مرزا داغ قلعۂ معلی کا پروردہ، بیگماتی ٹکسالی بولی کا ماہر، روز ازل سے ہی میرے نام لیواؤں میں سے تھا۔ تخلص داغ تھا۔ اور عاشقوں کے دل میں بستا تھا اور میں خود اس کے دل میں رہتی تھی۔ امیر مینائی، یہ نام زبان پر آتے ہی دل و دماغ ایک عجیب سے بانکپن اور روحانیت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ داغ کے رنگ کو آگے بڑھایا مجھے پیار کی چاشنی سے ہمکنار کیا۔ ضامن علی جلال اسی دور میں ہوا میرا یہ دوسرا صناعی، ندرت اور تراکیب کی بندش اس کا خاصہ تھیں اور عقد ثریا کا مصحفی میرا جاں نثار دوست دار اور ممنون۔ رب کا شکر ادا کر بھائی ✣ جس نے ہماری گلے بنا دی

وطن میرا بھارت کی پیاری زمیں ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی میرا دامن وطن پرستی اور بچوں کی شاعری سے خالی تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بڑے بڑے سبق۔

درگا سہائے سرور، تر اتن مہر، نوبت رائے نظر، نظم طباطبائی ــــ کس کا ذکر نہ کروں، بلالحاظ مذہب وملت، بلالحاظ فرقہ و عقیدہ میرے پرستاروں کے جذب صادق میں کبھی کمی نہ آئی۔

شاد عظیم آبادی جیسا شاعر بھی یاد آتا ہے جو پٹنے میں میرے پیار کی شمعیں جلائے رہا اور بجائے کافور کے خون دل سوختہ کرتا رہا "نغمۂ الہام" دے کر اس نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ ٹھیک ہے کہ ؎

تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

میں بھی شمع تھی خود جلتی تھی اور پروانے خود جل کر میری ضو فشانی میں اضافہ کرتے تھے۔

ایک اور عاشق ملے، پڑھے لکھے اور جج کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہو کر بھی اتنے مشرقی کہ ڈر لگنے لگا، مگر قریب آئے تو ہنسا ہنسا کر رلا دیا ؎

حامد کچھ نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

اکبر الٰہ آبادی نے جب یہ بات کہی تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ حامدہ کا نام مجھے دے رہے ہیں۔

نہ میں ہندو نہ میں مسلم:۔ میں اردو ہوں نہ میں کھتریوں اور آریوں کی سنسکرت ہوں نہ مسلمانوں کی عربی نہ ہندوؤں کی ہندی، میں تو بس اردو

ریاض خیرآبادی

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
پسلی پھڑک اٹھی نگہِ انتخاب کی

آتے آتے ترے لب تک جو تبسم بن جائے
اس ادا سے کبھی ہم سے بھی ہو پیماں کوئی

چھلکائیں، لاؤ بھر کے، گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

کیا حسرت سے رخصت صبح کے تاروں کو یہ کہہ کر
کہ جن کا شام سے تھا آسرا اب تک نہیں آئے

ریاض احمد نام، ریاض تخلص، ۱۸۵۳ء/۱۲۷۰ھ میں خیرآباد ضلع سیتاپور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ بزرگ ایران کے رہنے والے تھے۔ مورث اعلیٰ خلجیوں کے عہد میں ہندوستان آئے اور خیرآباد میں سکونت اختیار کی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سید طفیل احمد سے پائی اور شاعری میں اسیر لکھنوی سے فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد امیر مینائی کے شاگرد ہوئے اور استاد کا نام روشن کیا۔ زندگی کا زیادہ حصہ گورکھپور میں گذارا۔ ۱۹۳۴ء/۱۳۵۲ھ میں خیرآباد میں وفات پائی۔

صفی لکھنوی

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

کوئی سیکھ لے دل کی بیتابیوں سے
ہر انجام میں رنگِ آغاز دینا

حسن مجاز، چشمِ حقیقت پسند میں
خوش رنگ ہے ضرور مگر دیرپا نہیں

دیکھیو تھک کے نہ بیٹھ اے دلِ حسرت انجام
قدمِ سعی، ابھی سرحدِ آغاز میں ہے

سید علی نقی زیدی نام، صفیؔ تخلص "لسان القوم" خطاب، ۱۸۶۲ء (۱۲۷۹ھ) میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے بسلسلۂ نسب حضرت زید الشہید بن حضرت امام زین العابدینؑ بن حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر منتہی ہوتا ہے مورثِ اعلیٰ سید نورالدین شاہ مبارک زیدی بعہد سلطان شمس الدین التمش غزنی سے آکر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے لیکن پردادا سید احسان علی دہلی سے فیض آباد چلے گئے۔ والد سید فضل حسین نواب امجد علی شاہ کے ولی عہد شاہزادہ مرزا سلیمان قدر کے اتالیق مقرر ہوئے۔ کیننگ کالجیٹ اسکول لکھنؤ سے انٹرنس پاس کیا۔ ۱۸۸۳ء سے محکمۂ دیوانی میں مختلف عہدوں پر رہ کر ۱۹۲۱ء میں پنشن لی اور ۱۹۵۰ء (۱۳۷۰ھ) میں "بزم لکھنؤ" کی یہ آخری شمع بجھ گئی۔

ہوا۔ میری زلف کی گھنیری چھاؤں نے ہر ایک کے لئے سکون و طمانیت بخشی ہے۔ ہر ایک کے لئے جو انسان رہا ہے میری محبت بھری آغوش وا رہی ہے۔ عیسائی آئے تو مجھے تعصب و نفرت کا زہر بھی پینا پڑا۔ فرنگی ذہنیت نے لڑاؤ اور حکومت کرو کا اصول اپنایا تو مناظروں اور مباحثوں نے جنم لیا۔

جس طرح تہذیبوں اور قوموں کا ٹکراؤ ہوتا ہے اسی طرح خیالات کی جنگ بھی ہمیشہ نئے نئے کارہائے نمایاں انجام دیتی ہے۔ ہر تخریب میں تعمیر کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔ فرقہ پرستی جنم لے چکی تھی۔ یہ ذہن آج بھی موجود ہے اس کی من پسند خوراک ہے۔ یکجہتی اور امن۔ عیسائی مسلم، ہندو مسلم، شیعہ سنی، سنی وہابی ہر ایک کی زبان میں تھی ایک نیا موضوع پیدا ہوا، عیسائی پادری، عماد الدین نے اسلام کے خلاف لکھا تو حالیؔ نے اس کا جواب لکھا ــــ عیسائیوں نے اسلام کے خلاف کتابیں لکھیں تو مسلمان عالم کب پیچھے رہتے میرا دامن بھر رہا تھا۔ پادری فنڈر، پادری آتھم، رام چندر، مرزا غلام محمد قادیانی اور سوامی دیانند سب مختلف الخیال میرے سائے میں آئے۔ دیانند کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" چاہے جس کے خلاف ہو میرے دامن میں ایک بے پناہ ادبی و تحقیقی گوہر ہے۔

یہی نہیں، دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ میرے جاں نثاروں میں سرشار، شرر، محمد علی طبیب، کشن پرشاد، عباس حسین

ہوش، مرزا محمد سعید اور جانے کتنے لوگ تھے جو منظر عام پر نہیں آئے مگر میرا دل ان کے تئیں محبت سے لبریز ہے۔
بعد میں صفی بلگرامی، سید احمد حیرت دہلوی — پیارے لال آشوب، عزیز مرزا نواب نصیر حسین خیال جیسے کئی دوسرے مندگان اردو جلوے دکھاتے رہے۔

جنگ اور میں : جب جب انسانی تہذیبیں آپس میں ٹکرائی ہیں اور کائنات خون کے آنسو روئی میرا دامن لالہ زار ہوا ہے جیسے عطر کی شیشی مہر بند رہے تو اس کا حسن و قبح معلوم نہیں ہوتا مگر جب وہ ٹوٹتی ہے ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے تو خوشبو چہار جانب میں پھیلتی ہے۔ ۱۹۱۴ء میں جب یورپ کی قومیں آمادۂ پیکار ہوئیں تو اس کا اثر مجھ پر میری سرزمین پر ہونا لازمی امر ہوا۔ اب تک دنیا کی بیشتر اقوام مادہ پرستی اور سب یہاں ہے کے نظریات سے متاثر ہو چکی تھیں میری زمین پر مگر ایک اور اثر ہوا۔
انگریزوں کے تئیں بیزاری کا رجحان روز بروز ترقی پانے لگا میری زمین بلاد ترکیہ کے معاملے میں تحریک ترک موالات کا مرکز بنی۔ اشتراکیت کا اثر، ایک نیا خیال۔ اللہ اللہ کسان مزدور بھی ایک پرچم تلے آنے کو تیار ہو گئے بیداری آزادی کی کروٹ، لیجئے میرے دامن میں جیسے اب بھی کمی تھی نہیں سیاست کی چیز بنی۔ ہندوستانی قوم پرستی کی سب سے بڑی مبلغ میں تھی۔ مغربیت کی سب سے بڑی مخالفت کرنے کے لیے مجھے اکسایا گیا ورنہ زبان ان باتوں سے ماورا ہوتی ہے۔ لیجئے خطابت ایک نیا موضوع، مولانا محمود الحسن

جہاں کو ناز ہے ہستی پر اپنی — میں اپنی نیستی پر مر رہا ہوں
ملا ہے جب سے لطفِ خاکساری — تنزل میں ترقی کر رہا ہوں
چارہ گر کو نظر نہیں آتا — داغ دل کیوں ابھر نہیں آتا
جو نظر آتا ہوں نہیں ہوں میں — اور جو کچھ ہوں نظر نہیں آتا
اس کی آنکھوں میں کچھ جگہ پاؤں — مجھے ایسا ہنر نہیں آتا
میرے ہمراہ ہے راہبر میرا — پھر بھی میں راہ پر نہیں آتا
نہ کر دو کوئی آرزو امجد — اس شجر میں ثمر نہیں آتا

سید احمد حسین نام، امجد تخلص، ۱۸۶۸ء ۱۲۸۵ھ میں پیدا ہوئے حیدرآباد دکن وطن ہے۔ والد صوفی سید رحیم علی بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ جن کا انتقال امجد کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ مکتب کی ابتدائی مذہبی تعلیم کے بعد مدرسہ نظامیہ حیدرآباد میں درس نظامیہ کا درس لیا۔ اور مولانا نادر الدین اور نواب آقا سید علی شوشتری جیسے عربی اور فارسی کے علماء کی صحبتوں میں ادبی مذاق اور بصیرت کی تشکیل ہوئی۔ ریاست حیدرآباد میں ۲۵ سال تک مددگار محاسب رہے۔ سادگی، تاثیر اور گداز امجد کے کلام کے خاص جوہر ہیں ۱۹۰۸ء میں رود موسیٰ کی طغیانی میں ماں، بیوی اور بچی نذر اجل ہوئے۔ اس واقعے نے امجد کی طبیعت کا رنگ ہی بدل ڈالا۔ اور وہ تصوف کی طرف راغب ہو گئے۔
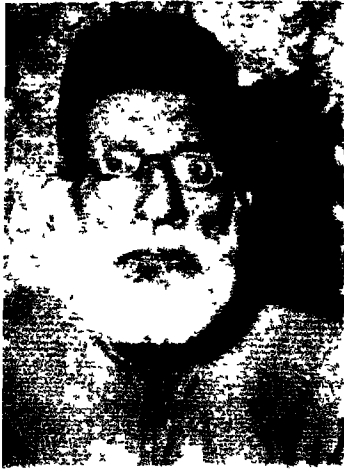
نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے ۔۔۔ وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد ۔۔۔ ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا

کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے

تماشا کامیاب آیا، تمنا بے قرار آئی

حسن سے اپنے وہ غافل تھا، میں اپنے عشق سے ۔۔۔ اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں ۔۔۔ ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

یہ بھی آدابِ محبت نے گوارا نہ کیا ۔۔۔ ان کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی جاتی

سید فضل الحسن نام، حسرت تخلص "امام المتغزلین" خطاب، سید اظہر حسن کے صاحبزادے ۱۸۷۵ء/۱۲۹۵ھ میں موہان ضلع اناؤ (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ جدِ اعلیٰ سید محمود نیشاپوری ہندوستان آئے اور موہان میں سکونت اختیار کی۔ حسرت کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔اے کیا۔ یہیں ان کی شاعری پروان چڑھی۔ مئی ۱۹۵۱ء/۱۳۷۱ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ مولانا حسرت کو شاعری میں تسلیم لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ تسلیم کا سلسلہ نسیم دہلوی کے توسط سے حکیم مومن خاں تک پہنچتا ہے لیکن حسرت پر اس سلسلہ کے علاوہ اور اساتذہ کا بھی اثر پڑا ہے۔ کہتے ہیں ؎

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن ۔۔۔ طبعِ حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

حسرت اگر ایک طرف معتدر سیاست دان تھے تو دوسری طرف اردو کے مایۂ ناز شاعر اور بالغ نظر نقاد۔ انہوں نے متقدمین و متاخرین شعرائے اردو کے کلام کا نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ ایک خاص ترتیب سے ان کے کلام کا انتخاب بھی شائع کیا۔ انہوں نے تمام عمر جو کچھ کہا غزل کی حدود کے اندر رہ کر کہا۔ وہ خصوصیت سے عاشقانہ، عارفانہ اور فلسفیانہ اشعار کہتے تھے۔ ان کے کلام میں داخلی رنگ پایا جاتا ہے جو دہلی کا طغرائے امتیاز ہے۔

دیوبند والے اور فرنگی محل والے مولانا عبدالباری مجھے اس مجمع میں گھسیٹ لائے۔ ابوالکلام، حسرت موہانی، ظفر علی اور محمد علی جیسے فرزندانِ ادب اور کشتگانِ اردو میرے چمن میں آبیاری کرنے آئے۔ کارل مارکس اور مغربیت کے خلاف عالمی تاثر دینے والے عالموں کے خیالات مجھ میں در آئے۔ جامعہ ملیہ قائم ہوا۔ میرا نیا گھر جہاں رہ کر مجھے سیاست کی رانی بننا تھا۔ ابوالکلام نے "الہلال" جاری کیا جس کے ذریعہ مجھے ہیوگو والٹیر، الیگزینڈر ڈوموزا روسو، گوئٹے اور چیخوف کی شکلیں

سرور جہان آبادی

یہ نسیم ٹھنڈی، ٹھنڈی، یہ ہوا کے سرد جھونکے
مجھے دے رہے ہیں لوری، دلِ بے قرار سو جا

محوِ سکوت ہیں، لبِ رنگیں، نوائے داغ
پھولوں میں اب ہے داغ کہ بوئے قبائے داغ

شب کہ وقفِ بالشِ تمکیں دلِ بے تاب تھا
عالمِ رؤیا میں، میں سرمستِ ذوقِ خواب تھا

صد چاک تیرے عشق میں جیبِ قبائے گل
دامن کی ہر کلی میں ہے بوئے وفائے گل

درگا سہائے نام، سرور تخلص ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے ایک مقتدر کائستھ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ والد کا نام حکیم پیارے لال تھا۔ تھوڑی سی عمر میں شہرت و ناموری کے آسمان پر چمکے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ مولوی کرامت حسین بہار سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ بعد میں بیان یزدانی کی شاگردی اختیار کی۔ شروع میں وحشت تخلص تھا۔ پھر سرور رکھ لیا۔ ۱۸۹۹ء میں ان کا کلام ادبی رسالوں میں شائع ہو کر مقبولِ عام ہونے لگا۔ سرور نہایت امنگ کے ساتھ اشعار میں اپنی خوش دلی کا ثبوت دے رہے تھے کہ دفعتاً ان کے اکلوتے بیٹے کا جسے اسکی ماں ایک سال کا چھوڑ کر مر چکی تھی، انتقال ہو گیا۔ اس حادثہ جانکاہ نے سرور کی طبیعت میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اسی وقت سے غم غلط کرنے کے لئے مے نوشی اختیار کی اور آخر میں اس قدر پینے لگے کہ کئی کئی روز تک مدہوش رہتے تھے۔ آخر ۱۹۱۰ء میں بعمر ۳۷ سال انتقال کیا۔

قومی نظریہ ابھر آیا مگر ہندو مسلم علیحدگی کے نظریات قائم رہے۔ کبھی ایمان مجھے روکے تھا کبھی کفر مجھے کھینچے تھا۔ خواجہ کمال الدینؒ مولانا ثناء اللہ، جماعتِ احمدیہ کے مولوی محمد علی اور ابوالکلام نے میرا دامن تھاما ہوا تھا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کو حکیم الامت ہونا تھا۔ دین اسلام کی اہمیت واضح کرنے کے لئے انہیں میری ضرورت تھی۔ قرآن کریم کی تعلیمات میرے ذریعہ عام ہوتی تھیں۔ حال کو ماضی کے آئینے میں دیکھنے کے لئے میرے روئے زیبا کی ضرورت تھی۔ شبلی، ندوی، عبدالماجد دریابادی، عبدالباری مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا ابوالکلام جیسے میرے عظیم پرستاروں نے مجھے نیا طور، نیا وقار دینے کی کامیاب مساعی کیں۔ میں اسلام کی روح بن گئی۔ اس سرزمین میں، عالمانہ متانت کی پیکر، اسلام کی رفعتوں کی علمبردار، اخلاق و فلسفہ کی رو رواں بنی مگر یہیں سے تغیر رونما ہوا۔ میری اسلامی عظمت اور رفعت کا کچھ نے دوسرا مطلب لیا۔ میرا دامن اگرچہ سب کے لئے آج بھی وا ہے مگر مجھے مسلمانوں کی زبان سمجھا جانے لگا۔ میں کبھی کسی ایک کی نہیں رہی۔ آج بھی یہ دعویٰ برقرار ہے چاہے میرے اور فارسی بیگم کے یکساں پرستار اقبال

ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور اساتذہ سے پائی۔ مرزا صاحب کی زندگی دہلی میں گذری۔ استاد ذوق کے بعد بہادر شاہ ظفر نے انہی کو اپنا کلام دکھایا۔ ۱۸۶۹ء / ۱۲۸۶ھ میں دہلی میں وفات پائی۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے اردو ڈائجسٹ کا غالب نمبر)

فارغ بخاری، جمیل ملک، جگن ناتھ آزاد، نریش کمار شاد، اختر الایمان، شاذ تمکنت، شاد عارفی، راجہ مہدی علی خاں، مخمور جالندھری، مجید لاہوری، مخمور علیگ، وزیر آغا، مصطفیٰ زیدی، قیوم نظر، یوسف ظفر، قتیل شفائی، ابن انشا، روش صدیقی، انور صابری، بسمل سعیدی، مخمور سعیدی، کمار پاشی، سلام مچھلی شہری، کرشن موہن، مہیش چندر نقش

اور اسے کچھ ہو نام:
تشنہ مراد آبادی، تسکین اعظمی، مجروح سلطان پوری،
شاعر صدیقی، جمیل الدین عالی، شوکت تھانوی، معین احسن
جذبی، [illegible] شاہجہاں پوری، عبدالحمید عدم، ماہر القادری —
سردار جعفری، مجروح [illegible]، علامہ [illegible] تاباں، [illegible] نگاہ
[illegible] آنند نرائن ملا، مہندر سنگھ
بیدی سحر، [illegible] نظامی، ساحر ہوشیارپوری، محسن زیدی
[illegible]، عالم فتحپوری، مسرور واحدی، سیماب
[illegible]، شوق کھوپالی، کیف کھوپالی، واجد
[illegible] آبادی، اختر جمشید، شاہد
[illegible] فہرست

ہے کہ طولِ شبِ فراق سے بھی زیادہ طویل ثابت ہو۔ ان میں
اُس دور کے عاشقانِ اردو کے نام شامل نہیں ہیں۔ جب
علاقائیت زوروں پر تھی۔ جیسے سیماب، سائل، کیفی، مخمور
وغیرہ۔ ان استادوں نے بھی گراں مایہ خدمات انجام دی
ہیں۔ ہائے یہ لوگ! صاحبِ دل لوگ جن میں کوئی غزل گو
ہے کوئی سب کچھ کہتا ہے، کوئی ترقی پسند ہے تو کوئی قدامت
پسند (ترقی پسند کہنے کو جی نہیں چاہتا۔)

میں اور طنز و مزاح :- گلابی اردو!۔
ملا رموزی، ہنستے ہنستے گلنار ہو جاتی ہوں۔ اس مشینی دور
میں تبسم کتنی گرانمایہ شے ہے مگر بہ حال عنقا ہیں ہے۔ میرے

سیماب اکبرآبادی

باقی ہے فنا کے بعد بھی وہ سیماب
جس کا دنیا میں نام باقی رہ جائے

جب تک جسم الفت کا عنصر ملا ہوگا
انسان کے پہلو میں دل بن نہ سکا ہوگا

کبھی پھول بن کر کبھی اشک بن کر
ہو زینتِ دامن و آستیں تم

مرا دل ہے ترے جلووں کی خلوت میں نہ سمجھا تھا
حقیقت یہ ہے خود اپنی حقیقت میں نہ سمجھا تھا

عاشق حسین نام، سیماب تخلص ۱۸۸۰ء میں اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ مولوی محمد حسین صدیقی کے صاحبزادے ہیں۔ عربی ادب، اصول، منطق اور فارسی پڑھ کر انگریزی شروع کی۔ ایف۔ اے کے آخری سال میں تھے کہ والد نے انتقال کیا اور سلسلۂ تعلیم بند کرنا پڑا۔ کچھ عرصہ ریلوے کے محکمہ میں ملازمت کی۔ پھر فطری ذوق شعری اور خدمت زبان و ادب کے شوق میں ملازمت سے مستعفی ہو کر آگرہ چلے گئے اور ۱۹۲۱ء میں "قصر الادب" کی بنیاد رکھی۔ پیمانہ، ثریا، شاعر اور [illegible] تاج کے ذریعہ اردو ادب کی خدمت کی۔ فن شعر میں داغ سے تلمذ تھا۔ تلامذہ کا حلقہ بے حد وسیع ہے۔ مولانا ۱۹۴۸ء میں آگرہ سے کراچی گئے اور ۱۹۵۱ء میں انتقال کیا۔

برج نرائن چکبست

دل دہلتے نہیں زنداں میں گرفتاروں کے
بیڑیاں ڈھونڈتے ہیں پاؤں وفاداروں کے

چمکتا ہے شہیدوں کا لہو قدرت کے پردے میں
شفق کا حسن کیا ہے پھول کی رنگیں قبا کیا ہے؟

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اتر جانا

یہ رنگِ شفق ہے کہ ہو اہلِ وفا کا
کچھ داغ نظر آتے ہیں دامانِ سحر میں

لئے دریا نے موتی، گُل تجر نے لعل پتھر نے   خریدا ہم نے سودا، دردِ الفت کا بشر ہو کر

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء (۱۳۰۰ھ) میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ آبا و اجداد کشمیر سے آئے تھے تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں بی اے کیا، پھر قانون کے امتحان میں کامیاب ہو کر لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ بچپن سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ ۱۹۲۶ء (۱۳۴۵ھ) میں ایک مقدمہ کی پیروی میں رائے بریلی گئے تھے، یکایک فالج میں مبتلا ہوئے اور اسٹیشن ہی پر وفات پا گئے۔ قیصر لکھنوی نے انہی کے مصرع سے تاریخ نکالی: "موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا" اردو ادب کو ان کی ذات سے بڑی امیدیں تھیں عجب اتفاق ہے کہ خود چکبست ایک شعر میں اپنی جواں مرگی کا افسوس کر گئے ہیں ؎

لے چلی بزم سے کس وقت مجھے مرگِ شباب   لب تک آیا بھی نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے

چکبست کسی کے شاگرد نہیں تھے لیکن اساتذۂ قدیم میں سے میر انیس، آتش اور غالب کا اثر ان کے کلام میں نمایاں ہے

پاس سب کچھ ہے، فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، مشتاق یوسفی، محفوظ علی، سالک چراغ حسن حسرت یعنی سندباد جہازی، امتیاز علی تاج، چچا چھکن والے، غلام احمد فرقت، فکر تونسوی، شفیق الرحمٰن جیسے کئی اور ہیں جو ہنسی ہنسی میں باتوں کی برچھیاں چلاتے ہیں لوگ زخمی ہوتے ہیں پھر ہنستے ہیں۔ عجب انداز ہیں۔

میرے ناول میرے افسانے: کوئی نہ سمجھے کہ میرے پاس ناول اور افسانے نہیں ہیں۔ ہندی بہن — بنگالی بہن، ملیالم، تامل، اڑیا، پنجابی تو خیر کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ چاہوں تو انگریزی اور فرانسیسی اور ڈچ، اطالوی یا جو بھی سامنے آئے، آنکھ ملا کر بات کر سکتی ہوں۔ میرے پرستار پریم چند، یلدرم، سلطان حیدر جوش، نیاز فتحپوری، پنڈت سدرشن اور پھر علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی، حامد اللہ افسر، ل احمد، خواجہ حسن نظامی، ایم اسلم، قیسی رامپوری، شاہد احمد، مسز عبدالقادر، فضل حق، بلقیس جہاں، عظیم بیگ چغتائی، حجاب امتیاز علی۔

اور پھر ایک اور بڑی کھیپ: سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر، کرشن چندر، بیدی، عصمت —

[illegible] یکتائی دل نے تیرے
اک تڑپ میں مرے دل کا فاصلہ جاتا رہا

[illegible] گل و گلشن [illegible] رہا
میں قفس میں بھی رہا یوں کہ نشیمن میں رہا

[illegible] دیا بہت طول
[illegible] اس سے [illegible] ترس گئیں

[illegible] درد اٹھا [illegible]
مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

[illegible] پردۂ قیامت ہوں
گر یقیں نہ ہو تو دیکھ لو اٹھا کے مجھے

آتے آتے آئے گا ان کو خیال
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

جلیل حسن نام، جلیل تخلص، جلیل القدر فصاحت جنگ خطاب ۱۸۶۹ء (۱۲۸۶ھ) میں اپنے وطن مانکپور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی حافظ عبدالکریم تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فارسی و عربی کی استعداد لکھنؤ میں بہم پہنچائی۔ بیس برس کی عمر میں امیر مینائی کے شاگرد ہوئے اور زیادہ تر ان کے ساتھ رہے۔ ۱۹۰۰ء میں اپنے استاد کے ہمراہ حیدرآباد دکن گئے۔ ۱۹۰۸ء میں میر محبوب علی خاں [illegible] نے پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا اور داغ مرحوم کی جگہ اپنی استادی کا شرف بخشا۔ میر عثمان علی خاں نے بھی انہی کو اپنا کلام دکھایا۔ کاروانِ امیر کا یہ آخری مسافر عمر کی ۷۷ منزلیں طے کرکے آخر ۱۹۴۶ء (۱۳۶۶ھ) میں دوسری دنیا کو سدھارا۔ اور حیدرآباد دکن میں سپردِ خاک ہوا۔

[illegible]، اختر رائے پوری، [illegible] صادق الخیری، احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی، اختر انصاری، سہیل عظیم آبادی، حسن عسکری، [illegible]، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر۔ شوکت صدیقی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ممتاز شیریں۔ بلونت سنگھ، انور عظیم، جیلانی بانو، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، مہندر ناتھ، [illegible] صدیقی، ابراہیم جلیس، رام لعل، کشمیری لال ذاکر، ایم۔ راجندر، چمن لال کاوش، موہن یاور، حامدی کاشمیری، کرشن گوپال عابد، دویندر سنگھ، سدرشن بالی— رتن سنگھ، رضوان احمد صدیقی، شاہد پرویز، عارف مارہروی، ایس مرزا، اختر عادل روپ، ابن سعید، شکیل جمالی، زکی انور، [illegible] علی سے لے کر اے۔ آر۔ خاتون، نادرہ خاتون، رضیہ بٹ، لطیف گل، ضیا عظیم آبادی، وحشی مارہروی، عادل رشید، گلشن نندا جیسے قلم کے دھنی میرے جاں نثار میرے دامن میں افسانوں اور ناولوں کے ذخیرے جمع کرتے آرہے ہیں۔ یہ مذکورہ بالا چند نام ہیں۔ اصل فہرست اس قدر طویل ہے کہ ہما کے صفحات ناکافی ہوں۔

میرے نقاد اور محقق۔ فنکار فن کی تخلیق کرتا ہے۔ خونِ جگر سے کارِ تزئینِ فن کرتا ہے۔ ناقد حسن و قبح پر نظر رکھتا ہے، یہ فن سے بھی زیادہ ذمہ داری اور لیاقت کا کام ہے۔ نقاد ذاتیات اور سطحیت سے بالاتر ہوتا ہے۔ ہر اچھی زبان کے پاس تاریخ، فلسفہ، روحانیت، اخلاقیات جیسے ادبی موضوعات کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ مجھ میں یہ سب

کچھ ہے۔ ہر ترقی پسند ادب میں نقاد اور محققین کو ایک خاص درجہ حاصل ہوتا ہے۔ میرے نگار خانے میں پورا گروہ ہے جس کی باریک بینی نے مجھے لطافت گیرائی اور شوخ

بخشا ہے۔ مجنوں گورکھپوری صلاح الدین احمد، احتشام حسین آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، مالک رام، علی سردار جعفری سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، وزیر آغا، علی جواد زیدی، وقار عظیم

حسن فاروقی، ڈاکٹر محمد حسن، اسلوب انصاری، ڈاکٹر
عبادت بریلوی، ڈاکٹر ابواللیث، ڈاکٹر یوسف حسین، پروفیسر
گیان چند، ... حمید ... شارب ردولوی، نثار احمد فاروقی،
... ڈاکٹر ... مصطفیٰ، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر
... ڈاکٹر ... رشا ... جیسے جید اور معتبر ناقد و محقق
میرے آس پاس ... میں مصروف تھے اور ہیں۔ مگر یہ بات
بہت افسوس کی ہے کہ آج کا ناقد مکمل طور سے غیر جانب
دار نہیں ... ہو گیا ہے مجھے تو سب کو برداشت کرنا
ہوتا ہے۔

آپ نہ مانیں گے:۔ میرے بہت سے پرستار
بہت سی باتوں کی نفی کرتے ہیں اگرچہ وہ حقیقت ہوتی
ہے آپ مانیں تو بتاؤں کہ یہ جو قتل و غارت گری، جرائم
اور جھوٹ کی ... داستانیں اور ... ادب لکھتے ہیں۔

کسی نہ کسی طرح میری خدمت عزت افزائی کرتے ہیں۔ یہ بھی میرے
عشاق ہیں مگر نہ تو ظفر عمر نیلی چھتری والے کو کسی نے
مانا اور نہ منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجموں کو سراہا اگرچہ
معمولی استعداد والے عوام تک میری حلاوت پہنچانے میں
ان کا بھی تعاون ہے۔ یہ بھی ماننا چاہئے اس دور میں
حب شخصیت پسندی کے اصنام ٹوٹ چکے ہیں تو مجھے
ابن صفی، اکرم الٰہ آبادی، ظفر ورجانسی، عارف مارہروی
انجم عرشی، جمیل انجم جیسے اچھے مصنفین کو تسلیم کرنا ہوگا۔
ان کی تخلیقات ادبی علاماؤں کی تخلیقات سے زیادہ
عوامی ہیں۔ انہیں تو زبان کی ترویج اور بقا میں حصہ
لینے والوں میں اگلی صف میں جگہ ملنی چاہئے۔

میری صحافت:۔ انگریز اپنے ساتھ چھاپہ خانے کا تحفہ

رضا علی وحشت

پھر کرے تازہ کشش پیدا حرم میرے لئے
محو آرائش ہے پھر بیت الصنم میرے لئے

خود بخود محسوس کی میں نے بھی لیں تاب ضبط
جب گراں ہونے لگا بار الم میرے لئے

تیرے ہی ذوق جلوہ سے وا ہو گئی ہے چشم
یاں ورنہ امتیاز وجود و عدم نہ تھا

رضا علی نام، وحشت تخلص ۱۸۸۲ء / ۱۳۱۲ھ میں بمقام کلکتہ پیدا ہوئے،
والد کا نام مولوی شمشاد علی۔ دادا حکیم غالب علی، غدر ۱۸۵۷ء میں دہلی
سے کلکتہ چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ وحشت کو شعر و شاعری سے فطری ذوق تھا۔ فصیح الملک داغ دہلوی کے
شاگرد مولوی عبدالغفور نساخ کے بیٹے مولوی ابوالقاسم سے تلمذ کیا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ کلکتہ
میں ملازم ہوئے۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج کلکتہ میں اردو کے پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء میں خان بہادر کا خطاب ملا اور ۱۹۳۶ء
میں پنشن ہو گئی۔ تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے بعد کلکتہ سے ڈھاکہ چلے گئے۔

ثاقب لکھنوی

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا' آواز نہیں آتی
برگشتہ ہوئی دنیا رسم و رہِ الفت سے
اِک میری طبیعت ہے جو راز نہیں آتی

میرزا ذاکر حسین قزلباش نام ثاقب تخلص۔ وطن لکھنؤ۔ پیدائش ۱۸۶۹ء۔ جدِ امجد حاجی علی قزلباش شاہ طہماسپ صفوی (بادشاہ ایران) کے خاص امراء میں سے تھے۔ دو سو برس کا زمانہ گذرا کہ ہندوستان آگئے۔ والد کا نام آغا محمد عسکری قزلباش جو مرزا محمد حسین کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم قدیم طریق پر ہوئی اور شاعری میں لکھنؤ اسکول میں تعلیم پائی جعفی امروہوی سے تلمذ حاصل کیا۔ اب سے پچیس برس قبل آپ کی شاعری کا چرچا تمام ہندوستان میں ہو چکا تھا۔ طرزِ بیان۔ زبان کی ندرت اور پاکیزگی آپ کے کلام کے خاص جوہر ہیں واردات حسن و عشق کو لطیف اشاروں میں بیان کرنا آپ کا حصہ ہے۔ آپ کا دیوان راجہ صاحب محمود آباد نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

لائے تھے فرنگی تسلط کے ساتھ ہی اخبارات و رسائل وجود میں آگئے تھے۔ دلی اخبار، دبدبۂ سکندری، اودھ اخبار کے ساتھ ہی اس شعبے میں سرعت سے ترقی ہوئی۔

اب تو اس امر پر فخر کرتی ہوں کہ میری صحافت دنیا میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ جسے یقین نہ آئے تو اخبارات کی سرکاری فہرست اٹھا کر دیکھ لے۔ (دل میں کچھ چبھ کر ٹوٹ گیا ہے۔) اگرچہ میں اب راندۂ درگاہ ہوں مگر پھر بھی بلندیا پر ہوں۔ روزنامے، ہفت روزے، ماہنامے، ڈائجسٹ سہ ماہی، سالانہ ہر طرح کے اخبارات و رسائل جدید ترین طباعت سے آراستہ و پیراستہ دلہنوں کی طرح سجے سنورے جریدے، نظم و نثر، افسانوں، داستانوں، مضامین اور انشائیوں سے مرصع صحیفے میری پیشانی میں قبولیتِ عامہ کا نور بھر رہے ہیں۔ مقبول ترین عوامی جریدوں میں ہما، ہدیٰ، شبستاں، شمع، بیسویں صدی، روبی، آجکل ابی جرائد میں شب خون، کتاب، صبا، گگن، واقعات ہفت روزوں میں بلٹز، صدقِ جدید، اردو زبان، حیات اور روزناموں میں ملاپ، پرتاپ، الجمعیۃ، سیاست جدید، آزاد ہند، انقلاب آبشار، ہند سماچار، سویرا، تیج اور اردو ٹائمز کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اس جگہ بچارے پرتاپ پر ہنسی آرہی ہے وہ میں ہی ہوں جس نے اسے قبولیت کے مدارج عطا کئے ہیں ستم ظریف میری زبان میں مجھے برا کہتا ہے۔ ایسے بھی لوگ دیکھے تھے مجھے، جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دیں گے کب سوچا تھا۔ یہ تو ہوئی ہندوستان کی کچھ صحافت۔

ادھر پاکستان میں جنگ، انجام، حریت، نوائے وقت جیسے روزنامے اور نقوش، نقش، سیپ، ہم قلم، ماہِ نو، الشجاع، سیارہ ڈائجسٹ، اردو ڈائجسٹ، عالمی ڈائجسٹ جیسے اردو کے عظیم جرائد میری عزت میں چار چاند لگاتے ہیں۔ پاکستان !

جسے میں نے تسلیم نہیں کیا ہے۔

میں نے تقسیم اور پاکستان کا ذکر جان کر چھوڑ دیا ہے کیونکہ میں اردو ہوں۔ برصغیر کے وسیع آنگن میں پلی بڑھی ہوں میں سب جانتی ہوں ملک کے دو ٹکڑے ہو سکتے ہیں مگر میں تقسیم نہیں ہو سکتی ہواؤں اور خوشبو کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔

مگر اب بات نہیں بنتی ہے۔ ایک دل اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے کہ کوئی پاکستان بھی ہے جہاں دور داں سے بے حسی ہے۔ مدتی ہے جہاں کوئی اور حکومت کرتا ہے۔ میں تو اس قدر جانتی ہوں کہ آدمی آدمی پر حکومت کر سکتا ہے مگر۔ ماں پر کوئی حکومت نہیں کر سکتا کیونکہ

ماں ۔ ہو تو حساسات گونگے ہو جائیں۔
خیالات مفلوج ہو جائیں۔
دلوں میں زنگ لگ جائے۔
قلم دم توڑ دے۔
مذاہب لاچار ہو جائیں۔
عقائد کے چراغ گل ہو جائیں
سیاست لنگڑی ہو جائے۔
فلسفے خودکشی کر لیں۔

مگر پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ میری ماں، میرا وطن ارباب سیاست بانٹ چکے ہیں۔ میں اپنی ہٹ دھرمی سے یہاں آباد رہی ہوں جبکہ کب کا مجھے دیس نکالا مل چکا ہے۔ میرے عاشقوں کا چولہ بدل کر، میرے نام کے نعرے لگا کر میرے گندم نما جو فروش دوستوں اور علمبرداروں نے، میرے نام کی تجارت کرنے والے بیوپاریوں نے میرے لئے جو پاکستان بنایا تھا وہاں میرا کیسا استقبال ہوا تھا۔ میرے ساتھ وہاں کیسا برتاؤ ہو رہا ہے۔ یہ میں ہی جانتی ہوں۔ پنجابی مجھے نہیں مانتے، سندھی اور بلوچی مجھے نہیں مانتے جو عاشق ہیں وہ مہاجر ہیں خانماں برباد۔

اور یہ بات کہنے کی نہیں ہے ۔ میں اردو ہوں، پراکرت اور سنسکرت کی بیٹی ہوں۔ گنگا جمنا کے میدانوں میں میری پرورش ہوئی، رشیوں، منیوں، صوفیوں بادشاہوں اور عالموں، پنڈتوں نے مجھے گودیوں میں کھلایا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
اٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

محمد اقبال نام، اقبال تخلص ۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ میں سیالکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے اقبال کو شمس العلماء مولوی سید میر حسن اور پروفیسر آرنلڈ جیسے شفیق استاد ملے، جن کے فیضِ تربیت میں ان کی فطری صلاحیتوں اور ذوقِ علمی کی نشوونما ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں یورپ گئے اور وہاں سے پی ایچ۔ ڈی اور بیرسٹری کی سندیں حاصل کیں۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ابتداً ارشد گورگانی سے مشورۂ سخن کیا۔ بعد میں مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی بہت جلد ان کے کلام کا آوازہ بلند ہو گیا۔ دنیا نے "شاعر

مشرق "ترجمان حقیقت" اور "علامہ" کے خطابات سے نوازا ۱۹۲۲ء میں "سر" کا خطاب ملا اور ۱۹۳۸ء میں لاہور میں وفات پائی۔

اقبال کی عظیم المرتبت شخصیت کی وسعتوں کا سمیٹنا بڑا مشکل کام ہے وہ ایک بلند پایہ مفکر اور فلسفی بھی تھے تو اردو فارسی کے قادر الکلام اور بانغ نظر شاعر بھی

میری مانگ میں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی سب نے لفظوں اور خیالوں کے ستاروں کی افشاں بھری ہے۔ میرا سہاگ امر ہے، میری عظمت مسلمہ ہے، میرا حسن سدا بہار ہے، نہیں

کچھ نہ کہنا ہی بہتر سمجھتی ہوں۔ زبان گنگ ہے اور حواس باختہ ہیں
دل میں آگ سی لگی ہے۔
کیسے کہوں، کہتی ہوں تو دوسرے ہنسیں گے۔

کیسے کہوں کہ اتنی عظمتوں والی حسینہ، اردو کا سہاگ اتر چکا ہے۔ یہ رنگا رنگ گلستان اردو اب خزاں رسیدہ ہو چکا ہے۔ شعروں اور شیرینی کی ذائقہ طاقت ور ہو چکی ہے۔ وہ محبت کی فضا کو اپنی آتشیں [illegible] سے [illegible] کر رہے ہیں۔ میری عظمتوں اور تقدس کے پرستار، میرے [illegible] پوجا کرنے والے مجھے اپنے گھر کے آنگن سے نکال کر دشت میں [illegible] وفاداروں نے مصلحت کی ردائیں اوڑھ لی ہیں۔ میرے پجاری اپنی دیوی کی پاکیزگی اور تقدس کا سودا معاد کے بازار میں کیے دیتے ہیں۔

ہاں!

میں دوراہے پر کھڑی ہوں!

تعصب کے چوراہے پر، میرے سر سے تاروں بھری اوڑھنی نوچی جا چکی ہے۔ میرے نور افشاں چہرے پر سیاہی پوت دی گئی ہے۔ پہچانو! پہچانو مجھے؟ کہ میں مٹی جاتی ہوں۔ یگانگت مٹ رہی ہے، یکجہتی مٹ رہی ہے، شیرینی مٹ رہی ہے۔ محبت ختم ہو رہی ہے۔ روایتیں مٹ رہی ہیں۔ میرے دوستدار دشمن بن گئے۔ مسلمانوں کی زبان قرار دیدی گئی ہوں۔ پاکستان میں بھی لٹ رہی ہوں جس کے گھر والے اسے دھتکاریں تو پھر تو غیر ہے۔

نہیں کسی نے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی محافظ دستگیر آیا۔ کسی نے بھوک ہڑتال کی، کسی نے چار لاکھ دستخطوں کے ساتھ عرضداشت کی مگر بے سود اردو کو مسلمانوں کے علاوہ کسی اور کی زبان سمجھنے والا ایک بھی رہنما اب تک نہ آیا۔ میری دکانیں سجائے، کتابیں فروخت کرنے والے اخبار

اختر شیرانی

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے

مجھے مے خانہ تھراتا ہوا محسوس ہوتا ہے
وہ میرے سامنے شرما کے جب پیمانہ رکھتے ہیں

ہے جام خالی تو پھیکی ہے چاندنی کیسی
یہ سیلِ نور ستم ہے شراب ہو نہ سکا

چمن کی ہر کلی سے نور کی مستی چھلکتی ہے
در و دیوار سے مہتاب کی شوخی جھلکتی ہے

نام محمد داؤد خاں، تاریخی نام مسعود خسرو۔ اختر شیرانی کے نام سے دنیائے شاعری میں مشہور ہیں۔ ۱۹۰۵ء/۱۳۲۲ھ میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۸ء/۱۳۶۸ھ میں بمقام لاہور انتقال ہوا۔ والد کا نام حافظ محمود خاں شیرانی، بزرگ صوبہ سرحد سے آئے تھے۔ دادا مولوی محمد اسمٰعیل خاں ٹونک کے نواب محمد علی خاں کے مختار تھے۔ ابتدائی تعلیم ٹونک میں پائی۔ مزید تعلیم کے لئے لاہور گئے کیونکہ ان کے والد وہاں پروفیسر تھے۔ اختر کا بیشتر زمانہ لاہور ہی میں گذرا۔ یہیں سے بہارستان، خیالستان اور رومان ادبی رسائل نکالے۔ ۱۹۳۴ء میں اردو کی مشہور لغت "جامع اللغات" کی ادارت کی۔

سجاد حیدر یلدرم

۱۸۸۰ء میں ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ سے بی اے پاس کیا۔ پھر ترکی میں سفیر بن کر گئے اور وہیں ترکی قلم 'یلدرم' (بمعنی بجلی) رکھا اور ترکی زبان کے چند شہ پاروں کو اردو میں منتقل کیا۔ واپسی پر یوپی میں ڈپٹی کلکٹر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے۔ ۱۹۴۲ء میں انتقال ہوا۔ سجاد حیدر یلدرم نے ایک خاص طرز تحریر کی بنیاد ڈالی اور اردو ادب میں ایک نیا تصور، ایک نیا اسلوب اور ایک نئی زندگی منتقل کی۔ انکے مضامین ہمیشہ اپنے رنگ میں نئے اور خیال میں اچھوتے ہوتے تھے۔ اردو میں انشائے لطیف کے ماہر تھے۔ انکی انشا کی خصوصیت رعنائیِ خیال، لطافتِ بیان، شگفتگی اور ندرت کے ساتھ ایک ایسا انداز ہے جسے نثر میں شاعری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یلدرم کے افسانے ادبیت کے شاہکار ہیں اور ان کے قلم نے افکارِ لطیف کی ایک دنیا آباد کی ہے۔ سید صاحب کی یاد کے ساتھ یہ نظم ہمیشہ وابستہ رہےگی

ماتھے پہ بندی　　آنکھ میں جادو
ہونٹوں کی بجلی　　گرتی تھی ہر سُو
چال لچکتی　　بات لہکتی
جیسے کسی نے　　پی ہو دارُو
انکھڑیاں ایسی　　جن میں تھے رقصاں
لمحہ میں رادھا　　لمحہ میں راہُو
ایسی پھڑک تھی　　خلق تھی حیراں
ریل پہ آیا　　کہاں سے آہُو

فروخت کر کے محل بنانے والے، میری نظمیں، کہانیاں، ناول بیچکر دولت کے انبار لگانے والے تاجر، اردو کی ترقی کا دم بھرنے والی انجمنیں اور وہ وظیفہ خوار خادمانِ زبان و ادب، وہ ادب کے جدی وارث، زبان کی قبر کے مجاور، وہ شہرت کے لئے میری قربانی کرنے والے ریاکار، اُف ہر طرف میرے مٹانے کے درپے گروہ در گروہ نظر آتے ہیں۔ ہر راہنما، ہر صاحبِ اقتدار مجھ سے ہمدردی جتاتا ہے۔ اردو کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہے مگر کچھ ہوتا نہیں میرے بچھ پرستاروں نے وزیر اعظم کے پاس عرضداشت گزارنے گئے حات فرما دیا؟ "میں کچھ نہیں کر سکتی" (بمبئی میں کانفرنس کے موقع پر اندرا جی کی تقریر) اب کون کرے۔ کچھ نہ ہوگا۔ ثانوی تعلیم کا درجہ بھی دیا جائے گا۔ پھر بھی موجودہ بالغ نسل کے بعد جب نئی پود آئے گی تب مجھے کوئی نہیں پہچانے گا۔ پھر میں ہمیشہ کے لئے لائبریریوں کے طاقِ نسیاں میں

مدہو جاؤں گی۔
نہیں ہرگز نہیں۔ میں اردو ہوں، میں عبرانی اور سنسکرت اور لاطینی کی طرح محدود نہیں ہوں۔ میں لامحدود ہوں۔ بے کراں ہوں، میں زندہ رہوں گی۔ برصغیر سے تو بہت تک مجھے دور کیا جاسکے گا۔ صرف میرا حلیہ بگاڑنے کی سعی کی جائے گی یہ کوشش آج بھی ہو رہی ہے۔ فلموں میں میری جلوہ فرمائی ہے مگر نام ہندی کا لکھا جاتا ہے کوئی اور بیٹھک میرے الفاظ سے ہندی لکھتے ہیں۔ میرے استعارے، میری ترکیبیں، میری شوخی، میری بلاغت سے اپنی ہندی کی عبارت کو چمکاتے ہیں۔ خود میرے اپنے میرے چہرے پر سیاہی پوتنا چاہتے ہیں، میری ایک چاہنے والی خاتون، بھلا سا نام ہے۔ ارے ہاں! عصمت۔ پچھلے دنوں خفقان جو اٹھا تو ہندی رسم الخط میں اردو لکھنے پڑھنے کی حماقت آمیز تجویز پیش کر بیٹھیں۔ شاید عصمت جانتی ہیں کہ مستقبل میں کیا ہونے کو ہے۔ کوئی مجھے انگریزی میں لکھنے کی صلاح دیتا ہے ارے احمقو! میرا تلفظ ہی تو میرا سرمایہ ہے۔ ش۔ ق کہاں سے لاؤ گے، حقیقت کو حکیکت بول کر کیسے لگو گے۔ ذرا ایمان سے بتانا؟۔

تری ہزار برتری، تری ہزار مصلحت
میری ہر اک شکست میں، میرے ہر اک قصور میں

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے، خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں، وہیں صیاد ہوتا ہے

ہاں سینہ گلوں کی طرح کر چاک
دے مر کے ثبوت، زندگی کا

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا   جو غم ہوا، اسے غمِ جاناں بنا دیا

اصغر حسین نام، اصغر تخلص، ۱۸۸۴ء / ۱۳۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد ضلع گورکھپور کے رہنے والے تھے لیکن ان کے والد منشی تفضل حسین قانون گو نے ملازمت کے ساتھ سکونت بھی گونڈہ میں اختیار کر لی تھی۔ اس لئے اصغر گونڈوی کہلائے۔ شاعری میں پہلے وحد بلگرامی سے اصلاح لیتے رہے، پھر چند غزلیں تسلیم لکھنوی کو دکھائیں چونکہ شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت کا شرف حاصل تھا اس لئے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ حکیمانہ ژرف نگاہی میں بادۂ تصوف کی سرمستی نے مل کر ان کے کلام کو اور غزل گو شعراء کے کلام سے علیحدہ کر دیا ہے۔ ان کی شاعری میں جدت کے ساتھ ساتھ درد و اثر بھی پایا جاتا ہے۔ اصغر ان مبارک ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے غزل کی شاعری میں انقلاب پیدا کیا۔ ۱۹۳۶ء / ۱۳۵۵ھ میں الٰہ آباد میں وفات پائی۔

مرے درد میں یہ خلش کہاں، مرے سوز میں یہ تپش کہاں
کسی اور ہی کی پکار ہے، مری زندگی کی صدا نہیں

اے چارہ ساز حالتِ دردِ نہاں نہ پوچھ
اِک راز ہے، جو کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم

گلشن پرست ہوں، مجھے گُل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں مَیں

کیا آ گیا خیال، دلِ بے قرار میں
خود آشیاں کو آگ لگا دی بہار میں

سمجھائے کون؟ بلبلِ غفلت شعار کو — محدود کر لیا ہے، چمن تک بہار کو

علی سکندر نام، جگرؔ تخلص "رئیس المتغزلین" خطاب، ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام علی نظر تھا۔ اور نظرؔ تخلص کرتے تھے۔ مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع، دہلی کے باشندے اور شاہجہاں کے استاد تھے۔ عتابِ شاہی کی وجہ سے ترکِ وطن کر کے مراد آباد چلے گئے۔ جگرؔ نے میٹرک تک انگریزی پڑھی تھی۔ شاعری کا ذوق اسلاف سے ورثہ میں ملا تھا۔ داغؔ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔

جگرؔ ایک مکمل غزل گو شاعر تھے۔ وہی کہتے تھے جو محسوس کرتے تھے۔ وارداتِ حسن و عشق میں ڈوب جاتے اور کیف وارفتگی اور بے خودی کی لہروں میں سننے والوں کو بھی بہالے جاتے۔ جگرؔ کی شاعری "قال" نہیں سراپا "حال" ہے۔ اور ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت سادگی اور روانی ہے۔ غزل کی جدید شاعری میں جن زبردست شخصیتوں نے انقلاب پیدا کیا ہے، ان میں جگرؔ بہت نمایاں ہیں۔

داستانِ غم طویل ہے۔

ہے کوئی جو میرے اجڑے ہوئے روپ میں ایک بار بہاریں بھر دے!۔ ارے غالبؔ کی صدیاں منانے والو! لاکھوں کی لاگت سے نام و نمود کے ذرائع تلاش کرنے والو! تحقیق اور تنقید میں آمادۂ پیکار مفکرو! دانشورو!۔ فاقہ کش ادیبو! شاعرو! تمہاری عظمتوں کی بلند عمارت ڈھ رہی ہے تم اردو ادب کی شاخوں اور ٹہنیوں سے لپٹے ہوئے ہو اور درخت کی جڑ کٹی جا رہی ہے؟۔ سوچو! غور کرو۔ کچھ کرو ـــــ نہیں تو ـ

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے اردو زباں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

اردو نمبر

تبرکات

غیر مطبوعہ — میر حسن دہلوی (مرحوم)

جلوہ گر چہرہ ترا بالوں میں جو شب ہو گیا
مہ ترے مکھڑے کے آگے ماہِ نخشب ہو گیا

میں تو ساری رات کھٹکا پاؤں کا سنتا رہا
کیوں بہانا میرے سر رکھتا ہے تو کب ہو گیا؟

شعر لکھواتے تھے جب تک تب تلک آتے تھے وہ
اب بلا آوے انہوں کی ان کا مطلب ہو گیا

عشق ہو تو ہو جوانی اور بڑھاپے میں نہو
اس پہ کیا موقوف ہے جب ہو گیا تب ہو گیا

آنکھ اٹھا کر جس کو دیکھا اسکے دل کو لے لیا
لیتے لیتے دل کے لینے کا انہیں ڈھب ہو گیا

کیوں پریشاں اب ہوں زلفوں کے تیری دام میں
عشق کے فرمان سے جاگیر و منصب ہو گیا

شعر کہنا تو بہت مشکل ہے لیکن اے حسن
کہتے کہتے بات میں تیری مزا اب ہو گیا

محمد عبدالعلیم سیر کوٹی

اردو نمبر

اُردو زبان ایرانی اور ہندوستانی تہذیبوں کے سنگم کا وہ آخری نقطہ ہے جہاں سے ان دونوں کے دھارے ایک ہو کر بہنے لگتے ہیں۔ اردو کے چمن زار میں جہاں لالہ و یاسمن کی جلوہ طرازی ہے وہاں ٹیسو اور سرس کے پھول بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی آبیاری کسی ایک قوم کی مرہونِ منت نہیں بلکہ ہندو مسلمان دونوں نے مل کر اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ اردو میں رواداری، محبت اور اخوت کا جذبہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود ہندوؤں اور عجمیوں کا سابقہ۔ اردو ادب میں اتحاد و یگانگت کی روایت کسی خلا کی پیداوار نہیں، اس کی پشت پر ایک ہزار سال کے ارتقا کی تاریخ ہے۔ اردو ادب نے باہمی علیحدگی اور نفرت کی خلیج کو پُر کرنے کی ہمیشہ سعی کی ہے۔ یہ وہ رشتہ ہے جو کعبے کو شوالے سے اور ہندو کو مسلمان سے جوڑے رہا ہے اور جوڑے ہوئے ہے اردو کا یہ لوچ اور اس کی یہ وسعت عبارت ہے ہندوستانی تہذیب سے جس کے ہاتھوں اردو کا خمیر اٹھا ہے۔

ہندوستان سالہا سال سے مختلف تہذیبوں کا سنگم رہا ہے۔ آریوں کی آمد کے بعد حملہ آوروں کی یورش برابر جاری رہی ان میں یونانی ہیں، ہن ہیں، گوجر، کشن، صفاری، ایرانی، ترک، تاتاری اور تورانی ہیں، ان سب کے اپنے اپنے اعتقادات تھے، اپنے رسم و رواج و مذہبی عقیدے تھے جنہوں نے ہندوستان کے قدیم تہذیبی مرقع میں اپنے اپنے نقش و نگار چھوڑے ہیں۔ جذب و تاثیر و اثر و قبول کے اس پیہم عمل نے ہندوستانی تہذیب کو ایک مخلوط تہذیب بنا دیا ہے۔ دونوں کے خمیر سے ایک نیا ہیولا تیار

اردو زبان کی سب سے پہلی آپ بیتی

سند ... میں آپ بیتیوں کا رواج ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد شروع ہوا جس قدر ملک رفتہ رفتہ ... زیادہ آپ بیتیاں لکھی جاتی رہیں ... سب سے پہلی آپ بیتی جو اردو زبان میں لکھی گئی وہ مولانا محمد جعفر کی "کالا پانی" تھی اس میں مولانا محمد جعفر تھانیسری نے اپنی زندگی کے اس دور کا واقعہ لکھا ہے جو انہیں جلا وطنی میں بسر کرنا پڑا۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری بہت بڑے مجاہد تھے انہوں نے وطن اور آزادی کی محبت میں بڑی سے بڑی مصیبت کا بڑی خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا عجیب بات ہے کہ علماء کے جس گروہ کی بدولت وقتاً فوقتاً ہندوستان میں آزادی کی لہریں پیدا ہوتی رہیں جس کا آخری مظاہرہ ۱۸۵۷ء میں ہوا، وہی مجاہد جب انگریز کے استبداد سے عبور دریائے شور کی سزا پا کر کالے پانی (انڈیمان) پہنچے تو انہوں نے اس قید و بند کو ایک معمولی واقعہ تصور کیا۔

(علیم الدین سالک)

ہوا جو نہ خالص ہندوستانی تھا نہ اسلامی۔ بلکہ اس کی تشکیل دونوں کے ٹکراؤ کی مرہونِ منت تھی اور اس مشترک تہذیب میں ایران و ہندوستان دونوں کی جاندار روایات کے سوتے آکر مل گئے اختلاط یا اخذ و قبول کا یہ عمل ہندوستانی تہذیب میں بارہا ہوا ہے اور اسی سے ہندوستانی تہذیب کی وسعت اور آفاقیت عبارت ہے اور باہمی رواداری، ایثار اور وسیع المشربی اس کے اصول رہے ہیں۔ جن تاریخی اور طبعی عناصر پر ہندوستان مشتمل ہے، ان کا تقاضا یہی رہا ہے کہ دو یک رنگی میں بوقلمونی اور بوقلمونی میں یک رنگی سے نباہ سکے مغلوں کے دورِ حکومت میں جو ہندایرانی تہذیب پیدا ہوئی اس نے بھی اسی اجتماعی عقیدہ کی پیروی کی ہے رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں اس تہذیب کا ورثہ آج بھی تین چیزوں کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ غالب، اردو اور تاج، اور یہ سچ ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں سے اگر کوئی زبان ہندوستانی تہذیب کے آفاقی پہلو کی بہترین مظہر ہو سکتی ہے تو وہ اردو ہے۔ وہ ایک مخلوط زبان ہے ہندوستان کے تاریخی و تہذیبی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے وہ وجود میں آئی ہے اس کا لوچ، اس کی نرمی اور اسکی وسیع دامنی ہندوستانی تہذیب کے عوامل کی پیدا کردہ ہے۔

مولوی عبدالحق نے ایک جگہ لکھا ہے کہ غیر زبان جو کسی قوم کو سیکھنا پڑتی ہے مخلوط نہیں بنتی بلکہ اس کی اپنی زبان غیر زبان کے اثر سے مخلوط بن جاتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد ہوا۔ فارسی مخلوط نہیں ہوئی بلکہ یہاں کی دیسی زبانیں فارسی سے مخلوط ہو کر اردو بن گئیں اور ایسا کرنے والے اہل ہند تھے۔ مولوی عبدالحق آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ملکی تسلط کے وقت فاتح قوم کی زبان فارسی تھی۔ اُمرا اور بادشاہ، دربار اور دفتر میں رسائی کا ایک بڑا ذریعہ یہ زبان بھی تھی جیسا ہونا چاہئے اور ہوتا آیا ہے ہندؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی اور ایسی سیکھی کہ استاد ہو گئے۔ متواتر مطالعہ، انشا، شعر و سخن کی مشق، سرکاری و دفتری نوشت و خواند کی وجہ سے فارسی اہل ملک کی طبائع میں ایسی رچ گئی تھی کہ انہوں نے فارسی لفظ ملکی زبان میں دھڑا دھڑ داخل کرنا شروع کر دیئے۔ اور اس اختلاط نے اردو میں وسعت، شوکت اور قوت پیدا کر دی ہے۔ مسلمان گو فاتح تھے لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ یہیں کے ہو گئے اور ان کے بے تکلف میل جول اور معاشرت، ادب اور حکومت کی باہمی شرکت کی وجہ سے اردو زبان پیدا ہوئی جو ان دونوں قوموں

کے اتحاد و تہذیب کی بے نظیر یادگار ہے۔

غرض یہ کہ یہ زبان اسی ملک میں بنی اور اسی ملک والوں نے بنائی اور انہیں کی عطا کی ہوئی ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ مسلمان بھی ان کے ساجھی ہیں لیکن شریک غالب ہندو ہی ہیں۔

اردو کی تعمیر میں اتحاد پسندی کے رجحانات کا بہت بڑا ہاتھ ہے، اردو کے ادبی مواد سے اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ہندوستان کے جس ماحول میں اردو شاعری نے آنکھ کھولی تھی اس کی فضا تصوف اور بھگتی کے رس سے چھلک رہی تھی۔ تصوف اس زمانے کی فکری اور اخلاقی بلندی کا معیار بن چکا تھا اور ہندو مسلمان دونوں قوموں میں وسعت سے رائج تھا۔ ہندوستانی تہذیب کی یہ ایک ممتاز خصوصیت ہے کہ جس بھی نئے نظریے سے اس کا سابقہ ہوا اس کو اس نے اپنے دامن میں پناہ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ہر جاندار اثر کو قبول کیا ہے اور اس کی ان قوتوں کو زندہ رکھا ہے جو اس کے مزاج کے ساتھ میل کھاتی تھیں بالکل یہی عمل ایرانی تصوف کے ساتھ ہوا۔ اردو کی ابتدائی غزل کی بنیاد بھی تصوف کے انہی رجحانات پر رکھی گئی۔ ہم جانتے ہیں کہ اردو شاعری کی ابتداء خانقاہوں، حال و قال کی مجلسوں یا صوفیوں کے تکیوں سے ہوئی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو غزل کا سب سے پہلے معرف حال و قال کی مجلسوں میں ہوا ہوگا اور انہی مجلسوں میں سب سے پہلے کلچرل سطح پر ہندوستانی و ایرانی نظریات کا سابقہ ہوا ہے۔ صوفیوں کی ان درگاہوں اور مجلسوں میں ہندو مسلمان برابر شریک ہوتے تھے اور ہندو بھگتوں یا مسلمان پیروں کی ایک سی عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں جہاں متضاد آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ جہاں متضاد خیالات کے لوگ بستے ہیں اور جہاں ہر شے میں تضاد اور

خواجہ حسن نظامی

۱۸۷۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں وفات پائی۔ مصورِ فطرت لقب پایا۔ خواجہ صاحب اردو میں خاص طرز کے موجد اور مشہور انشا پرداز تھے۔ ان کی تحریر میں شہد کی سی مٹھاس، دلکشی، سادگی اور بے تکلفی ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ معمولی مضمون کو نہایت دلکش اور موثر بنا دیتے تھے۔ زبان دلی کی ٹکسالی، سادہ، شگفتہ اور شیریں ہونے کی وجہ سے قبول عام حاصل کر چکی ہے۔ دہلی کی پرانی تہذیب و معاشرت اور مغلیہ شہزادیوں کے واقعات نہایت دردانگیز پیرائے میں بیان کئے ہیں۔ 'سی پارۂ دل' میں اُن کے پُراثر ادبی، اخلاقی اور صوفیانہ مضامین ہیں۔

اس تضاد کے باوجود یک رنگی پائی جاتی ہے، ایک ایسا وسیع حقیقی تصور پیش کیا جا سکتا تھا انہی نظریات کی روشنی میں اردو غزل کے SECULAR CHARACTER کا راز کھلتا ہے۔ اردو کے غزل گو شاعروں میں ہر قوم کے لوگ ہیں، یہاں مسجد کے مینار اور شوالے کے کلس ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں اور جس منزل کی طرف یہ اشارہ کرتے ہیں وہ ایک ہے۔ مادی اعتبار سے اسلام اور ہندو ازم کے راستے مختلف ہیں لیکن ان متوازی راستوں کے درمیان ایک مشترک ہندوستانی راستہ بھی ہے، جس کی جھلک اردو غزل میں قدم قدم پر ملے گی۔

تیں۔ جاؤں کعبہ و صنم خانہ کوں
دیکھیا ہوں ہر کہاں دستا ہے تجھ مکھ کا صفا
—— (قلی قطب شاہ)

اردو میں سب سے پہلا ترجمہ

مصنفین کا بیان ہے کہ تیرہویں صدی ہجری اور تقریباً ۱۹ ویں صدی کے آغاز سے ترجموں کی ابتدا ہوئی جبکہ میر عطا حسین خاں تحسین نے چہار درویش کا قصہ اردو میں لکھ کر "نوطرز مرصع" نام رکھا۔ اس کے بعد بہت سی فارسی اور ہندی کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ بابو نہال چند لاہوری نے ایک قصہ کو جو فارسی زبان میں تھا، اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام مذہب عشق معروف بہ "گل بکاؤلی" رکھا۔ مذہب عشق تاریخی نام ہے یہ کتاب ۱۲۱۷ھ میں ترجمہ ہوئی۔ اس کے بعد پنڈت دیا شنکر نسیم نے اس کو اردو نظم کا لباس پہنایا اور یہ مثنوی "گلزار نسیم" مقبول خاص و عام ہوئی۔

گر ہوا ہے طالب آزادگی
بندہ مت ہو سبحہ و زنار کا
—— (ولی)

مشرب عشق میں ہیں شیخ و برہمن یکساں
رشتۂ سبحہ و زنار کوئی کیا جانے
—— (سراج)

کوئی تسبیح اور زنار کے جھگڑے میں مت بولو
یہ دونوں ایک ہیں اور ان کے بیچ رشتہ ہے
—— (آبرو)

مقصود درد دل ہے نہ اسلام ہے نہ کفر
پھر ہر گلے میں سبحہ و زنار کیوں نہ ہو
—— (امیر)

رحیم و رام کی سمرن ہے شیخ و ہندو کو
دل اس کے نام کی رٹنا رٹے ہے کیا کیجئے
—— (ولی اللہ محب)

مشرب صلح کل ہے اے زاہد
دیر بھی اک حرم کا سایہ ہے
—— (امیر مینائی)

تمہارا بول بالا ہر جگہ اللہ والوں میں
یہی ہو حق حرم میں ہے یہی جپ تپ شوالوں میں
—— (ثاقب)

کعبہ و دیر میں دوڑاتے ہو ڈھو کے ڈکر
کیا کہیں گے تمہیں سب گبر و مسلمان وہیں
—— (جلیل مانکپوری)

دل بدل آئینہ ہے دیر و حرم
حق جو پوچھو ایک در ہے دو طرف
—— (نسیم)

اپنا تو سر جھکے ہے دونوں طرف کہ اسکی
تصویر جلوے میں ہے اور ہے حرم میں خاکا

منشی پریم چند

منشی پریم چند ۱۸۸۰ء میں بنارس میں پیدا ہوئے، بی اے تک تعلیم حاصل کر کے محکمہ تعلیم میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے۔ وطن کی محبت سے سرشار ہو کر افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" ۱۹۰۹ء میں شائع کیا۔ برٹش گورنمنٹ کو اس کتاب میں بغاوت کے جذبے کی جھلک نظر آئی تو اس کو ضبط کر لیا۔ پریم چند نے اپنی آزادی سلب ہوتے ہوئے دیکھا تو ملازمت سے استعفا دیدیا۔ اور تمام عمر تصنیف تالیف میں گذار دی۔ ۱۹۳۶ء میں بنارس میں وفات پائی۔ پریم چند شہرۂ آفاق ادیب اور بے مثل افسانہ نگار تھے۔ انہوں نے دیہاتی زندگی کی بڑی خوبی سے تصویر کشی کی ہے اور ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری اپنے شباب پر ہے۔ پریم چند کے افسانوں میں رومانی اور وجد آفریں تخیلی دنیا کے مرقعے بھی ہیں۔ پریم چند کی زبان سادہ آسان اور شگفتہ ہے۔

(پیارے لال آشوب)

دیر و حرم میں جلوۂ قدرت ہے آشکار
زنار و سبحہ میں نہیں فرق ایک تار کا

(راجہ کشن کمار وفا)

دیر و حرم ہیں شیخ و برہمن کے واسطے
ہم جن کو پوجتے ہیں وہ پتھر ہی اور ہیں

(کبیرا سنگھ جوہر)

دیر و حرم پہ نہیں موقوف کچھ لئے غافلو
یار کو سجدہ سے مطلب ہے کہیں سجدہ کیا

(مادھو رام جوہر)

جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہے وہی اور وہی بت خانہ ہے میرا

(چکبست)

ایک ہی جلوہ جہان دیر و کعبہ ہے مگر
اتفاق رائے شیخ و برہمن میں کیوں نہیں

(دیبی پرشاد بشاش)

یہ سلسلہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا، ایسی کئی مثالیں اردو نظم سے بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہاں صرف چند پہ اکتفا کیا جائے گا۔ اردو شاعروں نے مذہب کے خارجی لوازمات کی ہمیشہ مخالفت کی ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ وہ دیواریں ہیں جو انسان کو انسان سے جدا کرتی ہیں۔

یہاں تسبیح کا حلقہ وہاں زنار کا پھندا
اسیری لازمی ہے مذہب شیخ و برہمن میں

(چکبست)

اردو کی پہلی تصنیف

اردو کی پہلی تصنیف کا سہرا حضرت امیر خسرؒو کے سر ہے" خالق باری" اس کا ایک زندہ نمونہ ہے حالانکہ ان کے بعض شعر ٹھیٹھ ہندی میں بھی ہیں جعفرت امیر خسرؒو دہلوی اردو کے سب سے پہلے شاعر اور ادیب بھی ہیں انہوں نے ہی سب سے پہلے اردو الفاظ اشعار میں استعمال کئے۔ اردو کی سب سے پہلی غزل بھی انہی کی ہے۔ ان کے زمانہ میں اردو زبان میں پختگی نہیں آئی تھی لیکن روانی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔

اور چونکہ مذہب کی یہ روائتی بندشیں بیکار ہیں اس لئے وہ دلِ حق بیں کو اس قید سے آزاد کرنے کی ترغیب دیتے ہیں ؎

بلا سے جاں ہیں یہ تسبیح اور زنار کے جھگڑے
دلِ حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں
اذاں دیتے ہیں بت خانے میں جا کر شانِ مومن سے
حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

———— (چکبست)

اقبالؔ نے بھی ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہم سب ہندی ہیں اور مذہب ہمیں بیر نہیں سکھاتا۔ اردو کے شاعر اسی ہندوستانیت کے پیامبر ہیں۔ وہ قوم کی شیرازہ بندی کے آرزومند ہیں۔ خارجی لوازمات نے جب بھی ہندوؤں مسلمانوں کے درمیان چپقلش پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اردو کے شاعر خون کے آنسو روئے ہیں اور وہ ان لوازمات کو کفر کے محلوں سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ فتنہ و فساد نہ تو اسلام میں جائز ہے نہ ہندو ازم میں ؎

روح اگر کفر کے محلوں سے نمایاں پائے
سرگ ہندو کو ملے، خلد مسلمان پائے

———— (افق)

ہندو اور مسلمانوں میں بعد پیدا کرنے کی جو کوششیں اب سے قبل پوری ایک صدی جاری رہی ہیں۔ اردو کے ادیب انہیں ہمیشہ ناکام بنانے کی سعی کرتے رہے ہیں حادثہ کانپور ۱۹۳۱ء سے متاثر ہو کر منور لکھنوی نے کہا تھا ؎

بکھرا ہے کس لئے سر ہندو و مسلماں کا
لگا ہے خون یہ انساں کے منہ کو انساں کا
جنونِ قتل کے قبضہ میں زندگی آ جائے
ہزار حیف کہ غالب درندگی آ جائے

اس کے باوجود وہ ناامید نہیں ہوتے کیونکہ وطن کے سینہ میں جب شہادت کی شمع جاگ اٹھتی ہے تو اس کی آنچ میں دل موم کی طرح پگھل جاتے ہیں ؎

یہ خون میرے دلِ غمزدہ کو بھر دے گا
یہ خون ہندو و مسلم کو ایک کر دے گا

———— (منورؔ)

اردو کے شاعر مجموعی طور پر اتحاد کی مشعل کو روشن رکھنے کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ جب اس نور سے کعبۂ دل جگمگا اٹھتا ہے تو منافرت کی دھند خود بخود چھٹ جاتی ہے ؎

آ مذہبوں کے یکدم جھگڑے سبھی بھلا دیں
آ دل سے امتیازِ دیر و حرم مٹا دیں
کر کے چراغ روشن پھر اتحاد کا ہم
جنت سے بڑھ کے دل کے کعبے کو ہم بنا دیں

———— (لال چند فلکؔ)

اسلام اور ہندو ازم میں جو بھی صداقتیں ہیں اردو کے شاعر ان کے دلدادہ ہیں اور انہیں سمیٹ لینے کی تلقین کرتے ہیں ؎

حرم کو جاؤ تو رستے سے دیر کے جاؤ

دعائیں ہے کہ بتوں کی خدا کے گھر میں چلو،
اور وہ مذہب کے نظام کو بدلنے کی دعوت دیتے ہیں
اس بے جان، فرسودہ اور روایتی رسم و رواج کے خلاف
آواز اٹھاتے ہیں جو دل کو دل اور انسان کو انسان
سے جدا رکھتا ہے ؎

آ غیریت کے پردے ایک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بسا دیں
(اقبالؔ)

اس نئے شوالے کا ایمان، ایمان اتحاد ہے جس کے
لئے وہ یوں دست بدعا ہیں ؎

باقی رہے نہ ہندو و مسلم میں کچھ بھی فرق
ہو جائیں ایک مثل دل و جاں خدا کرے
ایمان اتحاد پہ لائے ہر اک نفس
قائم ہو اتحاد کا ایماں خدا کرے
عیسائی ہوں، ہندو ہوں، مسلم ہوں خواہ سکھ
سب نام پر ہوں صلح کے قرباں خدا کرے
(منور لکھنوی)

غرض یہ کہ اردو ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں — جس سے
ہندوستانی تہذیب کی اتحاد پسندانہ روح کو تقویت
نہ پہنچی ہو۔

اردو کسی خاص فرقے یا علاقے کی زبان نہیں
ہے۔ اس کے بولنے اور سمجھنے والوں میں ہر رنگ، ہر صوبے
اور ہر مذہب کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اس کے بنانے
اور ترقی دینے میں صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہی ہاتھ
نہیں بلکہ انگریز، پارسی، سکھ، عیسائی بھی اس میں شریک ہیں۔
اردو کی سب سے پہلی غزل بقول علامہ کیفی —
چندر بھان برہمن، شاہجہاں کے عہد کے ایک ہندو

شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ علمیت و
فضیلت کے اعلیٰ مدارج طے کئے۔ ۱۸۸۱ء میں سرسید
نے انہیں علی گڑھ کالج میں فارسی کا پروفیسر بنا دیا۔
علی گڑھ کی فضا شبلی کی علمی نشو و نما کے لئے بہت
مفید ثابت ہوئی، اور وہیں سے علمی دنیا میں شہرت حاصل
کی۔ مولانا شبلی نے علم کلام، تاریخ، تنقید، سیرت، غرض
ہر میدان میں اپنی ذہانت کا نقش جمایا۔ لیکن سب سے
زیادہ نام تاریخ اور تنقید میں پیدا کیا۔ ادب، تاریخ اور
تحقیق میں مولانا کا رتبہ بہت بلند ہے۔ آخر عمر میں سیرت النبی
شروع کی۔ دو جلدیں مکمل کی تھیں کہ زندگی نے وفا نہ
کی اور ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔
شبلی کی طرز تحریر اپنی شگفتگی، بانکپن، روانی اور طرز
زبان کے اعتبار سے بہت ممتاز ہے۔
ظہور قدسی، دعوت عشیرہ، اسلامی حکومت کا تمدن
پر اثر، شاعری کس چیز کا نام ہے۔ آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔

فارسی شاعر نے لکھی تھی۔ اردو کے ارتقار کے ہر دور میں ہندو اہلِ قلم مسلمانوں کے دوش بدوش کام کرتے رہے ہیں۔ ولی رام ولیؔ، رام کشن اور بدھ سنگھ ان شاعروں میں سے ہیں۔ جن کی شاعری کا زمانہ شمالی ہندوستان میں ولی اورنگ آبادی سے قبل کا ہے۔

اسی طرح دکن میں بھی قلی قطب شاہ، وجہی اور ولی کے ساتھ کئی ہندو شاعر بھی موجود تھے۔ ان میں سے تین کے نام ہم تک پہنچے ہیں (۱) رام راؤ (۲) سیوک اور (۳) جسونت سنگھ منشی۔ رام راؤ نے واقعاتِ شہادت حسینؓ پر ایک کتاب قلمبند کی جو اب نایاب ہے سیوک نے جنگ نامہ لکھا اور منشیؔ اورنگ زیب کے دربار میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے اور انکی تصانیف اردو، فارسی دونوں میں ہیں۔

محمد شاہ کے زمانے میں اور اس کے بعد شمالی ہندوستان میں جن ہندو حضرات نے اردو کی نشو و نما میں اہم حصہ لیا ہے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔ ٹیک چند بہارؔ، آنند رام مخلصؔ، بندرابن راقمؔ، آفتاب رائے رسواؔ، خوشونت رائے شادابؔ، عجائب رام منشیؔ، بدھ سنگھ قلندرؔ، بھکاری داس عزیزؔ، راجہ رام ذرہؔ، بال مکند حضورؔ۔ ماسہ رام مہندر، رائے سرب سنگھ دیوانہ، جسونت سنگھ پروانہؔ اور راجہ رام نرائن موزوںؔ۔

اس کے بعد کے اردو میں ہندو شاعروں، اور ادیبوں کے نام اس کثرت سے ملتے ہیں کہ محض نام گنوانے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ یہاں یہ جان لینا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اردو کے ہندو شاعروں اور ادیبوں کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ مختلف تذکروں کی مدد سے ایسے کم ازکم ہندو سو اہلِ قلم کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں اس طرح کا کچھ اندازہ شاید ان تذکروں کے حوالہ سے لگ سکے گا جو اردو کے ہندو ادیبوں یا شاعروں کے بارے میں لکھے گئے۔

(۱) آثار شعرائے ہندو (دیبی پرشاد بشاشؔ)

(۲) ہندو شعرار۔ (عبدالرؤف عشرتؔ لکھنوی)

(۳) یادِ رفتگان۔ (شام موہن لال جگرؔ بریلوی)

(۴) منتخب ہندو شعرار (عبدالشکور)

(۵) بہارِ گلشن کشمیر (دو جلدوں میں، برج کشن کول بے خبرؔ، اور جگ موہن ناتھ شوقؔ۔)

(۶) خمخانۂ جاوید (سری رام دہلوی)

(۷) ایک مثنوی بعنوان اردو از جگن ناتھ آزاد۔

ہندوؤں کو اردو سے ہمیشہ شغف رہا ہے۔ اور انہوں نے اسے اپنی زبان سمجھ کر برتا۔ اس سلسلہ میں پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، علامہ کیفیؔ اور کرشن چندر کے نام نہ گنوانا تاریخی غلطی ہوگی۔ اردو کے بنانے اور سنوارنے میں ہندو مسلمانوں کے علاوہ عیسائیوں نے جو حصہ لیا ہے اس کا ذکر ہمیشہ فخر کے ساتھ کیا جائے گا۔ ڈاکٹر

اردو روزنامچے

ڈائری یا روزنامچہ ادب کا ایک شعبہ ہے بعض روزنامچے عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ اٹلی اور انگلستان میں بعض نامور ادیبوں نے اپنے روزنامچے لکھے۔ ان روزنامچوں سے نہ صرف لکھنے والے کے سوانح معلوم ہوتے ہیں بلکہ اس کے دور پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم ایک پورے دَور کو ایک شخصیت کے روزنامچے میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ اردو میں خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے بڑے مقبول ہوئے۔ یہ روزنامچے اولاً رسالہ درویش دہلی اور اس کے بعد رسالہ منادی دہلی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

مام بابو سکسینہ نے ان کا ذکر ایک الگ کتاب (INDO UROPEAN POETS OF URDU AND PERSIAN) میں کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے خطبات میں ایک مقام پر اردو کے یورپین شعرا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تخمیناً ایک سو یورپین یا اینگلو انڈین ایسے ہیں جو اردو کے شاعر ہوئے ہیں اور بعض ان میں سے صاحبِ دیوان ہیں۔ یہ بات ہندوستان کی کسی دوسری زبان کو نصیب نہیں ہوئی۔

ان یورپین شعرا میں پرتگالی بھی ہیں، ڈچ بھی، انگریز بھی اور فرانسیسی بھی۔

ہالینڈ اور پرتگال والوں نے اردو کی قواعد و صرف و نحو پر کتابیں لکھیں۔ اردو زبان کی سب سے پہلی گرامر ایک ڈچ کیٹلر نے لکھی ہے۔ یہ شخص ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر تھا۔ شاہ عالم (۱۷۱۲-۱۷۰۸)۔ اور جہاندار شاہ کے دربار میں بھی ڈچ سفیر کے طور پر حاضر ہوا تھا۔ اس نے صرف و نحو ہندوستانی کے نام سے اردو زبان کی گرامر غالباً ۱۷۱۵ء میں لکھی۔

ان یورپین لوگوں میں سے جنہوں نے اردو زبان کو وسعت دینے میں اہم حصہ لیا ہے۔ چند کے نام یہ ہیں بنجمن اس نے ۱۷۴۳ء میں لاطینی زبان میں اردو کی قواعد لکھی اور بائبل کا ترجمہ کیا۔

اس کے علاوہ فلی۔جی۔اے فرنز کیسیا نو بیلی گانی، ہیڈلے اور ڈف نے بھی اردو گرامر اور صرف و نحو پر رسالے اور کتابیں لکھیں۔

جن مستشرقین نے اردو زبان کی سرپرستی فرمائی ہے۔ ان میں ڈاکٹر گل کرائسٹ، ڈاکٹر اسپرانگر۔ میلٹ اور گارساں دتاسی کے نام پیش پیش ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کا نام سرفہرست ہے۔ اپنی حیات عزیز کے آخری بیس برس متواتر وہ زبان اردو وار دو ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ اس کے پرنسپل ڈاکٹر گل کرائسٹ مقرر ہوئے۔ یہاں انہوں نے اردو کے ترجمہ و تالیف کا ایک محکمہ قائم کیا۔ انہوں نے نہ صرف

اردو کی پہلی مکمل لغت

سید احمد دہلوی ۱۸۴۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۶۸ء سے اردو لغت کی ترتیب شروع کی اور ۱۸۷۸ء میں اس کا ایک حصہ 'ارمغانِ دہلی' کے نام سے شائع کیا۔ ڈاکٹر فیلسن (انسپکٹر مدارس صوبہ بہار) کو اپنی انگریزی اردو ڈکشنری کے لئے ایک ماہر زبان کی ضرورت تھی۔ انہوں نے سید احمد دہلوی کو منتخب کیا۔ سید احمد نے سات سال تک ان کے ساتھ کام کیا اور ۲۵ سال کی مسلسل محنت کے بعد ۱۸۹۲ء میں لغت مکمل کی جو سید علی بلگرامی کی سفارش پر نظام دکن نے شائع کرائی، اور انہیں کے نام پر 'فرہنگ آصفیہ' نام رکھا گیا۔ سید احمد دہلوی کا سب سے بڑا کارنامہ اردو لغت ہے۔ اردو زبان میں 'فرہنگ آصفیہ' سے پہلے اتنی مستند اور مکمل لغت موجود نہ تھی۔ اسی کارنامے نمایاں سے ان کا نام زندہ ہے۔ سید احمد نے ۱۹۱۸ء میں دہلی میں وفات پائی۔

اردو کا دامن

فارسی اور اردو میں بڑا گہرا تعلق ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ فارسی اور اردو ایک تصویر کے دو رُخ ہیں تو یہ بے جا نہ ہوگا، اس لئے اردو کا دامن آپ بیتیوں سے خالی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس میں کچھ آپ بیتیاں ہیں، کچھ سفرنامے، کچھ ملفوظات و مکتوبات ہیں، کچھ ڈائریاں اور روزنامچے۔ بعض کا رنگ بڑا شوخ اور دلکش ہے اور بعض نہایت متین اور خشک ہیں۔

خود اردو لغات، قواعد اور تاریخ وغیرہ کے متعلق کتابیں لکھیں بلکہ ہندوستان کے لائق اہل قلم ہندوؤں اور مسلمانوں کو کالج میں بلوا کر ان سے بھی لکھوائیں۔ ان کی اردو زبان و ادب سے متعلق تصانیف ایک درجن کے لگ بھگ ہیں۔ سنہ [illegible] میں وہ ہندوستان سے چلے گئے لیکن لندن جا کر پھر اردو پڑھانے کے کام میں مصروف رہے ان کا سب سے بڑا کارنامہ اردو لغات کی تدوین ہے اس کے علاوہ کپتان جوزف ٹیلر، گلیڈون، ٹامس روبک، جان شکسپیر، ولیم ٹیلر اور ڈنکن فاربس نے بھی اردو میں لغت ترتیب دیئے۔ اردو لغت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے نام ہمیشہ گنوائے جائیں گے کیونکہ ان کی یہ تصانیف اردو کے عہدی دور میں سنگ راہ کی اہمیت رکھتی ہیں۔

اردو شاعروں و ادیبوں کے تذکرے بھی مستشرقین نے لکھے ہیں۔ مسٹر فیلن اور مولوی کریم الدین نے باہمی شرکت و معاونت سے شعرا ہند کا تذکرہ "طبقات شعرا ہند" کے نام سے مرتب کیا۔ ان کے علاوہ گراہم بیل نے ایک مختصر کتاب ہسٹری آف اردو لٹریچر کے نام سے انگریزی میں لکھی اور لندن سے شائع کی۔

فورٹ ولیم کالج سے سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی تک عشق کی ایک جست نہیں ہے بلکہ دلی کالج اس ارتقاء کی درمیانی کڑی ہے۔ ڈاکٹر اسپرانگر کئی سالوں تک دلی کالج کے پرنسپل رہے اور بعد میں کلکتہ مدرسے کے پرنسپل ہو گئے۔ دلی کالج میں اردو نوازی کی جو فضا پیدا ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر میں ڈاکٹر اسپرانگر کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ وہ اردو کے عاشقوں میں گنے جاتے ہیں ان کی تصانیف میں شاہان اودھ کے کتب خانہ میں اردو فارسی کتابوں کی فہرست ایک ایسی بے مثال خدمت ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ان کے نام کو زندۂ جاوید رکھے گی۔

مستشرقین میں اردو زبان کا سب سے بڑا ماہر و عاشق گارساں دتاسی تھا۔ یہ ایک فرانسیسی عالم تھا جسے اردو زبان سے حقیقی عشق تھا وہ اپنے وطن پیرس میں بیٹھے ہوئے اردو کی رفتار و ترقی کا مطالعہ کرتا رہتا تھا — وہ ہندوستان میں مقیم اپنے انگریز دوستوں سے معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ اور ہر سال کے آخر میں پیرس یونیورسٹی میں اردو کی سال بسال ترقی پر لیکچر دیتا تھا۔ اس کے انیس لیکچر جو [illegible] تک کے ہیں انجمن ترقی اردو نے ترجمہ کر کے چھاپ دیئے ہیں۔ ان لیکچروں میں اردو کی ادبیات، شاعری، مصنفین، شعراء اور اخبارات وغیرہ سب کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ دتاسی نے اردو کی کئی کتابوں کو اپنی ادارات میں چھپوایا اور ترجمے بھی کئے اس کی تصانیف میں ایک اردو زبان کی تاریخ بھی ہے اردو کے متعلق اس کی تصانیف کی تعداد کافی ہے۔ ان میں اس کا مرتب کیا ہوا وہ [illegible] تذکرہ نہایت اہم ہے۔ جس میں تین ہزار ہندی اردو شعراء اور مصنفین کا ذکر درج ہے

اردو کی تہذیبی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہوئے یہ دیکھنا بھی کم اہم نہ ہوگا کہ اس کا تعلق ہند آریائی زبانوں سے ہے۔ اردو کو ہندوستان کی زبانوں میں جو

اہمیت حاصل ہے وہ محض اتفاقی نہیں۔ بلکہ سیکڑوں سالوں کے لسانی اور تمدنی تحریکات کا نتیجہ ہے۔ آریوں کی آمد کے بعد سے مسلمانوں کی فتوحات تک شمالی ہندوستان میں جس بولی کا رواج رہا وہ مدھیہ پردیش کی کسی نہ کسی بولی پر مبنی تھی۔ مسلمانوں کی فتح دلی کے وقت شورسینی اپ بھرنش کی ایک جدید شکل (قدیم مغربی ہندی)۔ یکساں طور پر اس علاقے میں رائج تھی۔ اپ بھرنشوں کا دور [illegible] سے [illegible] تک قرار دیا جاتا ہے مسلمانوں کی آمد تک شمالی ہندوستان کی اپ بھرنش ادبی شکل اختیار کر چکی تھیں اور آہستہ آہستہ عوام کی ڈگر سے دور ہٹ رہی تھیں۔ عوام کی زبان کا دھارا برابر آگے بڑھ رہا تھا موٹے طور پر اس کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ سندھ و پنجاب میں پشاچی اور مدھیہ پردیش میں شورسینی پراکرتیں، نئی اپ بھرنشوں (بگڑی بولیوں) کے لئے راستہ صاف کر چکی تھیں۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت سندھ میں براچڈ، جنوبی پنجاب میں کیکئی اور مدھیہ پردیش میں شورسینی اپ بھرنش رائج تھیں۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد لسانی تحریکیں اس قدر گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ بیرونی اور اندرونی زبانوں کے دائرے عموماً ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ گیارہویں صدی سے یہ اپ بھرنشیں نئی دیسی بولیوں کو جنم دینے لگیں کیکئی سے لہندا، براچڈ سے سندھی اور شورسینی اپ بھرنش سے کھڑی بولی راجستھانی اور مشرقی پنجابی کی شاخیں پھوٹنے لگیں۔ ایرانیوں اور ہندوستانیوں کا سب سے پہلا سابقہ لاہور میں ہوتا ہے۔ یہ مقام مشرقی پنجابی و لہندا کے سنگم پر واقع ہوتا ہے اور اردو کا بیج اسی علاقہ کی زبان میں بویا جاتا ہے جو مشرقی پنجابی تھی۔ اس کی اصل کے بارے میں خود گریرسن بھی غلط بیانیاں کرتا ہے مگر یہ بات صاف ہے کہ مشرقی پنجابی ایک طرف لہندا اور دوسری طرف مغربی ہندی کی بولیوں سے متاثر تھی اور یہی وہ بولی ہے جس میں ایرانی اثرات کے تحت اردو کی داغ بیل پڑتی ہے۔ بعد میں جب دارالسلطنت لاہور سے دلی آجاتا ہے۔ تو مغربی ہندی کے لسانی تاثرات کے تحت یہ زبان ایک مستقل رنگ روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اس تمام بحث سے مدعا یہ ہے کہ اردو ہندوستان

ابوالکلام آزاد

محی الدین احمد نام، والد ماجد کا نام مولانا خیرالدین۔ آبائی وطن دہلی۔ حجاز و مصر میں تعلیم حاصل کی۔ آزاد نے ہندوستان آنے کے بعد کلکتہ میں رہائش اختیار کی اور رسالہ "الہلال" نکالا جس کے خاص اسلوب تحریر اور طرز ادا نے اردو ادب میں حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا پھر "البلاغ" جاری کیا۔ مولانا ہندوستان کے مشہور سیاستداں، مصنف، مقرر اور زبردست اہل قلم تھے، ان کی تحریر میں علمی شان، بیان میں شوکت و رعنائی اور زبان میں متانت کے ساتھ بانکپن بھی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۵۸ء تک آزاد ہندوستان کے وزیر تعلیم رہے۔ مولانا اردو کے بہترین انشاپردازوں میں جس پر اردو ہمیشہ ناز کرے گی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ "تفسیر قرآن" ہے۔ فروری ۱۹۵۸ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔

کے آب و گل سے ہندوستانی عوام کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے۔ اسکی جڑیں عوام میں پھیلی ہوئی ہیں اور اس لحاظ سے وہ شمالی ہندوستان کی ممتاز ترین زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہندوستانی تہذیب کی طرح اردو بھی ایک مخلوط زبان ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی جاندار روایات کو آگے بڑھانے میں جن عوامل کا ہاتھ ہے ان میں ایک اردو زبان بھی ہے۔ اردو ادب نے "ہندوستانیت" کے وسیع مفہوم کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور اسے سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچایا ہے۔ اردو ہندوستانی تہذیب کا بہترین ترجمان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو زبان نے عربی فارسی سے بہت کچھ لیا۔ لیکن وہ نہ فارسی کا وجود ظلی ہے نہ ایک تقلیدی ادب۔ اور ایسا کہنا اردو ادب سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت بہم پہنچانا ہے۔ اردو کے ان شہ پاروں میں جن کے نام اس سلسلہ میں گنوائے جاسکتے ہیں۔ کچھ یہ ہیں "باغ و بہار" مثنوی میر حسن، مراثی میر انیس، غالب کی شاعری اور اسکے خطوط۔" اور اصل تو یہ ہے کہ ہندوستان بھر کے ادب میں ان کا جواب نہیں۔

اردو زبان کی پہلی گرامر

اردو زبان کی سب سے پہلی گرامر ایک ڈچ اردو شاعر نے جس کا نام "کیٹلر" تھا، لکھی ہے یہ شخص ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر تھا۔ شاہ عالم (۱۷۰۸-۱۷۱۲ء) اور جہاندار شاہ کے دربار میں ڈچ سفیر کے طور پر حاضر ہوا تھا۔ اس نے "نحو ہندوستانی" کے نام سے اردو زبان کی گرامر ۱۷۱۵ء میں لکھی۔ (بحوالہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔)

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی کوئی تاریخ اردو ادب سے مدد لیے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی اردو ادب میں جو تاریخی مواد موجود ہے اسکی روشنی میں ہندوستان کی موجودہ تاریخ کو نئے سرے سے ترتیب دیا جاسکتا ہے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی سب سے پہلی تحریک جو "وہابی تحریک" کہلاتی ہے اس کا پس منظر سمجھنے کے لیے شاہ ولی اللہ کی تحریروں کو سامنے رکھنا ازبس ضروری ہے۔

اردو کے دکنی ادب کی مثنویوں میں اس عہد کے پورے دکن کی تہذیبی اور معاشی روح کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہاں فقط قطب شاہ کے کلام کا ذکر کردینا ہی کافی ہے اس زمانے کے ہندو مسلمانوں کے تعلقات، عوام کے رسم و رواج ہندوؤں مسلمانوں کے تہوار، اس زمانے کے عقائد، نظریات اور اس کے علاوہ فنون جنگ کے انداز کے بارے میں اردو کے دکنی ادب میں سے بیش بہا ذخیرہ تلاش کیا جاسکتا ہے۔

نادر شاہ کے حملوں کے بعد دلی پر بڑی بڑی مصیبتیں نازل ہوئیں اور ایسے وقت پڑے کہ خواب و خور حرام اور اطمینان و سکون خواب و خیال ہوگیا۔ دلی کی اس بے بسی اور بے کسی کے نہایت سچے مرقعے میر کے کلام سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ میر نے غزلیں نہیں کہیں دل اور دلی کے مرثیے لکھے ہیں اس کے علاوہ ان کی تصنیف ذکر میر میں ہندوستان کی اس اندوہ گیں فضا کا تاریخی ماحول ملتا ہے۔

سودا کے کلام سے بھی اس زمانے کے تاریخی حالات متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ شیخ چاند کا بیان ہے کہ سودا کے قطعات سے بعض تاریخی واقعات کی صحیح اطلاع ملتی ہے۔ ان میں سے ایک تو فتح شجاع الدولہ کا مشہور تاریخی قطعہ ہے اس کے

علاوہ آصف الدولہ کے لڑکوں کی ولادتوں کی تاریخیں ہیں۔ باغ تکت رائے، چاہ آصف الدولہ، مسجد آصف الدولہ کے تاریخی قطعات بھی اچھے خاصے ہیں سودا کے کلام میں اس زمانے کے مختلف تاریخی سیاسی معاشرتی حالات اور واقعات ہم کو بے کم و کاست ملتے ہیں۔ محمد شاہ سے لے کر آصف الدولہ تک کے تاریخی واقعات دستیاب ہو سکتے ہیں۔ بسنت خاں خواجہ سرا کے اقتدار، احمد شاہ کے زمانے میں فوج کی حالت عالمگیر ثانی کے زمانہ میں عماد الملک کی وزارت، اور اس کا اثر فرخ آباد کے حالات، شجاع الدولہ کی روہیلوں سے جنگ، فرنگیوں اور تلنگیوں کی فوجوں کا حال —

آصف الدولہ کے زمانے میں مالی و ملکی مہمات اور انگریزوں کے دخل وغیرہ کا واضح خاکہ ہمیں سودا کے کلام میں نظر آتا ہے۔ اس زمانہ کی معاشی کش مکش کی زندہ تصویریں ہم کو ان نظموں میں نظر آتی ہیں۔ امیر غریب، سپاہی، فقیر اور مختلف پیشہ وروں کی بپتائیں ہم سودا کی نظموں میں سنتے ہیں۔ ان کے مذہبی خیالات وعقائد، وضع قطع، کھانا پینا، پہننا، اوڑھنا سب کچھ ہمیں چند نظموں کو پڑھ کر معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانہ کے معاشرتی رسوم مثلاً بیاہ کی رات ڈومنی کا جلوہ دینا، آرسی مصحف، ساچق، برات، چوتھی کھیلنا، پردہ وغیرہ کے مفصل تذکرے اس کے کلام میں جگہ جگہ آتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس زمانہ کے مشہور حسینوں کے نام بھی، اس نے لکھ دیئے ہیں جو شخص اس زمانہ کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے سودا (اور میر) کے کلام میں بڑا مفید اور کارآمد مسالا موجود ہے جو حالات تاریخ کی ضخیم کتابوں میں نہیں ملیں گے وہ سب ان کے ہاں موجود ہیں۔

اس پر آشوب زمانہ کا انتہائی نقطہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہے۔ جب مغل دربار کی شمع ہمیشہ کے لئے بجھ کر رہ گئی۔ غالب اسی ماحول کے نمائندہ تھے۔ اپنے خطوں میں انہوں نے جس دردمندانہ لہجے میں غدر کا ذکر کیا ہے

پہلے ناول نگار - نذیر احمد

۱۸۳۶ء میں بجنور میں پیدا ہوئے۔ دہلی کالج میں تعلیم پائی اور دہلی کو ہی اپنا وطن بنا لیا اور یہیں ۱۹۱۲ء میں وفات پائی انہوں نے اردو ناول کو مہذب اور سنجیدہ رنگ میں پیش کیا۔ ان کا پایہ اردو نثر میں بہت بلند ہے اور ان کا شمار آج بھی چوٹی کے نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ مولوی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ ان کے تمام ناول اصلاحی و معاشرتی ہیں "مراۃ العروس" ان کا پہلا ناول ہے۔ نذیر احمد نے دہلی کے شریف گھرانوں کی گھریلو زندگی کے بڑے کامیاب نقشے کھینچے ہیں۔ اور دہلی کی خاص ٹکسالی زبان اور محاورے استعمال کئے ہیں۔ وہ عورتوں کے مکالمے کے بادشاہ ہیں۔ نذیر احمد کی بے نظیر قدرت بیان، وسیع ذخیرۂ الفاظ اور جدت خیال اردو لٹریچر کی جان ہیں۔ نذیر احمد کا عظیم الشان کارنامہ قرآن کریم کا ترجمہ ہے۔

اسکے سلنے سے آنکھیں آشوب کر آتی ہیں۔ غدر کے حالات کی کوئی تاریخ غالب کے خطوط کی مدد کے بغیر تیار نہیں کی جا سکتی۔ اپنی فارسی تصنیف روزنامہ دستنبو میں انہوں نے ۱۸۵۷ء تک کے غدر کے حالات قلمبند کئے ہیں اور گل اندام فرنگیوں اور دلی کے تباہ و برباد ہونے کے نقشے کو ایسے رنگوں سے کھینچا ہے کہ ایک ایک لفظ سے اس دل سوختگی کی بو آتی ہے جو اس تاریخی ماحول کا لازمہ تھی۔ دلی اور اودھ کی سلطنت کے انتزاع کو زیادہ بہتر سمجھنے کے لئے شاہ عالم آفتاب بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ اختر کے کلام سے نہایت اہم تاریخی مدد لی جا سکتی ہے۔ غدر کے بعد انگریزوں کے قدم ہندوستان میں جم جانے کے بعد ہندوستان کی سیاسی ذہنی اور ادبی زندگی میں جو انقلاب آیا ہے اس کی بالتفصیل نشاندہی کے لئے اس دور کے اردو ادب کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ مغربیت کے اثر سے ہندوستان کی تہذیبی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اردو میں اس کا ردعمل دو صورتوں میں رونما ہوا ہے۔ سرسید کی تحریک اور اکبر الہ آبادی کی شاعری سرسید نے ہندوستان کے مسلمانوں کی بیداری کے لئے سیاسی معاشی اور تہذیبی سطح پر جو کام کیا ہے۔ تاریخ اسے کبھی محو نہیں کر سکتی۔ انکی مجتہدانہ روح انکی تصانیف اور ان کے ساتھیوں کے مضامین میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اکبر الہ آبادی نے مغرب کی کورانہ تقلید اور غلامی کی لعنتوں کا پردہ مزاح کے حربہ سے چاک کیا ہے ـــــ

پرانے ناول مختلف خطوط کا مجموعہ ہوتے تھے!

اردو میں سب سے پُرلطف خط مرزا غالب نے لکھے ہیں۔ ان خطوط کو ایک خاص ترتیب سے پڑھا جائے تو یہ خطوط مرزا غالب کے حالات کے مختلف ابواب بن جاتے ہیں مکتوبات ادب کا وہ شعبہ ہیں جنہیں صداقت پر مبنی خیال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ناول نگاری کی داغ بیل پڑی تو لوگوں نے مکتوبات کے ذریعے ناول لکھے یعنی پورا ناول مختلف خطوط پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس طرح لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ افسانوں اور ناولوں کو اس زمانے کے قاری صداقت سے خالی سمجھتے تھے۔ اس کے برخلاف خطوط کو وہ صداقت پر مبنی خیال کرتے تھے۔ خط وکتابت خواہ وہ اصلی ہو یا فرضی، ناول نگاری کے ارتقا میں ایک اہم کڑی رہ چکی ہے۔ قباحت یہ ہے کہ پلاٹ کے تسلسل کو خط وکتابت کا پیرایۂ بیان غیر ضروری طور پر پھیلا دیتا ہے۔ ہیرو یا ہیروئن کا کچھ حال بیان کرنا ہو تو اس کے لئے ایک لمبا خط لکھا جانا ضروری ہے جس میں بہت سی غیر متعلق باتیں اس لئے بیان کی جائیں گی کہ وہ خط سچ مچ کا خط معلوم ہو ـــ یہی وجہ ہے کہ آخر کار یہ اسلوب نگارش ناول نگاروں کو ترک کرنا پڑا۔ لیکن جہاں تک سوانح نگاری کا تعلق ہے۔ یہ ایک امر مسلم ہے کہ خطوط خود نوشت سرگزشت ہوتے ہیں۔ آج بھی مشہور ادبی و سیاسی شخصیتوں کے خطوط (مثلاً ۱۔ خطوط غالب۔ ۲۔ غبار خاطر از ابوالکلام آزاد۔ ۳۔ مکتوبات نیاز فتح پوری) ہمارے ادب کا ایک قابل قدر سرمایہ ہیں۔

(یوسف جمال انصاری)

شاد حیدر آبادی

ترتیب کائنات میں پوشیدہ راز ہے

میں کیا بتاؤں تیرا پتہ تجھ کو ہائے دل

ظہور جلوۂ حسن ازل آرا کو کیا کہئے

طریقت کا اشارہ ہے۔ خدا کہئے خدا کہئے

ہے انساں دائرہ پرکار کا یا نقطۂ کثرت

اسی کو ابتدا کہئے اسی کو انتہا کہئے

سینہ پہ ہاتھ رکھ کے تسلی نہ دے یہ کہہ

دل میں، جگر میں، درد ہے تو کہاں ہے

یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد متخلص بہ شاد ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام راجہ ہری کرشن تھا آباؤ اجداد دہلی کے ایک قدیم معزز خاندان سے تھے۔ جن کا کوئی رکن نظام ہائے سابق میں سے کسی کے ہمراہ حیدرآباد گیا تھا۔ شاعری میں حضور نظام نواب میر محبوب علی خاں مرحوم کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ وہ آپ کو اپنا شاگرد معنوی کہہ کر یاد کیا کرتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں ان کو عہدۂ وزارت اور راجہ راجگان مہاراجہ بہادر کا خاندانی خطاب عطا ہوا۔ ۱۹۰۳ء میں کے سی۔ آئی۔ ای۔ اور ۱۹۱۰ء میں جی۔ سی۔ آئی۔ ای کے معزز خطابات سے سرفراز ہوئے ۱۹۱۲ء میں عہدۂ وزارت سے دستبردار ہوگئے تھے مگر تھوڑے عرصہ کے بعد پھر وزارت ان کے سپرد کی گئی۔ ۱۹۴۰ء میں انتقال کیا۔

شاعرانہ انداز میں انہوں نے اپنے زمانہ کی معاشرت کی اور سیاسی ماحول کی دیانت داری سے ترجمانی کی ہے ان کے کلام میں حکومت کی چیرہ دستیوں، قومی پریشانیوں تہذیبی انحطاط اور قدیم و جدید کی کشمکش کی واضح تصویریں ملتی ہیں۔ اردو کے ایک ادیب کا بیان ہے کہ "۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی پوری داستان حوصلہ و ہوس کی، الفت و آویزش کی، شور و سکوت کی سوزیاں کی اکبر کی شاعری میں جلوہ گر ہے"۔ اس عہد کے شعار و شعور کو سمجھنے کے لئے اکبری کلام سے ہر طرح کی مدد لی جا سکتی ہے۔ شاید اتنی قیمتی مدد کہیں سے حاصل بھی نہیں ہو سکتی۔

غرض یہ کہ اردو کی تہذیبی قدر و قیمت نظر انداز نہیں کی جا سکتی، اردو ادب اڑھائی سو سال سے ہندوستانی تہذیب و تاریخ کے تقاضوں کو پورا کرتا چلا آرہا ہے۔ جنگ آزادی کی تحریک میں اردو نے جو خدمت کی ہے وہ اسے ہندوستان کی باقی تمام علاقائی زبانوں سے ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے اور بقول ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی "اردو ادب کا رخ گھر میں چھوئی موئی کی طرح دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہا۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے اس کی کوششیں لائق رشک ہیں اور نئے ہندوستان کے بنانے سنوارنے میں اس کا قابل قدر حصہ ہے اصل یہ ہے کہ ہم نے اپنے ادبی سرمایہ کا ابھی تک اس نظریہ

سے جائزہ ہی نہیں لیا۔"

اردو کی اہمیت اس کی حیات اور اس کی بقا کے بارے میں یہ کہنا نہایت صحیح ہوگا کہ اگر ہندوستانی تہذیب کے عناصر ترکیبی کو یکجا کر دیکھئے تو وہ اردو ہے اور اگر انہیں بکھیر دیکھئے تو وہ اتحاد، اخوت، خلوص، رواداری اور محبت کے گہرے اور گمبھیر جذبات ہیں۔ ان جذبات کی وسعت ہمہ گیری اور آفاقیت کو نظر میں رکھتے ہوئے اردو ادب کا نئے سرے سے جائزہ لیجئے تو اردو ادب ہندوستانی تہذیب کی شہ رگ کا کام کرتا دکھائی دے گا۔

■■

سیاسی آپ بیتیاں

سیاسی آپ بیتیوں میں مولانا حسرت موہانی کی "قیدِ فرنگ" کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے بڑی بیباکی کے ساتھ جیل کی زندگی اور اس کی مصیبتوں کا حال لکھا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ اس زمانے کی تصنیف ہے جس زمانے میں آزادی کا نام لینا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ جیل خانے کیا تھے؟ دوزخ کے طبقات تھے جہاں خاص طور پر سیاسی قیدیوں کو سخت عقوبت دی جاتی تھی۔ مولانا نے جیل کے ایام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجھے جیل کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس نے میری زندگی میں سادگی، اعتدال، ضبطِ نفس، ریاضت، جفاکشی، استقلال اور سب سے بڑھ کر توکل و قناعت کے جوہر عطا کئے۔ میرے شعر میں اثر اسی کی بدولت پیدا ہوا۔ اس نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی اور دل سے ماسوا اللہ کا خوف دور کر دیا۔

چودھری افضل حق نے بھی "میرا افسانہ" اور "دوزخ" لکھ کر اردو ادب میں دو نہایت اہم آپ بیتیوں کا اضافہ کیا ہے۔ "دوزخ" ان کے ایام قید و بند کی داستان ہے۔ اس میں ایک چیز قابلِ ذکر ہے کہ حسرت موہانی والی جیل اور چودھری افضل حق والی جیل میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ وقت اور سیاست کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ جیل کے حالات بھی تبدیل ہوتے گئے۔ پھر بھی انہوں نے قیدیوں کے ساتھ مل کر سیاسی قیدیوں کے لئے کچھ حقوق حاصل کرنے کے لئے بڑی جد و جہد کی۔

"میرا افسانہ" ایک قابلِ قدر تصنیف ہے جس میں چودھری افضل حق نے اپنی آپ بیتی بڑی بے تکلفی سے بیان کی ہے۔ وہ پولیس میں تھانیدار تھے کہ خلافت کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک سے ملت کو کیا فائدہ پہنچا؟ اس تفصیل کو جانے دیجئے۔ فقط دو باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں بیداری کے آثار پیدا ہوئے اور انہوں نے سیاسیات کے شجرِ ممنوعہ کو آخر چھو ہی لیا۔ دوسرے اس تحریک کی بدولت کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ عوام کے دلوں سے انگریزوں کی ہیبت اٹھ گئی اور انہیں یقین ہو گیا کہ انگریز کا وعدہ شاعری کے روایتی معشوق کے وعدے کی طرح بے اعتبار ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کے دل انگریز کی نفرت سے لبریز ہو گئے۔

(علیم الدین سالک)

پرندوں کے احسانات اردو ادب پر

• حامد اللہ افسر

پرندوں نے ہماری شاعری پر بہت احسانات کئے ہیں یوں تو اردو شاعری کا گلزار طرح طرح کے پرندوں سے بھرا پڑا ہے لیکن بعض پرند ہماری شاعری کا ایسا جزو بن گئے ہیں کہ اگر آج ہم ان کو اپنی شاعری سے خارج کر دیں تو اس کی قدر و قیمت آدھی رہ جائے۔

جب ہم چمنستان اردو کی روشوں پر گلگشت کرتے ہوئے نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو اسے قسم قسم کے خوش آواز اور خوش رنگ پرندوں سے آباد پاتے ہیں۔ سب سے پہلے بلبل پر نظر پڑتی ہے، گو یہ پرند ہمارے ملک کا پرند نہیں ہے اور شاید اس سرزمین کی آب و ہوا اس کو راس بھی نہیں آتی لیکن اس کے باوجود ہماری شاعری پر اس درجہ اس کا قبضہ ہے کہ مشکل سے کوئی غزل ایسی ملے گی جس کے کسی نہ کسی شعر کو بلبل نے رونق نہ بخشی ہو۔ یہ اصل میں ایران کا ایک خوش الحان اور شیریں زبان پرند ہے۔ اس کی دو قسمیں بہت مشہور ہیں حسینی بلبل جس کا کل جسم سفید اور چوٹی سیاہ ہوتی ہے اور سلطانی بلبل جس کا کل جسم سرخی مائل اور چوٹی سیاہ ہوتی ہے، دونوں کی دُمیں بڑی ہوتی ہیں۔

اردو شاعری میں بلبل کو عاشق کا نمائندہ سمجھنا چاہیے اور ایک عاشق پر عشق میں جو کچھ نہیں گزر سکتا۔ اردو شعر کی دنیا میں وہ سب اس پر گزرتا ہے، اس چھوٹی سی چڑیا پر وہ وہ مصائب توڑے جاتے ہیں جن کو شاید قوی سے قوی اور بہادر سے بہادر انسان بھی نہیں سہ سکتا۔ کبھی اس کا دل خون ہو کر اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑتا ہے، کبھی اس کو گرفتار کرنے کے لیے گل کی رگوں کا جال بچھایا جاتا ہے، کبھی اس کو قفس میں بند کر کے باغ میں بہار کو بلا لیا جاتا ہے، کبھی اس کو ذبح کر کے سارے گلشن میں اس کا خون بکھیر دیا جاتا ہے جس سے پھولوں کا رنگ نکھر جاتا ہے، غرض طرح طرح سے اس کی گت بنائی جاتی ہے۔

پرندوں کی دنیا جو ہمارے شاعروں نے بسائی ہے وہ ایک بڑی حد تک محض خیالی ہے، فطرت کے حسن میں پرندوں نے جو چار چاند لگائے ہیں اس کے ذکر سے ہماری شاعری محروم ہے، موجودہ دور کی بعض نظموں کو چھوڑ کر شاذ و نادر ہی ایسا کوئی شعر مل جاتا ہے جس میں کسی پرند کو فطرت کا ایک خوشنما اور

کیف انگیز جزو ہونے کی حیثیت سے جگہ دی گئی ہو۔
اب چمن زار اردو میں بلبل کی بہار دیکھیے۔ میر تقی میر گلچیں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ؎

سن اے بے درد گلچیں غارتِ گلشن مبارک ہو
پہ ٹک گوشِ مروت جانبِ فریادِ بلبل کر

اسی مضمون کو دوسرے لفظوں میں سنیئے ؎

بلبل کی اُدر چشمِ مروت سے دیکھ ٹک
بیدردیوں چمن میں کسو پھول کو نہ توڑ

دونوں شعروں میں بلبل کو عاشق فرض کر کے گلچیں کو پھول توڑنے سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میر نے ایک اور شعر میں گل کو جفا جو قرار دیا ہے اور بلبل کو اتنا وفادار ظاہر کیا ہے کہ اس نے اپنی جان ہی قربان کر دی ؎

گل کی جفا بھی جانی، دیکھی وفائے بلبل
یکمشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

میر کبھی کبھی بلبل سے ناراض بھی ہو جاتے ہیں کہتے ہیں ؎

بلبل کی بے کلی نے شب بے دماغ رکھا
سونے دیا نہ ہم کو، ظالم نہ آپ سوئی

ایک اور شعر میں ان کی ناراضگی زیادہ خلاف فطرت نہیں ہے ؎

جاتے نہیں اٹھاتے یہ شور ہر سحر کے
یا اب چمن میں بلبل ہم ہی رہیں گے یا تو

خواجہ میر درد صوفی مشرب شاعر ہیں، ان کے نزدیک اگر انسان گوش ہوش وا رکھے تو بلبل جیسے خوش الحان پرند اور زاغ جیسے کریہہ الآواز پرند میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کہتے ہیں ؎

غفلتِ دل ہوئی مگر پنبۂ گوش خلق درد
بلبلِ داستاں سرا ورنہ ہر ایک زاغ ہے

سودا اپنی فریاد کو بلبل کی فریاد سے زیادہ پُر

معصوم امنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولوں میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہے

ہم تری صورتِ انکار کو پہچانتے تو ہیں
وہ تبسم تو شریکِ لبِ گویائی کر

محمد حفیظ نام، حفیظ تخلص، کنیت ابوالاثر ۱۹۰۰ء/۱۳۱۸ھ میں پنجاب کے قدیم شہر جالندھر میں پیدا ہوئے ان کا خاندان قدیم چوہان سورج بنسی راجپوت خاندان کی ایک شاخ ہے جو دو سو سال قبل مسلمان ہو گیا تھا۔ حفیظ کی ابتدائی تعلیم جالندھر میں ہوئی بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ مولانا غلام قادر گرامی سے اصلاح لی۔ ۱۹۲۵ء میں پہلا مجموعہ "نغمہ زار" ان کی شہرت کا باعث ہوا۔ "سوز و ساز" اور "تلخابۂ شیریں" بعد کا کلام ہے حفیظ کا سب سے بڑا کارنامہ "شاہنامۂ اسلام" ہے۔
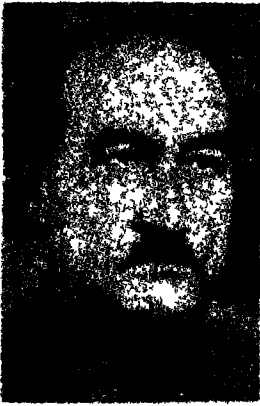
بے ہوشیوں نے اور خبردار کر دیا ‎ ‎ سوئی جو عقل، روح کو بیدار کر دیا

جس آنکھ کے پردے میں چھلکتے ہیں آنسو ‎ ‎ دراصل وہ سرچشمۂ انوارِ خدا ہے

مگر راتوں کو جب فکرِ وطن میں سر جھکاتا ہوں

فضائے سرد میں دھیمی سی اک آواز پاتا ہوں

یہ آواز اس لطافت سے مرے کانوں میں آتی ہے

صبا جس طرح، زیرِ شاخِ سنبل گنگناتی ہے

فضا میں جس طرح "روح الامیں" کی بال جنبانی

برستا ہو کہیں کچھ دُود، جیسے خواب میں پانی

جگاتی ہے سحر جس ناز سے نغموں کو دریا میں ‎ ‎ ہوا کی سنسناہٹ جس طرح گنجان صحرا میں

حقیقت کیا بتاؤں، اس صدائے روح افزا کی ‎ ‎ نہاں ہیں جس کے اندر کاوشیں امروز و فردا کی

شبیر حسین خاں نام، جوشؔ تخلص، "شاعرِ انقلاب" خطاب، ملیح آباد وطن۔ ۱۸۹۴ء ۱۳۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ بزرگ کابل سے ہندوستان آئے تھے۔ والد بشیر احمد خاں بشیرؔ اور دادا نواب محمد احمد خاں احمدؔ دونوں صاحبِ دیوان تھے۔ جوشؔ کے پردادا نواب حسام الدولہ تہور جنگ فقیر محمد خاں گویاؔ (شاگردِ ناسخ) کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ جوشؔ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر کچھ عرصہ تک چند اسکولوں میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۴ء میں حیدرآباد دکن گئے اور دس سال تک عثمانیہ یونیورسٹی کے "دارالترجمہ" میں ملازمت کی۔ جوشؔ نے بچپن سے شعر کہنا شروع کیا۔ اور عزیزؔ لکھنوی سے اصلاح لی۔ کچھ عرصہ تک غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ اس کے بعد اپنی توجہ نظم کی طرف مبذول کر دی۔ جوشؔ کی شاعری، اُن کے کردار اور سیرت کا آئینہ اور خود اُن پر گزری ہوئی کیفیتوں کا مرقع ہے۔ "شبابیات" ان کا خاص موضوع ہے۔ اُن کو زبان پر پوری قدرت ہے۔ ان کے کلام میں اگر ایک طرف غنائی شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں تو دوسری طرف انقلابی اور خصوصاً اشتراکی عنصر آب و تاب سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔

تاثیر بتاتے ہیں ؎

نالے نے ترے بلبل نم چشم نہ کی گل کی

فریاد مری سن کر صیاد بہت رویا

ایک اور شعر میں بلبل کے نالوں کی تاثیر کے متعلق سوداؔ طنز کرتے ہیں ؎

کیوں ہے خاموش مری طرح چمن میں بلبل

تیرے نالوں کی تو تاثیر بہت اچھی ہے

تپشؔ بلبل کے نالہ کو خدا کے حسن کا افسانہ قرار دیتے ہیں جس کو سننے کے لیے گل عدم سے ہستی میں آتے ہیں۔

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش

بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اس کا

مومنؔ بلبل کو متنبہ کرتے ہیں کہ پھول سے وفا کی اُمید نہ رکھو، اس نے تیری محبت کا سودائی بن کر اپنا لباس چاک نہیں کیا ہے ؎

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیے

چاک یہ ابنِ گل پر تو نہ جائے بلبل
جامہ یاران (یاسمن) کا قبا ہوتا ہے
غالب نے بلبل کو غزل خوانی سکھا دی ہے
جب چمن میں آیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

اقبال فلسفی ہیں اور اپنے لفظ لفظ سے قوم کے

سید سلیمان ندوی

پیدائش ۱۸۸۴ء وطن عظیم آباد پٹنہ، والد کا نام حکیم سید ابوالحسن۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی اور خوش قسمتی سے مولانا شبلی جیسے بے مثل ادیب، محقق اور مفکر استاد ملے۔ ان کی نظر انتخاب نے بھی انہی کو اپنا جانشین بنایا۔ عربی ادب و تاریخ کے ذوق نے ان کو بجائے طبیب کے ادیب بنا دیا۔ مولانا شبلی نے بسترِ مرگ پر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر "سیرت، سیرت" کہا تھا۔ مولانا سلیمان نے یہ حق ادا کیا اور سیرت النبیؐ کی بقیہ چار جلدیں لکھیں۔ مولانا کی تحریروں میں علمیت اور ادبیت کے ساتھ ایک زور اور حلاوت پائی جاتی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں کراچی میں انتقال فرمایا۔

دل میں ولولہ اور جوش پیدا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں،
وہ بلبل اور شہباز کا مقابلہ کر کے بتانا چاہتے ہیں کہ چمن
کا کیف و سرور نہیں بلکہ بیابان کی ویرانی زندگی کو
زندگی بناتی ہے ؎

یہ حسن و لطافت کیوں، وہ قوت و شوکت کیوں
بلبل چمنستانی، شہباز بیابانی

ایک اور شعر میں نسیم سحر کی زبان سے کہتے ہیں ؎

مجبور ہوئی جاتی ہوں میں ترکِ وطن پر
بے ذوق ہیں بلبل کی نواہائے طربناک

بندۂ آزاد کی ایک نظر سے بلبل میں اقبال شاہیں
کے اوصاف بھر دیتے ہیں ؎

شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار
کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز

ذیل کے شعر میں بلبل و طاؤس کی تقلید سے مغربی
تہذیب کی طرف اشارہ ہے ؎

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

اکبر الٰہ آبادی بھی غالب کی طرح بلبل کو چہکنا سکھاتے
ہیں مگر جو کیفیت غالب کے یہاں ہے وہ ان کے یہاں
نہیں ہے ؎

جو محفل میں اکبر نے کھولی زباں
گلستاں میں بلبل چہکنے لگے

ایک اور شعر میں اکبر نے بلبل کے ترانوں میں بھی
نئے زمانے کا اثر دکھایا ہے ؎

رنگِ رخِ بہار کی زینت ہوئی نئی
گلشن میں بلبلوں کا ترانہ بدل گیا

اردو شاعری میں عندلیب کی صورت میں بھی بلبل
جلوہ گر نظر آتی ہے۔ میر تقی میر فرماتے ہیں ؎

سدا ہو خار خار باغباں گل کا جہاں مانع

عزیز لکھنوی

مَیں تو بے ہوش ہوا ، ذوقِ نظر سے اپنی
تیری تاثیر تھی اے جلوۂ جانانہ جدا

اب بھی زیادہ عالمِ اسباب سے ہے وہ
جو کچھ کسی کے اُجڑے ہوئے دل میں رہ گیا

بس یہ تھی وسعتِ آرائشِ گیتی محدود
دونوں عالم کو ترے وصل کا ساماں سمجھا

کہہ کے بیمار سے یہ بجھ گئی شمع
رات ہوتی ہے یوں بسر دیکھو

بے حقیقت دل کی ہستی کو وہ سمجھے تھے مگر
اس ہو کی بوند نے عالم تہ و بالا کیا

مرزا محمد ہادی نام، عزیز تخلص ۱۸۸۲ء/۱۳۰۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، اُن کے والد مرزا محمد علی ایک زبردست عالم تھے۔ اصل وطن شیراز ہے۔ جدِ امجد مرزا محمد جعفر شیراز سے کشمیر آئے۔ کئی پشتوں سے ان کا خاندان لکھنؤ میں متوطن ہے اور اسکا شمار شہر کے ذی علم خاندانوں میں ہوتا ہے۔ عزیز نے عربی اور فارسی کی تعلیم وطن ہی میں پائی۔ شاعری میں صفی لکھنوی سے استفادہ کیا، اور اُنیس برس کی عمر میں اچھے شعر کہنے لگے۔ ۱۹۲۵ء/۱۳۵۴ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

سمجھو اے عندلیب اس باغ سے کنجِ قفس بہتر

میر نے ایک شعر میں عندلیب کی آواز دلخراش کا اثر ظاہر کیا ہے ؎

اللہ رے عندلیب کی آواز دلخراش
جی ہی نکل گیا جو کہا اس نے ہائے گل

میر ہی کا ایک اور شعر ہے ؎

سیر کر عندلیب کا احوال
ہیں پریشاں چمن میں کچھ پر و بال

ناسخ اپنے موزوں نالوں سے عندلیب کی فریاد کا مقابلہ کرتے ہیں ؎

نالۂ موزوں یہ کہتے ہیں بہ آوازِ بلند
آج ہم باطل کریں گے دعوہ ہائے عندلیب

جوش ملیح آبادی گلبانگ سے توجہ ہٹا کر ترانۂ زاغ کی طرف رخ کرنے کی ہدایت کرتے ہیں ؎

اگر اُچاٹ ہے گلبانگِ عندلیب سے دل
تو بن خدا کے لیے محرمِ ترانۂ زاغ

جگر مراد آبادی بلبل کو گل کے پردہ میں خدا کے جلوے کی طرف متوجہ کر رہے ہیں ؎

اور کیا چاہتی ہے، بلبلِ شوریدہ مزاج
پردۂ گل میں ہے خود چاک گریباں کوئی

ایک اور شعر میں جگر نے غنچوں کے کھلنے اور ان میں رنگ و بو پیدا ہونے کا سبب بلبل کے نالہ ہائے خونیں کو قرار دیا ہے ؎۔

کرے نہ کام جو بلبل کا نالۂ خونیں!

پیدائش ۱۸۵۶ء تعلیم ایف اے تک ۱۸۷۷ء میں اپنا مشہور اخبار "اودھ پنچ" لکھنؤ سے جاری کیا۔ زندہ دلی انکی گھٹی میں پڑی تھی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں اکبر الہ آبادی، نواب آزاد، ظریف اور رتن ناتھ سرشار جیسے زندہ دل سحر بیان اور جادو قلم نامہ نگار ملے جنہوں نے "اودھ پنچ" کو چار چاند لگا دیئے۔ سجاد حسین کی تحریر کا ایک خاص انداز تھا جس میں واقعیت اور معلومات کے ساتھ لطائف و ظرائف بکثرت ہوتے تھے۔ ان کی تحریر میں بے باکی اور آزادیٔ خیال حد سے زیادہ تھی، جو کہتے تھے بانکے پن سے کہتے تھے۔ سجاد حسین نے ظریفانہ ناول نگاری کی بنیاد ڈالی۔ انکے ناولوں میں جدت طرازی بھی ہے۔ اور ظرافت نگاری بھی "حاجی بغلول" ان کا شاہکار ناول ہے۔ ۱۹۱۵ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

نہ نکلے نیند سے چونکیں نہ رنگ و بو آئے!
مگر بلبل کی فریاد کو بے اثر نہیں مانتے ؎

دم بخود رہ گئی بلبل ہی چمن میں ورنہ
کون سا پھول تھا جو گوش بر آواز نہ تھا

بلبل کا ذکر بہت ہو چکا، اب چمن زار اردو کے اور پرندوں کا ذکر سنئے۔

قمری بھی مجازی عاشق ہے۔ یہ فاختہ کی قسم کا ایک پرندہ ہے جس کے گلے میں طوق ہوتا ہے۔ قمری اکثر سرو کے درخت پر بیٹھنا پسند کرتی ہے اس لیے اردو شاعری میں اسے سرو کا عاشق قرار دیتے ہیں۔ میر تقی میرؔ فرماتے ہیں ؎

پروانہ ہوں ازل سے سراجِ منیر کا
قمری ہوں سروِ باغِ علیِ کبیر کا

میرؔ ہی کا شعر ہے ؎

عشق قمری کو ہو بے سروِ گلستاں کیونکر
ابر پیدا نہیں طاؤس ہو رقصاں کیونکر

میرؔ ایک اور شعر میں چمن کی نہر کا منبع قمری کی "چشم گریاں" کو قرار دیتے ہیں ؎

شاید کہ مند گئی ہے قمری کی چشم گریاں
کچھ ٹوٹ سا چلا ہے پانی چمن کے جو کا

ذوقؔ نے قمری کی فریاد سے صور کا کام لیا ہے ؎

تیرے قامت سے جو ہو برپا قیامت سر پر
کام لے منقار سے فریادِ قمری صور کا

کویل میں بعض ایسی خصوصیات موجود ہیں جو شاعری کی دنیا کو چار چاند لگا سکتی ہیں اور شعر کو کیفیات سے لبریز کر سکتی ہیں لیکن اردو شعرا نے اس پرندے کی ان صفات سے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ منیرؔ شکوہ آبادی جیسے شاعر پر کوئل کوئی خاص اثر قائم نہ کر سکی کہتے ہیں ؎

آم کے بور کی کثرت سے نہ نکلے باہر
بیٹھ جائے وہیں آواز جو بولے کوئل

اور کسی کا شعر ہے ؎

دشتِ جنوں میں آیا تھا میں کونسی گھڑی

بے چین کر دیا مجھے کویل نے کوک کے

آرزو لکھنوی اپنے شعر میں حقائق زندگی سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں ؎

سونے گھر میں ایک تو یوں ہی کہیں آتی ہے نیند
کوک اٹھتی ہے جو کویل اور اڑ جاتی ہے نیند

راقمِ مضمون کا ایک شعر ہے ؎

رسیلا راگ چھیڑا، آم کے باغوں میں کویل نے
نہ ہو جب کوئی دل والا تو اس کا درد کیا سمجھے

راقم مضمون ہی کا ایک اور شعر ہے ؎

ہیں آموں کے باغوں میں نغمے رسیلے
یہ ساون کی راتیں ہیں کویل کی راتیں

طوطی۔ یا توتی اردو شاعری میں اکثر چہکتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ پرند توتے سے مختلف ہے۔ جو لوگ اسے توتے کا مونث سمجھتے ہیں غلطی پر ہیں۔ یہ لفظ اردو میں مذکر ہے۔ توتی اصل میں ایک خوش آواز پرند ہے جو شہتوت کے موسم میں اکثر دکھائی دیتا ہے اور شہتوت بہت رغبت سے کھاتا ہے، شاید اسی وجہ سے اس کا نام توتی پڑ گیا ہے۔ عربوں نے اس کا املا طوطی کر دیا ہے۔

امیر مینائی کا شعر ہے ؎

صدایہ قلقلِ مینا سے میخانے میں آتی ہے
کہ بختِ سبز اک طوطی ہے مستوں کے گلستاں کا

امیر لکھنوی نے ایک محاورے سے کام لیا ہے ؎

آئی خزاں فسردہ ہوئے گل گئی بہار
طوطی چمن میں بول چکا عندلیب کا

امیر ہی کا ایک اور شعر ہے، اس میں بھی محاورے کو خوبصورتی سے نبھایا ہے ؎

ہے قفس میں شور اک گلشن تلک فریاد کا
بولتا ہے آج کل طوطی مرے صیاد کا

مور کے خوبصورت پروں نے بھی اردو شاعری کی زیب و زینت بڑھانے میں مدد دی ہے، گو اس کا برسات میں کوکنا اور مست ہو کر ناچنا جن کیفیتوں کا حامل ہے ان سے اردو شاعری نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ کہتے ہیں کہ آدم کے ساتھ بہشت سے یہ بھی

۱۸۸۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں سینٹ اسٹیفنسز کالج دہلی سے بی اے کر کے حیدرآباد دکن میں ملازم ہو گئے۔ جب ریٹائر ہوئے تو اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری تھے۔ وہیں ۱۹۴۷ء میں انتقال ہوا۔ فرحت اللہ بیگ کی زبان دِلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ شوخی اور سنجیدہ طنز و ظرافت ان کی انشا کا طرۂ امتیاز ہے۔ بیان کی سادگی اور زبان کا لوچ ان کی ظرافت میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ اسی لئے مزاح نگاری میں انہیں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ مشاہیر کی قلمی تصویر کھینچنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اپنے استاد "مولوی نذیر احمد کی کہانی اپنی زبانی" ان کا غیر فانی شاہکار ہے۔

نکالا گیا تھا۔ شاید اسی لیے اردو شعر کی دنیا میں اسے مقبولیت حاصل نہیں ہے۔ امیر مینائی کا شعر ہے ؎

مور ناچیں کوئلیں کوکیں پپیہے بول اٹھیں
وصل کے دن آ گئے فصل آئی کیا برسات کی

مور طاؤس کی صورت میں بھی اردو شاعری میں نظر آ

رجب علی بیگ سرور

۱۷۸۷ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ والد کا نام اصغر علی بیگ تھا۔ ۱۸۲۴ء میں غازی الدین حیدر شاہ اودھ نے جلاوطن کر دیا تو سرور کانپور چلے گئے لیکن نصیر الدین حیدر نے پھر لکھنؤ بلا لیا۔ بعد میں واجد علی شاہ نے سرور کو اپنا درباری شاعر بنا لیا۔ جب ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ ضبط ہوئی اور واجد علی شاہ جلاوطن ہو کر مٹیا برج کلکتہ میں نظر بند کر دیے گئے تو سرور کو مہاراجہ بنارس نے اپنے پاس بلا لیا۔ اور وہیں ۱۸۶۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ سرور نے ۱۸۲۴ء میں فسانۂ عجائب لکھی یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے اور اسی سے ان کا نام زندہ ہے۔ 'فسانۂ عجائب' کی عبارت نہایت پرتکلف مقفیٰ و مسجع ہے۔ ہر جگہ رنگینی اور دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ سرور صاحب کا بہت بڑا کمال تھا۔

جاتا ہے ؎

مرغ خوش خواں اس چمن کا ہوں کہ جس کے صحن میں
آسماں طاؤس سا کرتا ہے صبح و شام رقص

مندرجہ بالا شعر میں پپیہے کا بھی ذکر ہے۔ یہ ایک پہاڑی پرند ہے اور بہت ہی خوش آواز ہوتا ہے۔ اس کی آواز میں سوز اور درد ہے۔ ہندی شاعری میں اس کا درجہ وہی ہے جو اردو شاعری میں بلبل کا ہے، لیکن اردو میں اس کی پوچھ زیادہ نہیں ہے۔ محسن کاکوروی کا شعر ہے ؎

پپیہے نے لیں دل میں سو چٹکیاں
کہاں بولتا ہے سکھی پی کہاں

ہدہد۔ یا مرغ سلیمان ایک خوب صورت پرند ہے جس کے سر پر تاج ہوتا ہے۔ مصر والے اس کو حضرت سلیمانؑ کا بیٹا خیال کرتے ہیں۔ مصریوں ہی کی ایک روایت ہے کہ پہلے اس کا تاج سونے کا تھا۔ لالچ سے لوگ اسے مارا کرتے تھے۔ جب اس نے حضرت سلیمانؑ سے فریاد کی تو انہوں نے اس سونے کے تاج کو اس کی جان کا وبال خیال کر کے دعا دی کہ اس کا پروں کا تاج ہو جائے چنانچہ اسی وقت سے اس کا تاج پروں کا ہو گیا۔ کسی کا شعر ہے ؎

ہوئی تکرار لے جانے میں کیا کیا جب لکھا نامہ
صبا سے نامہ بر بگڑا لڑا ہدہد کبوتر سے

لال ایک چھوٹے سے خوش آواز پرند کا نام ہے جس کا رنگ سرخ ہوتا ہے اور پروں پر سفید چتیاں ہوتی ہیں، مسلمان اس کی آواز سے "صم بکم عمی فہم لا یرجعون" کا تلفظ ادا ہونا خیال کرتے ہیں، برسات میں اس کی سرخی نہایت تیزی پر ہوتی ہے۔ وزیر لکھنوی کا شعر ہے ؎

رنگیں لبِ لعل کی صدا ہے
کیا خوب یہ لال بولتا ہے

کبوتر بھی اردو شاعری میں کہیں کہیں اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مصحفی کا شعر ہے ؎

الحذر اے طائرِ دل دیکھئے ہوتا ہے کیا
جان پر کھیلے ہیں ہم اس کا کبوتر مار کے

شاما ایک سیاہ رنگ خوش الحان پرندہ ہے۔ محسن کاکوروی نے کاجل کو شاما کی طرح اڑایا ہے ؎

صاف آمادۂ پرواز ہے شاما کی طرح
پر لگائے ہوئے مژگانِ صنم سے کاجل

عقاب۔ گدھ کی قسم کا ایک شکاری پرندہ ہے ؎

نہ ملے گا کبھی شکارِ یقیں
گو عقابِ گماں بلند ہوا

شہباز۔ بڑے باز کو کہتے ہیں جس کی مدد سے پہلے زمانے میں بادشاہ شکار کھیلا کرتے تھے۔ آتش لکھنوی کہتے ہیں ؎

تو نے زلفوں کو الجھ پڑنے سے منڈوا دیا جو یار
شاہبازِ حسن بے بازو نظر آیا مجھے

اقبال نے اردو شاعری میں شہباز کو بہت سربلندی عطا فرمائی ہے۔ تین شعر کے ایک قطعہ میں فرماتے ہیں ؎

زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پر
شپرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہنر
لیکن اے شہباز یہ مرغانِ صحرا کے اچھوت
ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر
ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام
روح ہے جس کی دمِ پرواز سر تا پا نظر

اقبال کا ایک اور شعر ہے ؎

عشق طینت میں فرومایہ نہیں مثلِ ہوس
پرِ شہباز سے ممکن نہیں پروازِ مگس

شاہین بھی ایک شکاری پرندہ ہے۔ اس کا رنگ سفید

محمد حسین آزاد

۱۸۳۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ محکمۂ تعلیم کی ملازمت کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۱۰ء میں انتقال ہوا۔ اردو نثر نگاروں میں آزاد کی شخصیت بہت نمایاں ہے۔ نثر میں ان کا طرز جداگانہ ہے۔ ان کی تصانیف میں 'آبِ حیات' اور 'نیرنگِ خیال' نے اہلِ قلم کو محو حیرت کر دیا۔ محمد حسین آزاد میں نازک خیالی اور لطافت دو ذوقیت خداداد تھی۔ فارسی زبان کی محبت نے اس جوہر کو اور بھی چمکا دیا۔ نثر میں شاعرانہ تخیل اور اسلوبِ بیان کی دلکش برجستہ مثالیں آزاد کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتیں جس انشاپردازی کو ادب کی جان اور لٹریچر کی روح کہا جا سکتا ہے وہ صرف آزاد کی تحریر ہے۔ ان کا انداز دلکش اور دل آویز ہوتا ہے۔ اس انشاپردازی کی تقلید آج تک کسی سے نہیں ہو سکی۔

۱۸۵۱ء میں اپنے وطن بلگرام (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۴ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد ۱۸۷۹ء میں تعلیم حاصل کرنے انگلستان گئے۔ اور یورپ سے ڈاکٹریٹ اور ڈی لٹ کی ڈگریاں لیں۔ بلگرامی بہت سی زبانوں کے عالم تھے لیکن تصنیف کی طرف کبھی توجہ نہیں دی۔ صرف ترجمے ان کی یادگار ہیں۔ مگر وہ ترجمے بھی تصنیف سے کم نہیں۔ "تمدن عرب" کا ترجمہ اس قدر لطیف ہے کہ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے نازک سے نازک فلسفیانہ بحثیں اور معمولی روزمرہ اس برجستگی کے ساتھ اردو قالب میں ڈھالے گئے ہیں کہ ان ترجموں سے معلوم ہوتا ہے کہ سید علی بلگرامی کو اردو زبان پر پوری طرح عبور حاصل تھا۔

دیتا ہے۔ اردو شاعری میں اس کو ڈاکٹر اقبال کے زمانہ تک کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی لیکن انہوں نے اپنے فلسفہ کی ترویج میں اس سے بہت کام لیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں

کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

ایک شعر میں مسلمانوں کے لیے موجودہ تعلیم کی غیر موزونیت کے متعلق فرماتے ہیں ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

یہ تو نام نام چند ایسے پرندوں کا ذکر تھا جنہوں نے اردو شاعری کو اپنے وجود سے مالامال کیا ہے اس کے علاوہ ہماری شاعری میں بغیر کسی طائر کا نام لیے قریب قریب ہر شاعر نے پرندوں کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے استعارہ کیا ہے۔ میر تقی میر فرماتے ہیں ؎

کیا زمزمہ کروں ہوں خوشی تجھ سے ہم صفیر
آیا جو میں چمن میں تو جاتی رہی بہار

میر ہی کا ایک شعر ہے ؎

بے بال و پر اسیر ہوں کنج قفس میں میر
جاتی نہیں ہے سر سے چمن کی ہوا ہنوز

میر نے کیا خوب شعر کہا ہے ؎

چمن میں دلخراش آواز آتی ہے چلی شاید
پسِ دیوارِ گلشن نالہ کش ہے کوئی پربستہ

جگر مرادآبادی فرماتے ہیں ؎

مجھے دیں نہ غیظ میں دھمکیاں گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مری سلطنت یہی آشیاں، مری مملکت یہی چار پر

اثر لکھنوی کا شعر ہے ؎

اسیری ایسی آزادی سے بہتر
چمن اپنا نہ اپنا آشیاں ہے

اثر ہی کا ایک اور شعر ہے ؎

کیوں غارت چمن پہ اتر آئیں بجلیاں
کیا ان کی رہ گزر میں مرا آشیاں نہ تھا

حفیظ جالندھری کا شعر ہے ؎

رونقِ بزم ہے شیون سے تو شیون ہی سہی

ہم صفیرانِ چمن پھر نہ خفا ہو جانا

حفیظ کا ایک اور شعر سنئے ؎

نہ کر ذکرِ نشیمن فکرِ آزادی میں اے ہمدم
مبادا اپنے ہاتھوں سے قفس تیار ہو جائے

اقبال اپنے مخصوص رنگ میں فرماتے ہیں ؎

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

ایک اور شعر میں کیا خوب بات کہی ہے ؎

شاخِ گل پر چہک ولیکن
کر اپنی خودی میں آشیانہ

ایک اور شعر میں مغربی ممالک کی عیّاریوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں ؎

گرچہ ہے دل کشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار
طائرکِ بلند بال دانہ و دام سے گزر

اس کے علاوہ اردو شعرا نے بغیر کسی پرندے کی تخصیص کے لفظ "مرغ" طائر کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور اس کے پردے میں طرح طرح کی خیال آرائیاں کی ہیں۔

میر تقی میر کا شعر ہے ؎

مرغانِ قفس سارے تسبیح میں تھے گل کی
ہر چند کہ ہر اک کا ڈھلکا ہوا منکا تھا

ایک اور شعر میر کا ہے ؎

حیرتِ روئے گل سے مرغِ چمن
چپ ہے یوں بے زبان ہے گویا

میر ہی کا یہ شعر بھی ہے ؎

ہوش اڑ گئے سبھوں کے شورِ سحر سے اسکے
مرغِ چمن اگرچہ یک مشت بال و پر تھا

اقبال فرماتے ہیں ؎

نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں
جو ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز

راقمِ مضمون کا ایک شعر ہے ؎

بادلوں کی سرزمیں پر نغمہ ہائے جاں فزا
مرغِ خوش پرواز آزادی اسی کا نام ہے

جو پرندے نظر کے سامنے تھے یا جن کا نام سنا تھا اردو شعراء نے صرف انہیں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایسے پرندوں سے بھی اُردو شعر کے باغ کو آباد کیا ہے جن کا وجود دنیا میں
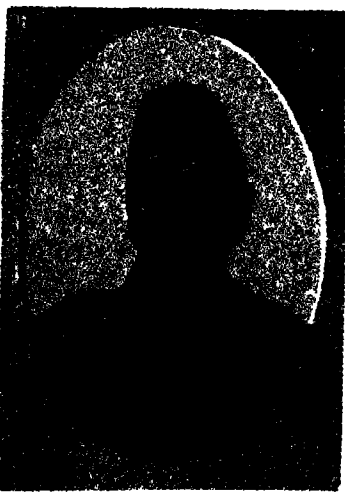
۱۸۴۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے کشمیری خاندان سے تھے، کیننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۷۸ء میں منشی نول کشور کے اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اسی اخبار میں "فسانۂ آزاد" لکھا۔ جو ناول نویسی کے فن میں منفرد اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد میں انتقال ہوا۔

نہیں مثلاً ھما یہ ایک فرضی پرندہ ہے اس کے متعلق
شعرا کا خیال ہے کہ جس کے سر پر اس کے پروں کا سایہ
پڑ جائے وہ بادشاہ ہو جائے۔ ایک اور خیالی پرند کا
نام عنقا رکھا ہے، اس کا بھی دنیا میں وجود نہیں ہے۔
اور خود شاعر اس لفظ کو ایسی چیزوں کے لیے استعمال
کرتے ہیں جو دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ ★★

اردو کا مستقبل اور ڈاکٹر اقبالؒ

جب میں پہلے پہل لکھنؤ گیا تو وہاں کے مشہور شاعر پیارے صاحب رشید زندہ تھے لکھنؤ کے بعض
شاعری سے دلچسپی رکھنے والے دوستوں نے میری آمد پر شعر و سخن کی ایک مجلس منعقد کی جس میں پیارے
صاحب رشید بھی تشریف لائے۔ حاضرین سے نام بنام ملانے کے بعد میر مجلس نے فرمائش کی کہ میں اپنا کلام
سناؤں۔ چنانچہ ان کے ارشاد کی تعمیل میں میں نے اپنی چند نظمیں سنائیں۔ میں وہ منظر اب تک نہیں بھولا کہ میں
اپنا کلام سنا رہا تھا اور میرے ہر ہر شعر پر پیارے صاحب رشید کے چہرے سے حیرت اور کوفت کے ملے جلے
جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ کبھی ان کی بھنویں تنتی تھیں اور پھیل جاتی تھیں، کبھی آنکھیں اکبارگی کھلتی تھیں اور
اکبارگی بند ہو جاتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ جب میں کلام سنا چکا تو ان کے پاس بیٹھ کر
میں نے ادب سے پوچھا۔ آپ کے سامنے شعر پڑھنا ہے تو گستاخی، لیکن جو کچھ میں نے عرض کیا، آپ نے ملاحظہ
فرمایا؟ انہوں نے قدرے تامل سے جواب دیا۔ ہاں صاحب سنا ہے لیکن سچ پوچھئے تو ایسی اردو نہ ہم نے آج تک
پڑھی ہے نہ سنی ہے، حیران ہوں کہ یہ فارسی ہے یا اردو ہے یا کوئی اور زبان ہے (پھر کسی قدر تبسم کے ساتھ)
اب دلی اور لکھنؤ کے وہ لوگ رخصت ہوتے جا رہے ہیں جن کے دم سے اردو شاعری کے ان دو مرکزوں کی
خصوصیتیں قائم تھیں، اور چند سال کی بات ہے کہ لکھنؤ، دلی، لاہور اور حیدر آباد دکن ایک سطح پر آ جائیں گے۔

زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ
خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب
کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے، ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاق سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئے
(۹ اگست ۲۳ء۔ اقبال نامہ حصہ اوّل ص۵۱)

زبانیں اپنی اندرونی قوتوں سے نشوونما پاتی ہیں اور نئے نئے خیالات و جذبات کے ادا کر سکنے پر ان کے
بقا کا انحصار ہے۔
(۹ ستمبر ۳۷ء۔ اقبال نامہ حصہ دوم ص۸۵)

اردو کے یورپین شعراء

(ماخوذ از اردو نمبر روزنامہ نئی دنیا ۱۹۵۳ء)

ہندوستان میں ایک وقت وہ تھا جب شاعرانہ آب و ہوا اس درجہ سازگار تھی کہ اکثر یورپین بھی گلشن شعر و شاعری میں محوِ خرام نظر آتے تھے۔ مثال کے طور پر الیگزینڈر ہیڈرلی آزاد، بوربون، جوزف ماتوک المتخلص بہ عاشق، ٹامس جیمز نفیس وغیرہم کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ غالباً آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ چند انگریز خواتین بھی خدا کے فضل و کرم سے شاعری کرتی تھیں جن کی جودت طبع نے گیسوئے اردو سنوارنے میں کوئی کمی باقی نہیں رکھی تھی۔ اب میں ان کے مختصر حالات و کلام کا نمونہ پیش کرتا ہوں:۔

کپتان الیگزینڈر ہیڈرلی ایک مسلمان شریف زادی کے بطن سے تھے کیونکہ ان کے والد مکرم موسیو جیمس ہیڈرلی کو دارالسلطنت دہلی کی رنگین صحبتوں نے اپنا اس قدر گرویدہ کرلیا تھا کہ وہ یہیں کی معاشرت اختیار کرکے اپنے وطن (فرانس) سے ہمیشہ کے لئے منہ موڑ چکے تھے۔

الیگزینڈر کی تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی تھی۔ جب انہوں نے سترہ اٹھارہ کے سن میں قدم رکھا تو دہلی نے جو ان دنوں شعر و ادب کا گہوارہ تھی۔ ان میں شعر و سخن

جمن ڈیوڈ مانٹروز مفطر ◄

اردو نمبر

کا ایسا مذاق پیدا کیا کہ وہ اچھے اچھے شعر کہنے اور نواب زین العابدین خاں عارف سے اصلاح لینے لگے۔ آپ میں لطیفہ گوئی، رنگین بیانی اور حاضر جوابی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی چنانچہ آپ کے کلام میں ان خداداد اوصاف کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی اور آپ تیس سال کی عمر میں ہی اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کی تاریخ وفات ۷ر جولائی ۱۸۹۱ء ہے۔ آپ کے بھائی طامس ہیڈرلی نے جو ریاست بھرت پور میں ڈپٹی تھے۔ آپ کے متفرق کلام کا مجموعہ ۱۸۶۵ء میں چھپوایا تھا لیکن اب وہ نایاب ہو چکا ہے تاہم ان کا کلام جو ہاتھ لگا ہے ان مختصر حالات کے بعد عرض کرتا ہوں ؎

جب مصیبت آپڑے جُز صبر بن آتا نہیں
تو گرفتارِ قفس پھڑکا، پھڑک کر رہ گیا

کچھ سمجھ کر دل میں اپنے پھر گیا شاید رقیب
شب جو دروازہ ترا کھڑکا کھڑک کر رہ گیا

یہ بزمِ پیرِ مغاں ہے ادب سے بیٹھ اے شیخ
جو ناچنا ہے تو جا کر کسی مزار پہ ناچ

یہ دردِ لا دوا ہے، نہ مجھ کو دوا پہ چھوڑ
ہمدم مریضِ عشق ہوں مجھ کو خدا پہ چھوڑ

بلاؤں تم کو کیا اس گھر میں جس گھر کی یہ حالت ہو
کہ جو اونچی سے ہے اونچی وہ ہے دیوار گردن تک

ہم نے دکھا دکھا تری تصویر جا بجا
ہر اک کو اپنی جان کا دشمن بنا لیا

آغا محمد شاہ نام، حشر تخلص، آبائی وطن کشمیر تھا۔ ۱۸۷۹ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ان کی ڈرامہ نویسی کی ابتدا ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ بعد میں کلکتہ چلے گئے کیونکہ یہی ان دنوں تھیٹریکل کمپنیوں کا مرکز تھا۔ اور تھیٹر کا طوطی بول رہا تھا جب تھیٹر کا بازار سرد پڑ گیا تو فلموں کے لئے آغا حشر نے 'یہودی کی لڑکی' اور 'رستم و سہراب' مشہور ڈرامے لکھے۔ چونکہ وہ شاعر بھی تھے۔ اس لئے ان کے ڈرامے زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اعلیٰ معیار کے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں میں وفورِ جذبات خوب دکھاتے ہیں۔ ان کا عشق بہت گہرا اور ان کے جذبات بہت عمیق ہیں۔ وہ نظم اور نثر دونوں کے استاد ہیں۔ حشر کی مکالمہ نگاری میں زورِ بیان معراج کمال پر ہوتا ہے۔ انکو مکالمہ پیش کرنے میں کمال حاصل ہے۔ آغا حشر کا ۱۹۳۵ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔

پنڈت برجموہن دتاتریہ نام کیفی تخلص۔ دہلی کے رہنے والے ۱۸۶۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے آپ کے بزرگ کشمیر سے بادشاہ فرخ سیر کے عہد میں دہلی آئے۔ والد بزرگوار کا نام پنڈت کنہیالال تھا۔ صغیر سن تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ فارسی کی تکمیل اپنے نانا سے کی جو اس زبان کے جید عالم تھے۔ شاعری کا مذاق اپنے ایک بزرگ پنڈت نرائن داس ضمیر دہلوی سے ورثہ میں پایا۔ انگریزی زبان میں فضیلت کا درجہ رکھتے تھے انجمن ترقی اردو دہلی کے رکن خاص تھے اور آپ کو محقق زبان کا درجہ حاصل تھا۔

سر کو وحشت میں پہاڑوں سے بچا کر لایا
در و دیوار سر کوچہ جاناں کے لئے

ہے جو ہر رنگ سے تو بن تیرے ؛ خون دل بھی پیا نہیں جاتا

فتنہ اٹھے ہے کس طرح ؟ ؛ اٹھ کے ذرا دکھا کہ یوں
حشر بپا ہو کس طرح ؟ ؛ چل کے ذرا بتا کہ یوں

اس بت کی راہ میں جو مجھے ساتھ لے چلے
دھو دھو کے بار بار پیوں برہمن کے پاؤں
رنگ حنا کے بوجھ سے اٹھنا محال ہے
نازک ہیں کس قدر مرے نازک بدن کے پاؤں

عزت سے مجھے پاس جو بٹھلاؤ تو آؤں
کیوں آپ سے آؤں مجھے لے جاؤ تو آؤں
کیا گھر میں تمہارے در و دیوار کو دیکھوں
تم اپنی جو صورت مجھے دکھلاؤ تو آؤں

ہے سجدہ ادھر فرض جدھر رخ ہے ہمارا
کاشانہ ترا قبلہ ہے اور قبلہ نما ہم

مذکورہ بالا انتخاب سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت آزاد نے جب ایسی خار دار زمینوں کو چمن بنا دیا ہو تو ان کے فکر رسا نے شگفتہ زمینوں میں کیسے گل کھلائے ہوں گے۔

بوربون :- یہ شہنشاہ اکبر کے عہد میں یورپ سے آیا تھا اور بہت جلد توپ خانہ کا افسر مقرر ہو گیا تھا۔ اسی کے خاندان سے جوہر بوربن جو عنایت مسیح کے نام سے بھی مشہور تھے مستقل طور پر بھوپال میں آباد ہو جانے کے باعث فارسی میں کافی دسترس حاصل کر لی تھی۔ شاعرانہ مذاق رکھنے کی وجہ سے جب کبھی شعر کہتے تو فارسی ہی میں لیکن بالعموم رزمیہ۔ کیونکہ اس وقت کا ماحول ہی ایسا تھا ان کے اردو شعر کا ایک ہی نمونہ پیش کرتا ہوں جو اس کے نام سے منسوب ہے ؎

کھینچ کر تیغ جو وہ میرے برابر آیا
راہ پر میں نے یہ جانا کہ مقدر آیا

خود نوشت سوانح نگاری

خود نوشت سوانح نگاری میں روزنامچے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ روزنامچے میں مصنف کے روز و شب کا ذکر خود اس کے قلم سے ہوتا ہے۔ روزنامچے کی ایک خالص ادبی صورت بھی ہے جس طرح مرزا رسوا نے 'امراؤ جان ادا' میں ایک طوائف کی سرگزشت لکھی۔ اسی طرح قاضی عبدالغفار نے 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' میں ایک طوائف اور ایک تماش بین کے روز و شب کا حال قلم بند کیا ہے۔ یہ تینوں کتابیں ہمارے سوانحی ادب میں ایک خاص درجے کی مالک ہیں۔ 'امراؤ جان ادا' اصل میں کسی ایک طوائف کا افسانہ نہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کی داستان ہے جس کا مرکزی کردار ایک زنِ بازاری ہے جو بالفاظ دیگر طوائفوں کی نمائندہ ہے۔ یہ کتاب کردار نگاری کے درجۂ کمال تک پہنچتی ہے۔ جس معاشرے کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔ طوائف اس معاشرے میں ایک خاص حیثیت کی مالک ہوا کرتی تھی۔ طوائف کا کوٹھا نوجوانوں کے لئے ایک تربیت گاہ سے کم نہ تھا۔ 'لیلیٰ کے خطوط' میں بھی طوائف کی ذہنیت کا ایک نہایت کامیاب تجزیہ ملتا ہے۔ یہ طوائف بھی ایک جیتی جاگتی عورت ہے لیکن نقطۂ نظر وہ نہیں جو مرزا رسوا کا تھا۔ یہاں طوائف خون آشام کے روپ میں بھی نظر آتی ہے اور پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل رکھنے والی عورت کی صورت میں بھی مگر اب طوائف کو وہ پہلا سا مقام حاصل نہیں۔ 'مجنوں کی ڈائری' میں ایک تماش بین نوجوان کے سوانح ہیں۔ ان میں تماش بینی کے پیشے پر ایک گہرا طنز ملتا ہے

شہزادہ مسیح :- آپ عنایت مسیح کے صاحبزادے اور نواب نظر محمد خاں والئ بھوپال کے وزیر خاص تھے۔ اس خاندان کے افراد نے چونکہ ہندوستانی طرز معاشرت اختیار کر لی تھی اس لئے وہ اپنا ایک نام تو ہندوستانی رکھا کرتے تھے اور دوسرا اپنی آبائی رسم، ملکی یادگار اور قومی روایت کے پیش نظر خاندانی نام برقرار رکھے چلے آتے تھے۔ شہزادہ مسیح شاعرانہ مذاق کے لحاظ سے اپنے والد مکرم کے جانشین تھے اور آپ کو حضرت میر اور سودا کی ہمعصری کا فخر حاصل تھا۔

آپ کا کلام کافی تھا اگر وہ زیورِ اشاعت سے مرصع ہو سکتا تو یقیناً اردو علم و ادب کے لئے ایک بیش بہا گنجینہ ثابت ہوتا۔ مگر افسوس وہ نامراد کرموں کی نذر ہو گیا۔ اب ان بچے کھچے پرزوں سے چند اشعار حاضر خدمت ہیں:

صحن و چمن سے دُور بت و برہمن سے دُور
حسرت نصیب دل ہے ہر ایک انجمن سے دُور
گھیرے ہوئے تھیں عشق میں ناکامیاں مجھے
تھی حد ممکنات میری انجمن سے دُور
شکوہ نہ باغباں کا نہ صیاد کا گلہ
رکھا میرے نصیب نے مجھ کو چمن سے دُور
مکھڑے پہ یہ ترے زلف بکھر کر آ گر آئے
یک جا سحر و شام کا نقشہ نظر آئے

جلوہ فگن جو سامنے وہ رشکِ حور تھا
جو ذرہ تھا وہ جوشِ تجلی سے طور تھا

ماشاء اللہ آپ کی بیگم صاحبہ بھی شاعری سے مس رکھتی تھیں اور ملا بھوپال کے زنانہ مشاعروں میں نہایت دلچسپی سے حصہ لیتی تھیں بفضل خدا آپ کا مجموعہ کلام بیاض کی صورت میں مرتب ہوا تھا مگر گردشِ روزگار کے

باعث وہ اب ناپید ہے لہٰذا موصوف کے کلام کا انتخاب پیش کرنے کے قابل دستیاب نہیں ہو سکا۔

ممتاز مسیح ممتاز:- مندرجہ بالا بوربون خاندان کے یہ چشم و چراغ چند سال پیشتر ملٹری ہیڈکوارٹر میں ایک معزز عہدہ پر مامور تھے آپ کے دل میں دبی چنگاری چمک اٹھی اور عہد حاضر کے ادبی رجحان کا حتی المقدور ساتھ دیا۔ آپ کے کلام کے رنگ کی جھلک ملاحظہ کیجئے۔

ستم ہو رہے ہیں، جفا ہو رہی ہے
دوانے دل مبتلا ہو رہی ہے
جھکائے ہے سر ان کے قدموں پہ ممتاز
نمازِ محبت ادا ہو رہی ہے

مجھے حشر میں کون ملتا گواہ
جدھر وہ تھے دنیا اُدھر ہو گئی
دمِ نزع کچھ آ کے سن لیجئے
مری داستاں مختصر ہو گئی

اب نہ دل ہے، نہ دل کے ارماں ہیں
تم نے قصہ ہی وہ تمام کیا

تجھے ہر سانس میں آتا ہے لطفِ زندگی ناداں
مجھے ہر سانس اک بانگِ درا معلوم ہوتی ہے

خدا کی شان جس کو دیکھنا ہو وہ تمہیں دیکھے
کہ اتنے بے وفا، بے مہر ایسے مہ لقا ہو تم

کپتان موسس مالوک:- آپ کے بزرگوں کا اصلی وطن آرمینیا تھا مگر انقلاب کے ہاتھوں ترکِ وطن پر مجبور ہوئے قسطنطنیہ اور کابل میں کچھ دنوں تک پناہ لی۔ آخر ہندوستان کی طرف رُخ کیا اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

کابل میں کچھ مدت رہنے کی وجہ سے فارسی
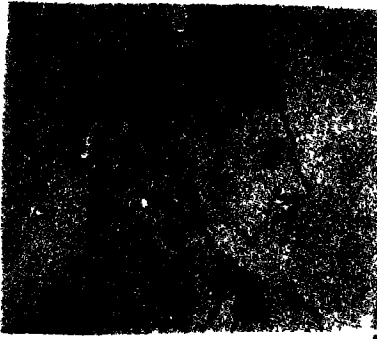
اردو کے پہلے ادیب

میر امن ۱۷۴۳ء-۱۱۴۶ھ میں بعہد محمد شاہ دہلی میں پیدا ہوئے ان کے بزرگ سلطنت مغلیہ میں ہمایوں کے دور سے ہر بادشاہ کے عہد میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے تھے احمد شاہ ابدالی کے حملہ ۱۷۶۱ء سے سلطنت کی تباہی اور دلی کی بربادی کے بعد میر امن تلاش معاش میں کلکتہ چلے گئے اور وہیں بعمر ستر سال ۱۸۰۲ء-۱۲۱۷ھ میں وفات پائی۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ (جن کو اردو زبان سے عشق تھا اور جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے پرنسپل تھے) کی فرمائش پر میر امن نے ۱۸۰۱ء میں قصہ چہار درویش (جو امیر خسرو دہلوی نے فارسی میں لکھا تھا) کا اردو میں ترجمہ کیا۔ میر امن نے نثر کی طرف ایسی توجہ دی اور اس میں ایسی ایسی گلکاریاں کیں کہ لوگ نثر سے دل چسپی لینے لگے۔

گویا ان کی مادری زبان بن چکی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ مادرِ فطرت نے آپ کی طبیعت میں شاعری کا ذوق بھی بخشا تھا اساتذہ کے فیضِ صحبت اور کتب عروض کے مطالعہ کی بدولت فارسی میں اپنے کلام کا کافی سرمایہ فراہم کیا۔ کبھی کبھی اردو میں بھی فکر کرتے تھے لیکن آپ کا صرف ایک ہی شعر فارسی کا پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کیونکہ پیش نظر نمبر اردو سے متعلق ہے۔

چہ کردی با من مشتاق اے دوست
مرید ساغر و پیمانہ کردی

جوزف مانوک۔ المتخلص عاشق: آپ کپتان موسس مانوک کے صاحبزادے تھے آپ نے بھی شعر و سخن کی دنیا میں اپنا نام خوب پیدا کیا۔ آپ کا بھی نام سفینہ شاعری بحر گمنامی میں غرق ہو چکا ہے۔ البتہ آثار الشعرا میں آپ کا کچھ تذکرہ اور ایک غزل موجود ہے اسی غزل کے چند اشعار ہدیتاً نذر ناظرین کرتا ہوں۔

آہ سے اب تیری کہتا ہے فلک تھرا کر
تجھ کو تاثیر یہ حاصل کبھی ایسی تو نہ تھی

کوئی وحشی، کوئی دیوانہ ہے، کوئی مجذوب
مست قائل تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

ہے میرا رشک چمن باغ میں دل کہتا ہے
گل پہ آواز عنادل کبھی ایسی تو نہ تھی

بے طرح عشق کے پھندے میں پھنسے ہو عاشق
یہ بلا جان پہ نازل کبھی ایسی تو نہ تھی

ٹامس جیمز۔ المتخلص نفیس: آپ کے بزرگ بھی مانوک خاندان کے ساتھ آرمینیا سے جلاوطن ہو کر قسطنطنیہ سے ہندوستان وارد ہوئے اور بھوپال ریاست کے دامن سے وابستہ ہوئے اکیس سال کی عمر میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور نام محمد سلیمان رکھا۔ عرفاً "اچھے صاحب" کہلاتے تھے۔ آپ کا کلام زیادہ تر حضرت داغ کا عکس معلوم ہوتا ہے اب یہاں کلام نفیس کا جستہ جستہ انتخاب پیش کرتا ہوں۔

ہو گیا دشمن جاں سارا زمانہ دل کا
قہر تھا اس بت عیار پہ آنا دل کا

خدا کے سامنے کہتا ہوا یہ جاؤں گا
بتوں نے راہ میں لوٹا ہے قافلہ دل کا

جنہوں نے اردو کو سب سے پہلے اپنی سلطنت کی سرکاری زبان قرار دیا

میر محبوب علی خاں آصف ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے انھیں ۱۸۸۴ء میں مکمل اختیارات کے ساتھ قلمرو آصفی کا حضور نظام تسلیم کر لیا گیا۔ حیدرآباد میں سرکاری زبان انہیں کے دور ۱۸۸۴ء میں فارسی سے اردو کر دی گئی۔

اردو کے بہترین شاعر تھے لیکن فارسی، عربی اور انگریزی پر بھی عبور رکھتے تھے۔ فرہنگ آصفیہ ان ہی کی سرپرستی کا نتیجہ تھا۔ مولوی سید بلگرامی سے تمدن عرب اور تاریخ دکن وغیرہ جیسی کتابیں محبوب علی خاں آصف نے ہی لکھوائی ہیں۔ مولوی عبدالحق مصنف تفسیر حقانی، قدر بلگرامی، مولانا شبلی، الطاف حسین حالی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا عبدالحلیم شرر جیسے ان گنت ارباب علم نے ان کی سرپرستی میں ساری زندگی کسب معاش سے بے نیاز ہو کر آرام سے گزار دی۔

لاش پہ کشتہ حسرت کی کھڑے ہو خاموش
آج دعوے نہیں کرتے ہو مسیحائی کا

زلیخا دید سے محروم پھر جاتی ہے آ آ کر
کوئی تصویر یوسف کھینچ دے دیوار زنداں پہ

کرتے نہیں نگاہ غریبوں کے حال پر
کتنا ہے اپنے حسن پر سرکار کو گھمنڈ

طپش دل نے نہ دی فرصت تحریر مجھے

داغ دہلوی کا سرکار آصفیہ سے پندرہ سو روپے وظیفہ مقرر تھا۔ ممدوح کی علمی سرپرستی کی وجہ سے انہیں شاہ العلوم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
میر محبوب علی خاں آصف تخلص کرتے تھے، وہ داغ دہلوی اور حضرت جلیل مانک پوری کے شاگرد تھے۔ موصوف کو جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ غزلیات کے علاوہ "تعلیم" اور "اصلاح فوج" وغیرہ کے متعلق انہوں نے بہت سی اخلاقی نظمیں کہی ہیں۔ غزلوں میں جگہ جگہ اخلاق کا درس ملتا ہے۔ مثلاً ان کے یہ دو مقطعے

آصف کو جان و مال سے اپنے نہیں دریغ
گر کام آئے خلق کی راحت کے واسطے

آصف کا ہے یہ قول سنیں صاحب غیرت
احسان نہ لے ہمت مردانہ کسی کا

اعلیٰ حضرت شاہ العلوم آصف نے تغزل میں بھی اچھے اشعار کہے ہیں

کبھی نہ دب کے ملیں گے ہم اُنسے اے آصف
وہ شاہِ حسن سہی، شہر یار ہم بھی ہیں

لو اور سنو کہتے ہیں وہ دیکھ کے مجھکو
یہ شخص بلاشبہ ہے دیوانہ کسی کا

نہیں ہے اگر تو ہمارا تو کیا ہے
زمانہ میں کوئی کسی کا ہوا ہے

۱۱ ۱۹ء میں اردو کے اس محسنِ اعظم نے رحلت پائی۔

اتفاقاً جو کبھی ہاتھ بھی آیا کاغذ
بحسن اتفاق بسنت کے موسم کا آغاز ہے اس انگریز شاعر نے جو کچھ بسنت پر خامہ فرسائی کی ہے لگے ہاتھوں اسے پیش کرنا یقیناً برمحل ہوگا اور پھر یہیں اس موضوع کا اختتام بھی بہتر رہے گا

دستار محتسب نے بھی باندھی ہے چمپئی
ابکے برس ہے جوش کچھ ایسا بسنت کا

اے بے خبر بسنت کی تجھ کو خبر بھی ہے
ہے میرے رنگ زرد پہ دھوکا بسنت کا

خوف طوالت اور تنگ دامانی مجبور کرتی ہے کہ اپنا قلم یہیں روک لیا جائے اور ویسے بھی ناممکن ہے کہ لگ بھگ سو فرنگی شعراء کو گوشہ گمنامی سے منظرِ عام پر لایا جائے۔

افسوس ہے کہ آج تک کسی علمی و ادبی ادارہ نے

جگ بیتی

ہمارے بیانیہ ادب کی ایک اہم شاخ مثنوی ہے۔ مثنوی کے ذریعے شاعر اپنا حال بھی قاری تک پہنچاتا ہے اور دوسروں کا حال بھی۔

یوں تو ہم مثنوی کو آپ بیتی سے کہیں بڑھ کر جگ بیتی قرار دے سکتے ہیں۔ اس لئے کہ مثنوی میں بعض اوقات تاریخی شخصیتوں اور بعض اوقات خرضی کرداروں کے قصے ہوتے ہیں لیکن آپ بیتی کا پہلو بھی اکثر و بیشتر مثنویات میں موجود ہوتا ہے۔ ہماری شاعری میں مثنوی کو رزمیہ کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔ رزمیہ شاعری میں ہیرو خواہ وہ افسانوی ہو یا تاریخی کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے۔ دنیا کی عظیم ترین شاعری رزمیہ شاعری ہی کو تصور کیا گیا ہے۔ ہومر کی ایلیڈ فردوسی کا شاہنامہ، ملٹن کا فردوس گم گشتہ۔ ہندوستانی ادب میں رامائن اور مہابھارت۔ غرضیکہ رزمیہ شاعری کے اعلیٰ ترین نمونے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں لیکن اعلیٰ کردار کے کارہائے نمایاں بیان کرنے کا فن ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ خواہ وہ خالصۃً رزمیہ کی حدود میں آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ نظامی کا سکندر نامہ۔ جامی کی یوسف زلیخا، وارث شاہ کی ہیر، میر حسن کی بدر منیر اور دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم اور اسی طرح اگر گنتے چلے جائیں تو مشرقی ادب میں بیانیہ شاعری کے اعلیٰ نمونوں کا فقدان نہیں ہے۔ جیسا کہ بیانیہ شاعری کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ ان مثنویوں میں جو پیرایۂ اظہار اختیار کیا گیا ہے وہ معروضی ہے۔ یعنی ہم ان مثنویوں کے ذریعہ ایک تہذیب اور ایک دور سے پوری طرح واقف ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے مثنوی کو جگ بیتی کہہ کر پکارنا مناسب ہوگا۔ تاہم یہ بھی ایک قدیم دستور چلا آتا ہے کہ اصل قصہ بیان کرنے سے پہلے شاعر خود اپنے دور اور اپنے حالات مختصراً بیان کرے۔ اس حصے کو آپ بیتی کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ دونوں صورتوں میں مثنوی نظم کے پیرائے میں سوانحی ادب کی اہم ضروریات کو پورا کرتی چلی آئی ہے۔

تلاش و تجسس تحقیق و تدقیق کی زحمت گوارہ نہ کی برعکس اسکے لٹریچر میں کچھ مواد اس سلسلہ میں ضرور دستیاب ہو سکتا ہے اور ہمیں اس بات پر بجا فخر ہونا چاہیے کہ اس گرانقدر کارنامہ میں رائے بہادر رام بابو سکسینہ ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی کی مساعی جمیلہ مستحق شکریہ ہیں

آپ نے اردو فارسی کے یورپین اور اینگلو یورپین شعراء، کے حالات و کلام کی تلاش میں لگاتار پندرہ سال صرف کئے اور ان کا انگریزی زبان میں مجموعہ مرتب کیا۔ اب آخر میں یہ جتانا شاید غیر موزوں نہ ہوگا کہ ان غیر ہندی نژاد شاعروں نے اپنے کلام میں فصاحت و بلاغت برجستگی اور دلپذیری، صنائع و بدائع پر خوب عبور حاصل کیا تھا، انکی طرف فارسی اور بالخصوص اردو کے پرستاروں اور علم و ادب کے علمبرداروں نے نگاہ مبذول نہ کی یعنی اپنی نظروں سے ان کو اوجھل کر دیا۔ قصہ کوتاہ اب یہ کہہ کر آپ سے رخصت ہوتا ہوں ؎

نقاب اتار کے رکھ دی کسی نے چہرہ سے
نگاہِ شوق نے کیا کہہ دیا خدا جانے

سب سے پہلا انقلابی شاعر

مومن سب سے پہلے غزل گو شاعر ہیں جنہوں نے "جہادیہ" مثنوی لکھ کر انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی

اردو نمبر

اردو کی اینگلو انڈین شاعرات

• ماخوذ

اردو زبان کی ترقی و ترویج میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں ہی کا نہیں بلکہ عیسائیوں کا بھی حصّہ ہے۔ اگرچہ اس دور میں اردو کے عیسائی شاعر اور ادیب بہت کم نظر آتے ہیں مگر اب سے ستر پچھتر برس قبل نہ صرف عیسائی اور اینگلو انڈین یا یورپین مرد ہی اردو شاعری کے میدان میں موجود تھے بلکہ خواتین بھی تھیں چنانچہ ان میں سے بعض مشہور خواتین کا مطبوعہ کلام بھی ملتا ہے ان میں سے چند شاعرات کا حال درج ذیل ہے۔

ملکہ جان ملکہ: ملکہ جان ملکہ ایک آرمینی خاتون تھیں اور اپنے زمانہ کی مشہور رقاصہ اور موسیقار۔ رہنے والی بنارس کی تھیں مگر کلکتہ میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ اور سنہ ۱۸۸۶ء میں "مخزن الفت ملکہ" کے نام سے اس نے اپنا دیوان بھی شائع کیا تھا۔ یہ دیوان محمد وزیر، مالک این پریس کلکتہ نے شائع کیا تھا۔ یہ دیوان ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۱۰۶ غزلیں ہیں اس میں گیت، ٹھمریاں وغیرہ بھی ہیں۔ ملکہ شاعری میں بنارس کے حکیم بانو صاحب ہلال کی شاگرد تھیں۔ مشاعروں میں بھی شرکت کرتی تھیں اور اپنے یہاں بھی مشاعرے منعقد کرتی تھیں چنانچہ اس سلسلہ میں وہ کہتی ہیں ؎

مملو ہے آج بزمِ سخن موجِ شعر سے
ملکہ ہیں جوشِ رحمتِ پروردگار کے

ملکہ وہ مجمعِ شعراء اور لطفِ شعر
قربان میں عنایتِ پروردگار کے

ملکہ کے دیوان کی ایک جلد برطانیہ کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی ہے۔ حمد میں کہتی ہیں ؎

دیکھا جسے وہ شاغلِ حمدِ غفور ہے
نغمہ یہی سُنا ہے چمن میں ہزار کا

ملکہ ہے جس کے وردِ زباں نام کبریا
صدمہ نہ ہوگا اس کو لحد کے فشار کا

غزل کے چند مختلف اشعار یہ ہیں ؎

اپنی حیرت کی کوئی شکل بنا لوں تو کہوں
سامنے آئینہ سازوں کو بٹھا لوں تو کہوں

دلِ صد چاک پہ لے جانِ جہاں فرقت میں
کیا گزرتی ہے ذرا ہوش میں آلوں تو کہوں

کیا جفا و ظلم کا ملکہ ترے شکوہ کریں ✦ جو کیا جانِ جہاں ہنس کر کیا اچھا کیا

اردو کی سب سے پہلی غزل

اردو کی سب سے پہلی غزل بقول علامہ کیفی مرحوم چندر بھان برہمن۔ شاہجہاں کے عہد کے ایک ہندو فارسی شاعر نے لکھی تھی۔ (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)

آپ ہی آپ جو یوں روتی ہو ٭ ملکہ سچ کہیو ـــــ کیا یاد آیا

جگر ملکہ کا اور فرقت کے صدمے ٭ خطِ تقدیر میں یونہی لکھا تھا

ملکہ اسی طرح جو تصور بندھا رہا
ہوگی نصیب انکی زیارت تمام رات

اینی بلاکر ملکہ: اینی بلاکر کلکتہ کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر بلاکر کی لڑکی تھی ملکہ تخلص کرتی تھی ہندوستانی موسیقی میں بھی خاصی مہارت رکھتی تھی۔ بنگال کے ایک ڈپٹی کلکٹر مولوی عبد الغنی ناسخ اس کے شاعری میں استاد تھے، دو شعر یہ ہیں ؎

ہوگئی نیند بھی ہمسایہ کو تا صبح حرام
میں نے نالہ جو کسی رات سرِ شام کیا
آہ وزاری نہیں سنتا بخدا راتوں کو
اس صنم کو ملکہ نے ہی مگر رام کیا

مس سارہ پری: مس سارہ پری کلکتہ کی ایک آرمینی خاتون تھیں اور نام غالباً مس سیجو تھا پیشہ کے لحاظ سے رقاصہ تھیں اردو، فارسی، انگریزی اور کسی قدر عربی بھی جانتی تھیں۔ ۱۸۲۹ء تک زندہ تھیں ــــــ کلام ملاحظہ فرمایئے ؎

عشق میں بے تاب کیوں ہے تجھ کو اے دل کیا ہوا
کیوں تڑپتا ہے برنگِ مرغِ بسمل کیا ہوا
غیر سے ملنا کبھی چھوڑا ہے نہ چھوڑیں گے کبھی
اے پری شکوہ کیا تو نے تو کیا حاصل ہوا

ہے رُخِ غیرتِ قمر کی تلاش ٭ شبِ گیسو کو ہے سحر کی تلاش
جو اذیت ہے دل کو راحت ہے ٭ عشق میں دل کو ہے ضرر کی تلاش

مس بلیک خفی: مس بلیک کا تخلص خفی تھا۔ مسٹر بلیک کی لڑکی تھی۔ ہندوستانی نام بادشاہ بیگم تھا اور یوسف والی کے نام سے مشہور تھی اردو، فارسی خوب جانتی تھی اور بہت زیادہ خوشنویس بھی تھی۔ شعروشاعری میں بڑی مہارت رکھتی تھی اور دوسروں کے اشعار کی اصلاح بھی دیا کرتی تھی۔ کلام ذیل بطور مشتے نمونہ از خروارے ہدیۂ ناظرین ہے ؎

خود شوقِ اسیری سے پھنسے دام میں صیاد
شرمندہ ترے ایک بھی دانے کے نہیں ہم

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں ٭ ہم سے وہ بے وفائی کرتے ہیں

مس شریر: مس فلورا سارکس پورا نام تھا۔ شریر تخلص کرتی تھیں۔ بزم اکبر آبادی کی صاحبزادی ہیں۔ رام پور آئیں تو یہاں آکر اختر جہاں بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں مناصاحب کی شاگرد تھیں۔ رشک رامپوری کی ایک غزل پر تضمین ملتی ہے۔ جس کا ایک بند یہاں درج کیا جا رہا ہے ؎

بر جو ہے ملنے میں عار دیکھئے کب تک رہے
دشمنِ جاں وہ نگار دیکھئے کب تک رہے
قلب میں اس کے غبار دیکھئے کب تک رہے
غیر کا یہ اعتبار دیکھئے کب تک رہے

مس ڈیر کانپور: کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

کٹی کب زندگی میں سختی سرِ دوراں میری
چڑھا کر دار پر تو نے اتاریں چوڑیاں میری
مثالِ طائرِ رنگِ حنا ہوں لے اڑیں گی بھی
نہیں صیاد کو معلوم جانے آشیاں میری ✱

اردو نمبر

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی لوہارو کی نوابی کے اصل وارث تھے مگر انگریزوں نے ان کے والد کو گدی سے لاحق کر کے ان کے چچا کو گدی پر بٹھا دیا تھا۔ ان کے والد پر الزام لگایا گیا تھا کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں انہوں نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ نواب سائل پہلے لال دروازے میں رہتے تھے۔ پھر فراش خانہ میں اٹھ آئے تھے۔ سب سے پہلے ہم نے انہیں اپنے بچپن میں ایک مشاعرے میں دیکھا۔ عجب شان و شوکت کے بزرگ تھے میدہ و شہاب رنگ، گول چہرہ، سفید براق داڑھی، سنہری فریم کی عینک، سر پر چوڑی زر کار لیس کی مخملی ٹوپی۔ قریب سے دیکھو تو اس پر زردوزی میں "سائل دہلوی" لکھا ہوا، چست پجامہ، چوڑیاں پنڈلیوں تک پڑی ہوئیں، پاؤں میں سلیم شاہی، بائیں ہاتھ میں چاندی کی مٹھ کی چھڑی، دائیں ہاتھ میں چھ انچ لمبا سگار، مخصوص ترنم سے غزل پڑھتے اور سننے والوں کو پھڑکاتے۔ پھر نواب صاحب کو اکثر دیکھنے کا اتفاق ہوا مشاعروں میں، پارٹیوں میں، شادی بیاہ کی محفلوں میں اور جب میرے والد کو آخری عمر میں شعر کہنے کا شوق ہوا تو انہوں نے نواب سائل کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ اکثر میرے والد ان کے ہاں جاتے اور کبھی کبھی نواب صاحب کبھی ہمارے ہاں آتے۔ کلام دکھانے کا بھی عجب لطیفہ ہے۔ شاگرد نے دس دس پندرہ پندرہ غزلیں (داغ کے رنگ میں اور زمین میں بھی) روزانہ کہنی شروع کر دیں۔ نواب صاحب کوئی ترمیم کرتے تو شاگرد صاحب ان سے الجھ جاتے اور ان کی اصلاح کو نہ مانتے۔ لہٰذا استادی شاگردی زیادہ دن نہ چل سکی، دوستی البتہ قائم رہی۔

نواب سائل بڑے حلیم الطبع اور بردبار آدمی تھے دلی کے معززین میں شمار ہوتے اور انگریزوں میں بھی ان کی خاصی پوچھ تھی۔ ان کا کلام خود ان کی شہرت کو چار چاند لگاتا تھا مگر ان کی بعض باتیں بالکل بچکانہ ہوتی تھیں مثلاً ٹوپی پر نام لکھوانا یا کسی بہانے یہ جتانا کہ "میں داغ کا داماد ہوں"۔ ان کی یہ کمزوری ان کے اکثر مقطعوں میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً ؎

جناب داغ کے داماد ہیں ہم دلی والے ہیں۔

یا وہ مقطع جس پر لکھنؤ والوں نے بہت اعتراض کیا تھا

انگلیاں اٹھنے لگیں داغ کے داماد آئے
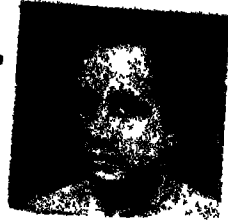
احسان دانش

احسان دانش مزدوروں کے شاعر ہیں ۱۹۱۴ء میں کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ آپکا نام احسان الحق والد کا نام قاضی دانش علی ہے۔ غربت اور حالات کی ناسازگاری کے باعث بہت کم تعلیم پائی وطن چھوڑ کر لاہور چلے گئے اور ایک مدت مزدوری معماری، چوکیداری وغیرہ کرتے رہے لیکن ساتھ ہی ساتھ مطالعہ بھی جاری رکھا۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ شعر کہنے کی مشق ہوگئی۔ اب لاہور میں رہتے ہیں۔

ایک دفعہ میں ان سے (ماہنامہ) ساقی کے لئے غزل لینے ان کے گھر گیا۔ اور بھی کئی احباب اور شاگرد جمع تھے۔ سائل صاحب نے اپنی تازہ غزل سنائی۔ ہر شعر پر واہ واہ ہوتی رہی اور وہ یہی فرماتے رہے "میں کیا کہتا ہوں؟ وہ کہلوا رہی ہے جو گھر میں بیٹھی ہے — داغ کی بیٹی کہلوا رہی ہے"۔ اصل بات یہ تھی کہ نواب صاحب کو بیگم سے اور انہی کی وجہ سے استاد سے بے حد محبت تھی۔ ورنہ بیگم صاحبہ داغ کی حقیقی بیٹی نہیں تھیں بلکہ ان کی سالی کی صاحبزادی تھیں، داغ نے انہیں گود لے لیا تھا۔ اسی طرح ان کا ایک مصرعہ تھا ؎

غالب میرے دادا تھے میں غالب کا پوتا ہوں

حالانکہ نہیں تھے۔

نوابوں میں عام طور سے اتنے شریف طبیعت کے لوگ نہیں ہوتے تھے جتنے کہ نواب سائل۔ ان کے بڑے بھائی نواب تاباں ان کی ضد تھے۔ گالیاں دینے پر آتے تو شیطان بھی کانوں پر ہاتھ دھرتا۔ اکثر سائل صاحب پر برس پڑتے اور وہ مغلظات سناتے کہ الہی توبہ، مگر وہ بیچارے منہ سے اُف تک نہ کرتے، دبی زبان سے اتنا البتہ کہہ دیتے کہ "بھائی جان! گالیاں آدھی مجھ پر پڑ رہی ہیں اور آدھی آپ پر"۔ اسی طرح جب بیخود صاحب مشاعروں میں برہم ہو کر مادر چادر پر اُتر آتے تو سائل صاحب جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہتے۔ دلی میں بیخود والوں، اور سائل والوں کے بڑے بڑے پالے ہوتے۔ اکثر مشاعروں میں مار پیٹ تک نوبت پہنچ جاتی۔ سائل صاحب ان جھگڑوں سے بہت گھبراتے تھے اور بالآخر انہوں نے دلی کے مشاعروں میں شریک ہونا ہی چھوڑ دیا تھا۔ بیخود اور سائل کے اختلاف کی اصل وجہ داغ کی جانشینی تھی جس کے مدعی دونوں تھے۔

آخر عمر میں سائل صاحب کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے ایک رکشا رکھ لی تھی۔ اس میں ان کا سوار ہونا اور اس میں سے اُترنا ہی ایک بڑا مرحلہ ہوتا تھا۔ ایک دن اس رکشا کا پہیہ لال کنوئیں پر ٹریم کی لیکھ میں ایسا اڑا کہ رکشا الٹ گئی — سائل صاحب کے سر میں سخت چوٹ آئی۔ لوگوں نے دوڑ کر انہیں اٹھایا۔ ہائے ہائے کرتے تھے اور اپنی بے بسی پر روتے تھے۔ میں بھی پرسش احوال کو گیا۔ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے "ایک وقت وہ تھا جب ابا جان کا ہاتھی ڈیوڑھی پر آتا تو میں لپک کر اس کی دم پکڑ اوپر جا بیٹھتا۔ یا اب یہ حال ہے کہ دوسروں کے سہارے بغیر اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتا"۔

سائل صاحب نے ہزاروں غزلیں کہیں، ان کے دیوان بھی چھپے مگر ان کا عمر بھر کا حاصل نظروں سے پوشیدہ ہی رہا۔ نور جہاں اور جہانگیر کے عشق پر ایک مثنوی لکھ رہے تھے جس کے پندرہ ہزار شعر کہہ چکے تھے افسوس کہ یہ خزینہ دفینہ بن کر رہ گیا۔ (شاہد احمد دہلوی)

پبلشر کو اپنی کتاب بھی دیجئے اور چھپائی کا پورا خرچ بھی

شمس العلماء منشی ذکاء اللہ

شمس العلماء منشی ذکا اللہ کے صاحبزادے مولوی عنایت اللہ نے بھی اپنے والد کی طرح ترجمہ کرنے میں بہت نام پایا بلکہ سرسید احمد خاں نے اپنے ایک خط میں ذکاء اللہ کو لکھا تھا کہ "تمہارا لڑکا تم سے اچھا ترجمہ کرتا ہے۔" مولوی صاحب نے سرسید کے زمانے میں علی گڑھ میں پڑھا تھا اور بی۔اے کرنے کے بعد سرسید کے پرائیویٹ سکریٹری کے فرائض انجام دینے لگے تھے۔ سرسید احمد کی فرمائش پر مولوی صاحب نے سرولیم میور کی کتاب سیرت نبوی کا ترجمہ کیا تھا۔ اسی ترجمے سے مولوی صاحب کی شہرت کا آغاز ہوا۔

مولوی صاحب مختلف سرکاری ملازمتوں پر مامور رہے۔ جب حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سلسلے میں دارالترجمہ قائم ہوا تو عنایت اللہ صاحب اس کے ناظم مقرر کئے گئے اس ملازمت میں آنے سے پہلے مولانا نے جغرافیہ اندلس اردو میں ترتیب دیا تھا۔ یہ عظیم علمی کارنامہ دارالترجمہ سے شائع ہوا۔ اس پر دس ہزار کا انعام انہیں ریاست سے ملا تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ یہ کتاب میری ساری عمر کی محنت کا نتیجہ ہے اور اس پر وقتاً فوقتاً جو خرچ ہوا، وہ بارہ ہزار سے کم نہیں۔ مولانا نے دارالترجمہ کے لئے اور بھی بعض دقیق کتابوں کے ترجمے کئے تھے۔

ڈوزی کی تاریخ کا ترجمہ انہوں نے خود اپنے صرفہ سے دو جلدوں میں چھپوایا تھا اور کوئی اور ہسپانی مغلوں کی تاریخ تھی، چار ضخیم جلدوں میں اس کا ترجمہ فرصت میں کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ مجھے لکھا کہ "تین جلدوں کا ترجمہ کر لیا ہے، چوتھی کا شروع کر دیا ہے۔ دیکھئے ترجمہ پہلے ختم ہوتا ہے یا زندگی۔" بارے ان کے انتقال سے پہلے چاروں جلدوں کا ترجمہ ہو گیا تھا۔ یہ ترجمہ چیمبرز ڈکشنری سائز کی چار مجلد کاپیوں میں ان کے پاس تھا اور فرماتے تھے کہ "علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری کے لئے یہ جلدیں بھیج دوں گا۔ چھپنا تو اس کا ناممکن ہے۔"

مولوی صاحب کو میں نے پہلے "زلفی" اور پھر تائیس کے ذریعے جانا۔ ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا مگر کوئی دس سال بعد ان سے پہلی ملاقات کا شرف

تقسیم ملک اور فسادات

دلی کالج کی بزم ادب نے ۲۹ نومبر ۱۹۵۲ء کو ہندوستانی ادبیات کا سمپوزیم کیا تھا۔ اس میں مسٹر واتسائن نے جو ہندی ساہتیہ میں بڑا درجہ رکھتے ہیں فرمایا تھا: "اردو میں فسادات اور تقسیم کی مخالفت میں جس درد اور سوز کے ساتھ افسانے اور نظمیں لکھی گئی ہیں اس کی مثال کسی دوسری ہندوستانی زبان میں نہیں مل سکتی۔"

حاصل ہوا۔ مولوی صاحب حیدرآباد میں ایک عالیشان کوٹھی میں رہتے تھے۔ میرے برادر نسبتی سید وزیر حسن ان سے ملانے مجھے لے گئے۔ گورا رنگ، سفید مونچھیں داڑھی صاف، چھوٹے قد کے دھان پان سے آدمی تھے۔ سرخ مخمل کی ٹوپی ان کے سفید بالوں اور اجلے رنگ پر بڑی بھلی لگتی تھی۔ محبت سے ملے۔ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بھولی بھولی باتیں کرتے تھے۔ حیدرآباد کی سازشوں سے سخت بیزار تھے۔ ادبی گفتگو بھی ہوئی۔ "تائیس دلی میں" ایک مضمون سید وزیر حسن نے لکھ کر ساقی میں چھپوایا تھا۔ اس سے متاثر اور خوش تھے۔ مولانا نے فرمایا: "عجیب بات ہے، کتاب سب کو پسند آئی ہے۔ راس مسعود کہتے ہیں کہ تمہارے ترجمے میں جو لطف ہے وہ فرانسیسی زبان کی اصل کتاب میں بھی نہیں۔ مگر مجھے تائیس سے زیادہ نجم السحر پسند ہے۔" میں نے پوچھا: "نجم السحر کہاں سے شائع ہوئی ہے؟" کہا: "مسودہ رکھا ہوا ہے، چھاپے کون؟" یہ کہہ کر الماری میں سے اس کا مسودہ نکال لائے۔ میں نے کہا: "اگر اجازت فرمائیں تو میں اسے چھاپ دوں۔" بہت خوش ہوئے اور بولے، "لے جائیے۔" میں نے کہا "گستاخی معاف، معاوضہ بھی فرما دیجئے۔" حیرت سے دیکھ کر بولے: "معاوضہ! معاوضہ تو آج تک کسی نے مجھے نہیں دیا اور نہ میں نے مانگا۔ کتاب چھپ جائے، بس یہی بہت ہے۔ میں نے تو جتنی کتابیں چھپوائیں (انہوں نے دو بڑے اداروں کے نام لیے) انہوں نے کتابوں کی پوری لاگت مجھ سے لی اور ہمیشہ انہیں نقصان ہوا۔ آپ نجم السحر چھاپ دیجئے مگر میں اس میں روپیہ نہیں لگا سکتا۔ دیکھ لیجئے کہیں آپ کو اس کے چھاپنے میں نقصان نہ ہو جائے۔"

اس کے بعد مولانا سے تعلقات بہت بڑھ گئے وہ حیدرآباد سے دل برداشتہ ہو کر یکایک دلی چلے آئے بارہ پندرہ ہزار روپیہ انعام کا ملنے والا تھا، وہ بھی چھوڑا۔ چند روز دلی میں رہے۔ اس کے بعد دہرہ دون میں ایک کوٹھی خرید کر وہیں رہنے لگے۔ اب انہیں فرصت ہی فرصت تھی۔ میری فرمائش پر انہوں نے کئی ترجمے کیے۔ جن میں سلامبو بھی شامل ہے۔ جانسن کی راسیلاس کا ترجمہ بالاقساط "ساقی" میں چھپا۔ پھر شیکسپیئر کے ڈراموں کے ترجمے کرنے شروع کیے تو بارہ چودہ ڈراموں کو اردو میں منتقل کر دیا۔

گرمیوں کے دو سیزن میں نے دہرہ دون اور مسوری میں گزارے۔ میرا کرایہ کا بنگلا مولوی صاحب کی کوٹھی کے قریب ہی تھا۔ بیشتر وقت مولانا ہی کے ساتھ گزرتا تھا۔ پرانے فلسفیوں کی سی زندگی تھی۔ ساری عمر شادی نہیں کی۔ دس بارہ کمروں کی عمدہ کوٹھی تھی۔ مولوی صاحب نہایت نفاست سے رہتے تھے۔ گھنٹوں ترجمہ کرتے۔ انہیں اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ بہت کم دوست تھے۔ ویسے بھی مولانا کم آمیز بلکہ مردم بیزار تھے۔ دہرہ دون کے دوران قیام میں میں صبح شام ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ اگر کسی دن نہ جاتا تو خود مجھے لینے آ جاتے۔ ان کی پرانی باتوں میں میرا بھی جی لگا رہتا

آخری بار جب مجھے ان کی علالت کی اطلاع ملی تو میں ان سے ملنے گیا۔ اندر کمرۂ خواب میں اکیلے لیٹے ہوئے تھے۔ نحیف آواز میں بولے "معاف کیجئے، میں تکلیف کی وجہ سے اٹھ نہیں سکتا۔ مرنے کا کوئی ہراس نہیں مگر مرض کی گندگی سے سخت پریشان ہوں"۔ کھانسی بہت سخت تھی۔ میں تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا آیا۔ بیچ میں طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی یا انہوں نے سنبھالا لیا تھا۔

ایک دن صبح کو لان میں کرسی ڈلوا کر بیٹھے ــــ مالی پھولوں کی کیاریاں ٹھیک کر رہا تھا۔ مولوی صاحب کو کھانسی اٹھی اور اس غضب کی اٹھی کہ کرسی ہی میں منکا ڈھلک گیا۔ مالی نے دوڑ کر سہارا دیا، مگر وہاں کیا رکھا تھا؟ طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکا تھا۔

(شاہد احمد دہلوی)

دوسری زبانیں آزادی کے لیے قربانیوں کا ایسا ریکارڈ پیش نہیں کر سکتیں!

(● از لکشمی نرائن تابش وسنسٹ)

اردو کا تعلق جنگ آزادی سے گہرا ہے۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے انگریزوں کے خلاف محاذ قائم کیا اور وہ ہمیشہ ان کے خلاف برسرِ پیکار رہے، انہوں نے اتحاد، اخوّت، حب الوطنی اور محبت کے نغمے گائے یہ ایک ایسا تاریک زمانہ تھا جب ہمارے قوائے عمل شل ہو چکے تھے اور ہم بالکل پست ہمت اور کمزور ہو گئے تھے اس وقت اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے ہمارے اندر بلند حوصلگی، اخلاقی جرأت اور جوش و خروش پیدا کیا۔ غدر سے پہلے ہمیں شاہ ولی اللہ کی تحریک نظر آتی ہے جس میں انگریزوں کو باہر نکالنے کی جدوجہد کی گئی تھی یہ ایک سیاسی اور اخلاقی انقلاب تھا اس میں بڑے بڑے فضلا، عقلا، اور ادبا، یعنی مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا عبدالعزیز، سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید شامل تھے۔ انہوں نے متحد و متفق ہو کر بانگِ دہل کہا کہ ہندوستانیوں کو انگریزوں کے خلاف لڑنا چاہیے۔ ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ہمارا مقدس فرض ہے۔ انہوں نے ہمیں خدا ترسی، نیک چلنی، تربیت نفسی، دیش بھگتی اور اچھے ہندو مسلمان بننے کی طرف رغبت دلائی۔ انگریزوں نے منیر شکوہ آبادی کو قید کر کے انڈمان بھیج دیا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کو کالے پانی میں سسک

فراق گورکھپوری

رگھوپتی سہائے نام۔ فراق تخلص گورکھپور وطن ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام منشی گورکھ پرشاد عبرت تھا۔ عبرت حالی کے ہمعصروں میں تھے۔ اردو فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی فراق کے گھر میں بچپن سے ہی شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد یوپی گورنمنٹ نے فوراً ڈپٹی کلکٹری کیلئے منتخب کرلیا اور آئی سی ایس کے لئے نامزد کر دیا تھا مگر ڈپٹی کلکٹر بننے سے قبل آپ سیاسی تحریک میں شریک ہو گئے۔ آجکل آپ اپنی پرانی درسگاہ الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے لیکچرار ہیں۔ فراق نے اپنی شاعری میں یہ چاہا ہے کہ دیار ہندوستان کے شاندار قدیم ادب اور ہندو مزاج کی مخصوص پاکیزگی و لطافت کو نغموں میں سمو یا جائے۔

سسک کر جان دینی پڑی، شیفتہ کو سات سال کی سزا ملی اور ان کی ساری جائداد غصب کرلی، امام بخش صہبائی کو توپوں سے اڑا دیا اور غالب کے عزیز شاگرد بیکش کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔ کیا ہندوستان کی کوئی دوسری زبان آزادی کے لئے قربانیوں کا ایسا ریکارڈ پیش کر سکتی ہے؟ یہ تمام مصیبتیں اور صعوبتیں اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور وہ ان مصائب و آلام میں بھی مسکراتے رہے۔

مومن سب سے پہلے غزل گو شاعر ہیں جنہوں نے "جہادیہ" مثنوی لکھ کر انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ آگے چل کر سر سید احمد خاں کی تحریک نے ہندوستان کے لوگوں کے دلوں سے شکست خوردگی کو دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ ماضی کے شاندار کارنامے الاپ کر ہمیں خواب غفلت سے بیدار کیا اور ہمارے اندر نفسیاتی جان پیدا کی، ذکاء اللہ، حالی، شبلی، حکیم اجمل خاں شیدا، محمد علی جوہر، چکبست، سرور جہاں آبادی اور اقبال نے ہمارے اندر نیا خون زندگی دوڑایا، حسرت موہانی، ابوالکلام آزاد، محروم، منشی پریم چند، مہاشے سدرشن، فراق، جوش اور علامہ کیفی نے ہمیں بستر خواب سے جگایا، نظیر اکبر آبادی اصفہان کی بلبل سے پیار نہیں کرتے بلکہ ان کو ہندوستان کے جانوروں سے بے حد محبت ہے، ان کی ساری شاعری ہندی عناصر کی آئینہ دار ہے۔ غرض کہ ان تمام چیزوں نے مل کر ملک کی محبت کا نمونہ ہمارے دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔

"نہ لیں بہشت کبھی ہم ہوم رول کے بدلے"

کے فلک شگاف نعروں سے فضائے بسیط گونج اٹھی اور ملک کو آزاد کرانے کی خاطر جان تک کی بازی لگا دی گئی چنانچہ ہمارے شاعر اور ادیب مشکلوں اور آفتوں کو ہنسی خوشی سے جھیلتے ہوئے اور رجز خوانی کرتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچ ہی گئے اپنے خون جگر سے وطن عزیز کی آبیاری کرنا زندہ قوموں کی نشانیاں ہوا کرتی ہیں سیاسی لیڈروں کے دوش بدوش اردو کے ادیب اور شاعر آزادی کے دلدادہ رہے ہیں ان کا ایثار اور قربانی سیاسی رہنماؤں سے کچھ کم وقعت نہیں رکھتا۔

میر ناصر علی

وہ پچیس سال تک ایک ہی داستان سناتے رہے مگر داستان ختم نہ ہوئی

داستان گوئی کا فن اب ہمارے ہاں بالکل ختم ہو چکا ہے دلّی کے آخری داستان گو میر باقر علی تھے۔ دُبلے پتلے سے آدمی تھے۔ سفید چھوٹی داڑھی، سر پر دو پلی، پاؤں میں دیسی جوتی، انگرکھا اور چُست پاجامہ پہنتے تھے۔ عمر ساٹھ اور ستر کے درمیان۔ کھُلتا ہوا رنگ، سُتواں ناک میانہ قد، باتیں کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے۔ داستان سنانے دُور دُور جاتے تھے۔ رجواڑوں اور نوابوں میں بلائے جاتے۔ ایک زمانے میں ریاست پٹیالہ میں داستان سنانے کے لیے ملازم رہے۔ رئیس مر گیا تو دلی واپس آ گئے۔ املی کی پہاڑی پر گھر تھا۔ آخری وقت میں افلاس نے گھیر لیا تھا۔ سینما ایسا چلا کہ میر صاحب کی پرسش ختم ہو گئی دلی کے ہندو رئیس چھنامل کے ہاں کسی وقت میں چالیس پچاس روپے ماہوار پر ملازم تھے۔ چھنامل والوں کا بیان ہے کہ ہم میر صاحب سے بچپن سے داستان سن رہے ہیں بیس پچیس سال ہو گئے، ایک داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ میرے بچپن میں میر صاحب فراش خانہ میں داستان سنایا کرتے تھے۔ ہفتے میں ان کا ایک دن مقرر تھا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ داستان کہتے برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ داستان کا ایک حصہ سنانے پائے تھے کہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ میر صاحب ہمیشہ داستان امیر حمزہ ہی سنایا کرتے۔ ایک نے ان سے پوچھا کہ میر صاحب، یہ داستان کبھی آپ نے ختم بھی کی ہے؟ بولے "عمر بھر میں ایک دفعہ!"

میر صاحب کے آبا و اجداد شاہی داستان گو تھے۔ غالباً انہی میں سے کسی کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ بادشاہ کو روزانہ داستان سنایا کرتے تھے۔ ایک موقع ایسا آیا کہ عاشق و معشوق کے درمیان صرف ایک پردہ حائل تھا۔ پردہ اٹھ جائے تو وصال ہو جائے مگر داستان گو نے احساسات، خیالات اور کیفیات کے بیان میں بارہ سال گزار دیے اور پردہ نہ اٹھا۔ آخر بادشاہ کا اشتیاق بے قابو ہو گیا اور اس نے تنگ آ کر کہا: آج پردہ اُٹھ جانا چاہیے۔ تب کہیں وہ پردہ اٹھا۔ میر صاحب کا بھی اسی سے کچھ ملتا جلتا حال تھا۔ بیگم کے بناؤ سنگھار میں ایک نشست ختم کر دیتے تھے۔ آراستہ ہونے کی تفصیل، زیورات کی قسمیں، لباس کی قسمیں، زیورات کی تفصیل شروع ہوتی تو میر صاحب سیکڑوں نام گنا جاتے۔ پھر یہ بھی بتاتے کہ شاہی بیگمات کے زیور کیا ہوتے تھے، درمیانہ طبقے کی خواتین کون کون سے زیور پہنتی تھیں۔ بھٹیاریاں، سقنیاں اور مہترانیاں کیا کیا پہنتی تھیں۔

میر صاحب بزم اور رزم کو اس انداز سے بیان کرتے کہ آنکھوں کے سامنے پورا نقشہ کھنچ جاتا۔ داستان کہتے جاتے اور موقع بہ موقع ایکٹنگ کرتے جاتے۔ آواز کے زیر و بم اور لب و لہجے سے بھی اثر بڑھاتے۔ امیر حمزہ اور عیاروں کا جب بیان کرتے تو ہنساتے ہنساتے لٹا دیتے۔ ہتھیاروں کے نام گنانے شروع کرتے تو ڈیڑھ دو سو نام ایک سانس میں لے جاتے۔ پھر کمال یہ کہ نام صرف طوطے کی طرح رٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ آپ جب چاہیں ٹوک کر کسی ہتھیار کی شکل اور اس کا استعمال دریافت کر سکتے تھے۔ میر صاحب پوچھنے سے چڑتے نہ تھے بلکہ خوش ہوتے اور تفصیل سے بتاتے۔

مثلاً منجنیق کو بیان کرنے ہی میں پندرہ منٹ صرف کر دیئے۔ عورت کا حسن بیان کرنے پر آئیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیں۔ اور کچھ نہیں تو چال ہی کی سینکڑوں قسمیں بتاتے۔ بیگم بن سنور کر ایک کمرے میں سے دوسرے کمرے میں آ رہی ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا۔ بیگم دہلیز نہیں پھلانگتیں۔ پھر کیا مجال کہ آپ میر صاحب کے بیان سے اُکتا نے یا اکتانے لگیں۔ انہوں نے یہ وسیع معلومات بڑی محنت سے حاصل کی تھی۔ ہر علم کا انہوں نے باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ استادوں سے باقاعدہ سیکھا تھا اور تو اور جب دلی میں طبیہ کالج کھلا تو میر صاحب نے ساٹھ سال کی عمر میں اس میں داخلہ لیا اور لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے لگے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کی سند بھی حاصل کی۔

میر صاحب کی داستان جہاں ہوتی وہاں اجلی اجلی چاندنیوں کے فرش بچھ جاتے۔ میر صاحب کے لئے ایک چھوٹا سا تخت بچھا دیا جاتا۔ اس پر قالین اور گاؤ تکیہ ہوتا۔ سامعین گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتے۔ پان اور حقے کا دور چلتا رہتا۔ گرمیوں میں شربت اور جاڑوں میں چائے سے تواضع کی جاتی۔ میر صاحب تخت پر براجمان ہوتے۔ کٹورے یا گلاس میں پانی منگواتے۔ جیب میں سے چاندی کی ڈبیا اور چاندی کی چھوٹی سی پیالی نکالتے۔ ڈبیا میں سے افیون کی گولی نکالتے۔ اسے روئی میں لپیٹتے۔ پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈالکر اُنٹے کو اس میں گھولتے رہتے اور دوستوں سے باتیں کرتے رہتے۔ جب ساری افیون دُھل کر پانی میں آ جاتی تو روئی اُگالدان میں پھینک دیتے اور گھولوے کی چسکی لگا لیتے۔ اس کے بعد چائے کا ایک گھونٹ پیتے۔ فرماتے : "چائے کی خوبی یہ ہے کہ لب بند، لب ریز اور لب سوز ہو"۔ پھر داستان شروع کر دیتے۔

جب داستان سننے والوں کا قحط ہو گیا تو میر صاحب نے چند کتابیں لکھیں مثلاً گاندھی جی کی کھادی تحریک کے زمانے میں ایک کتابچہ "گاڑھے خاں نے ململ جان کو طلاق دے دی"۔ "باجی پڑوس"۔ "مولا بخش ہاتھی"۔ اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی کتابیں کئی لکھی تھیں جو ایک بار چھپنے کے بعد دوبارہ نہیں چھپیں۔ اکثر رسالوں میں ان کے مضامین بھی شائع ہوئے مگر جو لطف ان کی تقریر میں تھا تحریر میں نہ آ سکا۔

میر باقر علی اپنے نانا میر امیر علی کے شاگرد تھے۔ جن بزرگوں نے میر امیر علی کی داستانیں سنی تھیں، کہتے تھے کہ باقر علی کی داستان ان کی پاسنگ بھی نہیں تھی۔ غالباً فرق یہی ہو گا کہ وہ بارہ سال تک پردہ پڑا رہنے دیتے ہوں گے، میر باقر علی سال دو سال میں پردہ اٹھا دیتے تھے۔

بڑھاپے میں ناقدری اور کس مپرسی کے ہاتھوں میر صاحب کو بڑی تکلیف پہنچی۔ دلی کا کامل الفن آخری داستان گو اپنا پیٹ پالنے کے لئے چھالیا بیچتا تھا ؂

اے کمال افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے

●● (شاہد احمد دہلوی)

مرزا چپاتی

جو کنکوے اڑاتے تھے

مرزا فخرالدین نام، محزؔ تخلص، عرف مرزا چپاتی، دلّی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ گورا رنگ، کشادہ پیشانی فلاتی آنکھیں، گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، گول سفید داڑھی، کسرتی بدن، سرو قد، بدن میں سفید انگرکھا، آڑا پاجامہ سر پہ چوگوشہ، پاؤں میں سلمے کی جوتی، واقعی مغل شہزادہ دکھائی دیتے تھے۔ بڑھاپے میں عسرت نے گھیر لیا تھا۔ سر پر چوڑی بیس کی ٹوپی، گلے میں پھٹا ہوا ململ کا کرتہ، پاؤں میں لیترے ہلکاتے پھرتے تھے مگر مرزا کی خوش مزاجی میں آخر تک فرق نہ آیا۔

جب تک پیسہ رہا خوب اللے تللے سے گزری۔ شاید ہی کوئی بازی ان سے چھوٹی ہو، کبوتر، لال اور بیڑیاں اڑائیں تو اوروں کو بھی دیکھا لیکن طوطے اڑاتے مرزا چپاتی ہی کو دیکھا۔ پتنگ بنانے اور پیچ لڑانے میں جواب نہ رکھتے تھے آخر آخر میں بیرم خاں کے ترا ہے کے ——— قریب ایک بوسیدہ سی دکان لے کر بیٹھ گئے تھے۔ پتنگیں بناتے اور پیٹ پالتے۔

غضب کے توتلے تھے۔ "ت" "کوٹ" بولتے۔ زندہ دل اور فقرے باز تھے۔ سیر سپاٹے کے دلدادہ، فضا بدلی اور انہیں دور کی سوجھی۔ برسات کا چھینٹا پڑا اور انہوں نے قطب کی راہ لی۔ کسی کھنڈر کے ایک در میں ہوا

کبھی اپنی گڈیاں لگا کر بیٹھ جاتے۔ کانپ ٹھڈے چاقو سے چھیلتے رہتے اور انہیں جھکا جھکا کر دیکھتے رہتے۔ دمڑچل ڈھیل چل، پٹیل، پری، بھیڑیا، لل دُما، کل دُما، بیسیوں قسم کی گڈیاں ان کے پاس تیار رہتیں۔ برکھا رُت ساری قطب ہی میں گزارتے۔

مرزا کی وجہ تسمیہ بھی عجیب ہے۔ مرزا بڑے چاؤ اور ارمانوں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ ان کی اماں نے منت مانی تھی کہ جب میرا بچہ بڑا ہوگا تو قطب صاحب کی درگاہ پر اس کے ہاتھ سے حلوہ اور چپاتیاں بٹواؤں گی بارہویں برس ان کی منت بڑھائی گئی تو مرزا نے چپاتیاں بانٹنی شروع کیں۔ لینے والے "مرزا چپاتی، مرزا چپاتی" کہہ کہہ کر چپاتیاں مانگتے تھے۔ اسی دن سے مرزا کا نام مرزا چپاتی مشہور ہوگیا۔

مرزا صاحب اپنی خوش گفتاری کی وجہ سے ہر دلعزیز تھے۔ اپنے خاندانی وقار کی وجہ سے امرا میں بلائے جاتے تھے۔ شعر بہت اچھا کہتے تھے اس لئے مشاعروں میں بلاوا ہوتا۔ تحت اللفظ پڑھتے تو لوگ اور بھی محظوظ ہوتے۔ ان کے اکثر اشعار دلی والوں کو ازبر ہوگئے تھے اس ایک شعر پر مرزا نے مشاعرہ اڑا کر رکھ دیا ؎

بنالی شوٹ ہیں شٹ آڈ نے پر یہ نہیں سمجھا
نہ میں جنٹ نے ٹابل ہوں نہ جنٹ میرے ٹابل ہے

ایک مسالمہ میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہوا ؎

شمر نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے
سر مدوکا ہو نہیں سکتا مرے سر کا جواب

ان کے تین شعر اور یاد آگئے ؎

صراف کسوٹی پہ گھسا کرتے ہیں زر کو
ہم وہ ہیں جو آنکھوں سے پرکھتے ہیں بشر کو

دل دِل کے ہیں چونتیس عدد حرف تہجی وہی
بے لکھے سمجھ لیتے ہیں ہم زیر و زبر کو

ان چاروں کو جادو نے ستم دیکھا ہے مُخرو
اک حسن کو، آواز کو، دولت کو، ہنر کو

دلی کی دو ڈیرہ دار طوائفیں اب سے کوئی چالیس سال پہلے بہت مشہور تھیں۔ نام تو خبر نہیں ان کے کیا تھے۔ دوتی اور چوتی کہلاتی تھیں۔ دلی کے شہزادوں میں ایک بڑی دھوم دھام کی شادی ہوئی۔ اس میں دوتی جان کا مجرا تھا۔ جب مجرا جم گیا۔ اور دوتی جان فرمائشی گانے سُنا چکیں تو انہوں نے اپنی پسند کے گانے سُنانے شروع کئے۔ مرزا چپاتی نے کہا۔ "بائی جی ذرا ٹھہرنا ایک شعر ہوگیا ہے، پہلے وہ سُن لو۔" مجلس میں سناٹا ہوگیا۔ مرزا نے شعر کہا ؎

ڈھستے ڈھستے ہوڈئی اٹی ملٹ
ساٹ پیسے کی ڈوتی رہ ڈئی

(گھستے گھستے ہوگئی اتنی ملت
سات پیسے کی دوتی رہ گئی)

محفل میں ایک قہقہہ پڑا اور سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ دوتی جان بڑی سلیقے کی خاتون تھیں، انکی تیوری پر ہلکا سا بل آیا مگر انہوں نے مجلس میں کھنڈت نہ ڈالنی چاہی۔ خود بھی ہنسنے لگیں اور بولیں: "سبحان اللہ، مرزا صاحب۔ میں تو بیماری میں بالکل سُت گئی تھی۔ اب بھی مجھ میں پوری ہی جان کہاں آئی ہے۔ صاحب عالم نے یاد فرمایا تھا اس لئے حاضر ہوگئی۔" صاحب خانہ نے کہا۔ "بائی جی، تم تو جانتی ہو مرزا کی عادت شوخی کی ہے۔ ہاں، آپ سنائیے کیا سُنا رہی تھیں۔" اور گانا پھر شروع ہوگیا۔

مرزا بڑے لاڈ پیار میں پلے اس لئے کورے جاہل رہے مگر ان کی گفتگو سے جہالت ظاہر نہ ہوتی تھی لمبی عمر پائی۔ آخری وقت اچھا نہ گزرا۔ عسرت و تنگدستی میں مرے۔ (شاہد احمد دہلوی)

مرحوم شوکت تھانوی کی زبانی

لکھنؤ کا ایک دور

(یہ مضمون ۱۹۵۵ء میں لکھا گیا تھا)

سیّد جالب دہلوی۔ اُردو کے مشہور و معروف اخبار نویس۔ جیتی جاگتی انسائیکلوپیڈیا۔ آپ لاکھ اجنبی بن کر جائیں مگر جہاں آپ نے اپنا نام بتایا اور والد کا نام سنایا آپ کے متعلق باقی حالات وہ آپ کو سنانا شروع کردیں گے کہ آپ کے دادا اس سنہ میں ہجرت کرکے افغان کے راستے پشاور تشریف لائے، اتنے دن تک خشک میووں کی تجارت کی اور اس تجارت میں اتنا کمایا۔ پھر خشک میووں کی تجارت پر ایک سیر حاصل تقریر کریں گے۔ میووں کے باغات کو اگر موضوع سخن بنالیا ہے تو سمجھاتے چلے جائیں گے کہ پالیز کس طرح بناتے ہیں اور ان میں کاریزوں کے ذریعے کس طرح پانی پہنچاتے ہیں، ان زمین دوز نہروں کے پانی کا مزہ کیسا ہوتا ہے، ان کا پانی کس قسم کے امراض پیدا کرتا ہے اور ان امراض کے لئے کون کون سی دوائیں مفید ہیں، پھر ان دواؤں سے جو مزید امراض پیدا ہوتے ہیں ان کا کیا علاج ہے۔ اگر آپ نے گھبرا کر ان کی توجہ خود ان ہی کے حقّے کی طرف منتقل کرادی کہ "سید صاحب حقّہ جل بجھا ہے شاید" تو اب وہ حقّے کے موضوع پر ایسی بحث کریں گے کہ حقّے کی تمام تاریخ آپ کے سامنے آجائے گی کہ کب یہ ایجاد ہوا، کن کن ممالک میں کس کس قسم کا حقّہ پیا جاتا ہے، عظیم اللہ خانی حقّہ کیا چیز ہے، پیچوان، گڑگڑی، ناریل، مشک، یہ سب کیا ہیں، لکھنؤ نے حقّے کے معاملہ میں کن تکلفات سے کام لیا ہے، ہر دم تازہ حقّے کی کونسی قسم ہے مختصر یہ کہ اگر آپ اسی وقت حقّے پر ایک تھیسس لکھ دیں تو ڈاکٹریٹ کہیں نہیں گئی، اور ایک حقّے پر کیا منحصر ہے کسی موضوع پر بات کرلیجئے انشاءاللہ بات کریں گے، بات کی جڑ بتائیں گے اور بات کی پھنگی تک بحث کرتے چلے جائیں گے۔ مثلاً چھیڑ دیجئے حلوہ سوہن کا ذکر، بس وہ شروع ہوجائیں گے کہ: جی ہاں خوب ہوتا ہے حلوہ سوہن، مگر دراصل یہ مٹھائی نہیں ہے بلکہ حکمائے اُمراء کو زیادہ سے زیادہ گھی کھلانے کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا اور تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حلوہ سوہن سب سے پہلے نانا فرنویس کے لئے ان کے طبیب ہندی عبدالستار سرہندی نے بنایا تھا، مگر وہ اس کو ترقی نہ دے سکے۔ اور یہ نسخہ صرف بیاض سرہندی میں رہ گیا۔ یہاں تک کہ حکیم الحکماء میر فضل اللہ سبزواری نے اس نسخے کو حاصل کیا اور کئی امراء پر آزمایا اور دماغ کی خشکی اور نیند کی کمی کے لئے یہ بہترین نسخہ ثابت ہوا، پھر اس میں ترمیمیں کی گئیں اور آخری صورت یہ ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کے چھتّے کی طرح کی ایک چیز بنائی جاتی تھی جس کے سوراخوں میں گھی ہوتا تھا اور اس میں ایسے اجزا بھی ہوتے تھے کہ یہ گھی نقصان نہ پہنچا سکے، اور معدہ اس کو قبول کرے۔ سینہ بہ سینہ

آنند لکھنوی

یہ نسخہ دلّی کے رحمت علی حلوائی تک پہنچا اور ان کے خاندان نے حلوہ سوہن کو اتنی ترقی دی کہ ملکہ وکٹوریہ اس ہندستانی تحفے کو کرسمس کا بہترین تحفہ کہا کرتی تھیں۔ عرض تو کیا کہ کیا حقہ اور کیا حلوہ سوہن، ان کو تو اپنی معلومات کے اظہار کے لیے ایک موضوع چاہیے تھا وہ حقہ نہ سہی حلوہ سوہن سہی، حلوہ سوہن نہ سہی، اجنٹا کے غار سہی، جو موضوع چھڑ جائے جالب صاحب اُس پر گھنٹوں بول سکتے تھے۔ خواہ وہ جنگ بلقان سے متعلق ہو یا سائمن کمیشن سے متعلق، وہ زردوزی کا قصّہ ہو یا نقب زنی کا، ان کو اپنی معلومات کے خزانے لٹانے سے مطلب، افیون کا شوق فرماتے تھے اور پرانی کتابیں جمع کرنے کے افیون سے زیادہ رسیا تھے۔ دعوتوں کی شرکت عبادت کی طرح فرض سمجھتے تھے اور یہ حق اسٹاف کے کسی ممبر کو کبھی نہ دیتے تھے۔ روزنامہ ہمدم ہی کے زمانے میں بڑے بڑے

ساگرد پیدا کیے۔ سیاست والے سیّد حبیب، چودھری رحم علی ہاشمی، قاضی محمد حامد حسرت، انیس احمد عباسی، اور نہ جانے کون کون۔ نام تھا بشارت علی مگر مشہور ہوئے جالبؔ دہلوی کے نام سے۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ جالبؔ صاحب نے اپنے اس تخلص سے بھی کبھی کام لیا یا نہیں، بہر حال جالبؔ صاحب کا کوئی شعر کبھی نہیں سُنا، جالب صاحب ہمدم سے دست بردار ہو کر اپنے ذاتی اخبار روزنامہ ہمت کے مالک اور مدیر بن گئے مگر وقت پورا ہو چکا تھا۔ عمر نے وفا نہ کی۔ جالبؔ صاحب سے رخصت ہو کر لاٹوش روڈ پہ آگے بڑھیے تو لاٹوش روڈ ہی سے ایک گلی قندھاری لین کے نام سے نکلتی ہے اور لکھنؤ کی مشہور انجمن ایک آنہ فنڈ کو جاتی ہے، بلکہ اسی ایک گلی سے ایک چھوٹی سی گلی اور پھوٹتی ہے جس کا نام ہے ایک آنہ فنڈ لین۔ اس گلی میں لکھنؤ کے ایک نہایت قابل ذکر بزرگ رہتے ہیں۔

قدیرؔ لکھنوی۔ جی ہاں اب تو یقیناً قدیرؔ صاحب بزرگ ہو چکے ہیں، ورنہ لکھنؤ کے بزرگ شعرا کی بزرگی سے گھبرا کر جن نوجوانوں نے ینگ پارٹی کے نام سے اپنی علیٰحدہ تنظیم کی تھی ان باغی نوجوانوں میں قدیرؔ لکھنوی اور سراجؔ لکھنوی کے نام سرفہرست تھے۔ لکھنؤ کی مشہور انجمن شعر و سخن معین الادب سے یہ حضرات علیٰحدہ ہو گئے تھے اور بہارِ ادب کے نام سے اپنی علیٰحدہ انجمن بنالی تھی اور آخر کار بہارِ ادب ہی میں سب سمٹ آئے تھے۔ قدیرؔ لکھنوی غزل کے شاعر ہیں اور بہت اچھے غزل گو، اپنے زمانے میں پڑھتے بھی خوب تھے اور ہر غزل میں موسیٰ اور طُور کا ذکر لے ہی آتے تھے۔ یہ مضمون انھوں نے ایسا اپنایا کہ کیا کسی یہودی نے اپنایا ہوگا، مشاعروں میں ان کو ہمیشہ نہایت ذمہ دار حیثیت حاصل ہوتی تھی اور جب بہارِ ادب کے سکریٹری مقرر ہوئے پھر تو ذمہ داری ہی ذمہ داری

تھی، سراج اور قدیر کا اتحاد اسی طرح ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا جیسے نور الٰہی محمد عمر کا اتحاد یا اصغر علی محمد علی تاجران عطر کا اتحاد۔ قدیر لکھنوی سے مل کر ہر شخص ان کی تواضع اور اُن کے اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا تھا اور وہ نہایت وضعداری کے ساتھ دوستی نباہنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔

قدیر صاحب سے رخصت ہو کر لا ٹوش روڈ ہی سے موتی لال بوس روڈ پر مڑ جایئے اور نئے گاؤں کا رُخ کیجئے تو گک صاحب کے اسپتال کے پاس ہی 'نگار' کا دفتر ہے یہاں

مولانا نیاز فتحپوری سے ملاقات ہو سکتی ہے۔

صاحب طرز انشا پردازوں میں نیاز صاحب کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ نیاز صاحب نے افسانوی ادب میں اضافہ کرتے کرتے ایک دم مذہبیات سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ اور پھر مذہب سے ایسی کھلم کھلا بغاوت فرمائی کہ بہت سے ہنگامے بھی ہوئے، مولانا عبد الماجد دریا آبادی سے نہایت زبردست رن پڑا اور خاصی بدمزگی پیدا ہوئی۔ خیر یہ تو جو کچھ ہوا اس سے یہاں بحث نہیں، مگر اصل نیاز، شہاب کی سرگزشت اور کیوپڈ اور سائیکی والے نیاز کو اس رنگ میں دیکھ کر کم سے کم مجھے کبھی خوشی نہیں ہوئی۔ مولانا نیاز فتحپوری کے علم و فضل سے انکار نہیں، ان کی ذہانت کا بھی میں قائل ہوں، میرا اکثر جی بھی چاہا ہے کہ ان سے محبت کروں، مگر ان سے ڈر سی لگتا ہے، وہ جس قدر دلچسپ اور محبوب شخصیت ہیں اسی قدر کھرے اور سپاٹ بھی بن جاتے ہیں، اور بعض اوقات تو اس قدر کاروباری آدمی نظر آتے ہیں کہ وحشت ہونے لگتی ہے، وہ جو چند بے ہودہ سے اعتبارات ہیں، مثلاً مروت، ایثار، دوست نوازی وغیرہ، نیاز صاحب ان لغویات کے بس اس حد تک قائل ہیں کہ ان

اثر لکھنوی (مرحوم)

سے خود ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے، بہرحال یہ بھی ایک اصول ہے اور اگر کوئی شخص اپنے کو یہ کہہ کر سمجھا سکے کہ ان کی ان باتوں سے ہم کو کیا مطلب، تو اس کو نیاز صاحب نہایت خوشگوار دوست ثابت ہوں گے یعنی اگر ان کی ناخوشگواریاں نظر انداز کر دیجئے تو وہ واقعی خوشگوار ہیں۔ نیاز صاحب کے گھر میں پہلے وصل صاحب بلگرامی بھی رہتے تھے مگر اب اُن سے ملاقات یہاں نہ ہوگی۔ بہرحال نیاز صاحب کے گھر سے چل کر پھر لا ٹوش روڈ پر آجایئے اور اس چڑھائی پر چڑھ جایئے جو تکیہ گھاٹی کی طرف جاتی ہے، یہاں

حامد اللہ افسر میرٹھی رہتے ہیں۔ پروفیسر حامد اللہ افسر میرٹھی جو ایک زمانے میں اپنے نام کے ساتھ بی اے لکھا کرتے تھے، مگر جب سے بی اے کے طالب علموں کو پڑھانا شروع کیا ہے یہ لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ بچوں کے نہایت

کامیاب شاعر ہیں اور مشاعرے کے شاعر قطعاً نہیں، اس لئے کہ نہایت ہولناک انداز سے پڑھتے ہیں البتہ وہی نظم یا غزل اگر وہ خود نہ سنائیں تو پڑھ کر پڑھنے والے کو زیادہ لطف آتا ہے۔ نہایت محتاط قسم کے لئے دیئے سے آدمی ہیں اور ایک حد تک الگ تھلگ سے رہتے ہیں، نہ کسی ہنگامے میں کبھی حصّہ لیا نہ کسی سے اتنی دوستی بڑھائی کہ دشمنی کا خطرہ پیدا ہو، نہ کسی کو اُن سے خواہ مخواہ کی کوئی توقع ہوتی ہے، نہ وہ کبھی خلاف توقع ثابت ہوتے ہیں، کالج جاتے ہیں، گھر آجاتے ہیں، کوئی مل گیا تو ہنس بول لئے ورنہ اپنے کام سے کام۔ ادبی خدمات سے ایک زمانے میں کافی کمایا اور جو کمایا وہ لٹایا نہیں، بلکہ سلامت روی سے چلتے رہے۔ اُن سے رسالوں میں ملاقات کا امکان زیادہ ہے۔ یوں ملاقات ذرا کم ہی ہوتی ہے اور ہو بھی جائے تو بہت مختصر اور سرسری۔ لہٰذا ان سے سرسری ملاقات کرکے نظیرآباد سے ہوتے ہوئے قیصر باغ چلئے اور

مولانا وصل بلگرامی سے ملاقات کیجئے، سُرخ و سفید معمر بزرگ، چہرے پر نورانی داڑھی اور منہ میں نقلی دانت اسم گرامی ہے مقبول حسین مگر مشہور ہیں وصل بلگرامی کے نام سے، وصل صاحب کے تخلص کا جو پول مولانا نیاز فتحپوری کی بیگم صاحبہ نے کھولا تھا ہمیشہ یاد رہے گا۔ نیاز صاحب کو ایک مرتبہ اچانک یہ خیال آیا کہ وصل صاحب کو ہر ایک وصل یا وصل بلگرامی کہتا ہے مگر بیگم صاحبہ مقبول حسین کہتی ہیں، چنانچہ انھوں نے پوچھا کہ آخر یہ مقبول حسین کہنے کی کیا تک ہے، وصل کیوں نہیں کہتی ہو۔ تو بیگم صاحبہ نے بڑی سادگی سے کہا۔ "تو کیا میں بھی گالی بکوں"

وصل صاحب اپنے زمانے کی نہایت ہنگامہ پرور شخصیت گذرے ہیں۔ ان کے افسانے اگر دہرائے جائیں تو بھی ایک داستان، امیر حمزہ کی داستان کو آئینہ دکھادے، مختصر یہ ہے کہ وصل صاحب کے نزدیک دنیا کی کوئی بات ناممکن نہیں ہے، میں اکثر ان کا امتحان لیتا رہتا تھا۔ ان کے اکثر کمالات پر مختلف مضامین میں روشنی ڈال چکا ہوں، اس وقت ان کا ایک کارنامہ یاد آرہا ہے۔ بیان کئے ہوئے واقعات کو دہرانے کے بجائے یہی کارنامہ پیش کئے دیتا ہوں۔

رائے بریلی میں مشاعرہ تھا جس میں لکھنؤ کے بہت سے شعراء شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے، یہ مشاعرہ ساری رات ہوتا رہا اور صبح اس وقت ختم ہوا کہ رائے بریلی سے لکھنؤ جانے والی ٹرین ہم کو بمشکل مل سکی، جس وقت ہم تار پھاند کر پلیٹ فارم پر پہنچے ہیں، ٹرین رینگ رہی تھی لہٰذا ٹکٹ لینے کا موقع ہی نہ مل سکا اور جو ڈبہ سامنے آگیا اسی میں سب سماگئے، ٹریولنگ ٹکٹ کلکٹر نے بھانپ لیا کہ یہ بے ٹکٹ مسافر ہیں لہٰذا ہم لوگوں کے ساتھ ہی وہ حضرت بھی اسی ڈبے میں آگئے۔ سب سے پہلے آئین سلونوی صاحب سے ٹکٹ مانگا۔ انھوں نے وصل صاحب کی طرف اشارہ کردیا، مجھ سے ٹکٹ مانگا، میں نے بھی یہی کیا۔ پھر تو سراج قدیر، مولانا آسی، مولانا امید، سب ہی نے وصل صاحب کی طرف اشارہ کیا، یہاں تک کہ ٹکٹ کلکٹر صاحب وصل صاحب کے پاس پہنچ گئے جو انتظاماً اس وقت اونگھ رہے تھے، چنانچہ ٹکٹ کلکٹر نے ان کا شانہ ہلا کر سب کے ٹکٹ مانگے۔ وصل صاحب نے گویا چونک کر پہلے تو ایک منٹ تک محض ان حضرت کو غور سے دیکھا۔ پھر نہایت شفقت سے ایک طمانچہ ان کے رخسار پر مار کر کہا "کتنا لمبا ہوگیا ہے تو اچھا خاصا قد آدم۔"

اور پھر ہم سب سے مخاطب ہوکر بولے "یہ صاحبزادے اتنے سے تھے اور دن بھر ٹنگے رہتے تھے میری گود میں، مگر صاحب ایسا بدمعاش تھا یہ کہ جہاں آکر بیٹھا میری گود میں اور میرے نمازی کپڑے اس نے ناپاک کئے۔ پیشاب کرنے کی مناسب جگہ گویا میری گود تھی ان کے لئے، اسی لئے

میں اس کو شش کو کہتا تھا اور ایک اس پر کیا ہے ان کے
باواجان سے زندگی بھر کے مراسم، ساتھ اٹھنا، ساتھ
بیٹھنا، مگر قسم لے لیجئے جو میں ان کا نام بھی جانتا ہوں،
ہمیشہ ان کو چندی کہا اور یہی ان کا نام پڑ گیا تھا۔"
پھر ان حضرت سے مخاطب ہو کر "ہیں کہاں آجکل
ہمارے چندی بھائی؟"

اس بے چارے نے نہایت سعادت مندی سے
کہا۔ "جی ان کا تو دو سال ہوئے انتقال بھی ہو گیا۔"

لیجئے وصل صاحب نے واقعی آنسوؤں سے
رونا شروع کر دیا۔ ان کے کارنامے، ان کی وضعداری
کے قصے، ان کی دولت نوازی کی داستانیں سنا رہے
ہیں اور رو رہے ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں یہ بھی پوچھ
لیا کہ مرزا پور میں انتقال ہوا ہے، پھر کیا تھا اپنے اور
مرحوم کے مرزا پور کے قصے سنانے شروع کر دیئے۔ اس
بیچارے نے حیرت سے کہا۔ "مگر وہ تو مرزا پور اپنی زندگی
کے آخری دنوں میں گئے تھے۔"

وصل صاحب نے اس کو ڈانٹ دیا کہ "تم کو کیا
معلوم، اپنی والدہ سے پوچھنا کہ جب مرحوم ان کو طلاق
دینے والے تھے اس وقت ان کی اور میری مرزا پور
میں کیسی جنگ ہوئی ہے کہہ دینا اپنی ماں سے کہ مقبول
چچا ملے تھے۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ جب باقاعدہ چچا بن گئے تو اُس
سے برسبیل تذکرہ یہ بھی کہہ دیا کہ "بیٹے وہ بات یہ ہوئی
کہ ہم میں سے کوئی بھی ٹکٹ نہ لے سکا، گاڑی چل چکی تھی
لہٰذا مجبور ہو گئے۔ حد یہ ہے کہ چائے تک نہیں پی۔"

اس نے کہا کہ "لاحول ولاقوۃ۔ بھلا کوئی بات بھی
ہو، ٹکٹ نہیں لیا تو کیا ہوا، میں جو حاضر ہوں۔"

اور لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہنچ کر اب وہ سعادت آثار
سر ہیں کہ چچا پہلے ریستوران چل کر آپ سب چائے پی لیں

چنانچہ سب کو اس غریب نے چائے پلائی اور ریستوران ہی
کے راستے باہر نکال دیا۔ غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وصل
صاحب کے یہ نو تصنیف بھتیجے اس کے بعد سے زندگی بھر
بھتیجے رہے، لذیذ حکایت اگر طویل ہو جائے تو بھی مزہ دے جاتی
ہے، لگے ہاتھوں ان کا ایک قصہ اور ملاحظہ فرمائیے۔

رشید احمد صدیقی

پیدائش ۱۸۹۶ء، جونپور وطن، علی گڑھ سے فارسی میں
ایم اے کر کے اردو ادب کے پروفیسر ہو گئے۔ مسلم یونیورسٹی میں
تمام عمر گزار کر وہیں سے پنشن لی اور علی گڑھ کو اپنا وطن بنالیا
رشید احمد صدیقی طنز و مزاح میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ان
کے مضامین میں انفرادیت اور مخصوص شان ہوتی ہے۔
رشید احمد صدیقی کے طرزِ تحریر کی ایک بڑی خوبی اس کی ادبی
شان اور چبھتے ہوئے فقرے ہیں۔ استعارے اور کنائے
اور شاعرانہ نزاکتِ بیان کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔ 'گنجہائے
گرانمایہ' اردو میں مرقع نگاری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ 'یلدرم'
(سجاد حیدر یلدرم) کے ہاں حسن و محبت کا کاروبار ہے اور مجاز
کی طرفگی و تازگی ہے۔ ان کی تحریروں میں ایک بات نہایت
واضح طور پر ملتی ہے یعنی وہ جذبات کی رو اور روانی میں بھی
اپنے وزن اور وقار کو بہہ جانے نہیں دیتے

مرحوم تسنیمؔ لکھنوی

وصلؔ صاحب کے ساتھ میں شریک سفر ہوں،
رفیع احمد خاں مرحوم بھی ہیں اور جوشؔ ملیح آبادی بھی۔
اِسی ڈبے میں ایک نوجوان صاحبزادے اپنی نئی نویلی
دلھن کے ساتھ سفر کر رہے ہیں اور یہ ارمان انگیز جوڑا
سب کے سامنے بے تکلفی میں مصروف ہے، کبھی دلہن
صاحب ایک ادائے خاص کے ساتھ دولھا کے شانے
پر سر رکھ دیتی ہیں، کبھی دولھا میاں اپنی دلھن کے دستِ
نازپرورکو اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہیں اور کبھی کبھی تقریباً
دونوں لپٹ جاتے ہیں۔ وصلؔ صاحب سامنے کی برتھ
پر بیٹھے ہوئے وظیفہ پڑھ رہے ہیں کہ یکایک انھوں نے
تسبیح رکھی اور لپک کر اُس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہوگئے
"تم کو جو کچھ انھوں نے دیا ہے اس سے زیادہ ہم دینے
کو تیار ہیں اب اِدھر آجاؤ۔"

پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ وصلؔ صاحب کو
یہ کیا سوجھی۔ وہ نوجوان جوش میں کھڑا ہوگیا کہ "مطلب
کیا ہے تمہارا۔ تم نے میری بیوی کا ہاتھ کیسے پکڑا۔"

اور وصلؔ صاحب نے اس سے بھی زیادہ کڑکدار
آواز میں کہا: "بکتے ہو تم۔ یہ بیوی ہو ہی نہیں سکتی۔ بیوی
ہوتی تو یہ بے تکلفی تم گھر جاکر کرتے، سرِراہ مجمع عام میں یہ
بے تکلفی اسی کے ساتھ ہو سکتی ہے جو بیوی نہ ہو۔"

اور پھر اس نوجوان کو ڈانٹا۔ "صاحبزادے مجھ کو
معلوم ہے کہ یہ تمہاری بیوی ہے، اور مجھ کو یہ بھی معلوم ہے
کہ تم ایک شریف باپ کے بیٹے ہو، مگر اتنی دیر سے جو حرکتیں
تم کر رہے ہو وہ ہرگز شریفانہ نہیں ہیں۔ میں نے تم کو ایک
سبق دینے کے لئے یہ حرکت کی ہے۔ اور اب میں تمہارے
باپ سے بھی مل کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان کی خاندانی
شرافت تم سرِراہ کس طرح لٹاتے پھرتے ہو۔ ڈوب
مرو تم ننگِ خاندان۔"

اور ہم سب نے دیکھا کہ واقعی وہ نوجوان ڈوب
مرنے کو تیار تھا۔ وصلؔ صاحب جب کافی ڈانٹ چکے تو
اس نے ندامت سے صرف یہ کہا کہ "آپ نے مجھ کو زندگی
بھر کے لئے ایک ایسا سبق دیا ہے کہ اب میں کبھی نہ بھول
سکوں گا۔"

اس کے جواب میں وصلؔ صاحب نے اس کو گلے
سے لگایا۔ دُلھن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر وظیفہ پڑھنے
میں مصروف ہوگئے۔

وصلؔ صاحب تو مر گئے، مگر کیا ایسے آدمی بار بار
پیدا ہوتے ہیں۔ وصلؔ صاحب کا قصہ خواہ کتنا ہی
طول کھینچے اس کو ادھورا ہی چھوڑنا پڑتا ہے، آپ بھی
اس قصے کو ادھورا ہی چھوڑیئے اور اسی قیصر باغ میں
وصلؔ صاحب کے گھر سے دس پانچ قدم آگے بڑھ کر
سید آل رضا سے ملئے۔ اگر مولانا عبدالحلیم شررؔ نے اپنی
کتاب کا نام "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" نہ رکھا ہوتا تو
سید آل رضا کو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کہتا۔ صرف

کل دشورت کے ہی نہیں سیرت اور طینت کے بھی
سین، چہرے پر خاندانی شرافت کا نور، مزاج میں تکلفاً
بن بلکہ واقعی انکسار، شخصیت میں اس بلا کی جاذبیت
جو ایک مرتبہ ملا اس نے ہمیشہ دم بھرا، شائستگی اور لطافت
معیاری پیکر، میں جب سب سے پہلے سید آل رضا سے
ملا ہوں وہ قیصر باغ میں نہیں بلکہ نعمت اللہ روڈ پر رہتے
تھے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس خلوص اور یگانگت
کے ساتھ سید صاحب ملے تھے کہ مجھے یہ بھی شبہ نہ ہو سکا
کہ میں ان سے پہلی مرتبہ مل رہا ہوں، ان سے مل کر مجھے بڑی
تقویت حاصل ہوئی تھی کہ میں آج ایک ایسے انسان سے
ملا ہوں جس پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے، معلوم نہیں
کیوں، یہ ملاقات رسمی ملاقات نہیں معلوم ہوئی بلکہ یگانگت
کا جیسے دل کو یقین ہو گیا اور اس کے بعد میں ہمیشہ سید آل رضا
سے اس طرح ملتا رہا کہ میرا دل چاہتا تھا ان سے محبت کروں
محبت کو احترام کا رنگ دوں اور ان کی زیادہ سے زیادہ
توجہ حاصل کروں، ان کا کلام پڑھا، ان کو مشاعروں میں
سنا اور ان کی شاعری کے متعلق ہمیشہ یہی رائے رہی کہ یہ
شاعری ان کے دل کا چور ہے، وہ اپنے شعر میں مجھ کو ہمیشہ
چوٹ کھاتے ہوئے محسوس ہوئے مگر یہ پتہ نہ چل سکا کہ یہ
چوٹ کب اور کہاں کھائی ہے۔ رفتہ رفتہ ان کی رعنائیوں
پر مذہبی رنگ غالب آتا چلا گیا اور دوستوں والے آل رضا
اللہ والے آل رضا بن کر رہ گئے۔ بہر حال وہ بھی لکھنؤ کے ان
لیڈروں میں ہیں جو لکھنؤ کی چہل پہل لوٹ کر پاکستان آ گئے
اور اب کراچی میں ہیں۔

قیصر باغ سے پھر امین آباد کا رخ کیجئے تاکہ گوئن روڈ
پر آپ کو اس بدنام شاعر سے ملایا جا سکے جس کا کوئی تخلص
نہیں ہے، جس کا کوئی دیوان نہیں ہے، جس کا کوئی شعر چھپ
نہیں سکتا مگر جس کے اشعار سینہ بہ سینہ جانے کہاں تک
پہنچ چکے ہیں۔ ع

مولانا عبدالباری آسی لکھنوی (مرحوم)

یہ ذکر اب کارواں در کارواں ہے

جی ہاں کارواں در کارواں، یہ وہی شاعر تو ہے جس
کے متعلق شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے کہا تھا کہ خیریت ہوئی کہ
یہ حضرت اس رنگ میں شعر کہتے ہیں، ورنہ سنجیدگی سے شعر کی
طرف توجہ فرماتے تو بہت سے شاعروں کا پتہ نہ چلتا کہ کیا
ہوئے۔ یہ ہیں۔

رفیع احمد خاں۔ وہ ذہین ترین انسان جس کی ذہانت
کی داد "لاحول ولاقوۃ" سے دی جاتی ہے۔ جس کا کلام
سن کر ثقہ قسم کے لوگ عجب گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل
میں مبتلا ہو کر کہتے ہیں "استغفراللہ مگر سبحان اللہ، کیا

خوب کہا ہے ،، فحاشی کو آرٹ بنا کر اس فحاشِ اعظم نے پیش کیا اور اپنے ساتھ ہی اِس فن کو ختم کر دیا۔ صرف گالیاں نہیں بکی ہیں، بڑے بڑے مسائل آپ نے اسی رنگ میں پیش کیے ہیں، سیاسی گتھیاں آپ نے اسی رنگ میں سلجھائی ہیں، معاشی اور معاشرتی مسائل کو اسی رنگ میں حل کیا ہے اور بڑے بڑے ماہرینِ فن شعر سے کم سے کم اس بات کا لوہا منوا لیا ہے کہ جہاں تک شعر کا تعلق ہے نہایت پختہ کار انداز سے ٹھکا ہوا شعر کہتا ہے اور اس رنگ میں جو انفرادیت اس کو حاصل ہوئی، مشکل ہی سے کسی اور کو نصیب ہوئی ہوگی اور یہ اس کے کلام کا سحر ہے کہ نہ مشاعرے میں پڑھا گیا، نہ دیوان کی صورت میں آیا نہ کہیں چھپا، مگر حافظوں میں محفوظ ہے۔

جہاں تک علم و فضل کا تعلق ہے، انگریزی زبان کے چند فاضلوں میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔ اور شعری سلیقے کے لئے غالباً صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ آپکے شاعرِ انقلاب جن کو اب ہندوستان نے پدم بھوشن بنا دیا ہے یعنی جوشؔ ملیح آبادی کو اپنے سب سے پہلے مجموعۂ نظم "روحِ ادب" کے لئے رفیع احمد خاں سے بہتر مقدمہ نگار نہ مل سکا تھا، رفیع احمد خاں نے بہت کہا اور بہت خوب کہا۔ مگر اپنی موت سے چند دن پہلے زندگی کی پہلی اور آخری ایک سنجیدہ غزل بھی کہہ ڈالی میں نے یہ غزل سنی تو مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے رفیع احمد خاں سے بہت تلخی کے ساتھ کہا کہ آخر یہ گھاس کھودنے کی جناب کو کیا ضرورت پیش آئی۔ اب آپ گویا اس قابل رہ گئے ہیں کہ اپنے کو دبائے عام کے سپرد کر دیں، رفیع احمد خاں نے میرے اس احتجاج کی قدر کی اور بڑی بے چارگی کے ساتھ کہا کہ بخدا مجھے خود نہیں معلوم کہ کس شامت کے ماتحت یہ غزل ہو گئی ہے، مگر جب وہ میرے ساتھ ہی کھیلتے کھیلتے مر گئے اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ موت نے یہ غزل کہلوائی تھی بلکہ اس غزل میں موت ہی نے ان کو آواز دی تھی، اس غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

اجل خدا کے واسطے بس اتنی مہلت اور دے
میں زندگی سے کہہ تو لوں کہ یہ ترا مآل ہے

رفیع احمد خاں کے گھر سے کلن کی لاش ہوتے ہوئے کچے احاطے ہیں۔

مولانا آسیؔ سے ملتے چلیئے۔ ایک چھوٹے سے بوسیدہ مکان میں ایک افیونی قسم کے بڑے میاں سے بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے ہیں، ان صاحب کا بھی یہ عالم ہے کہ میلی قمیض پر اُجلا پاجامہ پہنے ہیں حالانکہ کل یہی بزرگ اُجلی قمیض پر میلا پاجامہ پہنے بیٹھے تھے، حقہ لگا ہوا ہے، چند نوجوان بھی اِدھر اُدھر مونڈھوں پر، تخت پر، چارپائی پر بیٹھے ہیں اور منتظر ہیں کہ شطرنج کی بازی ختم ہو۔ خود ان حضرت کو بھی بازی ختم کرنے کی جلدی ہے مگر مقابلہ جن بڑے میاں سے ہے وہ شطرنج کے مہروں کو بھی افیون چٹانے میں مصروف ہیں، معلوم نہیں یہ بڑے میاں کون ہیں مگر جو صاحب ان سے کھیل رہے ہیں ان کا اسمِ گرامی ہے مولانا عبدالباری آسیؔ۔ شارحِ غالبؔ بھی ہیں اور مطبع نول کشور سے نہ جانے ایسی کتنی کتابیں مرتب کر کے نکلوا چکے ہیں جو ہمیشہ باقی رہیں گی۔ کلیاتِ میرؔ اس اہتمام سے چھپوائی ہے کہ سبحان اللہ۔ کلیاتِ نظیرؔ اکبر آبادی واقعی بے نظیر ہے۔ دیوان خواجہ میر دردؔ اس خوبصورتی سے چھپوایا ہے کہ اب تک یہ اہتمام نہ ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ بیشمار ایسی ہی کتابیں آپ ہی کے اہتمام میں نول کشور کے مطبع سے نکل رہی ہیں اور آپ ہیں کہ کبھی آرگسؔ کے فرضی نام سے غالبؔ کے خلاف ایک چونکا دینے والا مضمون لکھ دیتے ہیں، کبھی یہ شوشہ چھوڑ دیتے ہیں کہ رباعیات عمر خیامؔ عمر خیام کی تھیں ہی نہیں۔ کبھی کسی ہمعصر سے چوٹیں چل رہی ہیں کبھی شاگردوں کو اکھاڑے میں زور کرا رہے ہیں، ایک سے ایک عجیب الخلقت شاگرد موجود ہے اور مولانا اس کو مشاعرہ میں چمکانے کے لئے غزل پہ غزل لکھ کر دے رہے ہیں، مشاعرہ

ہے تو شاگردوں کو سمیٹے بیٹھے ہیں کہ آپ یہ مطلع لکھ لیجئے، آپ یہ شعر لکھ لیجئے، آپ یہ مصرعہ لگائیے۔ آپ کی غزل کا یہ مقطع ہو اور وہ سب شاگرد مشاعرے میں مولانا کی غزلیں پڑھ پڑھ کر سلام کر رہے ہیں اور مولانا خوش ہیں کہ شاگرد چمک گیا۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ کمبخت کبھی شاعر بن بھی سکے گا یا نہیں۔ اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ دماغ کی بہترین کاوش تبرک بن کر شاگردوں میں بٹ گئی اور خود مولانا نہایت پھسی پھسی غزل پڑھ کر آگئے۔ اب مولانا آسی بھی نہ رہے اور یہ اکھاڑہ بھی ختم ہو گیا۔

مولانا آسی کے گھر سے چل کر مولوی گنج کا راستہ پکڑ لیجیے مولوی گنج کے چوراہے سے بائیں ہاتھ والی سڑک پر مڑ جائیے یہی راستہ اس گلی کو مڑ جاتا ہے جس میں

مولانا صفی رہتے ہیں۔ لکھنؤ کے نہایت قابلِ احترام شاعر، عزیز لکھنوی کے استاد، حضرت آرزو کے ہمعصر۔ وہ کیا بیٹھے ہیں اپنی چارپائی پر مہاتما گاندھی بنے ہوئے، ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتا ہے۔ نہ جانے کب سے بیمار ہیں حالانکہ بیمار نہیں بلکہ تندرستی ہی ایسی ہے، چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی ہیں اور خود ان کے درمیان چارپائی پر بیٹھے ہیں جس کے سرہانے بستر گول کیا ہوا رکھا ہے، حقہ قریب رکھا ہوا ہے اور صراحی اسٹول پر دھری ہے جس پر کٹورا اوندھا ہوا ہے۔ جس کا جی چاہے چلا جائے اور جب تک جی چاہے بیٹھ کر ان کا دماغ تناول فرماتا رہے نہ گھر کا دروازہ بند کریں گے نہ کسی آنے والے سے اپنی مصروفیت کا ذکر کریں گے اور یہ سلسلہ تقریباً دن بھر جاری رہے گا۔ ایک گیا تو دو اور آگئے، وہ اُٹھے تو کوئی اور آگیا البتہ بس دو قسم کے آنے والوں سے ذرا گھبراتے تھے ایک وہ جو کلام سُننے آئیں دوسرے وہ جو کسی مشاعرے میں مدعو کرنا چاہیں اور جب یہ اطمینان کر لیتے کہ آنے والا ان دونوں میں سے کسی کام سے نہیں آیا تو چہرے

امتیاز علی تاج

سید امتیاز علی تاج ۱۹۰۰ء میں بمقام لاہور پیدا ہوئے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ کالج کے ڈرامیٹک کلب میں بہت دلچسپی لی تصنیف و تالیف کا بہت اچھا ملکہ رکھتے سلیقہ رکھتے تھے۔ امتیاز علی تاج کا شاہکار "انار کلی" ہے جو اردو ادب کے ڈراموں کا "تاج" ہے۔ اسی لئے اس ڈرامے پر اردو زبان کو فخر و ناز ہے۔ اس میں سلیم (جہانگیر) کی لو و ٹریجیڈی اور اس کی دلربا کنیز "انار کلی" کا حسرتناک انجام معاشرت اور تمدن کی ہو بہو تصویریں اور لال قلعہ کی بول چال ہے۔ انار کلی کا اندازِ بیان ملاحظہ فرمایئے "سلیم تمہیں کیا مل گیا میری نیندوں کو لوٹ کر، میری راحت کو غارت کر کے، تمہیں کیا مل گیا سلیم پھر تم نے کیوں محبت کے پیغام بھیجے، کیوں سلگتی ہوئی چنگاری کو دہکایا" اس تحریر کے اسلوب سے حسنِ بیان کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔ ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء کو وفات ہوئی

پر خوف کی جگہ اطمینان کی بشاشت نظر آنے لگتی پھر خواہ کوئی کتنی ہی دیر بیٹھے اور کتنا ہی ان کا وقت برباد کرے ان کو پروا نہ ہوتی۔ انجمن معین الادب اور بہارِ ادب کے سالانہ مشاعروں اور شیعہ کانفرنس کے ان اجلاسوں میں تو چلے جاتے تھے جن میں اُن کو نظم پڑھنا ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ نہ کہیں اور جانے کو جی چاہتا تھا نہ صحت اجازت دیتی تھی، پھر بھی آئے دن تقاضے ہوتے ہی رہتے تھے اور مولانا صفی اپنی انتہائی مروت کے باوجود چڑچڑے پن پر مجبور ہو جاتے تھے، مولانا صفی کی شاعرانہ عظمت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے، مگر میں ایک مرتبہ ان کی تصویر دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوا جس میں وہ تمغہ لگائے بیٹھے تھے۔ مجھ کو ان کی بلند شخصیت پر یہ تمغے کچھ بدنما داغ نظر آئے اور میں نے اپنی اس تکلیف کا اظہار بھی کر دیا۔ قصہ یہ ہوا کہ میں اُس زمانے میں شباب

چودھری محمد علی ردولوی

نامی ایک ماہنامے کا ایڈیٹر تھا اس میں مولانا پر ایک مضمون حضرت ماجد الہ آبادی نے لکھا تھا لہذا میں مولانا سے تصویر لینے گیا اور مولانا نے وہی تصویر دینا چاہی۔ مگر میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ تمغے والی تصویر چھاپ کر میں اپنے اُس اعتقاد کو مجروح نہ کروں گا جو مجھ کو آپ سے ہے۔ میں اس تصویر کو آپ کے شایانِ شان نہیں سمجھتا۔ مولانا نے اس کے متعلق مجھ سے کوئی بحث نہیں کی بلکہ یہ عذر کر دیا کہ یہ تمغے مشاعروں کے نہیں بلکہ شیعہ کانفرنس کے ہیں، بہرحال چونکہ اس وقت اور کوئی تصویر موجود نہیں، لہٰذا آپ فوٹو گرافر کو لے آئیں اور اپنی مرضی کی تصویر کھنچوا لیں، چنانچہ مجھ کو یہی کرنا پڑا۔ مولانا صفی کے مکان کے قریب ہی ان کے برادرِ عزیز سید مقبول حسین ظریف لکھنوی کا بھی مکان ہے ان سے بھی ملتے چلیں۔ آہنی پھاٹک کے اندر میدان میں کرسی ڈالے جو بزرگ اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے بالوں کا خود ہی جائزہ لے رہے ہیں اور قینچی سے ان بالوں کو بغیر آئینے کی مدد کے برابر کرتے جا رہے ہیں۔ یہی ہیں۔

ظریف لکھنوی جن کو اردو کی مزاحیہ شاعری میں بہت ہی بلند مقام حاصل ہے۔ ظریف لکھنوی کی شہرت اودھ پنچ سے شروع ہوئی اور مشاعروں سے اُمنڈ کر تمام دنیائے اُردو پر چھا گئی۔ میں نے ان کو سب سے پہلے خود اُن ہی کے گھر میں انجمن معین الادب کے ایک مشاعرہ میں دیکھا تھا۔ جس میں تمام مشاعرہ ختم ہونے کے بعد سب کے آخر میں ظریف صاحب نے غزل پڑھی تھی، لکھنؤ کے طرحی مشاعروں میں مزاحیہ کلام مشاعرے کے آخر ہی میں پڑھا جاتا تھا۔ اس مشاعرے میں بھی آخری غزل ظریف صاحب کی تھی۔ ظریف صاحب سے پہلے مولانا صفی صاحب غزل پڑھ چکے تھے جن کی غزل کا ایک شعر اب تک دماغ میں محفوظ ہے ؎

قسمت میں جو لکھا ہے ملتا ہے بہر صورت
دانہ نہ سہی خرمن، خرمن نہ سہی دانہ

اور صفی صاحب سے پہلے حکیم دانش لکھنوی نامی ایک منقی صورت بزرگ نے ایک عجیب و غریب شعر پڑھا اور انتہائی سنجیدگی سے پڑھا تھا ؎

ہو گرم شبِ وصلت یوں پہلوئے جانانہ
رخسار بہ رخسارہ شانہ بسرِ شانہ،

ظریف صاحب کی غزل کا یہ شعر جو غالباً غزل کا تیسرا مطلع تھا اب تک یاد ہے ؎

لیلیٰ تری محمل میں گھس پڑتا ہے درآنہ
مجنوں کی شکایت کیا دیوانہ تو دیوانہ

ظریف صاحب ایک خاص قسم کے ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے اور جب سامعین ان کے کلام پر ہنستے تھے تو وہ اس قدر سنجیدہ نظر آتے تھے کہ ان کی اس سنجیدگی پر

اور بھی ہنسی آتی تھی - ظریف کی غزلوں کے علاوہ ان کی
شہرت کا باعث ان کی نظمیں ہیں۔ سفرنامہ عراق ان کی
ایک ایسی نظم ہے جس میں ان کے رنگِ سخن کے تمام پہلو
نمایاں ہیں، ہم سفر مستورات کا ذکر کیا ہے تو خالص بیگماتی
زبان ہے ؎

بیوی کی جھاڑو ایسے موئے بدمعاش پر
اُترے یہاں پہ کوئی کہاں اس کی لاش پر

نوکر کا ذکر کیا ہے تو اس کی زبان پوربی ہے، وہ
ملازم سخت نالاں ہے کہ اس کو خلاصیوں میں ٹھونس دیا
گیا ہے اور اس کی کوئی نہیں سُنتا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ ؎

کھلاسین میں کون سُنت بھری بات ہے
کپتان سے کہی تو سسُر پچھاڑ کھات ہے

اور جب خود اپنا حصہ نظم کرتے ہیں تو اپنی زبان ہے
اور اپنا بیان کہ ؎

اِسٹیشنوں کی بھیڑ بھی اِک یادگار تھی
عورت پہ مرد، مرد پہ عورت سوار تھی

اس شعر میں جو غیر محتاط اندازِ بیان ہے وہ کبھی کبھی
ظریف صاحب کے کلام میں آجایا کرتا تھا، مثلاً ؎

مذاق اچھا کیا عاشق سے یہ حسرت بھرے دِل نے
اِدھر وصلت کا نام آیا یہ پہلے سے لگا ہلنے!

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ظریف صاحب کے
کلام کا بیشتر حصہ مولانا صفی کا ہے اور یہ شبہ اس وقت
سے تقویت حاصل کر گیا جب لکھنؤ کے مشہور ماہر امراض
جنسی ایس۔ اے حکیم کا ایک منظوم اشتہار مولانا صفی نے
اپنے نام سے لکھا تھا اِس اشتہار میں جو شوخی اور ظرافت
تھی وہ تقریباً وہی تھی جو ظریف صاحب کے کلام میں نظر آتی
ہے، بہرحال ہم کو اِس سے بحث نہیں، اگر یہ واقعہ بھی ہے
تو اس کو گھر ملو پین دین سمجھنا چاہیئے۔ ظریف صاحب
بہرحال مولانا صفی سے ہی مشورہ فرماتے تھے، بڑے بھائی

ظریف لکھنوی (مرحوم)

اور اُستاد نے اگر کچھ بخش دیا ہو تو کیا عجب ہے، بہرحال صفی
زندہ رہے نہ ظریف، دونوں ہی لکھنؤ کی صحبتوں کو ویران
کر گئے۔ ظریف صاحب کے مکان سے چل کر رکاب گنج کے
پل کی طرف ہو کر جانا چاہیئے اس لئے کہ رکاب گنج کا پل
آنے سے پہلے ہی داہنے ہاتھ کو ایک گلی مڑتی ہے جس میں
سراج لکھنوی کا مکان ہے۔ لکھنؤ کی ینگ پارٹی کے
سربراہ اور مقتدر مہاجرین کے پیرو۔
سراج لکھنوی نے اگرچہ جامِ جہاں نما کے ایڈیٹ

مولانا افقر موہانی پر مقدمہ نہ بھی چلایا ہوتا تو بھی لکھنؤ کی تاریخ کی تدوین کے وقت ان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ نہ صرف نہایت خوش گو غزل کے شاعر ہیں بلکہ ان کے کلام میں نقاد کو بہت کچھ مل جاتا ہے اور غزل کی تہی مایگی کی شکایت کرنیوالے سراج کا کلام دیکھ کر اپنی شکایت پر نظرثانی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ سراج نے بھی بعض اوقات صرف زبان کے چٹخاروں سے کام لیا ہے، مثلاً ؎

اِک ذرا آپ کو زحمت ہوگی
آپکے پاؤں کے نیچے دل ہے

مگر ہر جگہ صرف زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ بہت سے اہم مسائل بھی ہیں، اہم مسائل سے مطلب وہ اہم مسائل نہیں جن کے لئے قومی نظمیں کہی جاتی ہیں، غزل کے بھی اہم مسائل ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ہر غزل میں نظر نہ آئیں۔ سراج لکھنوی مشاعروں کے مردِ میدان رہ چکے ہیں اور ان کی مقبولیت کا ایک وسیع میدان بھی تھا۔ غالباً یہ اسی مقبولیت کا نتیجہ تھا کہ مولانا افقر موہانی نے اپنے رسالے میں ان کی ایک غزل کے متعلق لکھ دیا کہ یہ غزل شروع سے آخر تک دیوانِ سراج جھنجھانوی میں موجود ہے، سرقے کے اِس الزام پر سراج لکھنوی نے افقر صاحب پر مقدمہ چلا دیا اور یہ مقدمہ خاصی ادبی اہمیت حاصل کر گیا۔ اس لئے کہ کون سا ایسا قابلِ ذکر ادیب یا شاعر تھا جو خانہ شہادت میں نہ آیا ہو۔ سراج صاحب کی طرف سے پنڈت آنند نرائن ملّا وکیل تھے اور افقر صاحب کے وکیل مسٹر متین الدین مرحوم تھے۔ خان بہادر سید عین الدین مرحوم کی عدالت میں یہ مقدمہ بہت دنوں تک چلا اور سراج لکھنوی کی طرف سے جو گواہ پیش کئے گئے اُن میں میں بھی تھا، احاطۂ عدالت میں مختلف درختوں کے سائے میں ادیبوں اور شاعروں کی مختلف ٹولیاں مشاعرے کرتی نظر آتی تھیں۔ بعد میں یہ مقدمہ سراج لکھنوی کے حق میں فیصل ہوا اور مولانا افقر موہانی کے متعلق فاضل مجسٹریٹ نے چند پُرلطف ریمارک دے کر یہ قصہ ختم کر دیا۔ بہرحال یہ تو سراج لکھنوی کے ذکر میں بات چل پڑی تھی۔ ذکر تھا خود سراج لکھنوی کا، جو نہایت دھان پان سے مرنجان مرنج دوست بھی تھے اور چونکہ اسی دفتر میں ملازم تھے جس میں رفیع احمد خاں مرحوم تھے۔ لہٰذا رفیع احمد خاں مرحوم کی کوششوں سے ان کو اس وقت اپنے بلوغ کا احساس ہوا جب اولاد بالغ ہونے کے قریب تھی۔ زندگی جو ایک سطحیت کے ساتھ بسر ہو رہی تھی اس میں مد و جزر کی، کیفیت پیدا ہوئی۔ شب بیداریاں شروع ہوئیں، تیری گلی کے سو سو پھیرے شروع ہوئے، گھر میں ناچاقیاں ہوئیں مگر یہ سب کچھ بھی عارضی تھا۔ چراغ پھڑپھڑایا ضرور تھا، مگر طلوعِ سحر کا مخبر بن کر۔ نتیجہ یہ کہ پھر سویرا ہو گیا، آنکھ کھلی تو گھر ہی میں بجری بنے بندھے ہوئے تھے اور ان لغزشوں پر ندامت کی جگالی فرما رہے تھے جو نہ جانے کیوں سرزد ہو گئی تھیں۔ سراج لکھنوی سے مل کر نخاس کی طرف چلنے کے لئے نادان محل روڈ سے گزرنا ہو گا تاکہ اشرف آباد چل کر سب سے پہلے

عزیز لکھنوی سے نیاز حاصل کیا جائے۔ عزیز لکھنوی کی شاعرانہ عظمت کے لئے صرف یہی کہہ دینا کافی ہو گا کہ وہ جوش ملیح آبادی کے اُستاد تھے۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے اُستاد تھے۔ حکیم سید علی آشفتہ کے اُستاد تھے، اور پنڈت موہن لال رواں کے اُستاد تھے۔ ایسے مشاہیر شاگرد کسی اُستاد کو مشکل ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ میں نے ان کو سب سے پہلے رفاہِ عام کیمپ کے اس جلسے میں نظم پڑھتے دیکھا تھا جس میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی طویل اسیری کے بعد رہا ہو کر لکھنؤ آئے تھے اور ان کا شاندار

استقبال اِسطرح کیا گیا تھا کہ جلوس میں ہندو بھی اللہ اکبر
کے نعرے بلند کر رہے تھے 'یہ جلسہ بھی خیر مقدم کرنے کے لئے
منعقد کیا گیا تھا۔ مولانا عزیز لکھنوی نے جو نظم پڑھی تھی
اس کا صرف ایک مصرعہ اس وقت ذہن میں ہے۔ ع

یوسف کی قید سلطنتِ مصر بنگئی

اس کے بعد کئی مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا
اور کئی مرتبہ اُن کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوا۔ ایک
دن عزیز صاحب امین آباد میں مل گئے۔ مجھ سے باتیں
ہی کر رہے تھے کہ ایک نہایت موٹے تازے شخص کو میں
نے دیکھا کہ آخر یہ کس چکی کا پسا کھاتا ہے۔ عزیز صاحب میرے
تجسس کو تاڑ گئے اور مجھ سے پوچھا جانتے ہو ان حضرت
کو، میں نے نفی میں سر ہلایا تو بولے: "یہ لکۃ ابر ہے" میں
پھر بھی حیران رہا تو فرمایا " ابر قدوائی کے صاحبزادے"
اسی طرح کے بے شمار لطیفے ہمدم کے دفتر میں آتے اور
سُنا جاتے۔ ہمدم کے دفتر میں ان کی آمد و رفت اس
زمانے میں ۔۔ بہت بڑھ گئی تھی۔ جب ان کے شاگرد
چودھری رحم علی الہاشمی 'ہمدم' کے ایڈیٹر تھے' ایک
دن میں نے عزیز صاحب سے پوچھا کہ بجنور کے اخبار
'مدینہ' کی پیشانی پر آپ کا جو شعر لکھا رہتا ہے ؎

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

یہ محض کاریگری ہے یا کچھ اور، تو ہنس کر بولے
کہ ہے تو واقعی یہ کاریگری، مگر آپ کاریگری کے اِتنے
مخالف کیوں ہیں؟ مدینہ کی میم، اِدھر اور 'ہ'، اُدھر،
بیچ میں صرف 'دین' رہ گیا اور مہ کو یا شق ہو گیا یہ
بات اگر مجھے سوجھ گئی اور میں نے نظم کر دی تو آپ
ناراض کیوں ہیں، میں نے لاکھ لاکھ سمجھایا کہ میں ناراض
نہیں ہوں بلکہ صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اور کوئی بات
تو نہیں ہے اس شعر میں مگر ان کو یہی شبہ رہا کہ میرے

عنایت اللہ دہلوی

پیدائش ۱۸۶۹ء وطن دہلی شمس العلما مولوی ذکاءاللہ
دہلوی کے لائق فرزند تھے۔ الٰہ آباد اور علی گڑھ میں تعلیم پائی
اپنے والد، سرسید اور علی گڑھ کالج کے پروفیسروں کی صحبت
میں رہ کر ترجمہ کا شوق ہوا اور سرسید کی فرمائش پر سرٹامس
آرنلڈ کی 'پریچنگ آف اسلام' کا ترجمہ 'دعوتِ اسلام' کے
نام سے کیا۔ ان کا علمی کارنامہ لین پول کی مشہور کتاب
'صلاح الدین ایوبی' اور ہیرلڈ لیمب کی دل چسپ اور محققانہ
تصنیف 'چنگیز خاں' اور 'تیمور' کے ترجمے ہیں۔ ان کا ایک
اور شاہکار 'اندلس کا تاریخی جغرافیہ' جو ڈوزی کی مشہور عالم
کتاب کا ترجمہ ہے۔ ان کے تراجم اس قدر سلیس 'آسان'
عام فہم اور با محاورہ ہوتے ہیں کہ انگریزی کتابوں کے
تراجم میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ ۱۹۴۳ء میں آپ نے دہلی
میں وفات پائی۔

دل میں کوئی اعتراض ہے جسے میں بیان کرنا نہیں چاہتا
چنانچہ جب کبھی ملتے یہی پوچھتے کہ ہاں بھئی وہ بات کیا
تھی اور میں از سرِ نو یقین دلاتا تھا کہ میں نے کسی اعتراض
کی غرض سے یہ بات نہیں پوچھی تھی۔ عزیز لکھنوی میں
اپنے خوردوں کو بھی دوست بنا لینے اور اپنے کو ان کے
لئے دلچسپ ثابت کرنے کا ملکہ تھا۔ چنانچہ ان کے
اِنتقال کے بعد صرف ان کے ہمعصروں اور شاگردوں
ہی کو ایک کمی محسوس نہیں ہوئی جو اُن سے مشورۂ سخن کرتے
تھے بلکہ امین آباد ہائی اسکول کے اُن لڑکوں کو بھی ایک
خلا محسوس ہوا جو ان سے صرف درسی کتابیں پڑھتے تھے
مگر عزیز لکھنوی ان کے دل و دماغ میں بھی رچے اور
بسے ہوئے تھے۔ عزیز صاحب کے مکان سے تھوڑے
ہی فاصلے پر
پروفیسر مسعود حسن ادیب بھی رہتے ہیں ان

سے بھی ملتے چلیے۔ پروفیسر مسعود حسن ادیب پروفیسر تو خیر ہیں ہی، لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اُردو اور مسعود حسن بھی ہیں مگر یہ جو ادیب اُن کا تخلص ہے اس کا مصرف کبھی سمجھ میں نہ آیا۔ ممکن ہے یہ تخلص بھی مسعود حسن صاحب اسی احتیاط سے رکھتے ہوں جس طرح وہ قلمی نوادر احتیاط سے رکھتے ہیں جن کو وہ اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتے ہیں اور یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کو ہوا بھی لگ سکے، اس میں شک نہیں کہ اُن کے کتب خانے میں بہت ہی قیمتی چیزیں ہیں اور ان کی قیمت کا راز صرف اُن کی نایابی میں ہے، مثلاً اِندر سبھا کا نایاب نسخہ، واجد علی شاہ کی بیگمات کے خطوط

واجد علی شاہ کی قلمی مثنویاں اور اِسی قسم کی بے شمار چیزیں جن کو لوگ عجائبات کے طور پر دیکھنے جاتے ہیں اور مسعود حسن صاحب اگر زیادہ مجبور کیے گئے تو وہ نوادر اس طرح دکھاتے ہیں جس طرح نظام حیدرآباد نے علامہ اقبال کو اپنے جواہرات کا خزانہ دکھایا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مسعود حسن صاحب کا خزانہ بھی جواہرات سے کم نہیں مگر وہ اس کو دولت بیدار بنانے کی بجائے دفن کئے ہوئے ہیں۔ مسعود حسن صاحب اُردو کے شیدائیوں میں سے ہیں ان کی خدمات سے قطع نظر صرف ان کو اُردو بولتا ہوا سُن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مزہ لے لے کر مٹھائی کھا رہا ہو، وہ ایک ایک لفظ سے ایسا

نواب صدیق حسن خاں قنوج کے رہنے والے تھے اُنکا بچپن حیدرآباد میں اور زمانۂ طالب علمی دہلی میں گذرا مفتی صدرالدین آزردہ نے انہیں تعلیم دی۔ تلاش معاش کی غرض سے ۱۲۷۰ھ میں بھوپال گئے تو ان کی عالمانہ صلاحیتوں سے متاثر ہو کر فرمانروائے وقت نواب شاہ جہاں بیگم تاجور نے

۱۲۸۸ھ میں انہیں اپنا رفیق حیات بنا کر نواب کا لقب عطا فرمایا اور ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر کی سند بھی۔

نواب صدیق حسن خاں بھوپال کے ہی نہیں ہندوستان کے ایسے واحد عالم و فاضل اور دبیر کامل تھے جنہوں نے تقریباً تین سو کتابوں کی تصنیف و تالیف کی۔ عربی اور فارسی کے علاوہ صرف اردو زبان میں ان کی سو سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

انگریزوں کے ہندوستان پر اقتدار سے انہیں سخت نفرت تھی اور اسی انگریز دشمنی نے ان کو بہت سے نقصان پہنچائے۔ ان کی جاگیر ضبط ہوئی، نواب کا خطاب واپس لیا گیا —— آپ نے "گل رعنا" کے نام سے اپنے اردو اور فارسی کلام کا تحفہ اردو ادب کو پیش کیا۔ یہ مجموعہ کلام بھی شائع ہو چکا ہے۔

اگرچہ یہ بات قیاسی ہے کہ وہ غالب کے شاگرد تھے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ غالب کے مشہور شاگرد "افتخار الشعراء" خان محمد خاں شہیر سے اپنے اردو اشعار پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ نواب موصوف اردو میں توفیق اور فارسی میں نواب تخلص کیا کرتے تھے۔

نواب یار محمد خاں شوکت بھوپال کے نواب فوجدار محمد خاں کے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے نہ صرف شاعری کے میدان میں صلاحیت کے جوہر دکھائے بلکہ نثر کے میدان میں بھی انہوں نے بہت سی کتابوں کا اردو ادب میں اضافہ کیا ہے۔

شعروشاعری اور ادبی خدمت کا جنون عہد طفلی سے ہی تھا — شوکت مشاعروں کی جان تھے۔ ان کے دیوان خانے پر ہر ہفتہ مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ان مشاعروں کی خصوصیت یہ تھی کہ بہترین غزل پڑھنے والے شاعر کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا جاتا تھا۔

تم سلامت رہو ہزار عاشق
ہیں اگر ایک ہُوا ، ہُوا نہ ہُوا

کلام اور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔ دیوان شوکت، مثنوی شعلۂ عشق۔ تذکرہ فرح بخش۔ مراسلاتِ شوکت بازنامہ۔ فیل نامہ۔ فسانۂ رحمت قرابادینِ شوکتی بہشت خوان شوکت وغیرہ وغیرہ۔

نواب شوکت ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے اور اسی سال کی عمر میں سے بیس سال کے علاوہ علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہتے ہوئے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔

نواب مرحوم کی بیگم حسن آرا بیگم نمکین بھی جو ملکہ دلی بی بی کے نام سے مشہور تھیں صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ کلام نمکین کے عنوان سے ان کے تین مجموعے مطبع حسینی کانپور سے شائع ہو چکے ہیں۔

مزہ لیں گے اور ان کے چہرے پر ایسا انبساط ہوگا کہ سُننے والے کے مُنہ میں پانی بھر آئے۔ ویسے بھی ان میں رہنے سہنے، اُٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا بڑا سلیقہ ہے، ہر بات سے فطری نفاست پسندی جھلکتی ہے اور اُن سے ملنے والے کو ان سے مل کر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے خطاطی کا کوئی نہایت نفیس نمونہ دیکھا ہو۔ مسعود صاحب سے مل کر نخاس ہوتے ہوئے بھوائی ٹولے کی طرف مڑ جایئے تو حکیم عبدالعزیز روڈ پر مرزا محمد عسکری کا نہایت بلند و بالا مکان ہے جس میں اب صرف اُن کی یاد رہتی ہے، وہ قبر کا کونہ آباد کر چکے ہیں مگر یہ ذکر ہے اُس وقت کا جب وہ زندہ تھے، اور ان میں زندگی کی ہر چہل پہل موجود تھی۔ وہ بھی بڑی چہکارے

نار زبان بولتے تھے اور بات کرتے وقت بات کا مزہ لیتے تھے۔ رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادبِ اردو کے مترجم کی حیثیت سے ان کی شخصیت اتنی بلند نہیں ہے جس قدر اپنی دوسری کتابوں نے انکو ہر دلعزیز اور ساتھ ہی ساتھ قابلِ ذکر بنا دیا ہے۔ نوادر من کیستم اور آئینہ بلاغت، ان کی وہ کتابیں ہیں جن میں مرزا صاحب اپنے صحیح خد وخال کیساتھ نظر آتے ہیں۔ بڑے اچھے دوست، بڑے دلچسپ بزرگ مگر ساتھ ہی ساتھ منتظم ایسے تھے کہ اگر آپ ان کے پاس پہنچ جائیں اور آپ کی تواضع اُن کے بجٹ سے باہر جا رہی ہو تو وہ شاید آپ کو پان کے لئے بھی نہ پوچھیں اور سلیقہ اتنا کہ پان اگر کھلائیں گے تو گلوریوں پر کیل کے ساتھ گلاب کی پنکھڑیاں بھی لگی ہوں گی کہ دیکھتے ہی طبیعت خوش ہو جائے بات بات میں لطیفے سنائیں گے، آپ کو ہنسائیں گے اور خود بھی ہنسنا چاہیں گے مگر آپ ذرا غلط زبان بولے اور ان کا مزہ کرکرا ہوا۔ لوگ ان کے پاس صرف ٹکسالی بولی ٹھولی اور کبھی کبھی ضلع جگت سننے جایا کرتے تھے مگر جب ٹکسالی بولی ٹھولی اور ضلع جگت ہی نہ رہا تو وہ اب کیا کرتے رہ کر۔ مرزا محمد عسکری کے مکان سے جھوائی ٹولہ ہوتے ہوئے آگے بڑھ جایئے تو

مولانا عبد الحلیم شرر کا مکان ہے جہاں وہ سفید گھنی داڑھی والے فادر کرسمس کی شکل کے بزرگ رہتے تھے جن کا ناول نویسی میں طوطی بولا کرتا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ان کا کتابوں اور کاغذوں سے اٹا ہوا وہ کمرہ نظر آتا تھا جس میں ایک میز پر کتابوں میں دفن یہ بزرگ ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے نظر آتے تھے۔ مجھ کو ان سے بات کرکے کبھی لطف نہ آیا۔ نہایت سپاٹ قسم کی باتیں کرتے تھے البتہ اس زمانے میں وہ دلچسپ بن گئے تھے جب ایک شخص مسلم اشرر پیدا ہو گیا تھا جو ان کی ہر ناول کو ہتیا لیتا تھا مثلاً انھوں نے لکھا دربار رام پور اس نے دربار حرام پور کے نام سے کچھ ادھر اُدھر سے بدل وہی کتاب چھاپ دی۔ سخت عاجز تھے مولانا اس کے ہاتھوں اور کچھ بنائے نہ بنتی تھی۔ نہ جانے ان کی کتنی کتابوں کا اس نے اسی طرح ناس مارا اور اپنے کو شرر کہہ کر اپنی خرافات بھی ان ہی کے سر تھوپ دیں، اس زمانے میں مولانا کی اس نورانی صورت پر وہ گالیاں بڑی بھلی لگتی تھیں جو منارام شرر کو وہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ مولانا کو میں نے ہمیشہ نہایت خشک اور کھرا پایا۔ وہ مصنف کم اور تاجر زیادہ نظر آتے تھے، مولانا شرر سے سرسری ملاقات کے بعد پھر جھوائی ٹولے سے ہوتے ہوئے ذرا چوک میں داخل ہو جایئے جہاں حیدر حسین خاں کے پھاٹک سے آگے بڑھ کر چودھرائن کے امام باڑے کے سامنے ہی ایک قابلِ ذکر بزرگ

خواجہ عبد الرؤف عشرت کی کتابوں کی دوکان ہے۔ اب نہ خواجہ عشرت رہے نہ ان کی دوکان مگر تصور میں اب بھی یہ دوکان موجود ہے جس میں خواجہ صاحب نہایت دھان پان قسم کے بزرگ اپنی ہی لکھی ہوئی شاعری سکھانے کی کتابیں، شاعری کی پہلی کتاب، شاعری کی دوسری کتاب، شاعری کی تیسری کتاب، شاعری کی چوتھی کتاب بیچا کرتے تھے۔ شاگردوں کی غزلیں بناتے تھے اور شام کو یہی دوکان شاعروں کا اڈا بن جاتی تھی جن میں مرزا صفدر مرزا بھی نظر آتے تھے۔ مشاطۂ سخن کے مصنف

صفدر مرزاپوری ریاض خیر آبادی کے شاگرد اور بہت سے شاگردوں کے اُستاد تھے۔ مشاعروں میں بڑی پابندی سے شرکت کرتے تھے اور غزل اس طرح پڑھتے تھے کہ کبھی کسی نے قافیہ اور ردیف نہ سنا، قافیہ اور ردیف تک پہنچتے پہنچتے اس قدر انکسار میں مبتلا ہوتے کہ بس ہیں ہیں ہیں ہو کر کے رہ جاتے مثلاً

پطرس بخاری

سید احمد شاہ بخاری پطرس ۱۸۹۸ میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور کیمبرج میں تعلیم پائی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے پھر یہیں پرنسپل ہو گئے۔ آل انڈیا ریڈیو میں ڈائرکٹر جنرل براڈکاسٹنگ رہے۔ ۱۹۵۰ء میں انجمن اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے مقرر ہوئے۔ بعد میں اقوام متحدہ کے سکریٹریٹ میں انڈر سکریٹری (اطلاعات) کا عہدہ ملا۔ ۱۹۵۸ء میں امریکہ میں انتقال ہوا۔ پطرس نامور ادیب، انشا پرداز اور مزاح نگار تھے۔ انہوں نے اپنے مضامین میں ان تمام لطافتوں کا اظہار کیا ہے۔ جو ہمیں مغرب میں نظر آتی ہیں۔ اس طرح پطرس نے اردو مزاح نگاری کے چمنستان میں نئے گل بوٹوں کا اضافہ کیا۔ پطرس کے مضامین میں اعلیٰ درجہ کی طنز و مزاح کی چاشنی ہے۔ وہ بلاشبہ اپنے زمانے کے ممتاز مزاح نگار تھے۔

فرق کیا عاشق و معشوق میں بس اتنا ہے
کوئی دیوانہ بنائے کوئی دیوانہ بنے

یہ شعر جب وہ پڑھتے تو وہ اس طرح سننے والے سنتے تھے کہ ؎

فرق کیا عاشق و معشوق میں بس اتنا ہے
کوئی دیوانہ بناتے کوئی ہیں ہیں ہیں!

ایک حادثے میں پیر اور ایک ہاتھ بیکار ہو گیا تھا چنانچہ پھر ہر غزل میں اس قسم کا ایک آدھ مصرعہ ضرور آجاتا تھا کہ ع

کر دیا مجبور اس بے دست و پائی نے مجھے

صفدر مرزا پوری سے مل کر چوک میں ہوتے ہوئے پارچے والی گلی سے فرنگی محل کی طرف چلیے، زردوزی کا کام کرنے والوں اور کڑھائی کے کام کی دوپلی ٹوپیاں اور کرتے بیچنے والوں کی دوکانوں سے گزر کر فرنگی محل شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی علمائے کرام ہی ہیں کچھ ادیب اور شاعر قسم کے بزرگ بھی ہیں مثلاً

مولانا صبغۃ اللہ شہید فرنگی محلی بنیادی طور پر آپ بھی مولوی ہیں، چنانچہ وعظ فرماتے ہیں، مجالس پڑھتے ہیں، نہایت خوش بیان خطیب ہیں اور جس تیزی سے اردو کے شگفتہ اور ڈھلے ڈھلائے فقرے اپنی تقریر میں آپ بولتے ہیں، بہت کم مقرر یہ شگفتگی اور زبان کی یہ صحت قائم رکھ سکتے ہیں۔ مختلف اخبارو اور رسالوں کی ادارت بھی کر چکے ہیں، مگر عالم دین و مفتی شرع متین زیادہ دنوں تک محض شاعر یا ادیب نہیں رہ سکتا، لہٰذا اب آپ صرف مولانا ہیں۔ فرنگی محل میں آپ سے مل کر اور آپ کے یہاں کی پر تکلف چائے پی کر وکٹوریہ اسٹریٹ پر بڑھ آنے کے قریب آجائیے تو فرنگی محل کے پل کے سامنے ہی

حکیم سید علی آشفتہ کا مطب اور دواخانہ ہے۔ حکیم آشفتہ لکھنؤ کی ینگ پارٹی کے سربراہ۔ عزیز لکھنوی کے شاگرد اور خود نہایت شگفتہ بیان شاعر ہیں لکھنوی تکلف کی منہ بولتی تصویر، سر پر پٹھے دار بال گلے میں چنا ہوا نفیس انگرکھا، پیروں میں جالی کھلا ہوا چوڑی دار پاجامہ، پیر میں کامدار جوتا اور ع

لکھنؤ ہم پر فدا ہے، ہم فدائے لکھنؤ

کی بذات خود تفسیر، ہر وقت شاعروں کا مجمع لگا رہتا ہے، شہر بھر کی ادبی اور شعری فضاؤں پر تبصرہ ہوتا ہے۔ بہت سے شاعروں کو خود بھی سمیٹے ہوئے ہیں مثلاً نوجوان خوش گو شاعر

منظر لکھنوی آپ ہی کے دواخانے کے منتظم ہیں یہ وہی منظر لکھنوی ہیں جن کا مطلع ؎

ایسا بیخود کیا خوف شب تنہائی نے

صبح سے شمع جلا دی ترے سودائی نے

سُن کر نواب سائل دہلوی نے سرِ مشاعرہ ان حضرت کا منہ چوم لیا تھا۔ یہ منظر لکھنوی مشہور ڈرامہ نویس منشی احسن کے بھانجے ہیں۔ مگر خود صرف غزل گو شاعر ہیں اور ان کا میدانِ عمل صرف مشاعرہ ہے، ینگ پارٹی کے رکن ہیں، مگر سراج اور قدیر بلکہ حکیم آشفتہ تک مشاعروں کے علاوہ ادبی رسائل میں بھی نظر آتے ہیں لیکن منظر ان بیشتر شعرائے لکھنؤ میں سے ہیں جن کو لٹریچر زیادہ عرصے تک یاد نہ رکھ سکے گا۔ منظر لکھنوی سے مل کر آپ پولیس پوسٹ یا ٹانا مہ تک بڑھ جائیے وہاں خان بہادر شیخ احمد علی عرف ڈلن صاحب سوداگر کے مکان میں آپ کی ملاقات

خواجہ مجذوب غوری

سے ہو سکتی ہے۔ خان بہادر خواجہ عزیز الحسن غوری، جو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید بن کر ڈپٹی کلکٹری کو چھوڑ بیٹھے تھے اور اپنی خدمات محکمۂ تعلیم میں اس لئے منتقل کرالی تھیں کہ ڈپٹی کلکٹری میں نہ جانے کب سود کی ڈگری دینا پڑ جائے یا کوئی اور خلافِ شرع فیصلہ کرنا پڑ جائے، چنانچہ خان بہادر ہیں، ڈپٹی انسپکٹر مدراس ہیں۔ بڑے سینئر ڈپٹی کلکٹر رہ چکے ہیں مگر وضع قطع سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کسی مسجد سے اذان دے کر آ رہے ہیں۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی، سرخ و سفید چہرے پر بھوری داڑھی، لمبا کرتا، اٹنگا پاجامہ، بغل میں لٹکا ہوا کلام مجید، مگر آپ کو مل جائیں گے تو سڑک ہی پر کھڑے کھڑے اپنی غزل سُنانا شروع کر دیں گے، اور غزل بھی وہ جس میں کم سے کم بہتر شعر ہوں گے، لہراتا ہوا ترنم اور ترنم کے ساتھ لہراتے ہوئے ہاتھ بلکہ کبھی کبھی سارے جسم سے لہرا جائیں گے اور غزل سُناتے رہیں گے ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی

ایک مرتبہ میرے گھر پر مشاعرہ تھا، مجذوب صاحب نے مطلع پڑھا ؎

تو نے ان کو کیا سے کیا ذوقِ فراواں کر دیا
پہلے جاں، پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کر دیا

میں نے کہا مجذوب صاحب توارد ہو گیا ہے، میرا مطلع ہے ؎

تو نے اکبر کیا سے کیا بیرم کو ہاں ہاں کر دیا
پہلے خاں پھر خانِ خاں پھر خان خاناں کر دیا

بڑی زور سے ہنسے اور پھر غزل شروع کر دی۔ ایک مرتبہ میں اور مولانا عنایت اللہ فرنگی محل ان کے ساتھ ہی ان کے موٹر پر جا رہے تھے جسے وہ خود چلا رہے تھے، راستے میں غزل سُنانا شروع کر دی اور اسٹیرنگ وہیل چھوڑ کر ہاتھ لہرانے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ موٹر ایک کھڈ میں قلابازی کھا گئی۔ شکر ہے کسی کو چوٹ نہیں آئی، سب کپڑے جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ مجذوب صاحب نے پوچھا کہ چوٹ تو نہیں آئی، مولانا عنایت اللہ نے فرمایا: اللہ نے بڑا فضل کیا، مجذوب صاحب نے کہا تو اس کا دوسرا مصرعہ یہ تھا کہ اور غزل شروع ہی کرنے والے تھے کہ مولانا عنایت اللہ نے ڈانٹ کر چپ کر دیا کہ پہلے کار کی خبر لو۔ اب کہاں ملتے ہیں یہ لوگ، مجذوب صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے

مجذوب صاحب سے ملتے ہوئے حضرت شاہ مینا صاحب کی درگاہ پر فاتحہ پڑھ کر جگت نرائن روڈ پر ہو لیجئے، یہ سڑک پنڈت جگت نرائن مُلا کے نامِ نامی سے منسوب اور اسی سڑک پر گولہ گنج میں ان کے صاحبزادے پنڈت آنند نرائن مُلا صاحب، جو نے شیئر رہتے ہیں۔

پنڈت آنند نرائن مُلا

اُردو کے ان چند ہندو شاعروں میں سے ایک ہیں جو آج بھی ہندوستان میں اُردو کے لیے سینہ سپر بنے ہوئے ہیں۔ ہائی کورٹ کے جج ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس رکھتے ہیں، وطن پرست ہیں

مولانا عبدالحلیم نام شرر تخلص، آپ ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ
میں پیدا ہوئے۔ اردو کے مشہور انشا پرداز، ناول نویس اور
مورخ تھے۔ آپ کے مضامین اور تصانیف کثرت سے ہیں۔
جدید طرز کے ناول کا چرچا آپ سے ہی ہوا۔ آپ کے اکثر
ناول تاریخی ہیں۔ آپ نے ۱۹۲۶ء میں وفات پائی

مگر ساتھ ہی اردو پرست بھی اور ہندوستان کی اردو دشمنی
سے آگاہ بھی، چنانچہ اپنا مجموعۂ کلام جوئے شیر پیش کرتے ہوئے
اس کا انتساب یوں کیا ہے۔

مٹتی ہوئی اردو کے نام

اِک موت کا جشن بھی منالیں تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک مسکرالیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اردو!
اِک آخری گیت اور گالیں تو چلیں

اور اس کے بعد دوسرے صفحے پر اس سے بھی زیادہ سخت
ایک چیز ہے :۔

آئندہ تاریخ کا ایک صفحہ

یہ سانحہ سالِ چہل و نو میں ہوا،
ہندی کی چھری تھی اور اردو کا گلا
اردو کے رفیقوں میں جو مقتول ہوئے
ملاّ نامی سنا ہے شاعر بھی تھا

پنڈت آنند نرائن ملاّ ان کشمیری پنڈتوں میں سے ہیں جن
کے ہاں ہمیشہ مسلمان باورچی رہا کرتا تھا، جو بات بات
میں انشاء اللہ اور ماشاء اللہ کہتے تھے اور تقسیم ملک
کے بعد وہ اپنے ہم زبانوں، ہمسفروں اور ہم نفسوں سے
محروم ہوگئے ہیں اس تکلیف کا اظہار پنڈت آنند نرائن ملاّ
نے مجھ سے اس طرح کیا کہ اپنا مجموعہ مجھے دیتے ہوئے اس کے
پہلے صفحہ پر لکھا ہے :۔

بھائی شوکت کی خدمت میں

بیادِ ایامے

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی پوچھے پنڈت جی سے کہ یہ باتیں بھلا دینے والی ہوتی ہیں؟
میں جذباتی ہو رہا ہوں لہٰذا یہاں سے چلئے، بھلا غضب
خدا کا راستے میں وزیر گنج پڑتا ہے وہاں آپ اردو کے
جلیل القدر شاعر اور جلال لکھنوی کے جانشین
آرزو لکھنوی کو بھول آئے ہیں۔ کانوں سے بہرے
مگر صحیح معنوں میں بحر العلوم۔ ڈرامہ کا میدان سر کئے ہوئے،
تغزل میں اپنا جھنڈا گاڑے ہوئے، زبان دانی میں اپنا
لوہا سب سے منواتے ہوئے اِس طرح مسکین صورت
بناتے بیٹھے ہیں گویا ان باتوں سے اور ان حضرت سے
کوئی تعلق ہی نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ اردو زبان کے لکھنؤ
کی جب تاریخ مرتب ہوگی اور اس کا ایک جگمگاتا ہوا
باب جلال لکھنوی کو ملے گا تو اس میں سب سے نمایاں
آرزو کا نام ہوگا۔ لکھنؤ کی مٹی سے یہ آفتاب ابھرا تھا مگر
خدا کی مٹی کراچی کی تھی جہاں یہ سورج پاکستانی پرچم کے
زیر سایہ غروب ہوا اور اردو شاعری کو مرتے مرتے
آبِ حیات پلا گیا۔ آرزو لکھنوی سے مل کر گولہ گنج ہوتے
ہوئے امین آباد کا رخ کیا ہی تھا کہ کسی کو دیکھ کر ٹھٹک

انگریزوں کے خلاف سب سے پہلی تحریک اور اردو

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی کوئی تاریخ اردو ادب سے مدد لئے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ اردو ادب میں جو تاریخی مواد موجود ہے اس کی روشنی میں انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی سب سے پہلی تحریک جو "وہابی تحریک" کہلاتی ہے اس کا پس منظر سمجھنے کے لئے شاہ ولی اللہ کی اردو تحریروں کو سامنے رکھنا ازبس ضروری ہے۔ (گوپی چند نارنگ)

جانا پڑا۔ اور اخاہ کہہ کر آگے بڑھے اور
سید علی عباس حسینی سے بغل گیر ہوگئے۔ عہدِ حاضر کا یہ جلیل القدر افسانہ نویس اپنی آنکھوں میں ذہانت کا تبسم لئے کھڑا تھا یا آسی بھول کا یہ شگفتہ مصنف جس نے اردو کے فنِ افسانہ نگاری کو نئی راہوں سے آشنا کیا خود اب تک پرانی روش پر چلتا ہے۔ وہی کھلے پائنچوں کا پاجامہ اور وہی شیروانی، نہ سوٹ ہے نہ ہیٹ اور نہ زمین پر اس طرح چلنے کا انداز کہ قدم آسمان پر پڑ رہے ہوں۔ اتنا بڑا فن کار اور خود اتنا سادہ کہ اپنی پرکاری کو کبھی ابھرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ملئے تو خلوص ہی خلوص، پرکھئے تو اعتماد ہی اعتماد، علی عباس حسینی سے مل کر آگے بڑھے ہی تھے کہ ایک تانگہ خود ہی قریب آ کر رکا، ہاتھوں میں ایک مجلد کاپی، کاپی پر رکھی ہوئی چاندی کی پانوں والی ڈبیہ دبلے سفید مونچھوں والے چہرے پر بچوں کی مسکراہٹ اور بھولپن لئے ایک صاحب آگے بڑھے اور گلے سے لگالیا۔ یہ ہیں
جعفر علی خاں اثر لکھنوی تہذیب و تمدن اور اودھ کی وضعداری اور شرافت کی زندہ مثال، بہت بڑے شاعر، بہت بڑے نقاد، بہت بڑے انشاپرداز مگر ان سب سے بڑے انسان جن کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس سے انسانیت نہ برستی ہو، خان بہادر ہیں۔ ایم۔بی۔ای ہیں۔ کمشنری سے لے کر وزارت تک کر چکے ہیں، مگر عالی ظرفی کا یہ عالم کہ کہیں بھی چھلکنے نہ پائے، جس سے ایک مرتبہ مل لئے اس نے ہمیشہ ان کو اپنا سمجھا، کیا عزیز کیا دوست، دوستوں کے عزیز بنے رہے اور عزیزوں کے دوست اور جس سے جو تعلقات قائم کر لئے ان کو آخر تک نباہ کر دکھادیا۔ مرزا جعفر علی خاں اثر سے مل کر آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ اس لکھنؤ سے مل لئے جو اب لکھنؤ میں بھی دراصل نہیں ہے، وہ روایتی وضعداری، وہ شستا شستہ اخلاق اور وہ افسانہ بن چکنے والا حلم اس ایک پیکر میں یکجا نظر آتا ہے۔

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی سے مل کر امین الدولہ پارک ہوتے ہوئے گونگے نواب کے باغ کی طرف اگر گذر ہوگیا تو وہاں منشی احمد علی
شوق قدوائی اور ان کے بھائی منشی واحد علی ابر سے ملنے کا خطرہ ہے، شوق قدوائی مرحوم اس وقت تک زندہ ہیں جب تک مثنوی عالم خیال زندہ ہے، ان کی شاعرانہ عظمت سے اردو شعر و ادب کی تاریخ کبھی انکار نہیں کرسکتی۔ ان کا شمار اپنے وقت کے اساتذہ میں تھا۔ جو شاعر ہی نہیں بلکہ شاعر گر بھی تھے۔ ان کا فنی تبحر مسلم سمجھا جاتا تھا، ان کی پُرگوئی سے ان کے معاصرین لرزہ براندام رہتے تھے اور دم نکلتا تھا۔ ان کے احباب کا اس وقت کے خوف سے جب شوق صاحب ان کو پکڑ لے جائیں اپنے گھر اور سنانا شروع کردیں، اپنا کلام، حال یہ تھا کہ دوستوں نے ان کی گلی کا راستہ چھوڑ رکھا تھا۔ شوق صاحب اگر دور سے نظر آجاتے تو لوگ بھاگتے تھے۔ سر پر پیر رکھ کر، مگر اس کے باوجود شوق صاحب کو ہر روز

بابائے اردو

ڈاکٹر عبدالحق

۱۸۷۴ء میں ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے ۱۹۶۱ء میں کراچی میں انتقال ہوا ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے بی اے پاس کیا اور وہیں سرسید اور مولانا حالی سے صحبتیں رہیں پھر عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل اور حیدر آباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے پچاس سال تک انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہے۔ ۱۹۳۵ء میں انجمن کا دفتر حیدر آباد دکن سے دہلی منتقل کیا اور آزادی ۱۹۴۷ء کے بعد دہلی سے کراچی چلے گئے انہوں نے اپنی تمام عمر اردو کی خدمت میں گزار دی۔ مولوی عبدالحق کی نثر میں ایک خاص قسم کی پختگی ہے طرز تحریر متین، پُر وقار سنجیدہ اور آسان ہے بحیثیت "زبان داں" اور "نقاد" ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ انجمن ترقی اردو دہلی نے ان کی نگرانی میں بے مثال تصانیف شائع کی ہیں۔

کوئی نہ کوئی شکار مل ہی جاتا تھا جس کو نہایت محبت سے گھیر کر گھر لاتے تھے۔ بڑے خلوص سے بٹھاتے تھے، اچھے سے اچھا کھلاتے تھے اور پھر اپنا کلام سنا کر کھلایا پلایا سب وصول کر لیتے تھے۔

لکھنؤ میں گونگے نواب کے باغ میں ایک بارہ دری میں شوقؔ قدوائی مرحوم اور ان کے برادر عزیز منشی واحد علی ابرؔ مرحوم کی بیٹھک تھی، اس بیٹھک کے ایک در میں شوقؔ صاحب کی نشست ہوتی تھی اور دو تین در چھوڑ کر ایک ایسی قسم کے در میں منشی واحد علی ابرؔ کچھ لکھا پڑھا کرتے تھے، خود تو خیر کسی کی شامت آئی تھی کہ وہ شوقؔ صاحب کے پاس آتا البتہ لوگوں کو پرچے لکھ لکھ کر دعوتوں کے بہانے سے اور بیماری کا دھوکہ دے دے کر دوستوں کو بلاتے تھے پھر بھی اگر کوئی نہ آئے تو شکار کی تلاش میں نکل جاتے تھے اور کسی نہ کسی کو پکڑ ہی لاتے تھے، خاطر و مدارات کے دام بچھاتے تھے، ناشتہ کرائیں گے۔ مرغن کھانے کھلائیں گے، آم خربوزوں سے تواضع کریں گے اور اس کے بعد کلام سنانے بیٹھ جائیں گے، حال یہ تھا کہ لوگ ماؤں سے دودھ اور بیویوں سے مہر بخشوا کر ان کا کلام سننے آتے تھے بلکہ جب پکڑ کر لائے جاتے تھے تو آتے تھے اور عموماً یہ ہوتا تھا کہ مثلاً کوئی شکار سہ پہر کو پھنسا اس کو ناشتہ کرایا اور رات کو کھانے کے وقت تک کلام سنایا، کھانے کا وقت ہو گیا تو اس کو ہزاروں قسمیں دے کر دسترخوان پر لے گئے بہت ہی تواضع سے کھانا کھلایا اور دسترخوان سے اٹھا کر پھر مقتل میں لے آئے اور سنانا شروع کر دیا کلام یہاں اس کو انتظار کہ غزل ختم ہو اور اجازت حاصل کرے اور یہاں غزل ختم ہوتے ہی دوسری غزل کا مطلع جب دیکھا کہ سننے والے کی داد میں تھکاوٹ کے آثار پیدا ہونے لگے تو پہلے مثلاً، اس نے اجازت چاہی تو اس کے تقو

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

محمد اسماعیل صدیقی ۱۸۴۴ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام پیر بخش تھا۔ میرٹھ ہی میں اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم ہوئی۔ مدرسی کا پیشہ اختیار کیا پھر نارمل سکول کے صدر مدرس بنے۔ پھر سہارنپور میں ہیڈ مولوی ہوئے۔ پھر چند دن بعد اردو مدارس کے انسپکٹر مقرر ہوئے۔ شروع سے ہی طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔ آپ مرزا غالب کے معتقدوں میں سے تھے۔ اردو کی کافی خدمت کی۔ اردو کے قاعدے سے پیکر دہویں جماعت تک مکمل نصاب مرتب کیا جس میں نثر میں مختلف موضوعات پر مضامین بھی لکھے۔ جماعتوں کی تدریجی ترقی کو ملحوظ رکھتے ہوئے زبان میں بھی تدریجی ترقی دی۔

آپ کی اردو آسان، عام فہم اور شیریں ہوتی ہے۔ آخر آپ نے ۱۹۱۷ء میں انتقال فرمایا۔

پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بھئی کب کب ملنا ہوتا ہے، ہم سخن کب کب ملتے ہیں۔ تمہارے ہی رنگ میں ایک غزل کہی تھی مطلع ملاحظہ ہو"

اور جب سننے والے کو ادھ موا کر دیا تو پان کھلا دیا۔ کبھی حقہ بڑھا دیا۔ مگر غزل کے بعد غزل کا سلسلہ جاری رہا۔ رات زیادہ آگئی تو بستر کا انتظام کرا دیا کہ اب کہاں جاؤ گے۔ سواری بھی نہ ملے گی اور صبح قبل اس کے کہ سونے والا جاگ کر بھاگے شوق صاحب خود اس کے سرہانے موجود اور منتظر کہ وہ جاگے تو سلسلہ شروع ہو اور اگر شوق صاحب غسل خانے جانے کے لئے یا کسی اور ضرورت سے اٹھے بھی تو ان کے چھوٹے بھائی موجود ہیں

آبر قدوائی آبر صاحب نے پکارا:۔

حضرت وہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہیں آپ۔ بھائی جان نے جس زمین میں ابھی غزل سنائی ہے اس میں عرض کیا ہے میں نے۔ شاید کسی قابل ہو مطلع:۔

لیجئے یک نہ شد دو شد بڑے میاں تو بڑے میاں

چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ یہ برادر عزیز بیاض سنبھالے، ناک کی پھنگی پر عینک لگائے اسی لئے تاک میں بیٹھے رہتے تھے کہ بڑے بھائی ذرا ٹلیں تو یہ اس سننے والے کی خبر لیں بہرحال یہ اپنی غزل سنانے لگے کہ شوق صاحب آگئے اور ان کو مجبوراً اپنی غزل ادھوری ہی چھوڑنا پڑی اور شوق صاحب پھر شروع ہو گئے۔ مگر اب وہ بھی نہیں ملتے، اُن سے بھاگنے والے ان کے لئے بھی ترس رہے ہیں، کچھ خدا کو پیارے ہوئے کچھ پاکستان کو اور جو رہ گئے ہیں وہ خود اپنے اچھے دن یاد کر کے سرد آہوں میں اپنے کو گھیرے ہوئے ہیں اور ان کے لئے ایک سرد آہ میں بھی بھرتا ہوں

اس خاکے میں صرف یہ انتظام رکھا گیا ہے کہ اس دور کے مشاہیر سے میں آپ کو بھی ملا دوں جن سے میں مل چکا ہوں وقت کے آگے پیچھے ہونے کا خیال نہ کیجئے صرف ان لوگوں سے میرے ساتھ مل لیجئے۔

(ماخوذ از نقوش)

★★

وہ ہستیاں - جن کے دم سے اردو زندہ ہے! اور زندہ رہے گی!

ترتیب و تلخیص: احمد مصطفیٰ صدیقی

حامد اللہ افسر میرٹھی

حامد اللہ افسر ادیب اور شاعر ہیں۔ جدید دور کے نثر نگاروں میں امتیازی شان کے حامل ہیں۔ ان کے افسانے بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ شاعری میں بھی ایک خاص امتیازی شان رکھتے ہیں۔ آپ کی اردو سادہ، عام فہم اور دلکش ہوتی ہے۔

میکش دہلوی

منشی ارشاد احمد میکش دہلوی قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے تھے۔ اس ضلع کے حوالی دار السلطنت دہلی ہونے کی وجہ سے وہ خود کو دہلوی لکھتے تھے۔ نواب صدیق حسن خاں کے دور میں میکش دہلوی بھوپال چلے گئے تھے۔ خود نواب صاحب نے اپنی تصنیف تذکرہ "صبح گلشن" میں تحریر کیا ہے کہ وہ اردو اور فارسی زبان دونوں کے شاعر تھے۔ کلام میں حلاوت بھی اور جدت و ندرت کے ساتھ بلاغت بھی۔ اردو میں میکش، اور فارسی میں محوی تخلص تھا۔ میکش کا یہ شعر آج بھی زبان زد عام ہے۔

سرشک گرم کی حدت کو پوچھو
برے دامن سے اپنی آستیں سے

مولانا عباس رفعت شروانی

بھوپال میں آنے والے جملہ شاعروں میں جنہیں تلمیذ غالب ہونے کا شرف حاصل تھا۔ رفعت سب سے نمایاں، منفرد اور ممتاز شاعر ہی نہیں بلکہ نثر نگار بھی تھے۔ اُن کے والد علامہ احمد یمنی نواب جہانگیر محمد خاں کے دور میں بھوپال آئے، اور یہیں بس گئے۔ رفعت نے چار نوابوں کا زمانہ دیکھا تھا جن میں نواب موصوف کے علاوہ نواب قدسیہ بیگم، نواب سکندر بیگم اور نواب شاہ جہاں بیگم تاجدر بھی تھیں۔ نواب صدیق حسن خاں ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ تصانیف کی تعداد ساٹھ سے بھی زیادہ ہے۔

خان محمد خاں شہیر

شہیر، غالب کی وفات کے بعد بھوپال تشریف لائے تھے ۱۸۶۹ء سے ۱۹۰۳ء تک وہیں رہے اور اسی زمین کی خاک انہیں نصیب ہوئی۔ بھوپال میں انہیں مسلم الثبوت استاد فن کا درجہ "افتخار الشعراء" کا خطاب عطا کر کے دیدیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ خطاب انہیں نواب شاہ جہاں بیگم تاجور نے دیا تھا، لیکن وہ ان کے شوہر نواب صدیق حسن خاں کے اشعار پر بھی اصلاح دیا کرتے تھے۔ بھوپال کے انیسویں صدی کے ادب کی ترویج و ارتقا میں خان محمد خاں شہیر کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

بھوپال میں انہیں غالب کا "نقش ثانی" کہہ کر بھی پکارا جاتا تھا۔ شہیر نے مدعی، عدو، رقیب اور واعظ کے خلاف بڑے نفیس پیرائے میں سیکڑوں اشعار منظوم کئے تھے۔ جن میں سے دو مندرجہ ذیل ہیں۔

کوئی ہو، ان کی وحشتِ دل کا علاج ہو
اک ہم اگر نہیں نہ سہی، مدعی سہی

میں نامرادِ ہجر، عدو کامگارِ وصل
وہ کام کر گیا ہے تو میں نام کر گیا

محسن الملک مہدی علی خاں

محسن الملک نواب محمد مہدی علی خاں اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ اپنی محنت اور قابلیت سے معمولی ملازمت سے ترقی کرتے کرتے نظام حیدر آباد سے "محسن الملک اور محسن الدولہ" کا خطاب پایا۔ آپ رہبرِ قوم سر سید احمد خاں کے ساتھی تھے۔ رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں اکثر آپ کے مفید و اخلاقی مضامین شائع ہوتے تھے۔

مولوی عبدالرحمٰن خاں

مولوی عبدالرحمٰن خاں ہندوستان کے مشہور عالم و فاضل ہیں۔ آپ جامعہ عثمانیہ کے پرنسپل تھے اور حیدر آباد اکاڈیمی کے صدر بھی۔

آپ کی کئی تصانیف ہیں۔ آپ نے ہی مشہور سیاح ابن بطوطہ کے سفر نامہ کا ترجمہ کیا ہے۔

نوح ناروی

محمد نوح ۸ ستمبر ۱۸۷۹ء ضلع رائے بریلی بھوانی پور میں پیدا ہوئے۔ شروع میں امیر مینائی و جلال لکھنوی سے اصلاح لیتے رہے مگر ۱۹۰۰ء میں داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۹۰۳ء میں داغ دہلوی نے حیدر آباد اپنے پاس بلا لیا۔ داغ کی جانشینی سب سے پہلے ان کو ہی ملی۔ روانی، سادگی اور فصاحت ان کے کلام کا خاصہ ہے۔ محاورے کے برمحل استعمال پر انہیں بے پناہ قدرت حاصل تھی۔

ہو نہ ہو روح بھٹکتی ہے کسی قیدی کی
رات بھر پیٹ رہا تھا درِ زنداں کوئی

اردو نمبر

شوکت تھانوی (قاضی جی)

شوکت تھانوی اردو کے مشہور مزاح نگار ادیب اور سنجیدہ ظرافت میں صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ آپ کے اکثر مضامین رسالوں میں چھپتے تھے اور اکثر ریڈیو پر نشر ہوتے رہے ہیں۔ "دنیائے تبسم" اور "بحر تبسم" آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ آپ نے کئی ناول بھی لکھے ہیں اور درسی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔

آپ کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ آپ مزاحیہ انداز میں سوسائٹی پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ اور لوگوں کو ہنسا کر ان کے عیوب سے خبردار کر دیتے تھے۔

کیا کوئی تیر حسینوں کی نظر ہوتی ہے
دل میں چبھتی ہے اِدھر پار اُدھر ہوتی ہے

سید علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی

سید علی حیدر لکھنؤ میں ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۹۳۳ء میں وفات پائی۔ نواب حیدر جنگ آپ کا خطاب تھا۔ لکھنؤ میں شہزادہ کام بخش کے معلم تھے۔ آصفیہ کے معتمد، نظام کالج کے پروفیسر، شہزادگان نظام کے استاد اور عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ کے ناظر ادبی رہے۔ آپ نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں شرح دیوان غالب اور نظم طباطبائی کافی مشہور ہیں۔ آپ نے "نواب حیدر جنگ" کا خطاب بھی حاصل کیا تھا۔

حامد حسن قادری

۱۸۹۷ء میں بچھراؤں ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے ان کے والد مولوی احمد حسن کو تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ تھا۔ اس فن میں قادری صاحب کی دلچسپی انہی کا فیضان ہے۔ رامپور میں تعلیم حاصل کر کے بڑودہ کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے پھر سینٹ جانس کالج آگرہ میں صدر شعبۂ فارسی و اردو رہے اور پچیس سال کے بعد ۱۹۵۵ء میں ریٹائر ہو کر کراچی میں سکونت اختیار کی۔ انہیں سب سے زیادہ دلچسپی شعر و ادب سے ہے۔ حامد حسن قادری مسلمہ قابلیت اور وسیع معلومات کے ادیب، انشا پرداز اور نقاد ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ "داستان تاریخ اردو" ہے۔ جو نثر نگاروں کی سب سے مکمل، مستند اور جامع تاریخ ہے ان کی "تاریخ مرثیہ گوئی" بھی نہایت مفید، مبسوط اور جامع تصنیف ہے۔

ناطق گلاؤٹھوی

سید ابو الحسن ناطق گلاؤٹھوی ۱۱ نومبر ۱۸۸۶ء کو کامٹی (ناگپور) میں پیدا ہوئے ان کے دادا سید غلام غوث میرٹھ میں وکالت کرتے تھے بعد میں گلاؤٹھی ضلع میرٹھ میں سکونت اختیار کر لی جہاں ان کی بڑی جائداد تھی۔ ناطق کے والد سید ظہور الدین وسیع پیمانے پر لکڑی کا کاروبار کرتے تھے اسی لئے وہ کامٹی میں سکونت پذیر ہو گئے۔ زمانے کے دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور اس کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں کی شاعری میں داغ سے اصلاح لی۔ غور و فکر اور مشق سے خود استادی کا درجہ حاصل کر لیا۔ ملک کی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ بہت سال تک ناگپور میونسپل کمیٹی کے رکن رہے ۱۹۲۱ء میں مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ عمر کے آخری حصے میں سیاسی سرگرمیاں جاری نہ رکھ سکے اور خانہ نشین ہو گئے۔ ۲۷ مئی ۱۹۶۹ء کو ناگپور میں ہی انتقال فرمایا۔ ناطق کے شعر میں ناگپور کارپوریشن

بعد مر دیے ہے ۔ بس لے ۵۵ برس آمل ان بیتے

آپ، اور جنس دل کے خریدار ! جی نہیں
پہچانتا ہوں ، صورتِ اہلِ نظر کو میں

پھولوں کا رنگ ، روپ پرندوں کے چہچہے
کس کو خبر ہے سب کدھر آئے کدھر گئے

ہم کہاں ہوں گے دعاؤں میں اثر ہونے تک
کچھ نہ کچھ ہو تو رہے گا ، مگر ہونے تک ؟

آج میخانے میں برکت ہی سہی
میکشو ! آؤ ، عبادت ہی سہی

شاہد احمد دہلوی

نام شاہد احمد دلی میں ۲۲ مئی ۱۹۰۶ء کو پیدا ہوئے

مس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی شاہد احمد کے دادا اور مولوی بشیر الدینؒ ان کے والد تھے۔ کیونکہ مولوی بشیر الدین حیدرآباد (دکن) میں ملازم تھے اس لئے شاہد صاحب کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد ہی میں ہوئی۔ اس کے بعد علی گڑھ، دلی اور لاہور میں تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۳۰ء میں دلی سے ماہنامہ ساقی' جاری کیا ساقی اپنے دور میں اردو کا بہت کامیاب پرچہ ثابت ہوا۔ اس کے ذریعے انہوں نے اردو علم وادب کی بڑی خدمات انجام دیں۔ ان کے ادارہ سے اردو کی کم و بیش دو سو کتابیں شائع ہوئیں۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان جانا پڑا اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور وہیں ۱۹۶۷ء میں ۲۷، ۲۸ مئی کی درمیانی شب میں بعارضۂ قلب انتقال ہوگیا۔

سید شاہ علی احسن مارہروی

احسن مارہرہ میں ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۰ء میں وفات پائی۔ مرزا داغ کے شاگرد تھے۔ اور علیگڑھ یونیورسٹی

راشد الخیری

۱۸۷۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی

مولوی نذیر احمد دہلوی کی طرح راشد الخیری بھی عورتوں کی اصلاح ترقی کے حامی تھے لیکن تعلیم سے زیادہ تربیت کو عورت کی زندگی کا زیور سمجھتے تھے۔ مولانا راشد الخیری کی تحریروں میں عورتوں کی مظلومیت پر مردوں کے دل پسیج گئے۔ انہوں نے اس مظلوم ہستی کی بہبود اور مرتبہ بلند کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ یہ مصرعہ انہی پر صادق آتا ہے" ع
"کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے" ان کی عبارت نہایت درد انگیز اور تاثیر سے لبریز ہوتی ہے۔ اسی لئے "مصورِ غم" کے لقب سے مشہور رہیں۔ ان کے بیان میں دلکشی اور لطافت ہوتی ہے یہ صاحب طرز، مستند، ادیب اور انشا پرداز ہیں۔ انکی اعلیٰ تصانیف صبح زندگی۔ شام زندگی اور شب زندگی ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں دہلی میں وفات پائی۔

محمد ہادی رسوا

۱۸۵۹ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، والد کا نام مرزا محمد تقی۔ مرزا رسوا مایۂ ناز ادیب تھے اور ان کو بہت سی زبانوں پر عبور تھا۔ علم کا جس قدر شوق تھا، اسی قدر قبولِ علم کی صلاحیت بھی تھی۔ خود فرمایا کرتے تھے: "مجھ کو کبھی فلسفہ کا جنون ہے کبھی ریاضی کا، کبھی سائنس کا، کبھی شعر و شاعری کا تو کبھی ناول نگاری کا۔" دارالترجمہ حیدرآباد دکن میں ملازم تھے وہیں ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔ "امراؤ جان ادا" مرزا رسوا کا مایۂ ناز شاہکار ہے اور اسی سے ان کا نام زندہ ہے۔ مرزا رسوا کی کامیابی کا راز زیادہ تر ان کی شیریں بیانی میں مضمر ہے۔ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان نے اس ناول کو اور بھی زیادہ دلکش اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ رسوا نے فلسفیانہ فکر، نفسیاتی تجزیہ، ادبی اور شاعرانہ ذوق اور فنی حسن تربیت کو یکجا کر کے امراؤ جان ادا کو ناول نگاری کے فن میں بلندی، گہرائی، لطافت و نزاکت اور ان سب کے ساتھ ساتھ تاثیر کی اقدار کا حامل بنایا اور اس طرح ناول نگاری کا فن پہلی مرتبہ عروج پر پہنچا۔ آج بھی اردو ادب کو ان کے ناول "امراؤ جان ادا" پر ناز ہے جو اردو زبان کا بہترین سرمایہ ہے۔

وحید الدین سلیم پانی پتی

آپ مولانا الطاف حسین حالی کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ حیدرآباد کے "جامعۂ عثمانیہ" میں مشرقی زبانوں کے پروفیسر تھے۔ بڑے محقق اور زبان دانی کے ماہر تھے۔

روش صدیقی

شاہد عزیز نام، روش تخلص۔ ۱۰ جولائی ۱۹۰۹ء کو جوالا پور ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی خلیل احمد جوالاپوری بھی شاعر تھے اور شاہد تخلص فرماتے تھے۔ روش ۱۹۴۷ء تک جوالا پور میں رہے وہاں وہ بانس کا کاروبار کرتے تھے۔ آزادی کے ساتھ فساد آئے تو جوالا پور بھی نہ بچ سکا، جان بچا کر مراد آباد پہنچے۔ ۱۹۶۳ء تک مراد آباد ہی میں رہے، اس کے بعد میرٹھ منتقل ہو گئے۔ جوالا پور سے نکلنے کے بعد ساری عمر شعر کہنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۳ء تک کوئی چار سال آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کی لیکن دفتری زندگی کی پابندی نہ کر سکنے کی بنا پر علیحدہ ہو گئے۔

عبدالباری آسی

میرٹھ کے قصبہ الدن میں ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ غزلیں و اخلاقی نظمیں لکھتے تھے۔ آپ کی کئی کتب نثر شائع ہوئی ہیں۔ جن میں شرح دیوانِ غالب بھی شامل ہے۔

میں اردو کے پروفیسر تھے۔ آپ نے ریاضِ سخن، ریاضِ خلیل، فصیح الملک نامی رسالے نکالے۔ ولی دکنی اور اپنے استاد داغ کے کلام کے مجموعے شائع کئے۔ آپ کی تصنیفات "جلوۂ داغ" "منتخب داغ" اور "انشائے داغ" مشہور ہیں۔

۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو ایک مشاعرے میں شرکت کیلئے شاہجہاں پور گئے، مشاعرے میں کلام سنا رہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ میرٹھ لاکر دفن کئے گئے۔ نمونہ۔

مرادِ وقت سفر ہے بے نیازِ جادہ و منزل
نہ کوئی راہبر میرا، نہ کوئی راہزن میرا

رنج و راحت میں ہے اک ربطِ لطیف
سرخوشی، ہے شاہدِ غم کا لباس

حرم نے کر دیا ہے محرمِ آدابِ نظارہ
چلیں اب دیر میں نظارۂ حسنِ بتاں کر لیں

منوّر لکھنوی

بشیشور پرشاد نام، لکھنؤ کے قدیم باشندے منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی کے صاحبزادے تھے۔ عمر بھر محکمۂ ریلوے سے وابستہ رہے اور مختلف مقامات پر تبادلے ہوتے رہے ۱۹۲۷ء میں دلی آئے اور جب ۱۹۵۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو دہلی کے ہی ہو رہے۔ شعر و سخن کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ بے شمار کتابوں کے مصنف تھے جس میں نظم، نثر اور منظوم ترجمے بھی شامل ہیں۔ نمونہ۔

ہوگا اب اس سے سوا اور کیا کرم تیرا!
ہے خوش نصیب جس کو میسّر ہے غم تیرا

ہے کچھ اگر سلیقہ، ہے کچھ اگر قرینہ

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

پیدائش ۱۸۸۷ء بمقام بجنور۔ یہ پہلے ادیب ہیں جنہوں نے اردو میں انگریزی طرز کی فاضلانہ محاسن نگاری کی بنیاد ڈالی۔ وہ نقادِ سخن کی حیثیت سے بڑے بلند مقام پر فائز ہیں۔

زبان دانی سے انہیں خاص مناسبت تھی۔ انہوں نے قیامِ یورپ میں وہاں کے مشہور شعراء کے کلام کا مطالعہ کیا تھا۔ اس سے ان کی باریک بیں اور نکتہ رس نگاہ میں بہت وسعت پیدا ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر بجنوری کا اصلی کارنامہ مرزا غالب کی شاعری پر ایک بسیط تبصرہ ہے جو "محاسن کلام غالب" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں انہوں نے غالب کا مقابلہ شعرائے یورپ سے کیا اور دکھا دیا کہ فقط اردو زبان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا کی "بزمِ ادب" میں دہلی کے اس خاک نشین کی شاعری کا کیا رتبہ ہے۔ انہوں نے غالب کے کلام پر مختلف پہلوؤں سے نہایت عمیق نظر ڈالی ہے۔ مرحوم کا تخیل خود اتنا بلند پرواز واقع ہوا تھا کہ غالب کے اشعار میں جن باریکیوں تک ان کی نظر پہنچی، دوسروں کی اب تک نہیں پہنچی تھی۔ افسوس وہ حقائق شناس جس نے سب سے پہلے غالب کی فلسفیانہ گتھیاں سلجھائیں ۱۹۱۹ء میں عین عالم شباب میں راہیِ ملکِ عدم ہو گیا۔

نصیر حسین خیاؔل

نواب نصیر حسین خیاؔل ۱۸۸۰ء میں عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ خیاؔل بادشاہ گروں کے خاندان سے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں یورپ گئے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں اردو زبان پر تقریر کی۔ ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوا۔ نواب خیاؔل صاحب طرز ادیب تھے اور انکی تصنیف "داستانِ اردو" انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں عبارت کی دلآویزی اور اندازِ بیان کی سحرکاری ہے۔ اسی سے ان کو بقائے دوام حاصل ہوئی۔ خیاؔل کی زباندانی اور ادب کو دیکھ کر "سرسید" اور "شرر" جیسے مشہور ادیبوں نے تعریف کی تھی۔ خیاؔل کا طرزِ نگارش نرالا اور انوکھا ہے اور ان کا ہر فقرہ بولتا ہوا جادو۔ نواب خیاؔل کی عبارت میں سادگی کے باوجود بلا کا بانکپن اور غضب کی شوخی ہے۔

مرنے کی طرح مرنا، جینے کی طرح جینا

بلا سے جانِ عنادل، ہے برق و باد کا خوف
سکوں نہ پھر بھی ملا، آشیاں بنا تو لیا

گنہگاری کی نیت کو گنہگاری نہیں کہتے
سفر کے قصد سے ہوتی ہے کب گردِ سفر پیدا

ڈاکٹر سید عبداللہ

پیدائش ۱۹۰۶ء والد کا نام سید انوار احمد شاہ۔ وطن ضلع ایبٹ آباد (صوبہ سرحد)، جامعہ ملیہ علی گڑھ اور لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ مشہور محقق پروفیسر محمود شیرانی کے شاگرد ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں "فارسی" اور ۱۹۳۲ء میں "عربی" میں ایم اے کیا اور ۱۹۳۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے "ڈاکٹر آف لٹریچر" کی ڈگری حاصل کی۔ آج کل اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس دور کے مشہور نقاد ہیں۔ ذوقِ جستجو، جذبۂ تحقیق، تدرف نگاہی، مطالعہ کی وسعت اور شگفتہ اسلوبِ نگارش ان کی منفرد خصوصیات ہیں اور وہ ایک ماہر کی طرح نقد و جرح کا کام نہایت چابک دستی اور احتیاط کے ساتھ کرتے ہیں۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ تنقید کا کام کتنا نازک اور سخت ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر عبداللہ کامیاب ناقد ہیں۔

افقر موہانی

سید محمد حسین نام۔ افقر تخلص۔ ظفر وارث تاریخی نام۔ ان کے والد مولانا سید اکرام علی بھی شعر کہتے تھے۔ بسمل تخلص تھا۔ افقر ۲۶ جولائی ۱۸۸۷ء کو موہان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں مستقلاً لکھنؤ چلے گئے اور مطبع نولکشور میں تصحیح کا کام کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد سرکاری ملازمت مل گئی اور ضلعدار مقرر ہوئے۔ ان کا زیادہ زمانہ ملیح آباد میں گذرا۔ ۱۹۱۲ء میں بمبئی چلے گئے۔ یہاں وہ مفید روزگار اور ایک مزاحیہ پرچہ مولانا پنچ کے ایڈیٹر ہو گئے۔ صحت کی خرابی کی بنا پر جب بمبئی سے واپس

آئے تو دوبارہ نولکشور پریس میں اپنی پرانی جگہ پر مقرر ہوگئے
۲ نومبر ۱۹۷۱ء کو لکھنؤ ہی میں انتقال فرمایا۔ نمونہ
فکرِ دنیا، فکرِ عقبیٰ، فکرِ حق، فکرِ سخن
چار دن کی زندگی، افقر ہے، کیا کیا کیجئے

یوں تو تمام رات تڑپتے کٹی مگر
گذری جو دل پہ وقتِ سحر کچھ نہ پوچھئے

دامن کا چاک، جیب کا چاک، آستیں کا چاک
سب مل گئے ہیں چاکِ گریباں کے آس پاس

آلم مظفر نگری

محمد اسحاق نام۔ آلم تخلص مظفر نگر یوپی کے رہنے والے۔ ساری عمر مدرسی میں گزاری۔ سیماب اکبر آبادی کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں تھے اور خود استاد کو ان کے علم و استعداد پر فخر تھا۔ نظم میں ان کی پانچ کتابیں شائع ہوئیں۔ بلبل، کوثر و تسنیم، سدرہ و طوبیٰ، معرکۂ کربلا، گیتا منظوم۔ موخرالذکر ہی پر یوپی گورنمنٹ کی طرف سے ڈیڑھ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہوا تھا۔ ۲۸ مئی ۱۹۶۹ء کو مظفر نگر میں انتقال ہوا۔

چشمِ زدن میں کہہ دیا زندگیٔ جہاں کا راز
دیکھا بھی تو نے بے خبر! رقصِ شرر نے کیا کیا!

خوابِ عیش زمانہ! تجھے خبر ہی نہیں
جو زندگی کو سنبھالے، وہ قوتِ غم ہے

ہر رگِ دل میں کھٹکتے ہیں، آلم دو پیکاں
درد کے ساتھ نگاہِ غلط انداز بھی ہے

خیر بہوروی

ضلع بلیا (یوپی) کے ایک گاؤں بہورہ میں پیدا

ہوئے۔ پرانے طرز کی فارسی، عربی کی تعلیم پائی تھی، اور اردو سے محبت تھی۔ اسی لئے مرحوم مولوی عبدالحق نے جب انجمن ترقی اردو کا دفتر ۱۹۳۶ء میں اورنگ آباد سے دلی منتقل کیا تو انہیں صدر دفتر میں بلا لیا۔ وہ تقسیم ملک تک انجمن کے نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے ملک بھر کا دورہ کرتے رہے اور اس کی تنظیم کا کام کرتے رہے، کچھ زمانہ غالباً نائب معتمد بھی رہے۔ جب تقسیم کے بعد ۱۹۴۹ء میں انجمن کا دفتر از سر نو علی گڈھ میں قائم ہوا اور قاضی عبدالغفار اس کے نگران ہوئے، تو خیر صاحب ان کے دستِ راست ثابت ہوئے، انہوں نے انجمن کے از سر نو قیام و استحکام میں انکی بہت مدد کی۔ قاضی عبدالغفار کی رحلت کے بعد نئے ماحول میں وہ زیادہ دن نہیں رہے چنانچہ ۱۹۵۷ء میں مستعفی ہوگئے۔ ۳ بروز ہفتہ ۷ جولائی ۱۹۷۱ء بوقتِ شب بہورہ ہی میں انتقال کیا۔

امداد امام اثر

۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا بیشتر حصہ پٹنہ میں گزارا۔ اثر فارسی و اردو میں فاضل اور زبان انگریزی میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ ان کی معرکہ آرا تصنیف "کاشف الحقائق" کی بدولت ان کا نام آج بھی زندہ ہے۔ اس میں دنیا کی تمام مشہور زبانوں کی شاعری پر عالمانہ اور محققانہ بحث کی گئی ہے۔ اثر شاعری کے حکیم تھے۔ انہوں نے کاشف الحقائق میں شعرا پر جو تنقید کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اثر بلند پایہ مصنف، جادو اثر ادیب اور بالغ نظر نقاد تھے۔ ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوا۔

محمد مخدوم محی الدین

مخدوم کے والد غوث محی الدین تعلقہ اندول حیدرآباد دکن میں تحصیل کے محرر تھے۔ تاریخ ولادت ۴ فروری ۱۹۰۸ء ہے۔ چار سال کے ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ تعلیم و تربیت ان کے چچا بشیر الدین کی سرپرستی میں ہوئی۔ مخدوم نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی اور سٹی کالج میں اردو کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔

۱۹۵۶ء میں آندھرا اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ کسی جلسہ میں شرکت کرنے کے لئے دہلی آئے ہوئے تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور ۲۵ اگست کی شام کو جاں بحق ہوئے۔ ہوائی جہاز کے ذریعہ میت حیدرآباد لیجائی گئی اور درگاہ شاہ خاموش میں سپرد خاک کئے گئے۔ ان کی زندگی میں کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے۔ سرخ سویرا، گل تر اور بساط رقص۔ ان کی وفات کے بعد ان کے مجموعے "بساط رقص" پر ساہتیہ اکاڈمی نے پانچ ہزار کا انعام ان کی بیوی کو ادا کیا تھا۔ کلام کا نمونہ:

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو
چلو، تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

بات کیا تھی، ذکر کس کا تھا کہ ہنگام نشاط
مسکرانے والی آنکھیں، ہچکیاں لینے لگیں

وصل ہے ان کی ادا، ہجر ہے ان کا انداز
کونسا رنگ بھروں عشق کے افسانوں میں

حافظ علی بہادر خاں ہلال

مرادآباد یوپی کے رہنے والے۔ علی بہادر خاں نام۔ ہلال تخلص۔ ۱۹۱۸ء میں علی گڑھ سے بی ایس سی کی امتیازی سند لی۔ ایم ایس سی میں تعلیم پا رہے تھے کہ ملک میں قومی تحریک اور عدم تعاون کے ہنگامے میں کالج کو خیرباد کہہ دیا۔ خلافت اور کانگریس کے سرگرم رکن بن گئے۔ آپ نے مدینہ بجنور، نصرت بمبئی اور مرکزی خلافت کے اخبار "خلافت" بمبئی میں ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ آخری دنوں میں دہلی سے ایک ہفتے وار "دور جدید" نکالتے تھے۔ حرکت قلب بند ہو جانے سے ۶ نومبر ۱۹۶۷ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔

ستم سے کھیلنے والے، جفا سے کھیلنے والے
جفا تو کیا، مسلماں ہیں قضا سے کھیلنے والے
مسلماں خاک و خوں میں جان پر کھیلے ہیں دنیا سے
خبر بھی ہے تجھے، رقص و فنا سے کھیلنے والے

عظیم بیگ چغتائی

۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ آگرہ وطن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے، ایل ایل بی کرکے ریاست جودھپور میں ملازم ہو گئے، چیف جسٹس تھے کہ ۱۹۴۱ء میں انتقال ہو گیا۔ اردو کے اور مزاح نگار اپنے مکالمہ اور طنز سے مزاح پیدا کرتے ہیں لیکن چغتائی کا پلاٹ ہی ہمیں ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے عظیم بیگ کا اسلوب سادہ اور صاف ہونے کے باوجود بے کیف نہیں اسی لئے پڑھنے والے کی دلچسپی کہیں بھی کم نہیں ہوتی چغتائی نے خاصی کتابیں لکھیں لیکن انکی شہرت "کولتار" اور "شریر بیوی" کی منت کش ہے۔

شفا گوالیاری

سید محمد حسن نام، گوالیار میں ۲۶ اگست ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام مظہر علی تھا، ان کے والد سید عوض علی طبابت کرتے تھے۔ ان کا خاندان قائم گنج ضلع فرخ آباد کا رہنے والا تھا جہاں سے ان کے اجداد نقل مکانی کر کے گوالیار جا بسے تھے ۱۹۲۰ء میں سیماب اکبرآبادی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے ۱۹۴۸ء میں بھوپال منتقل ہونا پڑا اور وہاں "شفا میڈیکل ہال" کے نام سے اپنا ذاتی مطب کھول لیا۔ ۲۲ جولائی ۱۹۶۸ء کو بھوپال ہی میں انتقال ہوا۔ نبض حیات، آیاتِ شفا، رگِ حیات اور نغمگی متعدد مجموعے کلام مرتب کر کے شائع کئے۔

چند شعر:-

کیا ہوئی تیری نگاہ مہرساز
کیوں افق سے مانگتا ہے تو، سحر؟

بھروسا مشعلوں پر تا کجا، اے کارواں والو:
خود اپنی روشنی میں کیوں نہ پہچانو مقام اپنا

وہ جب دیکھتے ہیں کبھی میری جانب
تو میں جانبِ آسماں دیکھتا ہوں

اثر لکھنوی

پورا نام مرزا جعفر علی خاں۔ شاعری میں حضرت عزیز لکھنوی مرحوم کے شاگرد تھے۔ مرحوم شاعری کے معاملہ میں وسیع المشرب تھے، نہ لکھنوی اور نہ دہلوی۔ ملازمت میں ڈپٹی کلکٹری سے ڈپٹی کمشنر تک پہنچے۔ پھر یو پی گورنمنٹ سے پنشن لیکر ریاست جموں و کشمیر میں مہاراجہ کے وزیر رہے کچھ دنوں وزیر اعظم کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ لیکن انہوں نے نہ تو شاعری کو فرائض منصبی کا راستہ روکنے دیا اور نہ فرائض منصبی کو شاعری کی سلطنت میں دخیل ہونے دیا شعر و ادب کی بھی خدمت کرتے رہے اور قانون و انصاف کی بھی اردو کے ادبی ذخائر پر آپ کی نظر وسیع بھی تھی اور عمیق بھی زبان کی نبضیں خوب پہچانتے تھے۔ نمونۂ کلام

متاعِ عیش پہ قرباں کیا نہ عزت کو
ہزار شکر رہا پاسِ آبرو باقی

نگاہِ ناز تیری شوخیوں سے بدگمانی ہے

مولانا غلام رسول مہر

مولانا غلام رسول مہر ۱۳ اپریل ۱۸۹۵ء کو جالندھر کے گاؤں پھول پور میں پیدا ہوئے اور ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے لاہور میں انتقال ہوا۔ حیدرآباد دکن میں ۱۹۱۵ء میں انسپکٹر تعلیمات مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں اپنا اخبار "سلطنت" جاری کرنے کی درخواست دی۔ جب حکومت کو معلوم ہوا کہ موصوف مولانا آزاد کے مریدوں کے حلقے سے تعلق رکھتے ہیں تو درخواست رد کر دی گئی۔ نومبر ۱۹۲۱ء زمیندار کے ایڈیٹر بنے اور ۱۴ اپریل ۱۹۲۷ء کو خود اپنا اخبار "انقلاب" جاری کیا۔ آپ نے یورپ اور مغربی ایشیا کے بیشتر ممالک کا سفر بھی کیا۔ پھر ۱۹۴۹ء میں انقلاب بند ہو گیا اور وہ تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی پر ایک شاندار کتاب ۱۹۵۲ء میں شائع کی۔ انہوں نے حضرت شہید کے رفیقوں کے حالات بھی "سرگزشت مجاہدین" کے نام سے اور

۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے کے کوائف "انقلاب" کے نام سے ۱۹۵۷ء میں شائع کئے۔ انہوں نے بچوں کے لئے بھی بہت سی کتابیں لکھیں اور بہت سے ترجمے کئے۔

یہ چنگاری مرے سینے میں تُو نے تو نہیں رکھدی

مرحوم غزل، قصیدہ، نظم، قطعہ، رباعی، مسدس، مخمس، مثلث، ترکیب بند، مرثیہ، نوحہ کسی بھی صنف میں بند نہیں تھے انہوں نے گیتا کا بھی منظوم ترجمہ کیا۔

صدیق احمد مجنوں گورکھپوری

مجنوں گورکھپوری کو ذہانت ورثہ میں ملی، اسی ذہانت کے بل پر انہوں نے گورکھپور سے رسالہ ایوان کا اجراء کیا اور ایوان ان کے رنگارنگ ادبی کارناموں کی تخلیق کا ایک ایسا ذریعہ بنا جس کے بعد شعر و ادب کی دنیا میں مجنوں کا سکہ چلنے لگا۔ ان کی علمی فضیلت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ خود فراق گورکھپوری نے ان کے متعلق لکھا ہے "اگرچہ مجھ سے وہ کافی چھوٹے ہیں لیکن ادبی میدان میں مجھ پر انہیں اولیت حاصل ہے اور وہ میرے سینیر ہیں ان کی ذہنی و ادبی نشو و نما بہت تیز رفتار رہی ہے — میری بہت سست رفتار — جب مجنوں قریب قریب ڈیڑھ ہزار صفحات لکھ کر اپنا قلم ڈال چکے تھے اس وقت لوگ مجھ سے روشناس ہوئے"۔

لالہ سری رام دہلوی

لالہ سری رام جی ۱۸۷۵ء میں بمقام دہلی تولد ہوئے۔ وہ ایک ایسے مشہور خاندان کے فرد ہیں جس کا سلسلہ راجہ ٹوڈر مل سے جا ملتا ہے۔ ان کے اسلاف عہدِ مغلیہ میں معزز عہدوں پر ممتاز رہے۔ ان کے والد آنریبل رائے بہادر مدن گوپال تھے جنہوں نے ایم اے کے بعد بار ایٹ لا کی ڈگری بھی حاصل کی۔ آزاد اور حالی کے مشہور دوست رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب جو اپنے دور کے ماہر تعلیم

نواب میر عثمان علی خاں ۱۹۱۱ء میں مسند نشین حکومت آصفیہ ہوئے۔ وہ ۱۳۰۳ھ میں تولد ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں ریاستوں کے انضمام کے باعث سلسلہ تاجداران آصفیہ کے آخری فرد ہیں۔ ہندوستان کی لسانی حیثیت سے تقسیم کے مخالف تھے اس لئے آپ نے گورنر بننے سے انکار کر دیا وہ اردو اور فارسی دونوں کے شاعر تھے۔ مرحوم و مغفور کے کلام کو ملوک الکلام کہنا زیادہ مناسب ہے۔ فصاحت جنگ جلیل سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ صاحب دیوان ہیں، کلام میں سادگی، سلاست اور بے تکلفی کے ہزاروں نمونے ملتے ہیں

ہزار بار تمہیں آزما کے دیکھ لیا۔
تمہارے وعدوں کا اب اعتبار مشکل ہے

انداز تیرے قاتل سب جان کے دشمن ہیں
چتون ہے کہ ناوک ہے غمزہ ہے کہ خنجر ہے

ایک عظیم شاعر ہونے کے علاوہ انہوں نے ۲۲ ستمبر ۱۹۱۸ء کو عثمانیہ یونیورسٹی قائم کر کے اردو زبان کی قابل قدر اور عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ اردو کے علاوہ وہ دیگر زبانوں کی ترقی کے خواہاں تھے۔ دارالترجمہ کے ذریعہ جو ممدوح کی سرپرستی کا مرہون منت ہے علوم و فنون کا ایک بیش بہا خزانہ اردو کے آغوش میں سمٹ آیا۔ اس وجہ سے نظام مرحوم کو سلطان العلوم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

انجمن ترقی اردو نے نظام مرحوم کے دور میں حیدرآباد میں جنم لیا۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ اس انجمن نے ایک موقر سہ ماہی جریدہ "اردو" جاری کیا اور ایک رسالہ سائنس بھی جس میں محض سائنس کے متعلق معلوماتی مضامین شائع ہوئے۔ انجمن کے سکریٹری بابائے اردو نے برسوں کے تجسس و تحقیق کے بعد انگریزی لغت کا اردو میں ترجمہ کیا جو ایسی لغات میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

نواب میر عثمان علی خاں نے اردو اور ارباب اردو کی جو خدمت کی ہے وہ بلا شبہ سب سے عظیم اور اعلیٰ ہے مرحوم نے بے شمار علمی اور تعلیمی اداروں کی سرپرستی کی اور بے شمار علم و ادب کے سرفروشوں کو اقتصادی اعانت اور معاونت سے سرفراز کیا۔ ان کی علمی اور ادبی سرپرستی پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے تو ہزاروں صفحات کی کتاب بھی ناکافی ہوگی۔ ان کے انتقال کے بعد یتیموں جیسی حرماں نصیبی اردو کا جیسے مقدر بن چکی ہے۔

تھے لا دھی کے عمر بسر گزار تھے۔
لالہ ہری رام نے ابتدائی تعلیم دہلی میں حاصل کی پھر اپنے والد کے ساتھ لاہور میں قیام کیا جہاں ۱۸۹۵ء میں ایم اے اور قانون کا امتحان پاس کر کے منصفی کا عہدہ حاصل کیا۔ امرتسر اور لاہور میں چند سال منصفی کے بعد مہ کے موذی مرض نے انہیں ۱۹۰۷ء میں سرکاری ملازمت

بہادر شاہ ظفر سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجدار ہی نہیں تھے۔ اسلامی حکومت کے زوال کے ایام میں آپ اپنے کلام سے شعر و شاعری کی محفلوں کو گرما رہے تھے میرؔ اور غالبؔ کی طرح آپ کی بھی غزلیں مقبول خاص و عام تھیں۔ اب بھی لوگ آپ کا کلام پڑھتے اور سر دھنتے ہیں۔ آپ نے اپنے کلام میں نہایت سلیقہ سے شاعرانہ لطافت کے ساتھ کشمکشِ حیات کی مصوری و عکاسی کی ہے۔ جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

غزلیات کے علاوہ مخمس، مسدس، نظمیں، بھجن، قطعات، رباعی و قصائد تمام موضوع پر آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کے کلام میں ایک دُکھے دل کی پکار بھی ہے۔ اور جگہ جگہ شوخی و متانت، سنجیدگی اور ولولہ انگیزی بھی نمایاں ہے۔

سے علیحدگی پر مجبور کر دیا لیکن ملازمت کی قید و بند سے آزاد ہو کر وہ حصارِ اردو میں آخری سانس تک محبوس رہے۔

تذکرہ ہزار داستان جسے خمخانہ جاوید کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، لالہ جی کی ایسی معرکتہ الآرا تصنیف ہے جس پر انہوں نے انتہائی محنت بھی کی اور بے دریغ روپیہ بھی صرف کیا۔ یہ تذکرہ بجا طور پر اردو کی انسائیکلوپیڈیا (قاموس اعظم) کا درجہ رکھتی ہے۔ اس تذکرہ کے ذریعہ سیکڑوں گمنام شاعروں کی تخلیقات صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوئیں۔

رل سے ۱۸۹۰ء میں دیوان انور اور ۱۹۰۲ء میں مہتابِ داغ اور ضمیمہ مہتاب داغ شائع فرماکر اپنے سلیقۂ تدوین و ترتیب کو اردو حلقوں میں منوالیا۔

قاضی عبدالغفار

'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' کے خالق جو اپنے ان دو بڑے کارناموں کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے خصوصی مقام حاصل کر چکے ہیں۔ یو۔پی میں پیدا ہوئے۔ یونیورسٹی سے ڈگری لے کر مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور حکیم اجمل خاں کے ساتھ صحافت اور سیاست کے میدان میں شامل ہوگئے۔

خلافت کے وفد کے ساتھ قاضی عبدالغفار لندن گئے لیکن واپسی میں فن صحافت سے متعلق معلومات کا خزانہ اپنے ساتھ لائے اور ۱۹۳۵ء میں حیدرآباد سے روزنامہ پیام نکالنے لگے۔ اس کانگریسی روزنامچے نے صحافتی دنیا میں انقلاب برپا کردیا۔ صحیح راہ نمائی اور آزادیٔ رائے کے نصب العین کو ساتھ لے کر چلے تو ہزاروں دشمن گھر ہی میں پیدا ہوگئے لیکن ان کے پائے استقامت میں ذرا سی بھی لغزش نہیں ہوئی۔

حیدرآباد میں سر مرزا اسمٰعیل کی صدارت عظمیٰ تک دفتر معلومات عامہ کے ناظم رہنے کے بعد ملازمت سے دستبردار ہوکر لکھنؤ آگئے۔

آزادیٔ ہند اور ملک کی تقسیم کے بعد قاضی صاحب نے انجمن ترقی اردو کی باگ سنبھال کر اردو کی ترقی، بقا اور تحفظ کی خاطر دن رات ایک کر دیئے۔ اردو زبان کی تاریخ اس ترقی پسند ادیب کی اردو کی بقا کی جدوجہد کو ہی نہیں بلکہ ان تخلیقات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی جو انہوں نے ایک صحافی اور مصنف کی حیثیت سے سرمایہ ادب میں اضافہ کے لئے نذر کیں۔

میراجی

اردو کی آزاد شاعری کے جنم داتا میراجی کے والد برج انسپکٹر تھے۔ نہایت پابند شرع اور پانچوں وقت کے نمازی تھے۔ ان کے تین لڑکے تھے۔ ثناءاللہ ثانی، انعام اللہ نامی اور اکرام اللہ کامی۔ ماں باپ نے اپنی حیثیت کے مطابق انہیں پالا پوسا مگر ان میں سے ایک نے بھی اسکول کی چند جماعتوں سے آگے پڑھ کر نہیں دیا، تینوں لڑکوں میں بڑے ثناءاللہ ثانی تھے جو آگے چل کر میراجی کے نام سے مشہور ہوئے۔ بقول شاہد احمد دہلوی مرحوم "اولیا کے گھر میں کیا بھوت پیدا نہیں ہوتے۔ عنفوان شباب میں ایک بہت بُری عادت نے جڑ پکڑ لی تھی جس نے انکی ساری زندگی کو نفسیاتی الجھنوں کا ڈھیر بنا دیا۔ جنسی بے راہ روی کی مثالوں نے میراجی کی شخصیت میں راہ پائی اور وہ خود ایک نفسیاتی نمونہ، ایک کیس بن گئے۔ میراجی کے جسم میں عقل اور دل کی لڑائی ہوتی رہتی تھی، ان کے من میں یہ بات سما گئی کہ عقل سے کام لینے میں ہمیشہ نقصان ہوتا ہے لٰہذا وہ شراب پی پی کر عقل کو گندہ کیا کرتے۔ مزاج میں شاہی اور روح میں درویشی تھی۔" ان کی دماغی کیفیات کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جب انہیں پونہ میں اپنے نابینا باپ کے انتقال کی خبر ملی تو انہوں نے مسجد میں جاکر منبر کے پاس پیشاب کیا اور کہا کہ تو نے میرے باپ کو مار دیا اس لئے میں تیرے گھر میں پیشاب کر رہا ہوں آوارگی کا یہ عالم تھا کہ مدہوش ہونے کے بعد وہ لاہور کے گلی کوچوں میں بھیک مانگتے اور کھٹے سنترے کھاتے۔ دہلی میں اکثر راتوں کو وہ بے ہوش پڑے پائے جاتے۔ اکثر سڑکوں پر پٹ بھی جاتے۔ انہیں ایک بنگالی لڑکی میراسین سے عشق ہو گیا تھا، اسی لئے اس کے نام پر اپنا نام رکھ لیا۔ میراسین سے انکا عشق جنون کے درجہ تک پہنچ گیا تھا ان کے پاس میراسین کی ایک

محمود شیرانی

پیدائش ۱۸۸۰ء، وطن ریاست ٹونک (راجپوتانہ)

لاہور اور لندن میں تعلیم پائی۔ لندن میں سرٹامس آرنلڈ نے (جو لاہور میں پروفیسر رہ چکے تھے) محمود شیرانی کو ریسرچ کے کام میں اپنا مددگار بنالیا۔ تحقیقات کا شوق اسی وجہ سے ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں لندن سے لاہور آئے۔ اور اسلامیہ کالج اور اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر ہوگئے۔ قلمی کتابیں اور تاریخی سکے جمع کرنے کا بیحد شوق تھا۔ ۱۹۴۶ء میں انتقال ہوا۔ مشہور شاعر اختر شیرانی انہی کے صاحبزادے تھے۔ محمود شیرانی نے تحقیق و تنقید میں حیرت انگیز کام کیا ہے۔ تحقیق میں محنت پسندی اور سخت کوشی کے جوہر نے ان کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے۔ وہ واقعات کی صحت و صداقت پر جان دیتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے تحقیق کا معیار بہت بلند کر دیا ہے۔ محمود شیرانی بلند پایہ محقق، نقاد اور صاحب ذوق تھے فردوسی کے "شاہنامہ" سے تو ان کو عشق تھا۔ شیرانی نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ "خالق باری" اور "قصہ چہار درویش" امیر خسرو کی "دیوان خواجہ اجمیری" اور "پرتھوی راج راسا" پرتھوی راج کے درباری شاعر چاند بردائی، کی تصنیف نہیں ہیں۔

تصویر نہ جانے کہاں سے آگئی تھی جسے وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، جب میراجی کی یاد زیادہ ستاتی تو اس تصویر کو سامنے رکھ کر دیکھتے۔ زمین پر سر پٹکتے اور بے ہوش ہو جاتے۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی چھوڑ کر وہ بمبئی گئے مگر ان کی شراب اور بڑھ گئی۔ آخری عمر میں انہوں نے یک لخت شراب چھوڑ دی اور ڈاکٹروں کے اصرار کے باوجود انہوں نے اپنے اوپر شراب کو بالکل حرام کر لیا۔ قلب کی حرکت میں فرق آ گیا۔ جگر اور معدے نے جواب دے دیا۔ اختر الایمان نے انہیں سرکاری ہسپتال میں داخل کر دیا جہاں سے وہ مر کے نکلے۔

آل احمد سرور

پیدائش ۱۹۱۲ء، وطن بدایوں (یو۔پی) سینٹ جانس کالج آگرہ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ ڈاکٹر بننے کا ارادہ تھا لیکن اردو ادب نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ انگریزی اور اردو میں ایم اے کر کے علی گڑھ میں صدر شعبۂ اردو ہو گئے۔ سرور اردو کے مشہور نقاد ہیں۔ ان کی تنقیدی تحریریں بہت سلجھی ہوئی ہیں۔ انہوں نے نئی اور پرانی شاعری پر جو تنقید کی ہے وہ اردو کی فن تنقید نگاری میں ایک اضافہ ہے۔ انکی تحریر میں شگفتگی، ندرت و لطافت ہے۔ ان کے شعور میں پختگی اور جذبات میں پاکیزگی ہے۔

کرشن چندر

۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں لاہور سے ایم اے کیا۔ خود لکھتے ہیں: میری عمر کا بیشتر حصہ کشمیر میں گزرا۔ کشمیر کی خوبصورتی اور غریبی سے متاثر ہوا ہوں اور اجتماعی طور پر خوبصورتی کو پانے اور غریبی کو کھو دینے ہی کو میں انسانیت کے بنیادی مسائل سمجھتا ہوں۔ کرشن چندر ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ ان کی تحریر میں، تخیل میں، قوتِ تخلیق میں، روانی اور تازگی موجود ہے۔ ان کا دل بہت حساس ہے۔ ان کی نظر اور ان کا دماغ زندگی کے ہر پہلو تک پہنچتا ہے۔ کرشن چندر نے اردو افسانے کو جس خوبصورتی اور فنی کمالات سے آگے بڑھایا وہ قابلِ قدر ہے۔ افسانوں کے علاوہ ناول بھی لکھے ہیں جن میں "شکست" اور "ایک گدھے کی سرگزشت" بہت مشہور ہیں۔

یحییٰ پور ضلع ہوشیارپور میں ۱۱ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد نوہریا رام درد بھی اپنے زمانے میں پنجاب کے ادبی حلقوں میں خاصے معروف تھے۔ درد بلانوش تھے۔ اسی نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ گھربار کی خبر اور نہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا دھیان۔ شاد نے جوں توں کرکے دسویں تک تعلیم مکمل کی اور کم عمری ہی میں ملازمت اور تلاش روزگار میں سرگرداں ہو گئے۔ شاد نثر اور نظم میں چالیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے جو ان کی زندگی ہی میں چھپ چکی تھیں۔ شاد نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا۔ شروع میں کچھ غزلیں اپنے والد کو دکھائیں بعد میں منشی تلوک چند محروم، جوش ملسیانی اور جوش ملیح آبادی سے مشورے اور اصلاح لیتے رہے۔ شاد کا کلام ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور بلند مقام رکھتا ہے لیکن افسوس اس جواں سال شاعر کی جملہ صلاحیتوں کو بلانوشی نے تباہ کر دیا تھا وہ کئی مرتبہ موت کے دروازے سے لوٹ کر آئے۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۶۸ء کو اچانک ان کے والد درد صاحب لاپتہ ہو گئے، گھر سے اچھے خاصے نکلے تھے۔ شاد نے ان کی تلاش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، لیکن بے سود۔ شاد نے غم غلط کرنے کے لئے شراب میں پناہ لینے کی کوشش کی یوں گھریلو زندگی تلخ سے تلخ تر ہوتی چلی گئی۔ ۲ مئی ۱۹۶۹ء کو گھر گئے تو وہاں کا ماحول معمول سے زیادہ ناقابلِ برداشت پایا۔ دس گیارہ بجے گھر سے نکلے اور رات بھر غائب رہے اگلی صبح ان کی لاش دریائے جمنا سے ملی۔

زندگی کے حسیں گلستاں میں — ہر تبسم ہے داغدارِ الم
جب نچوڑا ہے خندۂ گل کو — اس سے ٹپکا ہے گریۂ شبنم

خلوصِ مہر و محبت کی جلوہ گاہ تو ہیں
نہیں ہیں منزلِ مقصود، سنگِ راہ تو ہیں
اگر ثواب کے قابل نہیں ہیں ہم، نہ سہی
خدا کے فضل سے شائستۂ گناہ تو ہیں

مری حیات کی پستی میں بھی بلندی تھی
زمیں پہ گر کے قدم میں نے آسماں کیلئے

نام شکیل احمد ۳ اگست ۱۹۱۶ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی جمیل احمد قادری بدایوں سے منتقل ہو کر بمبئی چلے گئے تھے جہاں وہ اٹھارہ سال تک خواجہ اہلسنت مسجد میں پیش امام رہے۔ شکیل نے ۱۹۳۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۶ء تک محکمۂ سپلائی دلی میں کلرکی کرتے رہے۔ ۴۶ء میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی گئے۔ یہاں ان کی ملاقات فلمساز کارداد سے ہوئی اور بمبئی کے ہی ہو رہے۔ شکیل مولانا ضیاالقادری کے شاگرد ہیں لیکن ۴۷ء کے بعد جگر مراد آبادی سے بھی استفادہ کیا تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۷۰ء کی صبح انہیں خون کی قے ہوئی اور اسی دن اسپتال میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ رعنائیاں، صنم و حرم، رنگینیاں، شبستاں اور نغمۂ فردوس جو نعتوں پر مشتمل ہے چند شعر ہیں۔

بے تعلق، ترے آگے سے گزر جاتا ہے
یہ بھی اک حسنِ طلب ہے ترے دیوانے کا

دل بے نیازِ آرزوئے التفات ہے
شاید اسی کا نام سکونِ حیات ہے

حالِ دل، احوالِ غم، شرحِ تمنا، عرضِ شوق
بیخودی میں کہہ گئے، افسانہ در افسانہ ہم
پارسائی خندہ زن، وعدہ خلافی طعنہ ریز
ہائے کس مشکل سے پہنچے تا درِ میخانہ ہم

سر عبدالقادر ہندوستان کی ان معدودے چند ہستیوں میں سے ہیں جنہیں ادب، سیاست اور معاشرت میں یکساں محبوبی حاصل ہے۔ ۱۸۹۴ء میں آپ نے فورمن کرسچین کالج

لاہور سے بی اے پاس کیا۔ اور پنجاب آبزرور کے ایڈیٹر ہو گئے۔ ۱۹۰۴ء میں انگلستان بیرسٹری کے لئے گئے اور بلادِ اسلامیہ کی سیر کرتے ہوئے واپس دلی آئے۔ دلی، لائلپور اور لاہور میں وکالت کرتے رہے۔ ۱۹۲۱ء میں پنجاب ہائی کورٹ کے جج ہوئے۔ مختلف اوقات میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل

کے رکن ڈپٹی پریزیڈنٹ، پریزیڈنٹ، وزیر تعلیم، وائسرائے کے ایگزیکٹو کونسل، وزیر ہند کے مشیر، بیرونی ممالک میں حکومت ہند کے نمائندے اور ایک دفعہ پھر ہائی کورٹ کے جج اور بہاولپور کے چیف جسٹس ہوئے ۔ ۱۹ ء میں آپ نے رسالہ مخزن جاری کیا جو اردو کی جدید نگاری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے مخزن میں آپ نے ہندوستان کے ہر مذہب وملت اور ہر قسم کے عقائد کے لوگوں کے مضامین شائع کئے اردو ادب کے محسنوں میں آپ کا نام ہمیشہ نہایت عزت کے ساتھ لیا جائے گا۔

سر شاہ محمد سلیمان مرحوم

سر شاہ محمد سلیمان صاحب ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں انٹرنس کے امتحان میں اول نمبر پر پاس ہوئے۔ اب وہ الہ آباد میں آ گئے اور چار سال تک مسلم ہوسٹل

میں مقیم رہے۔ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے ایف اے کا امتحان شاندار طریقے سے پاس کیا اور پوری یونیورسٹی میں چوتھے نمبر پر رہے۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے بی اے کا امتحان بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ وہ اول نمبر رہے، سرکاری وظیفہ پایا اور مزید تعلیم کے لئے یورپ تشریف لے گئے۔

۱۹۱۱ء میں شاہ سلیمان ولایت سے واپس آئے اور قانون ہند کے عمیق مطالعے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے

الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہو گئے تو اپنے وقت کا کچھ حصہ قانون کے علاوہ اور دوسرے مشاغل کو بھی دینے لگے۔ آپ کی ذہانت و ذکاوت ہمہ گیر تھی۔ آپ کو نہ صرف قانون سے حد درجہ شغف تھا بلکہ آپ کو دیگر علوم میں بھی کافی دسترس حاصل تھی۔ خصوصاً ریاضیات اور طبعیات سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ آپ کو اردو شاعری کا بھی خاص ذوق تھا۔ چنانچہ آپ نے ذوق اور میر کے دیوان مرتب کئے اور ان کو اپنے حواشی کے ساتھ اپنے اخراجات سے چھپوایا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو اردو ادب سے کتنی محبت تھی۔ وکالت کے زمانے میں آپ کو دوسرے شہروں میں جانے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ آپ جس شہر میں تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں اردو کے پرانے قلمی نسخے تلاش کرتے تھے اور ان کو اپنے ذاتی کتب خانہ کے لئے خرید لیتے تھے۔

پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی

۱۸۷۱ میں پیدا ہوئے۔ اور ۶ر اکتوبر ۱۹۶۵ء کو انتقال فرمایا۔ سرکاری نوکری سے سبکدوش (ریٹائر) ہونے کے بعد دلی یونیورسٹی اور اندرپرستھ کالج فار وومین دلی میں ۳۲ برس اردو اور فارسی کے صدر شعبہ اور استاد رہے۔ ۸ برس کی عمر ہی میں حکیم محمود خاں کے ذریعہ شریف منزل بلیماران دلی میں داغ دہلوی (مرحوم) سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی

الم نشرح ہوا سترِ خفی بزبانِ مستی میں
یہ خمیانہ ہوا اسے نازاں اپنے حالِ وجداں کا

ادیب الملک اکبر حیدری

جہانِ حسن میں محوِ ترنم ہے وفا میری
میں نغمہ ہوں محبت کا مجسم ہے صدا میری

دلِ مضطر کو جس پر اعتمادِ کامرانی تھا
مرے احساس خودداری میں ہے شانِ التجا میری

مشیت کی نگاہوں میں جو معیارِ پرستش تھی
ہوئی ہے جذبِ اشکِ خونفشاں میں وہ دعا میری

اک آنسو اور وہ بھی دل کی رنگینی سے بیگانہ
نہ دیکھی جائے گی دنیا سے تصویرِ وفا میری

نیاز و ناز کا افسانہ لکھنے کے لئے اکبر
سنی ہے کاتبِ قدرت نے برسوں التجا میری

سے اردو۔ فارسی اور عربی پڑھی۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور اورنٹیل کالج لاہور سے نصابی اکتسابِ علم کیا۔ خواجہ میر درد مرحوم کا صوفیانہ رنگ اپنایا۔ حمد، نعت، منقبت، سلام، مرثیہ، غزل، نظم، رباعی، مسدس سب کچھ لکھا۔ تین گیتا اور سنسکرت سے براہِ راست شلوک اور منتروں کے اردو منظوم ترجمے کئے۔ لاکھوں شعر زندگی میں کہے۔ خالص غزلوں میں بھی ایک شعر حمد۔ ایک نعت میں ہوتا تھا۔ عرفانیات اور تصوف، دینیات، کلام پاک اور حدیث کے سمجھے بغیر ان کا کلام سمجھنا مشکل تھا۔ قرآن پاک کی آیتیں اور عربی، فارسی کے کلاسیکل حوالے اور تلمیحات ان کا خاص مذاق تھا۔ فنِ تاریخ گوئی اور صنعت توشیح میں خاص ملکہ تھا۔ ایک ایک شعر ہی میں اور ایک قطعہ کے دو تین اشعار میں چار چار پانچ پانچ تاریخیں اور مختلف سن نکالتے تھے، ہجری، عیسوی، بکرمی، شاکھا اور

انا الحق جزو لاینفک بنا ہے میرے ایقاں کا
یہی ہے قل ھو اللہ احد مستوں کے قرآں کا

الف الحمد کا قشقہ ہے میرے نورِ ایماں کا
بنا ہر رشتۂ زنارِ گلو تارِ رگِ جاں کا

ملا جو بے تمنا دل ازل میں اہلِ باطن کو
وہی ہے دیرِ ترسا کا وہی کعبہ مسلماں کا

پروفیسر سید احتشام حسین

پروفیسر سید احتشام حسین نے ۱۹۱۲ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ماہل کی سرزمین پر شیعوں کے ایک مہذب خاندان میں آنکھ کھولی۔ بچپن میں پڑھنا لکھنا عربی فارسی سے شروع کیا لیکن کچھ عرصے کے بعد ان کے گھر والوں نے انہیں انگریزی میں تعلیم دینا مناسب سمجھا۔ چنانچہ اعظم گڑھ میں اسکول کی تعلیم حاصل کی۔ جہاں سے وہ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے الٰہ آباد چلے گئے۔ الٰہ آباد سے انہوں نے بی اے اور ایم اے کے امتحانات دونوں اول نمبر میں پاس کئے جس کے بعد ۱۹۳۸ء میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ادبیات اردو کے لیکچرار ہو گئے۔ بعد میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے الٰہ آباد چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ بعارضۂ قلب یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو انتقال فرمایا۔

الٰہ آباد کے قیام کے زمانے میں احتشام صاحب نے بہت کافی لکھا اور ادب کے ہر شعبے کی طرف توجہ کی۔ شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید۔ غرضیکہ کوئی شعبہ بھی ان سے بچ نہ سکا۔ نظمیں اور افسانے انہوں نے کم لکھے لیکن جو کچھ لکھے، انہیں میں سنجیدگی نظر آتی ہے ان میں سماج کے بہت ہی اہم اور ضروری مسائل کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ ہندوستانی نوجوانوں کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ انسانوں کی آفاقی الجھنوں اور پریشانیوں کا تذکرہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فنی اور جمالیاتی خوبیاں بھی پیدا کی جاتی ہیں۔ ان کی شروع کی زیادہ تر نظمیں رومانی ہیں لیکن ان میں بھی زندگی کا دل دھڑکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستانی نوجوانوں کے جذبات و احساسات کو ان میں سمویا گیا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی نظموں میں رومان کے نقوش مدھم پڑتے گئے اور حقیقت کا رنگ غالب آتا گیا۔

یہ تھے وہ اشعار جو دہلی کی "بزم اردو" کے ایک اجلاس میں گونجے، سننے والوں نے داد کا غلغلہ بلند کیا۔ شاعر کی مترنم آواز نے ایک مخصوص تحت اللفظ کے انداز میں یہ اشعار پڑھے۔ مجمع میں دہلی اور بیرون دہلی کے مخصوص شعراء موجود تھے۔ داد کا شور کم ہوا تو حضرت سائل مرحوم کی بلند آواز گونجتی ہوئی سنائی دی۔ جو اس جلسے کی صدارت فرما رہے تھے "حیدری صاحب نیا رنگ اختیار کیا ہے آپ نے۔ ماشاءاللہ، بہت خوب۔ نادر انداز ہے۔" یہ تھے ادیب الملک اکبر حیدری۔

مخصوص احباب میں ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اکبر نے شاعرانہ دل و دماغ مگر شکل پہلوانوں کی پائی ہے۔ متوسط قد، تنومند، گول چہرہ، خندہ پیشانی، مسکراتی ہوئی شربتی آنکھیں۔ جن میں ہر وقت پائپ کے تمباکو کا دھواں ناچ ناچ کر ایک ہلکا خمار قائم رکھتا تھا۔ نہایت خوش پوش اور خوش باش اور خوش مزاج مرنجان مرنج طبیعت کا انسان، اپنے مخصوص اصولوں کا سختی سے پابند۔

اکبر کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان کی بذلہ سنجی

بہت جلد لوگوں کو ان سے بے تکلف بنا لیتی تھی لیکن مخلص دوستوں میں صرف چند ہی تھے جن میں حضرت خواجہ حسن نظامی سید ذوالفقار علی بخاری، بھیا احسان الحق عشقی، ملا محمد الواحدی ڈاکٹر سید احمد بریلوی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی۔ قاری عباس حسین، دیش بندھو گپتا اور مرحوم نقی نور دہلوی ایک نظم میں دہلی کی بزم ادب کا تذکرہ اکبر مرحوم نے اس طرح کیا تھا۔

خوبیٔ قسمت سے ہیں اہلِ نظر اربابِ ہوش
معنوی فرزند تیرے تیری بزمِ ناز میں
تیری خدمت پر کمربستہ بصد جوش و خروش
ہیں ترے نورِ نظر لیکن نئے انداز میں
ہیں بخاری، عشرتؔ و محمودؔ و تاباںؔ و حزیںؔ
تیری بزمِ علم و فن میں آج تخئیل آفریں
بارگاہِ علم ہے نیرنگ کی بزمِ ادب
خادمانِ بزمِ اردو ہیں یہاں مصروفِ کار
اکبرؔ و وحشیؔ. سعیدؔ و برقؔ و قاریؔ سب کے سب
تیری محفل کے لئے ہیں باعثِ عز و وقار
اے جہان آباد کی خفتہ زمیں بیدار ہو
یعنی اب گُل آفرینی کے لئے تیار ہو

اکبر کی زندگی میں ان کی صحت قابلِ رشک تھی لیکن اس سے زیادہ قابلِ رشک شاید موت بھی ہوتی یعنی نہایت مختصر اور بے اعتباری سی علالت میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو بھرے گھر کو الوداع کہا اور چل بسے۔

جگن ناتھ آزاد

ہندو پاک کے مشہور صحافی، ادیب اور شاعر جناب تلوک چند محروم کے آپ صاحبزادے ہیں۔ ادبی ذوق اور طبع کی موزونیت آپ کو ورثہ میں ملی۔ خداداد صلاحیت، شفیق باپ کی تربیت اور اس ستھرے علمی ادبی ماحول سے آزاد کے ذوق شاعری کو نکھارا اور انہوں نے شعر و فن کی ابتدائی منزلیں بہت جلد طے کر لیں۔ ابھی وہ نوعمری تھے کہ ادب کی دنیا میں ان کا نام کافی مشہور ہو گیا۔ علامہ اقبال اور ان کی شاعری سے ان کو خاص عقیدت ہے۔ اب تک ان کے کئی شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں [illegible]

[illegible]

شیراز ہند جونپور کے چھوٹے سے قصبہ مچھلی شہر میں یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو پیدا ہوئے۔ والد مرحوم کا نام عبدالرزاق ہے۔ آپ کے دادا قبلہ محمد اسمٰعیل عالم دین اور محدث تھے۔ بچپن میں اپنے قصبہ کے تین استاد فن شاعروں سید محمد نوح شمیم

قبلہ ہادی صاحب اور جناب متین صاحب سے اصلاح لی پھر اپنے ہی شعور کو رہنما بنا لیا۔ شاعری مڈل اسکول کی طالبعلمی ہی کے زمانے سے شروع کر دی فیض آباد (اودھ) میں سلسلۂ تعلیم سلام کا قیام ان کی شاعری کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا۔ خود سلام کا کہنا ہے کہ "میری شاعری کو ایک تہذیب اور شعور حسن دینے کے لئے محرم کی مجلسوں اور اجودھیا جی کے جھولوں کے میلوں اور ان کے پس منظر کو بڑا دخل ہے"۔ بدقسمتی سے سلام ہائی اسکول کے امتحان میں فیل ہو گئے لیکن اعلیٰ قابلیت کا امتحان سیکنڈ ڈویزن میں پاس کر لیا۔ فیض آباد کے پاس رودولی میں جہاں کے لڑکے کسی زمانے میں بہت مشہور تھے (اب جس قصبہ کو پروانہ رودلوی کے نام سے شہرت حاصل ہے جیسے کبھی شہر کو سلام کے نام سے) ایک زمانہ میں شعروادب کا بڑا چرچا تھا سلام کو بھی رودولی نے کھینچا اور سہارا دیا اور انقلابی شاعر ہونے کے باوجود رودولی کے تعلقہ داروں اور رئیسوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سلام کو پہلی ملازمت الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ مشرق میں ملی اور یہ ملازمت ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ لائی۔ الٰہ آباد ہی میں قیام کے دوران ان کا نمائندہ مجموعہ "وسعتیں" مکتبہ اردو لاہور نے شائع کیا جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے بعد وہ آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ اسٹیشن پر سکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ اب وہ ترقی کر کے پروڈیوسر ہو گئے ہیں اور آل انڈیا ریڈیو کے دہلی اسٹیشن سے وابستہ ہیں۔ حال ہی میں ان کو ادبی خدمات کے صلے میں پدم شری کا قومی اعزاز ملا ہے۔ ان کی شاعری مشرقی یوپی بالخصوص اودھ کے پاکیزہ اور معصوم جذبات کی مظہر ہے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین

عابد حسین نام ۱۸۹۶ء میں دمامی پور تحصیل قنوج ضلع فرخ آباد یوپی میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان کے جن شہروں سے بسلسلہ تعلیم تعلقات رہے ان میں بھوپال، الٰہ آباد اور علی گڑھ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ لندن اور برلن بھی تعلیم کے ہی سلسلہ میں گئے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد

ایم اے کرنے کے لیے جب علی گڑھ پہونچے تو تحریک ترکِ موالات چل پڑی اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ۱۹۲۱ء میں آکسفورڈ سے بی اے آنرز کا ابتدائی امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۶ء میں جرمنی سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کیا۔ وہاں سے واپسی پر ساری زندگی درس و تدریس کے لئے وقف کر دی۔ ۱۹۲۶ء سے تادمِ تحریر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہی میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فلسفی ہی نہیں ادیب بھی ہیں۔ دوسری زبانوں

سے بے شمار ترجمے اردو میں منتقل کئے جن میں "میری کہانی" "جگ بیتی" "تلاشِ حق" "قوم کی آواز" "ضبطِ نفس" اور "نفس پرستی" "مکالماتِ افلاطون" اور "تاریخ فلسفۂ اسلام" کے نام سرِفہرست ہیں۔ ان ترجموں کے علاوہ آپ نے یونیسکو کے لئے "ہندوستان میں جبری تعلیم" نامی کتاب بھی لکھی ہے۔ آپ کی سب سے اہم تصنیف "ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب" ہے "مضامینِ عابد" اور "بزمِ بے تکلف" کے نام سے مضامین کے دو مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

علی محمد عارف

علی محمد عارف مرحوم میر خورشید نفیس خلف انیس کے نواسے تھے۔ کمسنی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ شفیق نانا نے نو سال کی عمر سے ان کی پرورش کی۔ میر خورشید علی نفیس خود بھی عربی و فارسی کے منتہی ہونے کے علاوہ علوم متداولہ پر

بالغ نظر رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے علی محمد عارف کی تعلیم پر خاص طور سے توجہ دی۔ انہوں نے کمسنی میں فارسی اور عربی پر عبور حاصل کر لیا۔ پہلے نانا سے چھپ چھپ کر غزل کہتے رہے اور ہمسن شعراء کے ساتھ مشاعروں میں بھی شریک ہوئے جب سنِ شعور کو پہونچے تو مرثیہ گوئی کو اپنا نصب العین بنایا۔ انہوں نے مرتے دم تک خاندانِ انیس کی تمام خصوصیات و روایات کو برقرار رکھا۔ خودداری اور وضعداری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اسی طرح مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی دونوں میں وہ خاندان انیس کے ممتاز نمائندے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں پچپن سال کی عمر میں ان کا اچانک انتقال ہوگیا۔ ہوا یوں کہ وہ ۱۳ ذی الحجہ کو آغا باقر کے امام باڑے میں مجلس پڑھنے جا رہے تھے۔ اس روز کوچوان کے بجائے وہ خود فٹن چلا رہے تھے اور کوچوان پیچھے کھڑا تھا۔ وکٹوریہ روڈ پر اچانک ان کے سینے میں شدید درد اٹھا اور گھر پہونچنے سے پہلے ہی راستے میں انکا انتقال ہوگیا۔

تھے جمع یلان حبش و روم و رے و شام
بے مذہب و نا اہل و سیہ قلب و سیہ فام

حربے وہ ہر اک پاس کہ جو موت کا پیغام
فرمانے لگے دل میں یہ عباس خوش انجام

گو پیاس ہے پُر لطفِ وغا آج ملے گا
بھاگے نہ اگر یہ تو مزا آج ملے گا

بجلی تھی کہ مسکن سے چمکتی ہوئی نکلی
کندن کی طرح صاف دمکتی ہوئی نکلی

ہر سو صفتِ شعلہ لپکتی ہوئی نکلی
آتش تھی کہ گلخن سے دہکتی ہوئی نکلی

کاٹھی کو جُدا یوں کیا اس برقِ شیم سے
جس طرح کوئی کھینچ لے ریشے کو قلم سے

حملہ کیا غازی نے صفِ اہلِ جفا پر
اُڑنے لگے سر ان کے جو خود سر تھے ہوا پر

یوں جلد ہی وہ آئی سپہ اہلِ دغا پر
جانوں کا بھی لینا ہوا دشوار قضا پر

دم اس کا لیا اُس کو سسکتا ہوا چھوڑا
بسمل کی طرح سب کو پھڑکتا ہوا چھوڑا

مولانا سید عبدالدائم جلالی

مولانا علوم شرقیہ کے بحرِ بیکراں ہیں۔ اسلامیات میں ان کو سند کا درجہ حاصل ہے اور عربی علم و ادب پر پورا

اردو ڈائجسٹ اپریل ۱۹۷۷ء ۱۷۷

مطبع نولکشور کے بانی
منشی نول کشور

اُردو کی خدمت کرنے والے صاحب حیثیت رئیسوں، نوابوں اور دیسی ریاستوں کے غیر مسلم تاجداروں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن ان مقتدر ہستیوں کے مقابلہ میں منشی نول کشور ایک ایسے معمولی گھرانے کے چشم و چراغ تھے جنہوں نے ساری زندگی اردو کے لیے وقف کر دی تھی اور اس میدان میں انہوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جنھیں سامنے رکھتے ہوئے بیدریغ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی علمی ترقیات میں علی العموم اور اردو کے ارتقاء میں علی الخصوص مرحوم کا اتنا بڑا ہاتھ تھا کہ وہ بقائے نسل انسانی تک نمایاں رہے گا۔

منشی نول کشور بھی خودساختہ انسان تھے۔ وہ ۱۸۳۶ء میں بمقام بستوی ضلع علی گڑھ پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی جمنا داس معمولی سا کاروبار کرتے تھے لیکن ان کے ہونہار لڑکے نے عسرت اور تنگدستی کے باوجود کسب معاش کو نظرانداز کرتے ہوئے اردو کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیا۔

منشی نول کشور کو اوائل عمری سے ہی اردو پریس اور اخبارات سے گہرا لگاؤ تھا۔ اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر وہ عرصہ دراز تک ہرسکھ رائے کے ماتحت نکلنے والے

عبور رکھتے ہیں۔ بہت سی مذہبی اور علمی کتابوں کے مصنف ہیں اردو نثر نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے —— آجکل دہلی کے مشہور عربی مدرسہ عالیہ فتحپوری میں آنے والے تشنگان علم کو اپنے علمی تبحر اور بصیرت سے سیراب و بہرہ ور کر رہے ہیں۔

مذہبی اور فلسفیانہ نکات کو محاورہ اردو میں شاعرانہ تلمیحات اور رمزیت کے ساتھ بیان کر جاتے ہیں آپ بڑے پاک باطن، صاف طینت اور وسیع النظر عالم ہیں۔

کے سلسلے میں "اردو شاعری کا تہذیبی مطالعہ" کے موضوع پر ایک مبسوط تصنیف لکھی ہے۔ اس کے علاوہ وہ پانچ کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے "اردو مثنویاں" پر حکومت اتر پردیش سے انہیں "غالب انعام" مل چکا ہے۔ اپنی غیر ملکی سیاحت کے سلسلے میں وہ کینیڈا، فرانس، جرمنی، برطانیہ، سوئٹزرلینڈ، اٹلی، چیکوسلواکیہ اور مصر جا چکے ہیں۔

ڈاکٹر گوپی چند اردو کے نقادوں اور محققوں میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ وہ دہلی یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ انسٹیٹیوٹ میں اردو کے ریڈر اور صدر شعبہ ہیں۔ انہوں نے پی ایچ ڈی

اردو نمبر

اخبار "کوہ نور" میں کام کرتے رہے۔ غدر کے بعد لاہور سے لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں آکر انہوں نے مشہور اخبار "اودھ" شایع کیا اور یہیں مطبع نول کشور کی بنیاد ڈالی جو اُن کی ذہانت اور بے لوث خدمت کی وجہ سے جلد ہی ایشیا کے بڑے بڑے مطابع میں شمار ہونے لگا۔ اس مطبع کے ذریعہ موصوف نے عربی، فارسی، سنسکرت وغیرہ کی کمیاب اور نادر کتابوں کو بھی شایع کیا اور ان کے اردو ترجمے بھی۔ اس طرح علم کا ایک وسیع خزانہ اردو میں منتقل ہو گیا۔

اُردو کے لیے اس احسانِ عظیم کو فراموش کرنا ممکن نہیں۔ مطبع نول کشور کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب ۱۸۹۵ء میں منشی جی کا انتقال ہوا تو وہ اپنے وارثوں کے لیے تقریباً کروڑ روپیہ کا سرمایہ فراہم کر چکے تھے۔ اس مطبع کی چھپی ہوئی بعض اردو کتابیں آج بھی اپنی کمیابی کی وجہ سے سو گنی قیمت کو پہنچ چکی ہیں۔ ★

آپ کا وطن جھنجھانہ (مظفر نگر) ہے۔ خاندانِ سادات علویہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تنویر صاحب نے اپنی زندگی کے پودے کو خود اپنے ہاتھوں سے سینچا ہے۔ محض اپنے شوق، لگن اور محنت سے تعلیم کے تمام مدارج طے کئے، یہاں تک کہ ایم

تدوین پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹری کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ آجکل جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ آپ نے کلیاتِ ذوق اور کلیاتِ نظیر کو ترتیب دیا ہے۔ اور اب "اردو شاعری میں ہندی اصناف کے تجربے" پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ آپ ایک اچھے شاعر — اور ایک باغ و بہار انسان ہیں۔ محفلوں میں اپنی شیریں زبانی اور شگفتہ بیانی کی وجہ سے مقبول اور ہر دلعزیز ہیں۔

عبدالعلیم جو بعد میں افقِ ادب پر علیم اختر مظفر نگری بن کر چھا گئے۔ ۱۹۱۴ء میں ضلع مظفر نگر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی محمد عمر صاحب بھی جو ایک اُجڑے ہوئے زمین دار خاندان کے فرد ... تھے۔

۱۹۱۲ء میں علیم اختر نے پہلا شعر کہا اور ۲۰ اپریل ۱۹۷۱ء کی شب کو آخری چار شعر کہہ کر انہوں نے زندگی کی ہما ہمی سے دوسرے دن کنارہ کر لیا۔ موصوف کو نواب صاحب رامپور نے ابوالمعانی، حسرت ثانی کے لقب سے سرفراز کیا تھا۔ علیم صاحب کا مجموعۂ کلام نکہت گل ۵۷ء میں شائع ہوا جسے

۵۸ء میں یو پی گورنمنٹ نے انعام کے قابل قرار دیا۔ بچوں کے لئے کہے گئے قطعات کا مجموعہ "پھول اور پتے" بھی اسی سال شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ "انوار حرم" اور "بوئے جمال" نعتیہ کلام اور غزلیات کا مجموعہ زیر طبع ہیں۔ اشعار جو وفات کی شب کو کہے گئے تھے درج ذیل ہیں۔

دل کا یہ حال ہوا اُن سے ملاقات کے بعد
اب کوئی بات بھی ہوگی نہ کسی بات کے بعد

اُف یہ عالم کوئی آنسو بھی نہیں آنکھوں میں
اس طرف سے گلۂ حرف و حکایات کے بعد

اس طرح رات کو پہلو میں لئے بیٹھا ہوں
جیسے اب صبح نہ آئیگی کوئی رات کے بعد

کس طرح مجھ سے وہ بدظن ہیں مری باتوں پر
دیکھتے ہیں وہ مرے مونہہ کو ہر اک بات کے بعد

اسرار الحق مجاز

مجاز ۱۹ نومبر ۱۹۱۲ء کو رودولی میں پیدا ہوئے ملک کے مشہور صحافی اور سیاسی انصار ہروانی ان کے برادر حقیقی ہیں۔ ان کے والد چودھری سراج الحق لکھنؤ میں مجسٹریٹ تھے۔ مجاز نے اپنی تعلیم کی ابتدا امین آباد ہائی اسکول لکھنؤ سے کی پھر کچھ دنوں سنٹ جانس کالج آگرہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے بی اے کیا۔ ۳ دسمبر ۱۹۵۴ء میں بمقام لکھنؤ رحلت کی اور اکتالیس برس کی قلیل زندگی میں انہوں نے اردو ادب کے دامن میں دو مجموعوں کا اضافہ کیا جنہیں اردو کے شیدائی "ساز نو" اور "آہنگ کلام" کے عنوان سے بخوبی جانتے ہیں۔

مجاز شاید غالب کے بعد ہی ایسے شاعر تھے جن کی زبان سے لطائف کی گلکاریاں ہوتی رہتی تھیں۔ صرف دو لفظوں کے استعمال سے انہوں نے ایک ایسے لطیفے کی تخلیق کی جس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔

بمبئی کی ایک محفل میں شاعروں کے علاوہ ایک مارواڑی سیٹھ بھی موجود تھے جو بقول خود مجاز کے سب سے بڑے شیدائی تھے۔ دوران گفتگو میں انہوں نے اپنے مرغوب

شاعر کو مخاطب کرتے ہوئے دریافت کیا۔

" مجاز صاحب آپ کا کیا تخلص ہے؟؟"

جواباً مرحوم نے ذیل کے دو الفاظ ادا کر کے ساری محفل کو قہقہہ زار بنا دیا۔

" اسرار الحق "

انہوں نے ملک و قوم کو جس پیرایہ میں دعوت دی ہے اس کا مقام ادب میں ہمیشہ بلند رہے گا۔ اپنے شعر میں قوم کو دعوت عمل دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

اپنی ایک مشہور عام نظم "آوارہ" میں انہوں نے ملک پر چھائے ہوئے افلاس کے اندھیروں کی طرف بڑی گہری کے عالم میں اشارے کئے ہیں۔

اے غم دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں
اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں
مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطان و جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غم دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مخمور دہلوی

ڈاکٹر فضل الٰہی نام، مخمور تخلص ۹۷-۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے اور ۲۶ فروری ۱۹۵۶ء کو دلی میں انتقال ہوا۔ شہرت کی کل عمر جنوری ۵۲-۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء تک

تغزل، تعشق و تصوف۔ آواز میں سوز و گداز اور عرفانی و وجدانی کیف حضرت بیخود دہلوی جانشین داغ کے شاگرد رشید تھے۔ ساری عمر (تقریباً تیس برس) نواب پٹودی سینیر کے ملازم اور مصاحب رہے۔

گوپی ناتھ امن

پیدائش ۱۸۹۸ء۔ وطن لکھنؤ۔ تعلیم بی۔ اے۔ ادیب فاضل منشی فاضل۔ تلمذ عزیز لکھنوی۔ آپ کے والد ماجد منشی مہابیر پرشاد قاصی اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔

امن صاحب کو ذوقِ شعری ورثہ میں ملا ہے۔
آپ ان چند لوگوں میں سے ہیں جو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار کہلاتے ہیں۔ آپ کا تعلق اودھ کے کائستھ علم دوست گھرانے سے ہے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ آصف الدولہ کے دربار میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔
امن صاحب کی شخصیت میں ادب و سیاست کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے سپاہی بھی ہیں اور میدان علم و ادب کے شہسوار بھی۔ دلّی میں جب حفاظت ہوئی تو آپ اس میں وزیر تھے۔ اس کے بعد بیلک ریلیشن آفیسر رہے پیرانہ سالی سیاسی زندگی کی مصروفیتوں

اور عہدہ کی ذمہ داریوں کے باوجود احسن صاحب کے اندر کا ادیب
شاعر ہمیشہ بیدار اور چاق و چوبند رہتا ہے۔

ثاقب کانپوری

اونچی اونچی چوٹیوں پر جب پگھل جاتی ہے برف
اور جب پڑتی ہیں اس پر آ کے کرنیں متصل،

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بجلیاں
کوندتی ہیں پردہ ہائے شب میں اکر ایکبار

ہے یہ جنازۂ شباب یا کہ مرا پلنگ ہے
آہ تمہیں خبر نہیں جان سے کوئی تنگ ہے

تلوک چند محروم

نام تلوک چند، تخلص محروم، گاجرانوالہ صوبہ پنجاب میں جولائی ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے میٹرک پاس کرنے کے بعد آپ ڈیرہ اسماعیل خان، عیسیٰ خیل اور کلورکوٹ میں بطور اسسٹنٹ انگلش ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۴ء میں کنٹونمنٹ بورڈ مڈل اسکول راولپنڈی میں زبان اردو و فارسی کے لیکچرار کے طور پر لے گئے۔ ایف، اے، بی اے وغیرہ کے امتحانات آپ نے اسکولوں کی ملازمت کے دوران میں پاس کئے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے اور ۶ جنوری ۱۹۶۶ء کو دہلی میں وفات پائی۔

گنج معانی۔ رباعیات محروم، مہرشی درشن، کاروانِ وطن، بہار طفلی، شعلۂ نوا، نیرنگِ معانی اور بچوں کی دنیا۔ آپ کے کلام کے مجموعے ہیں جو مختلف اوقات میں چھپتے رہے۔

محروم صاحب کے کلام میں سوز و گداز کی فراوانی ہے اور یہ خصوصیت آپ کو ہندوستان بھر کے شاعروں میں ممتاز کرتی ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ اور کم سن بچی کی وفات پر جو مرثیے لکھے ہیں انہیں پڑھ کر کوئی بھی آنسوؤں کو نہیں روک سکتا۔ اپنی دو برس کی بچی کی موت پر "مزار پر دوسری صبح" کے عنوان سے جو مرثیہ لکھا تھا اس کے چند شعر یہ ہیں۔

عرصۂ شگفتگی زندہ کن بہار ہے
کیا تیری شمعوں میں بند صحبت خوشگوار ہے

ثاقب کی نظمیں یاس و حرماں، درد و اندوہ اور مجبوری بیکسی کی دردناک تصویریں ہیں خصوصاً "بیوہ اور برسات" ایک بے پناہ چیز ہے۔ ہر شعر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک الماس کا نشتر ہے جو دل و جگر کے ٹکڑے کئے دیتا ہے آخر تک پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ حالات زندگی معلوم نہ ہو سکے۔

مایوس ہو کے کل گئے، پھر آج آ گئے
اے کاش! زیرِ خاک سے ہو آشکار تو

ہم دودھ لیکے کتنے ہیں گھر سے ترے لئے
دو دن کی بھوکی پیاسی ہے اے شیر خوار تو

جانے سے تیرے رونقِ کاشانہ لٹ گئی
تھی اے شکنتلا مرے گھر کی بہار تو

کیا خوشگوار چلتی ہے بادِ نسیم صبح
اور زیرِ سنگ و خاک ہے وقفِ فشار تو

برسا رہے ہیں اشک کا مینہ تیری خاک پر
ظاہر ہو تا بہ شکلِ گلِ نو بہار تو

روتا ہے پھوٹ پھوٹ کے بالیں پہ تیری آج
وہ بھائی جس سے کرتی تھی ہنس ہنس کے پیار تو

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ ددھیالی نام عطاء اللہ اور ننھیالی نام شرف الدین احمد۔ عوام میں ڈنڈے والے پیر کے نام سے مشہور ہوئے اور عقیدت مندوں نے صرف "شاہ جی" کہا۔ حضرت علامہ انور شاہ نے امیر شریعت کا لقب دیا۔ اسلاف خاندان بخارا سے سری نگر وارد ہوئے تھے۔ بچپن پٹنہ میں نانی کے سایۂ شفقت میں گزرا۔ جن کے در پر محاورہ اور روزمرہ کی صحت کے لئے شاد عظیم آبادی تک سجدہ کرتے تھے۔ نانی صاحبہ کے انتقال کے بعد پٹنہ سے گجرات گئے، کچھ دنوں بنارس میں چاندی کے ورق کوٹتے رہے حتیٰ کہ امرتسر پہنچ گئے۔ اساتذہ سے قرآن، فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ بڑے خوش الحان تھے۔ وعظ شروع کیا تو سارا امرتسر گرویدہ ہو گیا۔ مولانا داؤد غزنوی کی تحریک پر تحریکِ خلافت میں شامل ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام ملک میں آپ کی خطابت کا شہرہ ہو گیا۔ اور سب نے یہ مان لیا

کہ اردو زبان میں آپ سے بڑا کوئی عوامی خطیب نہیں۔

مرحوم چلتا پھرتا شرعی انسائیکلوپیڈیا تھے' اردو' فارسی، پنجابی کسی زبان میں ان کی طبیعت بند نہ تھی۔ جماعت احرار، سیاسیات میں ان کی مساعی شکست انجام کا ثمرہ تھی۔ چودھری افضل حق۔ مولانا مظہر علی اظہر اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی ایسے لوگ آپ کے دست بازو تھے جو آپ کی زندگی ہی میں ٹوٹ گئے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی

سرخ و سفید رنگ، نورانی گول داڑھی، موزوں قامت متناسب اعضاء، سڈول جسم ـــ یہ ہے مولانا کا ظاہر ان کا کھدر، کا لباس اسباب ظاہری میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ اگر کبھی آپ کو لکھنؤ سے فیض آباد جانے کا اتفاق ہو اور ٹرین کے تیسرے درجہ کے کسی ڈبہ میں اس حلیہ کا کوئی آدمی نظر آجائے تو بلا جھجک سمجھ لیجئے کہ یہی مولانا دریابادی ہیں اور پھر عقیدت سے ان کے ہاتھوں کو چوم لیجئے۔

مولانا ضلع بارہ بنکی کے قصبہ دریاباد کے ایک علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا مولوی مظہر کریم عالم دین اور مفتی شرع متین تھے۔ ایام غدر میں انگریزوں کے خلاف فتوئی دیا اور اس جرم میں کالے پانی کی سزا پائی۔

آپ کے والد مولوی عبدالقادر مرحوم بھی عربی و فارسی کے فارغ التحصیل تھے۔ انہوں نے ڈپٹی کلکٹری کی اور اپنے دونوں بیٹوں عبدالمجید اور عبدالماجد کو عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم دینے کے بعد انگریزی میں تعلیم دلائی۔ مولانا دریابادی نے میٹریکولیشن سیتاپور سے پاس کیا۔ ۱۹۰۸ء میں لکھنؤ کے کیننگ کالج میں داخل ہوئے اور انگریزی کی ایک کتاب پڑھ کر الحاد کی طرف مائل ہو گئے۔ فلسفہ اور نفسیات کے مطالعے کے نتیجہ میں خود کو مسلمان کہنے کی بجائے ریشنلسٹ اور ایگناسٹک کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ یہ حالت لگ بھگ آٹھ سال تک باقی رہی۔

شبلی نعمانی کی سیرت النبی اور مولوی محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمہ قرآن پڑھنے کو مل گیا اور مولانا اپنے قول کے مطابق از سر نو مسلمان ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء کے آس پاس مسٹر عبدالماجد' مولانا عبدالماجد بن گئے۔ داڑھی رکھ لی۔ وضع و قطع میں مذہبی رنگ نمایاں ہونے لگا۔ مذہبی کتب سے شغف بڑھا اور ۱۹۳۲ء میں تفسیر ماجدی مکمل کر کے مفسر قرآن کہلائے۔ مولانا کا انداز تحریر سب سے جدا ہے۔ ان کی عبارت میں طنز کے ساتھ بلا کی شوخی بھی ہوتی ہے۔ تقریباً ۴۰ کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ مضامین کی تعداد بے شمار ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی

بقول نعیم صدیقی ـــ "وہ اگرچہ ایک انقلابی مفکر بھی ہے، ایک سحر طراز ادیب اور خطیب بھی لیکن اس کی بڑائی کا اصلی راز یہ ہے کہ وہ ایک آدمی ہے۔ ایک ایسی شخصیت ہے کہ جس کی اہمیت کسی آبائی جاگیر، کسی سرکاری عہدے، کسی خاندانی منصب اور کسی مصنوعی شہرت اور نمائشی پروپیگنڈہ کے سبب نہیں بلکہ محض ایک نظریہ و مقصد، ایک سیرت و کردار اور ایک سرگرمئی عمل کے بل پر ہے۔"

لیکن اب مودودی ایک فرد کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل فلسفہ ایک اجتماعی کیرکٹر، ایک سیاسی تصور، ایک منظم تحریک اور ایک نصب العین کا نام ہے۔ ان کے نام سے نہ صرف برصغیر بلکہ دنیا کے تمام مسلمان واقف ہیں۔ کچھ ان کے حامی ہیں اور کچھ مخالف لیکن ان کے مخالف اور حامی دونوں ہی اس ایک بات پر متفق ہیں کہ ان کی شخصیت میں تضاد اور تناقض نہیں ہے۔

ان کا سراپا علی سفیان آفاقی کے جملوں میں یہ ہے:

چھوٹے بالوں کے پٹے جن میں درمیان سے مانگ نکلی ہوئی، کھلتا ہوا گندمی رنگ چوڑا ماتھا، آنکھوں پر چشمے سے نیلے رنگ

کے شیشوں کی عینک، دوہرا جسم اور مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ چہرہ ہنس مکھ اور سفید سی داڑھی پر جہاں تہاں سیاہی مترشح۔ مولانا مودودی کے کردار کی سب سے بڑی خوبی تھی کہ وہ سچے ہیں اور انہوں نے پھانسی کی کوٹھری میں بھی جھوٹ نہیں بولا۔ انہوں نے سیکڑوں کتابیں لکھی ہیں اور ان پر درجنوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے ہجرت کر گئے لیکن پاکستان میں جسے انہوں نے اپنا وطن بنایا، ہر حکومت سے ان کی ٹکر رہی اور انہوں نے ہنسی خوشی زندانوں کو آباد رکھا مگر اپنی راہ نہیں بدلی۔ کسی انسان کی اس سے بڑی خوبی اور کیا ہو سکتی ہے؟

مرزا واجد حسین یگانہ چنگیزی

سیاہ رنگ، داڑھی مونچھیں صاف اور کم رو۔ اپنی لن ترانی اور غالب کی ہجو کے لئے شہرت پائی۔ موصوف کے والد کا نام مرزا پیارے صاحب تھا۔ ۱۸۸۴ء میں شہر عظیم آباد کے محلہ مغلپورہ میں پیدا ہوئے۔ شعر و ادب میں مذاقِ سخن کی اصلاح سب سے پہلے مولوی سید علی خاں بیتاب عظیم آبادی نے اس کے بعد شاد عظیم آبادی سے کی۔ ۱۹۲۰ء میں علاج کے سلسلہ میں لکھنؤ آئے، وہیں ایک معزز گھرانے میں شادی کر لی اور وہیں موت کی آغوش میں گئے۔ زبان دانی، محاورہ بندی، جدتِ بیان اور جوش ادا کے لئے خاص طور پر ممتاز ہوئے۔ مرزا کی پوری زندگی ادبی جھگڑوں میں گزری۔ غالب کی غلط تقلید کے لئے مرزا نے شعرائے لکھنؤ پر پرجوش تنقیدیں کیں جس کے نتیجہ میں تمام اودھ ایک طرف ہو گیا اور یگانہ اکیلے رہ گئے۔ لکھنؤ کے شعراء نے یگانہ کا اس حد تک بائیکاٹ کیا کہ جس مشاعرے میں وہ جاتے اس میں تمام دوسرے شعراء شرکت نہ کرتے لیکن مرزا یگانہ کی غالب دشمنی بڑھتی ہی گئی اور "غالب شکن" کے نام سے ایک رسالہ جاری کر کے غالب دشمنی کو انتہا تک پہنچا دیا۔ مرزا یگانہ صرف غالب ہی کو اپنے سے کمتر نہیں سمجھتے تھے بلکہ فارسی کے بے نظیر غزل گو شاعر نظیری نیشاپوری اور علامہ اقبال کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کی مشہور تصنیفات یہ ہیں، "شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز" (اس میں عزیز لکھنوی مرحوم پر شدید حملے اور اعتراضات ہیں) "آیاتِ وجدانی"

مرزا محمود بیگ

مرزا شہباز بیگ کے صاحبزادے مرزا محمود بیگ ۱۸ اگست ۱۹۰۸ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گلی قاسم جان اور چوڑی والان کے علاوہ عربک اسکول میں حاصل کی۔ عربک کالج سے انٹر، سینٹ اسٹیفن کالج سے انگریزی میں بی اے آنرز اور فلسفہ میں ایم اے کیا۔ ۱۹۳۱ء میں وہ یوپی ایس سی کے امتحان میں شامل ہوئے اور پاس ہونے کے بعد حکومت ہند نے انہیں محکمۂ تعلیم کے لئے منتخب کر لیا۔ وہ نہ صرف ایک اچھے استاد اور ایک ماہر تعلیم ہیں بلکہ اردو کے صاحب طرز انشا پرداز اور ایک پُراثر مقرر بھی ہیں۔ ان کے اسلوب میں سادگی اور خوش مذاقی کا بڑا لطیف سا امتزاج ملتا ہے۔ آواز اور انداز بیان میں اتنا سحر ہے کہ سامع محو ہو جاتا ہے۔

اس میں ہمعصر شعراء پر طنز کی گئی ہے) "چراغِ سخن" معاصر شعراء کی عروض دانی پر اعتراضات ہیں) "ترانہ" (مجموعہ رباعیات) "غالب شکن" ادب خبیثہ ادب لطیف کی مذمت میں "آیاتِ وجدانی" نمونہ کلام :-

پیدا ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی
دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر

یگانہ کی بعض رباعیاں بھی بہت عمدہ ہیں۔ ایک رباعی سنئے :-

کعبہ کی طرف دور سے سجدہ کر لوں
یا دیر کا آخری نظارہ کر لوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا
اک ادا گنہ کر لوں کہ توبہ کر لوں

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

ایم اے ڈی لٹ ایل ایل بی، بلا کے ذہین تھے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ انہوں نے انگریزی میں تاریخ ادب اردو لکھ کر انواع و اقسام کے جواہر سے مالا مال زبان تسلیم کرایا۔ اعلیٰ اخلاق، شرافت اور قابلیت کے باوجود رام بابو کو غرور چھو کر بھی نہیں گزرا۔ انہوں نے ایک ضخیم کتاب میں یوروپین اور اینگلو انڈین شاعروں کا کلام مع حالات جمع کیا، ان کی چند مشہور تصنیفات یہ ہیں۔ اردو ادب جدید۔ اشارت و روایت، اردو شعراء کا مرقع معہ پیش لفظ۔ مثنویات میر و خط میر۔ اردو اور فارسی کے شاعروں کا کلام بزبان ہندی۔

عبدالرزاق ملیح آبادی

خاندان پٹھان۔ وطن ملیح آباد، خود کو مولانا آزاد مرحوم سے زیادہ پرانا کہتے تھے۔ عمر کبھی چھیاسی برس کی کبھی ننانوے برس کی بتلاتے تھے۔ مزاج نرم بھی تھا اور گرم بھی۔ ۱۹۲۹ء میں قوتِ ارادی کی برتری کا ثبوت دینے کے لئے سنکھیا کھا لیا تھا۔ مرنے میں کیا کسر تھی لیکن ایسے پٹھان قسم کے لوگوں کا شاید قدرت بھی ساتھ دیا کرتی ہے۔ حضرت کا سر پندرہ دن گھوما مگر پہلے سے کہیں زیادہ تندرست ہو گئے۔ سنکھیا کے طفیل سر کے بھورے بال کالے بھونرا ہو گئے اور چہرے کا پیلا رنگ گہرا سرخ ہو گیا۔ جفت سازی، خیاطی اور گیسو تراشی تک میں ماہر تھے۔ مصر جا کر ۴ سال عربی پڑھی۔ ہندوستان واپس آ کر انگریزی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے۔ انور پاشا، امیر شکیب ارسلان، عبدالعزیز شاولیش۔ عبدالحمید زہراوی۔ سید امام تونسی، ابو سعید الہندی العربی۔ مرزا عبدالقیوم دہلوی، عبدالجبار خیری، عبدالستار خیری اور لالہ ہردیال جیسے انقلابیوں سے ملاقاتیں رہیں۔ مصر میں ایک مقام زیتون ہے پہلی جنگ عظیم میں ترکوں سے لڑنے والی ہندوستانی فوجوں کو انگریز پہلے یہیں اتارتے تھے۔ آپ بھیس بدل کر فوجیوں میں گھس جاتے تھے اور انقلاب کا درس دیا کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان کو بہت عزیز رکھتے تھے ان کے اخبارات پیغام، پیام، الجامعہ (عربی) اور الہلال میں کام کیا۔ ہندوستان میں تین مصری اخبارات المقطم، الاہرام اور البلاغ کے نامہ نگار بھی رہے۔ پھر اپنا اخبار کلکتہ ہی سے "ہند" نام سے نکالا جو آجکل "آزاد ہند" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ ہفتہ وار "اجالا" کلکتہ بھی آپ ہی نے جاری کیا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما پر دہلی آئے اور ہندوستان کی ثقافتی کونسل کے سہ ماہی علمی رسالے "ثقافت الہند" کو ایڈٹ کرتے رہے اور آل انڈیا ریڈیو کے شعبہ عربی کے سپروائزر بھی رہے۔ آپ کا ایک خاص اسلوب تھا، تحریر میں ہلکی ظرافت اور چھپی ہوئی چٹکیاں ہوتی تھیں۔ جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جیل بھی گئے۔ خدا حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

دولہا صاحب عروج

درمیانہ قد، دبلا پتلا جسم، تیکھے نقش، ترشی ہوئی پتلی مونچھیں، قرینے سے جمے ہوئے بالوں پر سفید ٹوپی، بر میں سفید انگرکھا، ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، کمر خمیدہ، آواز گرجتی ہوئی۔ یہ تھے خورشید حسن عروج جو عرف عام میں دولہا کے نام سے مشہور تھے۔ حیدرآباد کی ایک مجلس میں حضور نظام بھی موجود تھے اور دولہا صاحب بڑے جوش و خروش کے ساتھ مرثیہ سنا رہے تھے، ایک معرکۃ الآرا بند پر پہنچے، چار مصرعے پڑھے اور حسب عادت رک گئے اور کہنے لگے "ملاحظہ فرمایا! کس طرح مضمون کو درجہ بدرجہ بلند کیا ہے اب سوچئے بیت کی گنجائش کہاں ہے؟" سارے مجمع کو بار بار مخاطب کیا اور چاروں مصرعے دہرائے، پھر اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے: "سوچئے بیت کیا ہو سکتی ہے، ماشاءاللہ مجمع سخندانوں اور سخن فہموں کا ہے" دفعتاً حضور نظام سے مخاطب ہوئے: "حضور دست بستہ عرض پرداز ہوں، ان چار مصرعوں پر کوئی شایانِ شان بیت لگا دے غلام ہو جاؤں گا۔"

نظام اس تعلی سے محظوظ ہو رہے تھے کہ دولہا صاحب نے اپنے دعوے کی تکرار کی "میں اپنی بیت ہٹائے لیتا ہوں کوئی لگا دے بیت، سچ عرض کرتا ہوں عمر بھر اسکا غلام رہوں گا"

"کہنے کو تو بیت میں کہہ دوں" نظام نے ایک امیر سے سرگوشی کی "لیکن انہیں پانوں گا کیوں کر؟"

دولہا صاحب نے اس تمہید کے بعد بیت پڑھی واقعی بہت ہی موزوں اور برمحل تھی، حضار مجلس نے گھٹنوں کے بل اٹھ اٹھ کر واہ واہ کی صدا بلند کی اور "مکرر مکرر" کا شور مچا، نظام کی عادت تھی کہ وہ جس بات کو پسند کرتے اور تعریف کرتے تو زانو پر ہاتھ ضرور مارتے، نظام نے بھی زانو پر ہاتھ مار کر اظہار پسندیدگی فرمایا۔ دولہا صاحب منبر پر کھڑے ہو گئے، پہلے نظام کو جھک جھک کر دونوں ہاتھوں سے مجرا کیا پھر مجمع کو چوطرف گھوم گھوم کر سلام کرنے لگے۔

"تائید ایزدی ہے مولا کی مدد ہے ورنہ اس کج مج بیاں کا کیا حوصلہ ــــ بزرگوں کا طفیل ہے سچ عرض کرتا ہوں میرے بس کی بات نہ تھی کہ ان چار مصرعوں پر بیت لگاتا ــــ اب بھی دہراتا ہوں اپنی بیت ہٹائے لیتا ہوں کوئی لگا دے کوئی"

حضرت عباس کے حال کا مرثیہ تھا، اسلحے سے آراستہ ہو کر جب حضرت میدان جنگ میں آئے۔ اور رجز خوانی فرمانے لگے، اسی اثنا میں انتہائی جوش میں جب رکابوں پر زور دے کر آپ نے اپنے آپ کو زمین پر انگڑائی لیکر بلند کیا تو بکتر کی کڑیاں ٹوٹنے لگیں، دولہا صاحب اس مضمون کو پڑھتے پڑھتے منبر پر کھڑے ہوئے اور اپنے کمر و سینے کو اتنا پھلایا کہ واقعی ان کے انگرکھے

کے بند ٹوٹنے لگے۔ اسی طرح معرکۂ جنگ پڑھتے وقت ان پر اتنا جوش و خروش طاری ہو جاتا تھا اور اس انداز سے ہاتھ چلاتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ تلوار چل رہی ہے۔ ان کی حرکات آواز کا اتار چڑھاؤ اور پڑھنے کا انداز ہر بیان اور ہر مضمون کی تصویر کشی کرتا تھا اور یہی ان کے پڑھنے کا کمال تھا۔

دولہا صاحب عروج کے مرثیے کے چند بند۔

آگے لشکر کے قریں یوں وہ جری للکارا
کون ہے وہ جسے مجھ سے ہے جدل کا یارا
اس کا فرزند ہوں آ گاہ ہو لشکر سارا
جس نے ایک ضرب میں مرحب سے جواں کو مارا
جو تھا گھمنڈ نخوت و پندار کا وہ سر توڑا
پھول کی طرح سے جس نے درِ خیبر توڑا

بے محل گو تھا مگر دے کے جواب مہمل
تیر سر کرنے لگے شیر کی جانب اہل
آگیا غیظ پڑے ابروئے جرار میں بل
ہاتھ قبضے پہ رکھا کانپ گئی ڈر کے اجل
تیغ رخشاں صفتِ شعلۂ روشن نکلی
کینچلی جھاڑ کے اڑتی ہوئی ناگن نکلی

وہ جھپٹا اسد بیشۂ حیدر صف پر
وہ آیا غضب خالقِ اکبر صف پر
وہ رہوار چلا صورتِ صرصر صف پر
وہ اسوار دبے بچھ گئی صف بر صف پہ
گہہ سرِ دوش گری، گاہ سوئے فرق گری
خرمنِ لشکرِ سفاک پہ وہ برق گری

تیغ کے ساتھ ہی پھرتی تھی نظر چار طرف
برقِ شمشیر کا یکساں تھا اثر چار طرف
اس سے ممکن تھا کسی کو نہ مفر چار طرف
دم میں جاتی تھی وہ مانندِ خبر چار طرف
جو سنائی تھی لعینوں کو قضا سنتے تھے
بند آنکھیں کیے سن سن کے صدا سنتے تھے

اے آر خاتون

پورا نام امت الرحمٰن۔ ۱۹۰۰ء میں دہلی کے محلہ کوچہ چیلان خواجہ میر درد کی بارہ دری کے قریب اپنے دادا صاحب کے مکان میں پیدا ہوئیں۔ دادا مولوی یوسف صاحب، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے شاہ اسحاق صاحب کی اولاد میں تھے اور دادی خواجہ میر درد صاحب کی اولاد میں تھیں۔ ۲ سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۱۴ سال کی عمر میں والدہ کی شفقت سے بھی محروم ہو گئیں۔ ابتدائی تعلیم بھوپال میں ہوئی۔ پندرہ سال کی عمر میں اپنی دادی کے ساتھ مکہ معظمہ گئیں اور تین سال تک وہیں رہیں ۱۹ سال کی عمر میں اپنے ماموں خان بہادر ڈپٹی سید بہار الدین کے لڑکے سید ظہیر الدین سے ان کی شادی ہوئی۔ سید ظہیر الدین صاحب یوپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ انہوں نے اسکولوں میں تعلیم نہیں حاصل کی جس قدر بھی لکھا اور لکھا پڑھا سب اپنے شوق اور جستجو کا نتیجہ تھا۔ اصلاحی افسانے اور طویل ناول لکھ کر نام کمایا۔ شمع اور تصویر ان کے مشہور ناول ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلی گئیں جہاں بڑی مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

حیدر آباد کے مشہور اور قابل وکیل مولوی فدا حسین خاں کے فرزند اور ہندوستان کے تیسرے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کے بھائی ہیں۔ ولادت اور ابتدائی تعلیم حیدر آباد میں ہوئی اور پھر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں شریک

ہوئے۔ ترک موالات کے زمانہ میں جامعہ ملیہ قائم ہوئی تو آپ جامعہ ملیہ میں آ گئے وہاں سے لندن جاکر پی۔ ایچ۔ ڈی کیا پھر حیدرآباد آکر شعبہ تاریخ کے ریڈر ہو گئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر رہے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں پرو وائس چانسلر بھی رہے۔ آجکل دہلی ہی میں مقیم ہیں اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے ہیں۔ نہایت زندہ دل مرنجان مرنج قابل اور محنتی شخص ہیں۔ تاریخ و ادب پر بڑا عبور ہے۔ علامہ اقبال، حکیم مومن خاں مومن اور اسداللہ خاں غالب پر بڑا کام کیا ہے۔ اردو زبان سے ڈاکٹر صاحب کو والہانہ محبت ہے اور آج بھی آپ اردو میں مستقل طور پر کام کر رہے ہیں۔

شاد عارفی

پورا نام احمد علی خاں شاد عارفی — گھر والے ننّن کہتے تھے۔ محلہ والوں میں پاپا کے نام سے بھی مشہور تھے۔ ۱۹۰۰ء میں لوہارو میں پیدا ہوئے ۹ سال کی عمر میں رامپور آ گئے۔ بہت ٹھوس اور پختہ شاعری کی، طنزیہ شاعری کی ایک خاص طرح ڈالی "جو کی روٹی کھا مگر آزاد رہ" انکی زندگی کا اصول تھا۔ کوئی ان کو کمیونسٹ اور کوئی دہریہ کہتا تھا لیکن وہ سچے مسلمان تھے۔ رامپور کے رئیسوں نے اکثر ان کی امداد کرنا چاہی مگر انہوں نے ہمیشہ انکار کیا اور دلیل یہ دی کہ اگر رئیسوں سے روپیہ لوں گا تو ان کے خلاف پھر نظمیں کیسے لکھوں گا؟ پتنگ بازی اور کبوتر بازی کا شوق تھا۔ انہوں نے شاعر کی حیثیت سے فرد اور سماج، عزیز و دوست کسی کو بھی نہیں بخشا۔ آخری زندگی غریبی اور افلاس میں گزاری۔ نمونۂ کلام:۔

تلخیٔ وقت و گردشِ دوراں پہ قہقہے
کچھ شاد ہی نے رنج و محن کا دیا جواب
چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

بہادر یار جنگ

حیدرآباد کے ایک مشہور فوجی خاندان سے تعلق تھا۔ بڑی غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے اور بچپن ہی سے تقریر کرنے کا شوق تھا۔ آدمی بھاری بھرکم اور سرخ و سفید تھے تقریر کے لئے کھڑے ہو جاتے تو اپنی ظاہری شخصیت ہی سے حاضرین کو مرعوب کر لیتے اور جب گل افشانیٔ گفتار دکھاتے تو غضب ہی کر دیتے تھے۔ تعلیم کچھ زیادہ نہیں ہوئی تھی لیکن حصول علم کا جذبہ تھا اس لئے معمولی عربی اور خاصی فارسی پڑھ لی تھی، اردو کا مطالعہ بہت اچھا تھا۔ ادبی کتابیں اور رسالوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے اور کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے۔ عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ اگر چند برس سال اور زندہ رہتے تو غیر معمولی سیاسی لیڈر ہوتے۔

علی جواد زیدی

علی جواد زیدی بڑے ذہین اور سنجیدہ شاعر ہیں' ایک زمانے میں کمیونسٹ تھے' ترقی پسندوں کی صف اول میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ آزادی کے بعد سرکاری ملازمت میں ترقی کی منازل طے کرتے کرتے آپ مرکزی وزارت اطلاعات میں ایک اہم عہدے پر فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مرکزی حکومت نے مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات مسز گجرال کی صدارت میں ترقی اردو کے لیے جو کمیٹی بنائی ہے، آپ اس کے ممبر و سکریٹری ہیں۔

زیدی صاحب کا وطن محمد آباد گوہنہ ضلع اعظم گڑھ ہے اور سرکاری کاغذات میں تاریخ پیدائش ۱۹ر جولائی ۱۹۲۰ء ہے صاحب دیوان شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ تہذیب و شائستگی، متانت و سنجیدگی اور بذلہ سنجی کی جیتی جاگتی تصویر ہیں بڑے اچھے تنقید نگار بھی ہیں۔

بڑا نہ مان مرے ہمسفر خدا کے لیے
چلوں گا میں بھی اسی راہ پر مگر تنہا

ڈاکٹر سمپورنانند آنند

یو۔پی کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند آنند تخلص کرتے تھے۔ اکثر شام کو ان کی کوٹھی پر مشاعرے کی محفلیں سجا کرتی تھیں جن میں چھوٹے اور بڑے ہر طرح کے شعراء جمع ہو جاتے تھے۔ اردو والوں کو ان سے یہ شکایت ہے کہ یوپی میں اردو کو دفن کرنے میں ان کا سب سے زیادہ حصہ تھا۔ وہ پکے ہندی دوست تھے اس کے باوجود اردو میں شعر کہتے تھے اور اردو کی شیرینی سے پورا پورا لطف حاصل کرتے تھے۔

نمونۂ کلام ؎

عشق میرا دھرم ہے اور پیار میری زندگی
دیش سیوا کے لئے جینا مرا ہے آرزو
وطن سے پیار اگر زندگی نہیں آنند
تو زندگی کو بھی توہینِ زندگی سمجھو

مولانا عبدالواحد آباد مرحوم

دیوبند کے ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ خوش نویسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ علمائے عصر حاضر میں بلند مرتبہ اور ذی علم مانے جاتے تھے۔ عرصہ دراز تک دارالعلوم دیوبند کے شعبہ حسابات کے نگراں تھے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی کے ہم سبق تھے۔

نمونۂ کلام ؎

پاسِ وفائے عشق یہاں تک ہے اے ندیم
دل میں ہزار زخم ہیں لب پر فغاں نہیں
چہرے کا رنگ زرد ہے آنکھوں میں ہے نمی
کہتا ہے کوئی جذبۂ الفت جواں نہیں

خان محبوب طرزی مرحوم

علی گڑھ کے دورِ قدیم نے جن اہلِ علم کی تربیت کا فخر حاصل کیا، ان میں خان محبوب طرزی سائنس جیسے خشک موضوع تعلیم کے باوجود شگفتہ نگار ارباب قلم میں شمار ہوتے ہیں۔ تقریباً ۱۵۰ ناولوں کے مصنف ہیں۔ ان کے ناول سماجی اصلاحی سیاسی خدمت اور ادب و رومان دونوں کی جامع ترجمانی میں بے نظیر مانے جاتے ہیں۔ جس واقعے پر قلم اٹھاتے ہیں ——————— اسکی حقیقی تصویر چشم ناظر کے لئے تیار کر دیتے ہیں۔ آجکل دو چار جز کی کتاب لکھنے والے مصنف مجسمۂ پندار و غرور بن جاتے ہیں مگر طرزی صاحب نے ہزاروں صفحات کی تصانیف پر

بھی چہرہ اور مزاج کو بگڑ آشنا نہیں ہونے دیا۔ ایسے انفرادی فن کی وہ لوگ قدر نہیں کرتے جو زمانہ کے نئے الٹ پھیر میں کسی مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ طرزی، غیور، خوددار اور ملک کے خاموش سپاہی تھے۔

آخر عمر میں طرزی صاحب نے نیا راستہ اور آغاز سحر جیسے ایسے ناول سپرد قلم کئے ہیں جنہیں پڑھ کر جدوجہد آزادی کے ہر رفیق کا حسن عمل یوں سامنے آجاتا ہے جیسے پڑھنے والا خود سارے حالات کو دیکھ رہا ہو۔ افسوس کہ ہندوستان کے اتنے بڑے ادیب نے غربت و افلاس میں زندگی گزاری اور جب انتقال کیا تو گھر میں کفن کے لئے بھی پیسے نہ تھے۔

مانی جائسی

قصبہ جائس ضلع رائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ خاندان اجتہاد سے تعلق رکھتے تھے۔ زندگی کے بہترین لمحات ریاست بھرا (یوپی) کی منیجری میں گذرے۔ صفی لکھنوی اور اثر لکھنوی کے ہمعصر تھے۔ پوری زندگی وضعداری اور خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ریاست بھرا سے علیحدگی اختیار کرکے لکھنؤ میں کچھ کاروبار کیا مگر شاعر اور کاروبار؟ بالآخر دہلی آگئے اور یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ چند سال قبل جاوہ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ افسوس ہے کہ اتنے عظیم شاعر کا مجموعہ کلام ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔ کاش کوئی اس طرف توجہ کرتا اور اردو ادب میں جو خلا سا رہ گیا ہے اسے پُر کر سکتا۔

مولانا محمد علی جوہر

دو سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ تعلیم و تربیت کا بار ماں کے ضعیف کندھوں پر آن پڑا، انہی کی

تربیت کا اثر تھا کہ علی برادران سارے فضائے ہند پر چھاگئے اور نہ صرف بین الاسلامی بلکہ بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ پہلے بریلی کے ایک اسکول میں داخل ہوئے۔ پھر علیگڑھ میں تعلیم پائی۔ آکسفورڈ سے بی اے کی ڈگری لی۔ اگر آئی سی ایس کے امتحان میں وہ گھوڑے کی سواری میں فیل نہ ہوگئے ہوتے تو ملک و ملت ایک شعلہ بیان مقرر اور خوددار لیڈر سے محروم ہو جاتے۔ ولایت سے آکر رام پور کے شعبۂ تعلیم میں ملازم رہے۔ پھر بڑودہ چلے گئے ٹائمز آف انڈیا میں ملک کے سیاسی حالات پر انگریزی میں بڑے اچھے مضامین لکھ کر صحافت کے میدان میں قدم رکھا بڑودہ سے کلکتہ چلے گئے۔ دیسی راجاؤں نے ان کو بڑے بڑے عہدے پیش کئے مگر انہوں نے سب کو ٹھکرا دیا اور کا

سے ہفتہ وار انگریزی اخبار کامریڈ نکالنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ کامریڈ کا پہلا پرچہ ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو نکلا اور صحیح معنوں میں اسی تاریخ سے ان کی پبلک لائف شروع ہوئی۔ ۲۰ سال تک ان کی ہنگامہ پرور شخصیت دنیا کے سامنے رہی اور بالآخر ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں انتقال کر گئے۔ ان کی تمنا تھی کہ وہ غلام ملک میں نہ مریں سو یہ تمنا پوری ہوئی۔ بڑے بے باک اور جری انسان تھے حجاز میں پہلی اسلامی موتمر میں انہوں نے بڑی گرجدار آواز میں سلطان ابن سعود (مرحوم) کو مخاطب کر کے کہا تھا:۔

"تو اپنے آپ کو اس مقدس سرزمین کا بادشاہ کہتا ہے اور کہلواتا ہے جہاں رسول مقبولؐ نے اپنی زندگی بسر کی تھی، حالانکہ تیرے پیشرو ترکوں نے اپنے آپ کو خادم الحرمین کہا اور کہلوایا تو بھی ان کی تقلید میں اپنے آپ کو خادم الحرمین کہہ اور ملوکیت پر جو امیر معاویہ کی سنت ہے، ہرگز ہرگز نہ چل" یہ باتیں ایک سرپھرا ہی کہہ سکتا تھا اور محمد علی جوہر مرحوم اپنے زمانہ کے سب سے بڑے سرپھرے تھے۔ ان کی مذہبیت بھی جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود ان میں خشکی نام کو نہ تھی۔ ان کی بے شمار خوش گپیاں اور بذلہ سنجیاں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کا ایک لطیفہ آپ بھی سنئے:۔

ظفر الملک مرحوم (ایڈیٹر الناظر) ایک مرتبہ روئی کا سبز لبادہ پہنے ہوئے مسلم لیگ کے جلسے میں شریک ہوئے ان کا کنٹوپ بھی اسی رنگ کا تھا محمد علی نے دیکھتے ہی پھبتی کسی "یہ ہریل کہاں سے آ گیا" اور اس پر ایک زوردار

نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی

نواب صاحب مرحوم بھیکم پور ضلع علیگڈھ کے رہنے والے تھے اور شروانیوں کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا قائم کیا ہوا کتب خانہ "حبیب گنج" ہندوستان کے نادر و نایاب کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اب یہ کتب خانہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کو دیدیا گیا ہے۔ نواب صاحب مرحوم ریاست حیدرآباد کے صدر الصدور اور امور مذہبی کے مشیر اعلیٰ تھے۔ وہ نہ صرف اپنے دور کے زبردست عالم اور صاحب تصنیف بزرگ تھے بلکہ ان کی شخصیت ایک ادارہ کی سی تھی اور وہ مشرقی تمدن کا بے مثال نمونہ اور علم و فضل کا مجسمہ تھے۔ ۱۹۵۱ء میں علیگڈھ میں نواب صاحب کا انتقال ہوا۔ اب ان کے صاحبزادے عبیدالرحمٰن خاں صاحب شیروانی اور پوتے ریاض الرحمٰن خاں شیروانی ان کی روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں مگر افسوس کہ ان کا علم و فضل انہیں کے ساتھ دفن ہو گیا۔ مرحوم مذہبی علوم۔ تاریخ و فلسفہ اور فقہ اسلامی کے زبردست عالم تھے اور شعر و ادب کا ستھرا مذاق رکھتے تھے میر حسن کا تذکرہ اور خواجہ میر درد کے دیوان کی ترتیب و تدوین اور ان کے مقدمے مرحوم کی علمی یادگاریں ہیں۔

صاحبِ دیوان سکھ شاعر

ہندوستان میں اردو ادب کو مشاعروں کے ذریعہ فروغ دینے والی یہ واحد ہستی ۹ مارچ ۱۹۰۸ء میں پاکستان میں پیدا ہوئی۔ کنور صاحب گرو نانک دیو کے خاندان کی براہ راست چودھویں پشت کے چشم و چراغ ہیں۔ اور سکھوں میں اردو کے واحد صاحب طرز صاحب دیوان شاعر ہیں۔ انہیں اردو سے بے پناہ عقیدت ہے اور وہ پندرہ سال کی عمر سے شعر کہتے چلے آرہے ہیں۔ اس طرح انھیں اردو کی خدمت کرتے ہوئے پچاس سال کا طویل عرصہ ہو چکا ہے۔

سحر صاحب نے پندرہ سال کی عمر میں جب وہ چیفس کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے پہلا شعر کہا تھا ؎

ذرا ہشیار رہنا، دیکھنا دھوکہ نہ کھا جانا
حسینوں نے چھپایا آستیں میں مار ہوتا ہے

اردو کے مشاعروں میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہر مشاعرہ میں ادیب اور شاعر ہی نہیں ادب اور شعر نواز انہیں اس طرح گھیر لیتے ہیں کہ برسات کی تاریک رات میں چراغوں کے اردگرد پروانوں کے بے انتہا ہجوم کی یاد آنے لگتی ہے۔

ان کی بدولت سارے ہندوستان میں آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ اور وہ مشاعروں کی شرکت کے سلسلے میں پاکستان اور انگلستان بھی ہو آئے ہیں۔

جوش ملیح آبادی کنور صاحب سے متاثر ہو کر ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

اگر نظارۂ خیر مجسم کی تمنا ہے
مہندر سنگھ کو اے ناظرانِ دیدہ ور دیکھو

قہقہہ پڑا۔ نمونہ کلام:۔

آزادیٔ وطن کیا یوں بے خطر ملے گی؟
قربانیاں دیئے بن فتح وظفر ملے گی؟
لندن کے ہوٹلوں میں کھا کر ڈنر ملے گی؟
جیلوں ہی میں ملے گی وہ چیز اگر ملے گی

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، بہار کے گورنر، ہندوستان کے نائب صدر جمہوریہ اور صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم اگرچہ پیشہ ور سیاستداں اور ادیب نہ تھے لیکن قدرت نے انہیں سیاسی عظمت سے بھی ہمکنار کیا اور ادبی عظمت بھی دی وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے اور ان کی اس خصوصیت کو ہمارے بڑے بڑے پیشہ ور

ادیب اور نقاد بھی نہیں سمجھے۔ بقول ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی "سادہ شراتی دلآویز اور تخلیقی جوہر سے مالا مال کسی اور وکیل، سیاستداں اور ماہر تعلیم کے یہاں نہیں ملتی"۔۔۔ نمونۂ کلام،

مانا ہجوم درد بھی ہے بزمِ زندگی
پر کیف زندگی نہ سہی زندگی تو ہے

للہ اس کے ذکر سے نفرت نہ کیجئے
ذاکر شکستہ حال سہی آدمی تو ہے

آصف (محمد آصف علی بیرسٹر)

جنگ آزادی کے آزمودہ کار سپاہی۔ کارواں سالار اور وقت کی ہر ایثار طلب آواز پر مردانہ وار لبیک کہنے والے مجاہد تھے۔ دلی آبائی وطن تھا۔ یہاں کی ٹکسالی زبان اُن کی گفتگو اور تقریر سے زندہ ہی۔

انسانوں کے درمیان مذہبی امتیاز و تفریق کو ہمیشہ برا کہا۔ دوسروں کی ہمدردی میں اپنا اثاثہ آبا ر بھی لٹا بیٹھے۔ امام الہند مولانا آزاد اپنے برادر خورد کی حیثیت سے ان کو زندگی کے ہر نشیب و فراز کی رہنمائی کے قابل بناتے رہے۔ شعروادب سے والہانہ وابستگی رہی سیاست نے جن لوگوں کو اہم ادبی خدمات سے محروم رکھا آصف بھی انہیں کی صف میں شامل ہیں۔

نمونۂ کلام۔ نظر ہے تشنۂ نظارۂ جمال ہنوز
خیال پر ہے مسلّط ترا خیال ہنوز
نصیب آصفِ غم آشنا نہ جاگ سکا
حریم خواب میں ہے شاہدِ وصال ہنوز

علامہ انور صابری

مولوی، مجاہدِ وطن، رند، شاعر ۔۔۔ انور صابری ہمارے ملک کے مشہور قومی شاعر ہیں، انہوں نے اپنی زندگی

حکیم محمد اجمل خاں شیدا دہلوی

حکیم محمود خاں صاحب کو قدرت نے تین عظیم المرتبت فرزند عطا کئے۔ بڑے حکیم عبدالمجید خاں، منجھلے حکیم محمد واصل خاں اور چھوٹے حکیم محمد اجمل خاں ۔۔۔ اور ان تینوں نے اپنے اپنے دور میں خاندانی روایات کو آگے بڑھانے اور اس پر نقش دوام ثبت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ فطرت نے جو ہمہ گیر خصوصیات اجمل اعظم کی ذات میں ودیعت فرمائی تھیں وہ ان کے خاندان ہی کے لئے نہیں پوری انسانیت کے لئے باعثِ فخر و شرف ہیں۔ طب ہو یا سیاست، مذہب ہو یا معاشرت، شعروادب ہو یا فنونِ لطیفہ انہیں زندگی کے ہر شعبے سے گہری دلچسپی تھی اور زندگی کے ان تمام شعبوں میں انہوں نے اپنی صداقت و شرافت، علم و بصیرت خلوص و محبت اور استقلال و استقامت کے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔ شیدا تخلص کرتے تھے، افسوس کہ ان کے اشعار

محفوظ نہیں رہ سکے۔

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں ۷ شوال المکرم ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۴ء) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اس زمانے کے دستور کے مطابق گھر پر ہوئی۔ پندرہ سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا۔ طب اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم مولوی جمیل الدین سے پڑھی اور اس کی عملی تربیت اپنے والد حکیم محمود خاں اعظم سے حاصل کی انیس سال کی عمر تھی کہ منطق، طبیعات، ادب، فلسفہ، حدیث، تفسیر، فقہ، یہ سب ان کے علمی مقبوضات میں شامل ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ فن خطاطی میں بھی کمال پیدا کیا اور محض اپنے شوق اور مطالعے سے انگریزی زبان میں بھی اتنی استعداد بہم پہونچائی کہ مغربی علوم وافکار کی سمت و رفتار معلوم ہوتی رہے۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کی سیاسی زندگی کا آغاز دراصل ۱۸۸۲ء کے بعد ہوتا ہے۔ ان کے والد حکیم محمود خاں نے اکمل المطابع کے نام سے ایک پریس قائم کیا تھا جس سے ایک اخبار بھی نکلتا تھا اس اخبار کا نام "اکمل الاخبار" تھا تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد حکیم صاحب نے "اکمل الاخبار" کی ادارتی نگرانی اپنے ذمے لے لی اور بعض اہم اداریوں کے علاوہ اس کے اکثر مضامین بھی خود ہی لکھتے رہے۔

وطن کی خدمت میں بسر کی۔ زندانوں کو آباد کیا اور اپنی انقلابی نظموں سے لوگوں کے دلوں میں آزادی کے جذبہ کو بیدار کیا۔ شوکت تھانوی مرحوم نے ایک بار لکھا تھا "مولانا انور صابری کے متعلق شبہ تو پہلے سے تھا کہ یہ حضرت واسکوڈیگاما اور سندباد جہازی کے امتزاج نظر آتے ہیں مگر "وہ جنہیں کوئی نہیں جانتا" کی سرسری سی ورق گردانی کرنے کے بعد یہ شبہ یقین بن گیا کہ یہ دریافتیں ان ہی کے ایسا جہاں گشت کر سکتا تھا" واضح رہے کہ اس کتاب میں انہوں نے اردو کے غیر معروف شعراء کا تذکرہ کیا ہے۔

علامہ صابری کا وطن دیوبند ہے لیکن ان کا مستقل قیام دہلی ہی میں رہتا ہے۔ وہ بے پناہ اور بے تکان شعر کہتے تھے۔ آزادیٔ وطن کے بعد چند برسوں تک وہ تمام آل انڈیا مشاعروں کو لوٹنے میں شہرت رکھتے تھے لیکن اب ضعیفی اور بیماری کی وجہ سے بہت کم مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں، موجودہ دور کے صفِ اوّل کے اردو شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

چاند تک پہنچا مگر معراج
کفر ٹوٹا بڑے غرور کے بعد

ڈاکٹر مغفور احمد اعجازی

ریاست بہار میں اردو تحریک کو نئی زندگی بخشنے والوں میں ڈاکٹر مغفور احمد اعجازی مرحوم کا نام سرفہرست ہے۔ وہ جب تک زندہ رہے اردو زبان کی تحریک سے گویا انہیں ہر روز ایک نئی زندگی ملتی رہی۔ انہوں نے اپنی عمر عزیز کا آخری حصہ اردو زبان کی بقا اور جدوجہد میں صرف کیا۔ وہ اردو زبان کے لئے ہی زندہ رہے اور اردو زبان کی سالمیت کیلئے ہی جنگ کرتے کرتے ۲۶ ستمبر ۱۹۶۶ء کو رحلت فرما گئے۔

مولوی سمیع اللہ قاسمی

سمیع اللہ قاسمی شاہجہانپوری نہ شاعر تھے نہ ادیب، لیکن ان کی دوکان پر شاعروں اور ادیبوں کا جمگھٹا رہتا تھا

بڑے حساس اور جوشیلے احراری تھے ایک بار کالے جھنڈوں سے صدر ناصر کے خلاف مظاہرہ کر دیا تھا اس لئے جب جب صدر ناصر ہندوستان آئے۔ مولوی سمیع اللہ قاسمی کو جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ دہلی کے بڑے اور چھوٹے، قدآور اور پستہ قد، اچھے اور برے، شرابی اور کبابی اور صوفی صفت، الغرض ہر قسم کے شاعر، ادیب، ایڈیٹر اور قوال تک شام کو انکی دوکان پر حاضری دیتے تھے۔ موصوف سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے ادبی جھڑپوں سے دہلوی گالیوں تک کی منزلیں طے کی جاتی تھیں اور رات گئے جب جامع مسجد کی تمام دوکانیں بند ہو جاتی تھیں اس وقت بھی مولوی صاحب کی دوکان ادب کھلی رہتی تھی ——— مرحوم کو غریبوں سے ایک خاص لگاؤ تھا پڑوسیوں کی خود بھی مدد کرتے تھے اور اپنے ہمعصروں کو بھی مجبور کر دیا کرتے تھے کہ انہی کی طرح ہر پڑوسی کی مدد کریں۔ سچی بات کرتے تھے اور سچی باتیں پسند کرتے تھے۔ دہلی میں ہر ادبی شورش کا آغاز ان کی دوکان ہی سے ہوتا تھا اور انجام بھی ——— انہوں نے نہ جانے کتنے ادبی فتنے جگائے اور نہ جانے کتنے معرکوں کی رہنمائی فرمائی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اردو نمبر

۱۰ ادارہ

اُردو کے سکھ اَدیب و شاعر

جو لوگ اردو زبان و ادب سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اردو زبان کسی خاص فرقہ، مذہب یا خطہ کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستان کے تمام رہنے والوں کی زبان ہے اور سب نے اردو کی ترویج اور ترقی میں "بقدر ہمت اوست" کے مصداق حصہ لیا ہے۔ گیسوئے اردو کو جہاں مسلمانوں اور ہندوؤں نے سنوارا ہے وہاں اس کے ناز برداروں میں سکھ اور عیسائی بھی نظر آتے ہیں۔ آج اردو شاعری کے میدان میں مخمور جالندھری۔ اودے سنگھ شائق۔ کرپال سنگھ بیدار۔ کنور مہندر سنگھ بیدی۔ اودھم سنگھ سردار۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ۔ پورن سنگھ ہنر کے نام ملتے ہیں تو افسانے اور کہانی لکھنے والوں میں راجندر سنگھ بیدی۔ بلونت سنگھ، شمشیر سنگھ نرولا کے اور صحافت میں، سردار دیوان سنگھ مفتون، سادھو سنگھ ہمدرد اور ماسٹر جگت سنگھ اور سردار دریہ سنگھ کے نام سامنے آتے ہیں ان میں سے اپنے اپنے رنگ اور اپنے اپنے میدان میں ہر ایک کی خدمات ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی اور سردار دیوان سنگھ مفتون نے تو خصوصیت سے اردو میں ایک خاص مقام پیدا کیا ہے۔ اوّل الذکر ایک مشہور افسانہ نگار اور مؤخر الذکر ہندوستان کے مایہ ناز صحافی ہیں۔ یہاں ان سب حضرات پر مختصراً روشنی ڈالی جاتی ہے۔ پہلے کہانی اور افسانے لکھنے والوں کو لیتا ہوں۔

افسانہ نگار

راجندر سنگھ بیدی:- اردو کے مشہور اور کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں اور اردو ان کو بین الاقوامی افسانہ نگاروں کے مقابلے میں پیش کر سکتی ہے بعض حضرات کے نزدیک فن کے اعتبار سے بیدی کا مقام کرشن چندر سے بھی بلند ہے۔ عرصہ دراز سے کہانیاں اور افسانے لکھ رہے ہیں۔ آجکل فلم لائن میں ہیں کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں دانہ دام گرہن، کوکھ جلی اور سات کھیل قابل ذکر ہیں۔ اردو کو بیدی پر بجا طور پر فخر ہے۔

بلونت سنگھ:- کہانیاں لکھتے ہیں اور پہلے پنجابی ادیب ہیں جنہوں نے پنجاب کے دیہات کی زندگی کو بڑے حسن و خوبی سے اپنی کہانیوں کے ذریعہ اردو میں پیش کیا ہے۔ اُردو میں بعض نئے الفاظ کو بھی شامل کیا ہے۔

شمشیر سنگھ نرولا:- کہانیاں لکھتے ہیں بعض کہانیاں تو بہت پسندیدہ ثابت ہوئی ہیں، اردو ہندی کا سنگم ہیں۔ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے قلم سے آزاد ہندوستان کے لئے ایک نئی زبان ڈھل رہی ہے۔ اردو کے ساتھ ہندی میں بھی لکھتے ہیں مرکزی حکومت میں انفارمیشن آفیسر ہیں۔ جانے کے نام سے اردو میں آپ کی کہانیوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے اردو کو آپ

لوک سبھا کے اسپیکر سردار گوردیال سنگھ ڈھلوں

لوک سبھا کے اسپیکر، پارلیمانی جمہوریت کے نگہبان و محافظ سردار گوردیال سنگھ ڈھلوں ایک فعال سیاستدان ہی نہیں، ایک اچھے ادیب و شاعر اور صحافی بھی ہیں۔ ایک عرصہ تک وہ اردو میں مضامین بھی لکھتے رہے اور شعر و شاعری بھی کرتے رہے۔ انہوں نے بی اے تک اردو اور فارسی پڑھی ہے چونکہ ان کے والد بھی اچھے فارسی داں تھے اس لئے ان کے گھر کا ماحول اور ان کا حلقۂ احباب بھی ادبی تھا۔ اور آج بھی اپنے مصروف وقت کا کچھ حصہ وہ ادب کی خدمت کے لئے نکال لیتے ہیں۔ سردار ڈھلوں ۱۹۴۷ء - ۵۴ تک اردو روزنامہ شیر بھارت اور پنجابی روزنامہ ورتمان کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ آپ ۶ اگست ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے اور امرتسر و لاہور کے سیاسی و ادبی ماحول میں آپ کی پرورش ہوئی۔

سے بہت سی توقعات ہیں کیونکہ آپ اردو اور ہندی کا ایک حسین امتزاج ادب میں پیش کرتے ہیں۔

سنتوکھ سنگھ دھیر: بیسویں اسکول ماسٹر ہیں۔ نئے پنجابی اور اردو کے معماروں میں ہیں۔ دونوں زبانوں میں افسانے لکھتے ہیں جو بالعموم پسند کئے جاتے ہیں۔

کرتار سنگھ دگل: آل انڈیا ریڈیو کے دہلی اسٹیشن میں کام کرتے ہیں یہ تین دریاؤں کا سنگم ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی اور ہندی بھی لکھتے ہیں۔ ان کے قلم کے ذریعہ تینوں زبانوں کے الفاظ و خیالات ایک دوسرے میں منتقل ہو رہے ہیں۔ کہانیاں، ناول اور ڈرامے لکھتے ہیں۔

مخمور جالندھری: جناب مخمور جالندھری کا پورا نام گوربخش سنگھ ہے بہت اچھے شاعر ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کے رنگ میں آج کے مسائل کو نہایت عمدگی سے نظم کرتے ہیں تقریباً نصف درجن غیر ملکی زبانوں کے ناولوں کو اردو کا جامہ پہنا چکے ہیں ان میں سے بعض دو دو ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ ماہنامہ شاہراہ دہلی اور روزنامہ نیا زمانہ جالندھر کے ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں

کرپال سنگھ بیدار: سردار کرپال سنگھ بیدار پٹیالے کے رہنے والے ہیں ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ بہت اچھے شعر کہتے ہیں اردو علم و ادب سے بڑی لگن ہے پنجاب میں اردو شعر و شاعری میں اچھا مقام ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی: دہلی کی محفل علم و ادب کی ایک شمع اور شاعروں کی رونق ہیں۔ مشاعرہ چلانے میں ماہر اور مشہور ہیں نعتیہ کلام بھی لکھتے ہیں۔ تاجور کے شاگرد ہیں۔ دہلی میں دنیائے شعر و شاعری کی رونق ہیں بعض غزلیں بہت پسندیدہ ثابت ہوئی ہیں۔

اودے سنگھ: سردار اودے سنگھ شائق پورا نام ہے۔ پنجاب میں کسی جگہ سرکاری وکیل ہیں، اردو سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

اودھم سنگھ:۔ سردار اودھم سنگھ۔ سردار تخلص رکھتے ہیں۔ جلال لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ اردو زبان کے شیدائیوں اور فدائیوں میں سے ہیں اچھے شعر کہتے ہیں۔

ڈاکٹر دیوانہ:۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ تخلص رکھتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ اردو علم و ادب سے اچھا شغف ہے۔ شعر بھی خاصے کہتے ہیں۔

پورن سنگھ:۔ سردار پورن، مہر تخلص ہے۔ امرتسر کے رہنے والے ہیں اچھے شعر کہتے ہیں۔ اردو کے شیدائیوں میں سے ہیں۔

مسافر گیانی گورمکھ سنگھ

بھرپاست کے پرانے شاعر، شاعر اور صاحب سوز و گداز شاعر [illegible] جب تک رہے ہر سال شاندار مشاعرہ اور کوی دربار کرتے تھے

اب پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ نمونہ کلام ہے

مسافر [illegible] دشمن پہچان دینا زندگی ہے
یہ دولت نام ہے [illegible] مجھے اپنے بزرگوں سے ملی ہے

• ادارہ

اٹھارہویں صدی میں جب ہندوستان پر برطانوی اقتدار کا پرچم بلند ہونے لگا اور حکومت برطانیہ نے جگہ جگہ اپنے فرانسیسی اور پرتگالی حریفوں کو ہزیمت دینا شروع کی تو ہندوستان کے گوشے گوشے سے یہ قومیں راہ فرار اختیار کرنے لگیں۔ کچھ لوگ گوا، دمن، ڈیوا ور پانڈیچری چلے گئے۔ کچھ لوگ یورپ واپس لوٹ گئے اور ان میں سے کچھ ایسے نمایاں خاندان جو ہندوستان کی آب و ہوا اور تہذیب و تمدن سے متاثر تھے دیسی ریاستوں میں ہجرت کرنے لگے۔

ان ہی لوگوں میں سے پرتگال کے ڈی سلوا اور فرانس کے بوربون خاندان کے افراد بھوپال آ گئے۔ ان مہاجرین میں زیادہ تر طبیب تھے جو فارسی اور اردو زبانوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ شعر و شاعری سے بھی انہیں رغبت تھی۔ چنانچہ مندرجہ ذیل اصحاب نے اردو شاعری میں اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔
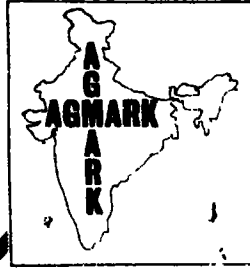
بالمعز بوربون فطرت، الیاس مسیح عبرت، فرانسس لائغر، تھامس بیسنٹ عرف اچھے صاحب نفیس، جوزف دلارے عاشق، بائین ظاہر، ڈی سلوا فطرت۔

نفیس کا کلام باقاعدگی کے ساتھ "پیام یار" لکھنؤ میں شایع ہوتا تھا۔ نفیس انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی بخوبی جانتے تھے اور فارسی، ترکی کے علاوہ اردو زبان میں روانی کے ساتھ شعر کہا کرتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں بمقام بھوپال پیدا ہوئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔
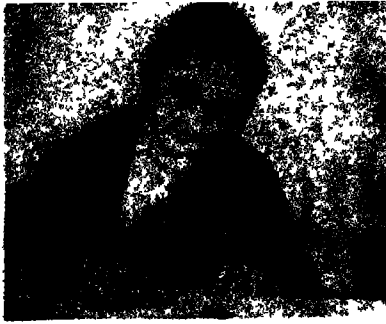
▲ رضیہ سجاد ظہیر

ان عورتوں نے افسانے لکھے

• ایم ایم

مختصر افسانہ، مرد اور عورت دونوں کی کوششوں سے ترقی کی سنہری منزلیں طے کرتا جا رہا ہے۔ چنانچہ میں نے اس مضمون میں صرف افسانہ نگار عورتوں کو منتخب کیا ہے! اس سے میری مُراد یہ نہیں کہ میں ان کو مردوں کی مخالف صف میں کھڑا کر رہا ہوں بلکہ میں ان کو مردوں کے دوش بدوش ہی سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر رشید جہاں عورتوں میں سب سے پہلی خاتون ہیں جنہوں نے ترقی پسند مصنفین کی جماعت میں شرکت کی۔ اور اس جماعت کی شعلہ ریز کتاب "انگارے" میں حصہ لیا۔ جس کو بعد میں حکومت نے شر انگیز، باغیانہ کتاب سمجھ کر ضبط کر لیا۔ رشید جہاں کے افسانے اس کتاب میں قدامت اور روایت کے خلاف حد درجہ بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ اِن کے افسانوں کا مجموعہ "عورت و دیگر افسانے" "انگارے" میں بھی ایسا جوشیلا پن، بیزاری اور بغاوت نظر آتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے وہ پرانی سماج، پرانے نظام، پرانی روایتوں کی بنیادوں کو ڈھا دینا چاہتی ہیں۔ اور نئی سماج، نئے نظام اور نئے رسوم کی بنیادیں رکھنے کی آرزومند ہیں۔ جھوٹی مذہب پرستی پر بھی وہ بے باکانہ طنز کرتی ہیں اور ساتھ ساتھ موجودہ سوسائٹی کی گندگیوں، کمزوریوں کو بھی بیان کرتی جاتی ہیں۔ جہاں جہاں قدامت پرست طبقہ جھنجھلاتا ہے وہاں پر وہ ایک گونجیلا نعرہ بلند کرتی ہیں۔ اور اپنے صحت مندانہ نظریوں کو بیان کرنے سے نہیں چوکتیں۔ ان کو انسانی فطرت کی کمزوریاں کی تصویریں کھینچنے میں بھی بڑی مہارت حاصل ہے۔ ان کے افسانے ایک ایسی عورت کے گرد گھومتے ہیں جو قدامت میں پلی بڑھی۔ لیکن اس قدامت کی گھٹن سے دُور بھاگنا چاہتی ہے۔ نئی زندگی کی کھلی، پاک و صاف فضا میں جہاں سکون کی چاندنی اپنی سنہری کرنیں پھیلا رہی ہو۔

آپ خان بہادر شیخ عبداللہ کی صاحبزادی ہیں اور صاحبزادہ محمود الظفر کی بیوی۔ آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی سے طبی ڈگری حاصل کی تھی۔ آپ کے خاندان کو ہندوستان بھر میں یہ فخر ہے کہ خاندان کا ہر فرد ڈگری یافتہ ہے۔

اس کے بعد عصمت چغتائی ایسی خاتون ہیں جو اپنے آپ کو نہ تو ترقی پسند کہتی ہیں، نہ رجعت پسند۔ شاید وہ کسی لیبل کو لگانا اس لئے پسند نہ کرتی ہوں کہ اس سے آجکل تعصبی جذبات زیادہ پھیلتے جا رہے ہیں۔ عصمت کی افسانہ نگاری کی ابتدا ۱۹۳۵ء سے ہوتی ہے۔ انھوں نے ڈرتے ڈرتے سب سے پہلا مضمون "فسادی" رسالہ ساقی کو بھیجا تھا جس پر مدیر نے لکھا تھا "آپ کا مضمون اچھا بلکہ بہت اچھا ہے۔ میں نے ایک نشست میں ختم کر لیا اسے سالنامے کے لئے رکھ لیا گیا ہے"۔ اسی ہمت افزائی کی وجہ سے وہ آج کل صفِ اوّل کی افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔ سچ تو یہ ہے ان میں ابتدا سے ہی افسانہ نگاری کی فنی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اور پھر عظیم بیگ کے ماحول نے ان کو اپنی صلاحیتوں کو اُبھارنے کا صحیح موقع دیا۔ بقول جاں نثار بریلوی "وہ عظیم بیگ سے زیادہ بے باک

عصمت چغتائی

سند ہیں عظیم بیگ کا من اردو میں کھوکھلی رومانیت
ایت کا ردِ عمل صاحب کو عصمت نے مہیا ئے
دیا۔" جب عصمت نے "لحاف" ایک جنسیاتی ،
انقلابی افسانہ لکھا تھا تو ملک کے رجعت پسندوں
سا آگ بھا کیونکہ عصمت نے بعض سماجی ممنوعات
، بقول پطرس" اس افسانے کا مرکز ثقل یا تا کہ ی
کا معاملہ نہیں بلکہ ایک جسمانی حرکت ہے " لیکن
عصمت کا یہ افسانہ فنی اعتبار سے اردو ادب کا
تہ ہے۔ اگر وہ افسانے میں ذہنی لذت سے نفرت
تیں تو ان کی یہ کوشش بہت کامیاب رہتی ،
کا پہلا مجموعہ "کلیاں" جیسے کہ نام سے ظاہر ہے۔
نگاری کی واقعی کلیاں ہیں۔ ننھی منی کلیاں جن میں
وشبو ہے باذبیت ہے، اور جو پھول بننے کی آرزو
کے افسانے ایک ایسی لڑکی کے گرد گھومتے ہیں
جوانی ہوئی ہے اور جو ابھی ابھی اسکول سے کالج میں

داخل ہوئی ہے اس کے علاوہ "کلیاں" میں گھر کے ملازموں
کی مجبوریوں اور ان کی امنگوں کے بھی بہترین نقوش نظر آتے
ہیں لیکن عصمت کی فکری تلخیاں "چوٹیں" میں زیادہ ہیں "چوٹیں"
میں عصمت پہلے سے زیادہ کامیاب دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے
وہ ایک چابکدست ناظر کی طرح اپنے اردگرد کی چیزوں کا
مشاہدہ کر رہی ہیں۔ اور اس ماحول میں سانس لینے والی زندگیوں
کے تجزیئے کرتی جا رہی ہیں اور ان کے افسانوں کو جو چیز جاندار
بناتی ہے وہ ان کی بے باک طرزِ نگارش ہے۔ بقول پطرس
" عصمت کے فقروں میں بول چال کی سی لطافت و روانی ہے
جملوں کا زیر و بم روزمرہ کا سا پھرتیلا زیر و بم ہے۔" ان کا اسلوب
موضوع سے پورا پورا مناسبت رکھتا ہے۔ عصمت اپنے افسانوں
میں ذاتی رائے کا کم اظہار کرتی ہیں اور جو موضوع پسند آئے۔
زندگی کے جس کے پہلو سے زیادہ واقف ہیں اسی کو اپنے افسانے
کا موضوع بناتی ہیں۔ شاید وہ انہی چیزوں کو بیان کرنے پر مجبور بھی
ہیں۔ بقول منٹو " جب تک عورتوں مردوں کے جذبات کے درمیان
موٹی دیوار حائل رہے گی عصمت اس کے چونے کو اپنے تیز ناخنوں
سے کریدتی رہے گی۔" سعادت حسن منٹو کا یہ کہنا سچ معلوم ہوتا
ہے۔ "چوٹیں" میں یہی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ایسی چوٹیں بھی ہیں
جو سماج نے عورت پر لگائی ہیں اور ایسی بھی چوٹیں ہیں جو عورت
نے سماج پر لگائی ہیں۔ عمل اور ردِ عمل یہ سائنسی نظریۂ عصمت کے
اپنی حس سے ہمدردی، ہمدردی اور خلوص کا آئینہ دار ہے۔ وہ چاہتی ہیں
نوجوان لڑکیاں قوت، اعتماد اور یقین حاصل کریں اور اس انتشاری
زمانے میں اپنی ہستی کا صحیح مقصد سمجھیں ورنہ جانوروں کی طرح
گھروں میں بند رہ کر سوکھتی رہنے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس
سے قوم کا زیادہ حصہ گل سڑ کر خراب ہو جائے گا اور ان کی نسلیں
تباہی کے انگاروں پر دم توڑتی رہیں گی۔ مولانا صلاح الدین احمد
نے بہت سچ کہا تھا " عصمت اپنے افسانوں میں معیاری
ہستیاں پیش نہیں کرتیں۔ وہ گوشت و خون کے پتلے ہمارے
سامنے لا کھڑی کرتی ہیں جن میں محاسن و معائب کا ایسا ہی تناقض

امتزاج ہے اور کمزوریوں خوبیوں کی ویسی ہی نفسیاتی ترکیب پائی جاتی ہے"۔ عصمت کے افسانوں کی ہیروئین مجھ کو امریکی فلم "وائٹ کارگو" کی ہیروئین ہیڈی لیمار جیسی نظر آتی ہے جو سفید نسل کے مردوں سے اپنی عزت آبرو بیچ کر انتقام لیتی تھی اور مرد کو زہر دیکر مار ڈالتی تھی۔ میں عصمت کو موجودہ افسانہ نگاروں میں بہترین فنکار سمجھتا ہوں۔ بقول پطرس "عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعثِ فخر ہے اور عصمت کے کارناموں کے لئے اردو خوانوں کو ہی نہیں بلکہ ادیبوں کو بھی ان کا ممنون ہونا چاہئے۔

عصمت، عظیم بیگ چغتائی مرحوم کی چھوٹی بہن ہیں۔ علی گڑھ سے انھوں نے بی۔اے، بی ٹی پاس کیا ہے اور علی گڑھ ہی میں ان کو علم نفسیات کے مطالعے مشاہدے کا زیادہ موقع ملا۔ اور یہیں سے ان کے نفسیاتی، جنسیاتی افسانوں اور جزئیات نگاری کا زور بڑھ جاتا ہے۔

افسانہ نگار عورتوں میں حجاب امتیاز علی نے بھی کافی شہرت حاصل کی۔ انہوں نے ایک نئے ماحول نئی سوسائٹی میں رہتے بستے ہوئے بھی ایک تخیلی دنیا کی تصویریں کھینچی ہیں جس میں نہ کوئی حقیقت ہے نہ کوئی زندگی! ان کے رومانی افسانوں کے موضوع کردار، ماحول، سب ایک مخصوص رنگ میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ان کے افسانے جو "ہیبتناک اور خوفناک" ہیں کچھ کچھ مغربی اثرات کے حاصل ہیں۔ انکے فن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے قاری کے ذہن پر بھی خوفناک اثرات ڈالے اور اسکو اسی وحشتناک ڈراؤنے ماحول میں گم سُم کر دیا۔

حجاب حیدرآباد میں ہی پیدا ہوئیں۔ آپ کی والدہ عباسی بیگم مرحومہ بھی ایک مشہور ادیبہ تھیں ۱۹۳۴ء کے بعد سے ازدواجی زندگی میں بھی آپ کو امتیاز علی تاج کا ادبی ماحول نصیب ہوا جہاں آپ کی ادبی صلاحیتوں کو ابھرنے کا بہترین موقع ہاتھ آیا۔ آپ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مشہور ہوا باز بھی تھیں ۱۹۳۶ء میں آپ نے ہوا بازی کا (A) لائسنس حاصل کیا تھا۔

ایک اور خالص رومان پسند طاہرہ دیوی شیرازی ہیں

ہاجرہ مسرور

ان کی تحریریں بیازی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ اور افسانوں کی ہیروئین کا کردار "نیاری" عورت" کا سا تھا۔ انکی کتاب "سحر بنگال" میں بھی جو نمایاں ہے وہ جذبات کی رنگین بیانی ہے شاعرانہ ماحول پیدا کر کے ہیروئین کو محو کر دیتی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی حقیقت نہ ہوتی تھی محض شاعرانہ مبالغہ۔

صالحہ عابد حسین کا نام دہلی گروپ کی عورتوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے ادب کی خوش قسمتی ہے کہ ہمارے پاس اگر ایسی عورتیں ہیں جن کو ورثے میں ادبی سرمایہ ملا ہے آپ کا تعلق مولانا حالی سے ہے

آپکے والد خواجہ غلام الثقلین مرحوم بھی ملک کے نامور ادیب تھے آپ کے بڑے بھائی ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین ہندوستان کے مشہور ادیبوں میں سے تھے اور تھے آپ کے شوہر ڈاکٹر عابد حسین جرمنی فلسفے کے ایک نامور ترجمان ہیں۔ اسی ادبی پس منظر اور ماحول کے اثرات کی وجہ سے ان میں ادبی رنگ ریاض رہا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کا ادبی میدان ناول، جدید ادب کے تحاسے

ممتاز شیریں

افسانوی ہلکا پھلکا ادب ہے۔ میں آپ کو ترقی پسند اس لئے سمجھتا ہوں کہ آپ سادہ مگر حقیقی واقعات کی عکاسی کرتی ہیں جس میں انسان کے غم اور اس کی خوشیاں ہوا کرتی ہیں۔ خود آپ کا خیال ہے کہ اکثر ایسے واقعات جو دل پر گہرا اثر ڈال سکیں۔ میرے افسانے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ انسان کی زندگی اور موت کو ہمدردی سے دیکھوں اور سچائی سے دکھلاؤں اور اپنے قصے کے کردار سے اس طرح گھل مل جاؤں کہ ان کے دکھ سکھ کو اپنا دکھ سکھ سمجھ سکوں۔"

ایک اور مشہور افسانہ نگار سحاب قزلباش ہیں۔ ان کا تعلق بھی ادبی سرپرستوں سے ہے۔ آپ کے والد آغا شاعر قزلباش مرحوم دہلی کے مشہور شاعر تھے۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ "بدلیاں" پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے آپ میں لکھنے کی فنی صلاحتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کتاب کے افسانے ایک ایسی نوجوان لڑکی کے گرد گھومتے ہیں جو رومان کو ہی زندگی کا سنہری مقصد سمجھتی ہے لیکن سحاب کے افسانے حجاب کی طرح خالص رومان کے عکاس نہیں۔ ان میں بھی بے لوث اور پاک محبت کا بیان ہے۔ محض خیالی داستانیں نہیں۔ اور سحاب کو حجاب سے جس چیز نے نمایاں درجہ دلایا وہ افسانوں میں تاثر اور شگفتگی ہے حقیقت افروز واقعات کی صحیح عکاسی اور گہری معنویت ہے!

پنجاب گروپ میں حجاب کے بعد ناہید عالم ادب کے نیلگوں آسمان پر چمکتی نظر آتی ہیں۔ بہت قلیل عرصے میں انھوں نے شہرت حاصل کر لی۔ ان کے افسانے 'ساقی' 'چمنستان' 'عالمگیر' میں شائع ہوئے۔ ان کو پڑھ کر یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ ناہید میں ابھرنے کی صلاحتیں زیادہ تھیں۔ ان کے افسانے ایک کالج گرل کنواری لڑکی کی امنگوں آرزوؤں، تمناؤں کی مختلف تصویریں کھینچتے ہیں جن میں میٹھی میٹھی سی چبھن اور کسک ہے۔ افسانہ "کھلاڑی" میں انھوں نے دبی دبی محبت کا اظہار بہت ہی دلچسپ، فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ "اندیشے" میں بھی انھوں نے ایک نوجوان لڑکی کے اندیشوں کا ذکر بہت عمدگی سے کیا ہے۔ لاشعوری ذہن کے نفسیات نے افسانے کو شاہکار بنا دیا ہے

لکھنؤی گروپ میں تین بہنوں کا ایک چھوٹا سا گروپ زیادہ مشہور تھا۔ یہ گروپ بیگم درانی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور پر مشتمل تھا۔ ان میں بیگم درانی بہت کم لکھا کرتی تھیں۔ شاید ازدواجی زندگی کی الجھنوں کی وجہ سے۔ لیکن خدیجہ اور ہاجرہ، زیادہ لکھا کرتی تھیں۔ پہلے پہلے ان دونوں بہنوں کے افسانوں میں ایسی یکسانیت ہوا کرتی تھی کہ یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا تھا کہ فلاں افسانہ کس نے لکھا؟ خدیجہ نے یا ہاجرہ نے! شاید اس یگانگت کی وجہ ان کی زندگیوں کا پس منظر ہو۔ گو کہ دونوں کی پیدائش میں دو سال کا فرق تھا۔ خدیجہ ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئیں اور ہاجرہ مسرور ۱۹۲۹ء میں۔ دونوں ابتدا سے ایک ساتھ پلی بڑھیں اور پڑھیں۔ ایک ساتھ افسانے لکھے اور پھر غضب یہ کہ ایک ہی رسالے میں چھپے۔ خدیجہ مستور کے افسانوں میں پختگی گہرائی ہے اور ہاجرہ کے افسانوں میں رعنائی اور فن کا نکھار

حساس پایا جاتا ہے۔ بقول پروفیسر وقار عظیم حجرہ کے
فسانے گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں۔ ان کے
نداز کی جرأت اور بے باکی زندگی کے معمولی سے واقعہ میں بھی
وئی نیا پہلو تلاش کر لیتی ہے۔ زبان کی صفائی، سادگی، ہلکی
پھلکی ادبیت، اس میں جا بجا تشبیہوں کی چمک اور افسانے
ں خود بخود ابھرتے ہوئے تصور زا اشارے ایک خاص کی دلکشی
انگی پیدا کر دیتے ہیں، اور ہاجرہ کے افسانوں میں عورت کے
دل کی کہانیاں ہوا کرتی ہیں۔ وہ عورت جو ماں، بہن، بیوی بنکر
اوران سب رشتہ داروں سے الگ صرف عورت رہ کر طرح
طرح کے ارمانوں، آرزوؤں اوران گنت دھڑکنوں کا گہوارہ
ہے۔ جو روتی ہے، ہنستی ہے، قربانیاں کرتی ہے۔ ہزاروں طرح
کی آگوں میں جلتی ہے۔ ہاجرہ نے اپنے افسانوں میں عورت اور
اس کے دل کی کہانی ماحول کو بدل بدل کر سنائی ہے اوراس نت
نئی فضا میں ہر جگہ کہانی کا عنصر دلچسپ ہے۔

ایک اور لکھنوی گروپ سے تعلق رکھنے والی قرۃ العین حیدر
ہیں آپ اردو کے مشہور افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم مرحوم کی
صاحبزادی ہیں۔ آپ کی والدہ نذر سجاد حیدر بھی اچھی افسانہ نگار
ہیں قرۃ العین حیدر کو ادبی میراث ماں باپ کی طرف سے ملی ہے
جس کا وہ صحیح استعمال کر رہی ہیں۔ ان کے افسانے بقول شیریں پہلے
پہلے حجاب کے انداز میں رنگے ہوئے تھے لیکن ان کے افسانوں
کا پس منظر تخیلی ماحول کے بجائے جدید انگریزی ماحول سے بنا ہے
اوران کی تحریر میں زیادہ روانی اور چستی ہے اور وہی اونچے متوسط
طبقے کے ساز و سامان اور عشرتوں کا ذکر۔ لیکن بعد میں وہ ان چیزوں
کو اس طرح پیش کرنے لگیں جیسے ان کا مقصد اس زندگی کی سطحیت
کا کھوکھلا پن دکھلانا ہو لیکن میرا خیال ہے حجاب سے زیادہ ان پر۔
اپنے ابا مرحوم کا اثر زیادہ ہے اور یہ اثر اس وجہ سے گہرا ہے کہ سجاد
حیدر مرحوم افسانوں کو کہتے جاتے تھے اور قرۃ العین ان کو لکھتی جاتی
تھیں، اور ان کے افسانوں میں مشرقی مغربی ماحول کا بھی کچھ ایسا
دلکش امتزاج ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مغربی ماحول کو

علامہ سر عبدالقادر، فضل حق قریشی دہلوی، آغا محمد یعقوب
دواشی اور سید وقار عظیم (ایک نایاب فوٹو)

مشرقی ماحول میں ڈھال رہی ہیں۔ مگر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کو
مغربی موضوع اور مغربی تکنیک سے زیادہ دلچسپی ہے اس کی وجہ
ان کی کانونٹ اور مخلوط کالجوں کی تعلیم کا اثر معلوم ہوتا ہے لیکن
یہ ہمارے اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسی بھی افسانہ نگار
ہیں جو اونچے متوسط طبقے کی صحیح عکاسی کرتی ہیں۔ اوران کے
بیان میں زیادہ سچائی اور خلوص ہوا کرتا ہے جو دوسری افسانہ نگار
عورتوں میں کم نظر آتا ہے۔ ان کے افسانے ایک کنواری لڑکی
کے گرد گھومتے ہیں جو مغربی فیشن کی دلدادہ ہے جس کو سفید نسل
کی عورتیں اور مرد مغربی ماحول مغربی موسیقی سے حد درجہ محبت
ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ افسانے خود ان کی اپنی زندگی

خدیجہ مستور

کے سچے مرقع ہیں یا ان کے مشاہدے کے عکاس ہیں۔ غرض ان کے افسانوں کی ہیروئن حد درجہ رومانی ہے۔ وہ مغربی فلموں میں دلچسپی لیتی ہے اور ایکٹنگ کرتی ہے

مجھ کو ان کے افسانے پڑھ کر دو چیزوں کا کیوں خیال آتا ہے۔ ایک کشمیر کی بہار کا۔ دوسرے امریکی فلموں کی ایکٹرس سونجا ہونی شاید یہ دونوں ان کے افسانوں کے پس منظر میں کہیں نہ کہیں اپنے تاثرات ضرور بکھر دیتے ہیں اور اسی لئے ان کے افسانوں کا پس منظر شفیق الرحمٰن کے افسانوں کے شوخ رنگوں کی طرح شریر، نارنجی، زعفرانی نظر آتا ہے۔ افسانے کے عنوان بھی بڑے خواب آگیں رکھی ہیں جیسے "دیودار کے درخت" "دریچے کے سامنے" "گومتی بہتی رہی" "برسات کے بعد" "ستاروں سے آگے" "آملہ دوست" اور بعض وقت مصرعوں کو افسانوں کا عنوان بنا دیتی ہیں، جیسے "میری گلی میں ایک پردیسی" "سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا" سچ تو یہ ہے کہ ان کا ہر افسانہ ایک مکمل شعر و نغمہ میٹھا سا ہوا گیت ہے جس کا ہر بول شیریں اور میٹھا ہے!! تقسیم

وطن کے بعد وہ پاکستان چلی گئی تھیں لیکن "آگ کا دریا" لکھ کر وہ بے وطن ہو گئیں پہلے لندن گئیں اور وہاں سے ہندوستان آگئیں اور اب وہ ہندوستان ہی میں ہیں۔

ایسے ہی رنگ میں لکھنے والی تسنیم سلیم چھتاری ہیں۔ آپ کا اصلی نام میمونہ تسنیم تھا لیکن نواب صاحب طالب نگر کے فرزند نواب سلیم سے شادی کرنے کے بعد آپ نے اپنا نام تسنیم سلیم رکھ لیا۔ آپ نواب صاحب چھتاری کی صاحبزادی ہیں ۱۹۳۶ء میں نینی تال میں پیدا ہوئیں۔

لیکن تسنیم کے افسانے قرۃ العین حیدر سے بالکل جدا ہیں۔ ان کے افسانوں کا رنگ منٹو کے افسانوں کی طرح سرخی مائل بھورا ہے اور کہیں کہیں زردی مائل نیلا۔ کیونکہ ان کے افسانوں میں زندگی ناچتی گاتی چلتی پھرتی، ہنستی کھیلتی نظر آتی ہے دونوں اپنے نرم دلوں کے جذبات کا اظہار کرتی ہیں۔ لیکن تسنیم کے افسانے یوں معلوم ہوتا ہے۔ سکون آمیز جھیلیں! اور قرۃ العین کے افسانے دوڑتی لپکتی ہوئی نہریں! ان کا خود خیال یہ ہے "ہمیشہ الجھی چیزوں سے دلچسپی رہی ہے میرے افسانوں کا مقصد نہ اصلاحی ہے نہ اخلاقی۔ میں صرف اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتی ہوں" افسانہ کسک ایسا معلوم ہوتا ہے خود ان کی زندگی کا عکس ہے۔ مجھ کو ان کے افسانے پڑھ کر اس لئے خوشی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ نوابی شان و شوکت میں رہنے والی لڑکیوں کی زندگیوں کے تجزیئے کرتی ہیں۔ ان کا نوابی غرور محبت کے قدموں پر دفن ہو جاتا ہے۔

سلمٰی رشید بھی نئے چاند کی طرح ابھریں اور ڈوب گئیں یہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی صاحبزادی ہیں۔ اپنے ابا کی طرح ان کی تحریر میں شگفتگی، طنز اور مزاح کی جھلکیاں ہیں جو دوسری عورتوں سے ان کو امتیاز کرتی ہیں کیونکہ دوسری عورتیں زیادہ تر سنجیدہ افسانے لکھتی ہیں۔ سلمٰی نے اردو کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر سے شادی کر لی ہے اور اب وہ بہت کم لکھتی ہیں۔

ایک کہنہ مشق نجیب آباد کی لکھنے والیوں میں سے شفیق بانو تھیں ان کی ایک کتاب " باغی لڑکی " بھی شائع ہوئی۔ ان کے افسانوں میں گھریلو جھگڑوں کا ذکر بہت عمدگی سے ہوا کرتا اور وہ ان جھگڑوں کے نتائج کو دکھلا کر یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ یہی جھگڑے ہماری زندگی کو گھن لگا رہے ہیں۔ ان کو ختم کر دیا جانا چاہئے۔ بقول آصف علیؔ اردو لکھنے والیوں میں شفیق بانو نے اپنے لئے جو جگہ پیدا کی۔ وہ ان کی فطرتی ذہانت، مشاہدہ کی استعداد اور اس زبان کے قلم بند کرنے کا قدرتی نتیجہ ہے حقیقت کا فطری، سادہ زبان میں ظاہر کر دینا ہی ادبی عمارتوں کی بنیاد ہے "۔ غرض ان کے افسانوں میں بھی مسکراہٹوں اور خوشیوں کا ذکر کم ہوتا ہے اور بے زاری اور غم کا ذکر زیادہ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا دل بہت حساس ہے جو ہر معمولی دکھ سے گہرا اثر قبول کرتا ہے !!

ایک زمانہ میں صوبہ بہار کے گروپ میں شکیلہ اختر بلند مقام پر نظر آتی تھیں۔ ان کے افسانے موجودہ کالج گرل، غریب، مزدور، بورڈنگ ہاؤس کے لڑکے اور لڑکیوں کے جذبات، احساسات اور ان کی امنگوں کے عکاس ہوتے ہیں ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ اتنا اچھا ہے کہ افسانے میں نگینہ کا کام دیتا ہے مگر یہ انسان کی نفسیاتی کیفیت، اور زندگی کی چل پہل اور نشیب و فراز کو دکھلانے کے ساتھ ساتھ منظر کشی زیادہ کرتی ہیں جس سے بعض وقت اکتاہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ لیکن شکیلہ میں فن کا زیادہ احساس پایا جاتا ہے۔ ان کے تمام افسانے فنی لحاظ سے بہت کامیاب ہوا کرتے ہیں۔

ایک اور مشہور فن کار سرلا دیوی ہیں۔ آپ اُردو کے مشہور ادیب کرشن چندر کی چھوٹی بہن ہیں۔ ان کے افسانے خوب ساقی اور نیا دور میں شائع ہوئے۔ ان کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں دماغ میں ۔ خونیں سماج اور ظالم مرد کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ کیونکہ وہ عورت کو بے جان پتھر یا انہیں سمجھیں بلکہ ایک انسان کی طرح اس

محسن اردو نواب آصف الدولہ بہادر شاہ اودھ

کو جینے کی تلقین کیا کرتی ہیں۔ ان کی طرز نگارش میں ایک باغیانہ پن ہے لیکن ان کا باغیانہ نعرہ زندگی کی تخریب نہیں کرتا بلکہ تعمیر کرتا ہے خاص جذبات کی بے باکی، پلاٹ کی گتھیاں، فضا، فنی ترکیبیں، لسانی الجھنیں، انوکھی تشبیہیں، اشارے ان سب کا امتزاج ان کے افسانوں کو جاندار بنا دیتا ہے۔ افسانہ نگار عورتوں میں مجھ کو بہت سی صدیقہ بیگم سیوہاروی بھی پسند ہیں۔ ان میں ترقی پسند رجحانات زیادہ پائے جاتے ہیں اور پھر ان کے افسانوں میں ایک ایسا ماحول ملتا ہے جس کی عکاسی بہت کم کی گئی ہے۔ وہ ہے حیدرآباد کا ماحول۔ کیونکہ ہمارے اُردو افسانے میں ہندوستان کے ہر صوبے اور دیہات کی تصویریں جھلکتی دکھائی نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانے ایک ایسی لڑکی کے گرد گھومتے ہیں جو ہر روز بیاں کرنا چاہتی ہے

لیکن پردہ کی وجہ سے مجبور ہے اس کے جذبات سینے میں ہی دفن ہوجاتے ہیں اور کہیں وہ اپنے افسانوں میں اس پردہ نشین لڑکی کے جذبات دکھلاتی ہیں جس کی شادی ہونے والی ہوتی ہے تو اپنے شوہر کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہوجاتی ہے۔ ان کی تحریر میں ہم آہنگی اور تنوع ہے تشبیہوں استعاروں کی بھی جدّتیں خوب ہوا کرتی ہیں۔

جہاں بانو بھی ایک اچھی ادیبہ ہیں، ان کے افسانے، مضامین کافی رنگین، دلچسپ اور معلومات افزا ہوتے ہیں۔ اب ایک اور جنوبی ہند کی ترقی پسند افسانہ نگار ممتاز شیریں ہیں جن کے افسانے ساقی، نیا دور، عالمگیر، ادب لطیف میں شائع ہوا کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد افسانہ نگار عورتوں میں واجدہ تبسم، عفت موہانی اور جیلانی بانو نے خوب نام کمایا۔ عفت موہانی کا قلم آج کل خاموش ہے۔ ایک زمانے میں ان کے افسانے دہلی سے شائع ہونے والے باتصویر ہفتہ وار "ہمت" میں چھپا کرتے تھے۔ ہمت ہی کے ذریعہ وہ ادبی دنیا سے متعارف ہوئیں پھر ہندوستان بھر میں ان کی شہرت ہوئی مگر اب نہ جانے کیوں ان کے افسانے دیکھنے کو نہیں ملتے۔ واجدہ تبسم اور جیلانی بانو کی مانگ ابھی تک بہت ہے اور خیال یہ ہے کہ آزادی کے بعد کی افسانہ نگار عورتوں میں ان دونوں کا نام سرِ فہرست ہی رہے گا۔

★★

اُردو کی پہلی ہندو صاحبِ دیوان شاعرہ

راج کماری سورج کلا سرور مدھیہ پردیش اسمبلی کی ممبر رہ چکی ہیں۔ ان کے والد معتمد السلطان راجہ سرا ودھ نرائن بسریا ریاست بھوپال کے وزیر اعظم تھے۔

گھریلو ماحول میں فارسی اور اردو کی فضا نے ان کے دل میں اس زبان سے ایسی والہانہ عقیدت پیدا کر دی تھی جس کا مظاہرہ ان کے یہ دو اشعار کر سکتے ہیں ؎

دل میں تمنا ہمارے پنہاں ہے رازِ اُردو
مجھ سے قضا نہ ہوگی ہرگز نمازِ اُردو
ہیں وجد میں فضائیں رقصاں ہیں چاند تارے
سرور نے کس ادا سے چھیڑا ہے سازِ اردو

شاعری کا شوق سرور کو بچپن سے ہے۔ بھوپال کی فضا نے اس میں مساعدت کی، کیونکہ سرزمین بھوپال شعرا کا مسکن تھا۔ ایسے ماحول سے بھلا کیوں نہ متاثر ہوتیں۔ بہر حال ۹ سال کی عمر میں سرور نے پہلا شعر کہا۔ انہوں نے عرصہ تک اپنے چچا رائے بہادر بیج نرائن وزیر اعظم ریاست جندھ سے جو ناظم تخلص فرماتے تھے اصلاح لی۔ شاعری ان کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ سرور کا کلام "حریم ناز" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

★

میر ناصر علی

۱۸۴۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کالج میں تعلیم پائی میر ناصر علی ان ادیبوں میں سے تھے جو صرف ادارت اور مضمون نگاری کے سبب نامور ہوئے۔ زبان و ادب کا فطری ذوق رکھتے تھے۔ کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن اپنے رسالہ "صلائے عام" کے ذریعے جو دہلی سے ۱۹۰۸ء میں جاری کیا تھا۔ صحیح زبان، دلکش اسلوب اور پاکیزہ خیالات کے نمونے پیش کئے ہیں۔ ادبی دنیا میں ان کے مقالات کی بڑی دھوم تھی۔ میر صاحب شاعر نہ تھے لیکن نثر میں شاعری کرتے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں انتقال کیا۔

سرزمین بھوپال کا اپنی ادب نوازی میں منفرد مقام ہے۔ یہ وہی خطہ ہے جس نے ادب کی خدمت میں اپنے اور بیگانے میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا جس سطح پر عظیم فنکاروں، شاعروں، مدبّروں اور ادیبوں کو یہاں سے خراج تحسین اور خراج وقار ادا کیا گیا وہ آپ اپنی مثال ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے یہیں غالب کا نسخہ حمیدیہ مرتب کرکے اسکے دیباچے کو خونِ جگر سے تحریر کیا۔ علامہ سید سلیمان، سر راس مسعود کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔ جگر مرادآبادی اور ڈاکٹر اقبال کو ماہانہ نذرانے کی صورت میں خطیر رقوم پیش کی گئیں۔ نواب صدیق حسن خاں کو تاجِ سلطنت پیش کیا گیا۔ نواب ممدوح نے اسی سرزمین پر تین سو کتابوں کی تصنیف و تالیف کی۔ آج بھی ان کی بیشتر عربی کتابوں کے ایڈیشن عرب ممالک سے شائع ہوئے ہیں نواب شاہ جہاں بیگم تاجدار ریاست بھوپال نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انہیں رشتہ ازدواج میں منسلک کر لیا۔ یہ وہ دور تھا جب گھر گھر ادب کی شمعیں فروزاں ہو رہی تھیں۔ بیگم اور نواب دونوں ہی شاعر تھے۔ ان کے ذوق نے پورے بھوپال کی فضا کو ادبی خوشبوؤں سے معطر و معنبر کر دیا۔ دربار میں نواب صدیق حسن خاں کے اردگرد اہل علم و ارباب کمال جمع رہتے۔ اندرون محل نواب شاہ جہاں بیگم نے ادبی محفلوں میں جان ڈال رکھی تھی۔ محل میں لال قلعہ کیطرح مشاعرے ہوا کرتے تھے اور خواتین شعراء میں نوک جھونک بھی رہا کرتی تھی۔ نواب ممدوحہ اردو کی پہلی حکمراں صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔

بھوپال اس خصوصیت کے علاوہ دو تین باتوں کی وجہ سے اور بھی ممتاز حیثیت رکھتا ہے ۱۸۱۹ء سے لے کر ۱۹۲۶ء تک جملہ اقتدار مسلسل بیگمات کے ہاتھوں میں رہا نواب گوہر بیگم قدسیہ، نواب سکندر بیگم، نواب شاہ جہاں بیگم اور پھر آخری تاجدار نواب محمد حمید اللہ خاں کی والدہ نواب سلطان جہاں بیگم — نواب ممدوح کو ایوان روسائے ہند نے تین مرتبہ اپنا چانسلر مقرر کیا۔ جتنی صاحبِ دیوان شاعرات نے اس زمین پر جنم لیا کہیں اور اس کی مثال نہیں ملتی۔ سب سے بڑا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ یہیں سے اردو کی پہلی ہندو شاعرہ نے ادب میں ایک دیوان "حریم ناز" کا اضافہ کیا۔ نواب شاہ جہاں بیگم کے دور میں ذوق شاعری کمال کو پہنچ چکا تھا۔ ان کے دور میں کم و بیش سو ڈیڑھ سو خواتین شاعرہ تھیں۔ خود نواب شاہجہاں بیگم صاحب دیوان تھیں۔ جن کا آغاز شاعری میں شیریں اور بعد میں تاجور تخلص تھا — رام بابو سکسینہ نے (تاریخ ادب اردو صفحہ ۴۱۰ پر) انکی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ نواب ممدوحہ کے علاوہ بھوپال کی دیگر نامور شاعرات میں چند ایک یہ ہیں — فرخندہ بیگم، اختر جہاں حیدرآبادی، امیر علی کو توال جاورہ اسٹیٹ کی صاحبزادیاں سکندر بیگم ضیا اور —

نواب سلطان جہاں بیگم حیا

سلطان جہاں بیگم حیاؔ، مولوی فتح علی خاں حیدرآبادی کی صاحبزادی کلثوم بی ممتازؔ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کی دو صاحبزادیاں منور جہاں بیگم مسرتؔ اور عشرت جہاں بیگم ثروتؔ۔ آمنہ بیگم آمنہؔ، عشرت جہاں عشرتؔ، کلثوم بی تمنم ام المجاہدین پروینؔ وغیرہ (خم خانۂ جاوید جلد اوّل صفحہ ۶۲ اور جواہر خانہ اشہری صفحہ ۵)

ان خاتون شعرا میں نواب شاہ جہاں بیگم کا دیوان اول "دیوانِ شیریں" اور دوسرا تاج الکلام کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کے علاوہ بیگم صاحبہ کی ایک مطبوعہ مثنوی "صدق البیان" فن شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کے کلام میں روانی، سلاست اور فنکاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ ■

نواب سلطان جہاں کے صاحبزادے ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خاں (علیگ) مرحوم

ضیا کیا مدعی سمجھے سخن اپنا ہے ذو معنی
نئے انداز ہیں اس میں نئے پہلو نکلتے ہیں

مذکورہ بالا خواتین شعراء کے علاوہ جو نواب گوہر بیگم قدسیہ سے لے کر نواب سلطان جہاں کے دور میں افق ادب پر نمودار ہوئیں۔ نواب حمید اللہ خاں بھوپال کے آخری فرمانروا کے دور میں فاطمہ قیصری ریحانہ اور راج کماری سورج کلا سرور کو صاحب دیوان ہونے کا فخر حاصل ہے بھوپال کی جملہ صاحب دیوان شاعرات میں انکی خاندان سے وابستگی قدر مشترک ہے۔

فاطمہ قیصری ریحانہ حمایت علی خاں چیف انجینئر کی صاحبزادی نے انٹر تک تعلیم حاصل کی۔ انکی ایک بہن مولانا ابوالکلام آزاد کے نواسے باقر حسین صاحب سے

منسوب ہیں جو آزاد بھون میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ یہ ممتاز خاتون غیر معمولی ذہانت اور صلاحیتوں کی مالک ہونے کے علاوہ خدا رسیدہ بزرگ تھیں۔ ان کا دیوان "تحفۂ دل" غزلیات، قطعات، رباعیات اور منظومات پر مشتمل ہے۔ سختی سے پردہ نشین اور خدا رسیدہ بزرگ ہونے کی وجہ سے انہوں نے فنِ شاعری میں کسی سے بھی مشورہ نہیں لیا۔ "تحفۂ دل" حقیقت اور معرفت کی معنی آفرینیوں کا گلدستہ اور پاکیزگیٔ فکر کا شاہکار ہے۔ ریحانہ صاحبہ کی ادارت میں ماہنامہ "نور" بھی شائع ہوا جس کا حلقۂ اشاعت زیادہ تر عقیدت مندوں تک محدود تھا۔ "تحفۂ دل" سے کچھ تحفے قارئین کی نذر ہیں ؎

ہے تجھ سے محبت یہی کافی ہے تسلی
یکساں ہے مجھے بخششِ غم ہے کہ نہیں ہے

انوارِ صمدیت واں تو یہاں ذات کے جلوے
اے شیخ یہ دل رشکِ حرم ہے کہ نہیں ہے

جس نے دیکھا اسی کو دیکھا ہے ÷ مٹ گیا عبد رہ گیا معبود
ماسوا پر نظر نہیں پڑتی ÷ ہے غمِ ہجرِ دوست بھی مسعود
کوئی نیّر کے دل کو کیا سمجھے ÷ گاہ شاہد ہے گاہ ہے مشہود

راجکماری سورج کلا سہائے سرور بھوپال کے آخری تاجدار نواب حمید اللہ کے وزیرِ اعظم معتمد السلطان راجہ سر اودھ نرائن بسریا مرحوم کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ہیں۔ سرور صاحبہ نے مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایک زمانہ میں مدھیہ پردیش اسمبلی کی ممبر رہیں۔ آجکل الٰہ آباد میں مقیم ہیں۔ موصوفہ کا مجموعۂ کلام "حریمِ ناز" شائع ہو کر اردو کے ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکا ہے۔ "حریمِ ناز" کا تعارف فراق گورکھپوری نے تحریر کیا ہے۔ محترمہ سرور کو اردو کی سب سے پہلی ہندو شاعرہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔

راجکماری کا تعلق ایسے خاندان سے تھا جو اردو اور فارسی کا دلدادہ اور قدر دان کہلائے جانے کا بجا طور پر مستحق ہے۔ ان کے چچا رائے بہادر برج نرائن ناظم وزیرِ اعظم ریاست جند خود فارسی اور اردو کے عالم تھے اور اپنے دور کے مشہور شاعروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ راجکماری نے بزمِ ریاضِ ادب کے مشاعروں میں جو ۶ ستمبر ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء کو الٰہ آباد، پٹنہ اور لکھنؤ سے بیک وقت نشر ہوئے شرکت فرما کر داد و تحسین حاصل کی۔ بزمِ ادب سیتاپور کے منعقد کردہ مشاعرے میں بھی انکی شرکت کا علم "منتخب گلدستہ مشاعرہ" مولفہ نادر رحمانی سے ہوتا ہے۔ اس گلدستہ پر مدیر ماہنامہ مشاعرہ نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اس کتابچہ میں محترمہ سرور بھوپالی کی ایک مختصر سی بے تکلفی کا آئینہ دار ہے ؎

صورت تمہاری آئینۂ دل پہ ہے عیاں
پردہ میں تم نے منہ کو چھپایا تو کیا ہوا

ایک اور شعر میں محبوب پر طنز کرتے ہوئے فرماتی ہیں ؎

پاس بیٹھے ہیں عدو، دور کھڑے ہیں عاشق
یہی شاید تری محفل کا قرینہ ہوگا

اسی دور کی ایک اور بھوپالی خاتون شاعرہ حسن آرا بیگم تمکین نواب یار محمد خاں شوکت کی بیگم تھیں۔ کلامِ تمکین کے نام سے ان کی تین کتابیں مطبع حسینی کانپور سے طبع ہوئیں۔ اس صاحبِ کمال شاعرہ کے بارے میں یہ انکشاف حیرت انگیز ہے کہ وہ گرجستان کی رہنے والی تھیں۔ نواب سکندر بیگم کے ساتھ مکہ معظمہ سے بھوپال چلی آئیں اور محل کے ماحول سے متاثر ہو کر اردو زبان پر دسترس حاصل کی۔ آج سے ۳۲ سال قبل بھوپال میں وفات پائی۔ روزمرہ میں ان کا ایک شعر انکے اردو زبان پر قادر ہونے کا واضح ثبوت ہے ؎

آنکھیں جو چار ہو گئیں کل ان سے راہ میں
صبر و قرار لے گئے اک ہی نگاہ میں

اسی غزل کے دو شعر اور لائق ستائش ہیں ؎

ذرات کائنات میں آئینہ جمال
کیا کیجیے جو نور ہے اپنی نگاہ میں

اے مست خوش خرام ذرا دیکھ بھال کے
آنکھیں بچھی ہوئی ہیں تری شاہراہ میں

منور جہاں بیگم مسرت اور مشرف جہاں بیگم ثروت دونوں مشہور شاعر نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تلمیذ مومن اور غالب کی صاحبزادیاں علی الترتیب بھوپال کے نواب عالمگیر محمد خاں مجو اور نواب صدر محمد خاں کی بیگمات تھیں۔ دونوں امیر مینائی کی شاگرد تھیں اور نواب شاہجہاں بیگم کی مقرب خاص۔ دونوں صاحب دیوان تھیں جن کا کلام زیور طباعت سے آراستہ تھا۔ نمونہ کلام سے ان کی قادر الکلامی اور شاعرانہ صلاحیتوں کا ثبوت ملتا ہے ؎

چلتے ہیں کس ادا سے وہ انداز دیکھنا
معجز نمائی نگہ ناز دیکھنا

تو سخت گیر ہے کہ مسرت ہے سخت جاں
اب ہم کو ہے یہ غمزۂ غماز دیکھنا

حال کیا پوچھتے ہو فرقت کا
ایک ہنگامہ تھا قیامت کا

خواب میں اب نظر وہ آئے مگر
خوب جاگا نصیب ثروت کا

کلثوم بی ممتاز کا دیوان بھی مطبع حسینی کان پور میں طبع ہوا۔ یہ اس دور کی ممتاز شاعرہ تھیں۔ نمونہ کلام سے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ؎

ستم سا ستم ہے جفا سی جفا ہے
مرا شکر بھی واں گلا ہو گیا

لہو سے شہیدوں کے کوچہ ترا
تماشا گہہ کربلا ہو گیا

سکندر بیگم ضیا، امیر علی کوتوال ریاست جاورہ کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے بھائی مولوی نظام الدین تاب وزیر مال تھے۔ کلام میں پختہ کاری اور کہنہ مشقی کے نمونے ملتے ہیں۔ فدا علی فارغ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ضیا کا دیوان شائع ہو کر مقبول عام ہوا ؎

تماشائی تمہارے حسن کے ہر سو نکلتے ہیں
حرم میں اہل ایماں، دیر میں ہندو نکلتے ہیں

غزل بھی، جو حاصل مشاعرہ کہی جا سکتی ہے۔ روانی، چستی، بندش زبان، سلاست اور فصاحت کو قطع نظر کر کے مغز اور حاصل پر اگر نظر کی جائے تو بے بہا سرمایۂ سخن ہاتھ آتا ہے'' ؎

نگاہ شوق کیا جانے کہ ارمانوں پہ کیا گزری
خبر کیا ہوش والوں کو کہ دیوانوں پہ کیا گزری

جنوں کو خود نہیں معلوم اپنی کارفرمائی
ہوا کیا آستینوں کو، گریبانوں پہ کیا گزری

چلی ایسی ہوا سرور، اڑا رنگ آدمیت کا
یہ انساں ہی سمجھتا ہے کہ انسانوں پہ کیا گزری

ناخدا کی نیتیں جذبات کی توہین تھیں
چھوڑ کر کشتی کو خود ٹکرا گئے ساحل سے ہم

عشق میں سرور نہیں ملتا ہے کوئی رہنما
راستہ پوچھیں کسی گم کردۂ منزل سے ہم

مولانا غلام قادر مرحوم گرامی ملک الشعراء دربار نظام دکن

ڈاکٹر زور (سید محی الدین قادری) :۔ حیدرآباد کی دنیا کے پہلے ادبی ڈاکٹر ــــ آپ کے نام سے کون واقف نہیں ــــ طالب علمی کے زمانے ہی سے آپ نے تصنیف وتالیف شروع کردی تھی۔ اردو زبان جب پر تول رہی تھی آپ نے اس کا اندازِ قد پہچان لیا تھا، اور اس میں تحقیقی و تنقیدی نظریں پیدا کر دی تھیں۔ دکنی زبان کی بڑی کھوج محترم نے کی ہے۔ آپ کی کئی

حیدرآباد کا ایک دور

• قطب النساء ہاشمی
تلخیص ثروت صدیقی

(یہ مضمون آج سے بیس سال پہلے لکھا گیا)

تصانیف وتالیفات ہیں جن کا آج فنِ تنقید میں بھی ایک نمایاں مقام ہے۔ اردو زبان کی حفاظت واشاعت ان کی زندگی کا مقصدِ عظیم ہے۔

"چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو"

اس مسلک پر محترم کی نظریں گڑی ہیں اور اردو دوستوں کو اس مسلک کے تحت بڑا سہارا دیتے رہے ہیں۔

فضل الرحمٰن :۔ میں نے پہلی مرتبہ آپ کو نظامت تعلیمات کی کرسی پر دیکھا تھا۔ مدرسہ عالیہ سے ایک میگزین کی ادارت واجازت کے سلسلے میں گئی تھی۔ مجھے اجازت بھی مل گئی اور میگزین کا ایک کچا خاکہ بھی! ان کی شخصیت کی ہمہ گیر قابلیت اور صلاحیت ہم سب سے پوشیدہ نہیں کئی محکموں کی نظامت کر کے محترم نے ہمہ گیر صلاحیت کا ثبوت دیا ہے لیکن ہر جگہ علمی ذوق وادب کے بھی پرستار رہے۔ آپ ایک فطری شاعر ہیں۔ چاندنی رات میں یا صبح صبح کوئی آپ کو بنجارہ ہل کی پہاڑیوں اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے دیکھ کر فوراً یہ اندازہ کر لیتا ہے کہ حسنِ فطرت کے آپ کتنے پرستار ہیں۔ کئی نظمیں اس کی گواہ ہیں۔ پاکیزہ نثر اور ٹھوس ڈراموں نے آپ کو دنیائے ادب میں ممتاز و بلند کر دیا ہے۔ بھرپور زندگی نے ادبی کام کے لیے کافی وقت دے رکھا ہے۔ اطمینان کی زندگی، غلط چیزوں سے انحراف وخاموشی لیکن موقع محل سے ان پر بے باکانہ اظہار جو ایک خاص سلیقہ ونفاست سے کیا جاتا ہے، انسانی محبت کے تقاضے کو ظاہر کرتا ہے۔

رائے جانکی پرشاد :۔ ایک یونانی فلاسفر کے لیے مشہور ہے کہ دن کے اُجالے میں ہاتھ میں چراغ لیے گلیوں میں گھس جاتا تھا۔ لوگوں نے اس دیوانگی کا سبب پوچھا تو کہنے لگا "انسان کو تلاش کرتا ہوں"۔ کیا تعجب ہے انسانوں کی اس بھری دنیا میں اسے ایک انسان نہیں مل

(کھڑے ہوئے) بلونت سنگھ، جگن ناتھ آزاد۔ ساحر لدھیانوی۔
(کرسیوں پر بیٹھے ہوئے) بسمل سعیدی۔ جوش ملیح آبادی۔ جاں نثار اختر دیوندر ستیارتھی۔ مجاز لکھنوی
(فرش پر) عرش ملسیانی
(ایک یادگار تصویر)

سکتا تھا۔ یہ بالکل سچ ہے۔ حقیقی معنوں میں انسان ملنا بہت مشکل ہے لیکن یہ دنیا انسانوں سے خالی بھی نہیں۔ انسان مل سکیں گے لیکن ان کی تعداد انگلیوں پر ہوگی۔

رائے جانکی پرشاد اوپر کے نظریہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی خاموش انسانی خدمتیں بہت سی ایسی ہیں جو منظر عام پر نہ آسکیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے اظہار سے انسانی خدمت کا جذبہ متاثر ہوتا تھا۔ رواداری اور خدمت انسانی نے انہیں ایک بڑا انسان بنا دیا ہے۔

عالم، صحافت پر عبور رکھنے والے، اُردو زبان کے شیدائی، انگریزی کا بلند مطالعہ کرنے والے، خاموش خدمتگار، کام کے قدردان اور انسان شناس ــــ اس بڑے انسان پر اتنا لکھنا کافی ہے۔

جہاں بانو :۔ محترمہ "بانو" حیدرآباد کے تمام علمی حلقوں میں "بانو آپا" کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ ملنے کے بعد دوبارہ کی خواہش باقی رہتی ہے۔ بات سوچ کر اور تول کر کرتی ہیں۔ آواز دھیمی مگر رسیلی، جملے مختصر مگر دل میں کھب جانے والے موزوں اور برمحل شعر گفتگو میں جان ڈالدیتے ہیں۔ باتوں باتوں میں بہت سی باتیں سکھلا جاتی ہیں۔ بے محل اور بے ڈھب چیزوں پر طنز ضرور کرتی ہیں۔ اچھائی اور برائی میں ایک قدم ہی کا تو فاصلہ ہے۔ ایک قدم آگے بڑھاؤ یا پیچھے ہٹاؤ، اچھائی برائی یا برائی اچھائی بن جاتی ہے۔ ان کے دل میں انسانیت کا درد رچا ہوا ہے، جیسے ایک آبلہ جسے ٹھیس کی بھی ضرورت نہیں۔ صرف بادِ مخالف کا ایک سرسری جھونکا اس میں ٹیس پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے کسی کو دکھ میں دیکھ نہیں سکتیں۔

محترمہ کئی تصانیف کی مالک ہیں۔ محمد حسین آزاد، رفتارِ خیال، بربطِ ناہید، فتراک وغیرہ۔ ایک عرصہ تک اُردو انجمن کی صدارت اور کئی رسالوں کی ادارت کر چکی ہیں ــــ خوش پوش، نفاست پسند، ذوقِ سلیم کی مالک۔

سکندر علی وجد :۔ وجد کی شاعری وجدان کی دنیا ہے۔ فن پختہ اور اس پر ناز بھی۔ اپنے آپ پر اعتماد اور فن سے واقفیت نے انہیں بہت قیمتی بنا دیا تھا، ان

محی الدین
قادری
زور

کے اشعار میں عظمتِ رفتہ کی یاد بہت گہری ہے ان کو اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر ناز و تفاخر ہے لیکن اپنے آپ پر بھی کچھ کم نہیں۔ درد اور تڑپ کے ساتھ گھدار آواز طرزِ کلام میں موسیقی جو محفل کو سکتہ کی حالت میں تبدیل کر دیتی تھی۔

دبلی پتلی شخصیت، گورا رنگ، چھریرا بدن آنکھیں علم و شعور سے متلاطم اور اس پر جامہ زیبی اور انکی شخصیت کے ظاہری رعب داب۔

بلند اخلاق، دوستوں کے اچھے رفیق، سوسائٹی کے نمایاں نمائندہ، دل سوز شاعر، حیدرآباد کی علمی فضا میں ان کا خاص اور بلند مقام ہے۔ اس لیے آج بھی دل چاہتا ہے کہ ان کی کوئی تازہ غزل یا نظم ان ہی کی آواز میں سنوں اور جھوم جاؤں۔

نصیرالدین ہاشمی:۔ دکن میں اردو کے مصنف اپنی شہرت کے آپ مالک جب سے انہوں نے قلم اٹھایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ رکھنے کی قسم کھائی ہے سیتی ہوں اب بھی روزانہ بلاناغہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں وہ عملی انسان ہیں۔ خیال و عمل میں بہت کم بعد رکھتے ہیں۔ ادھر کسی چیز کا خیال آیا اُدھر کام شروع ہو گیا یہی وجہ ہے کہ چوبیس پچیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں۔

دبلے پتلے انسان دیکھنے میں ناتواں مگر ارادے کے پکے۔

حیدرآباد کی تمام ریسرچ خواتین ان کی کتابوں سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔

آپ نے پہلے کتب خانہ آصفیہ کی قلمی کتابوں کی تفصیلی فہرست کا صبر آزما کام اپنے عجلتی انداز میں ختم کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ کتب خانہ سالار جنگ کی قلمی کتابوں کی فہرست بھی ترتیب دی۔ بہ حیثیت مورخ و محقق آپ نے ہند و پاکستان میں اپنا نام دائیں جانب لکھوایا ہے۔

زینت ساجدہ:۔ زینت ساجدہ نے ایک ناتواں جسم اور قوی دماغ سے دنیائے علم و ادب میں قدم رکھا۔ جب وہ ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں جب ہی سے ان کی ادبیت نمایاں تھی۔ محنتی کم ذہین زیادہ۔ خاموش رہنے والی لیکن بہت سوچنے والی — وسیع زاویۂ نظر اور گہرا مشاہدہ — اپنی اس سوچ اور گہرائی میں ایک خاص رچاؤ۔ اپنی کمزوری صحت کے باوجود اکثر جماعت میں اول رہا کرتی تھیں۔

ان کی ادبی زندگی کالج میں چمکی۔ دادا کی تربیت نے ان کی خوبیوں کو اُجاگر کیا۔ آنکھیں کھلیں اور آگے بڑھتی گئیں۔ آگے اور بہت آگے — آج ترقی پسندوں کی صف میں خاص درجہ رکھتی ہیں۔

کامیاب افسانہ نگار، سیدھا سادا طرز، دلچسپ اور صحیح زاویۂ نگاہ اسی لیے ان کی پہلی کتاب "جلترنگ" اب تک بہت سی خوش آیند امیدوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔

سید محمد صاحب:۔ سید محمد صاحب بڑے خاموش آدمی ہیں۔ ان کا شعار علمی خدمت اور کتابوں سے محبت

ہے۔ میں سید صاحب کو بہت نزدیک سے بھی دیکھتی ہوں۔ یونیورسٹی سے کبھی فرصت ملی کہ بازار جاکر اچھی اچھی کتابیں خرید لائے۔ حیدرآباد میں شاید ہی اتنی زبردست "خانہ لائبریری" ملے گی جتنی سید صاحب کے پاس ہے۔ پھر حسنِ سلیقہ و صفائی کا یہ عالم کہ لائبریری میں خاموش و پاکیزہ علمی لہر مل جائے گی۔ کتابوں سے آپ کو بہت محبت ہے۔ بڑی احتیاط اور دل دہی سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔

مرزا عصمت اللہ بیگ مرحوم :۔ میرا مضمون ادھر ختم ہوا اور اُدھر معلوم ہوا کہ مرحوم اس چلتی پھرتی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آہ کیا ہستی تھی۔ ان کے بات کرنے کا انداز، شعر پڑھنے کا انداز، نثر لکھنے کا سلیقہ ـــــ کوئی سنجیدہ علمی محفل ان کے بغیر سونی ہو جاتی تھی۔ وہ ہر مجلس کے روحِ رواں تھے۔

علمی ادبی محفلیں عوام کو زیادہ دیر تک دماغی کاوشوں میں پھنسائے رکھنے میں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ سنجیدہ سے سنجیدہ صاحبِ فکر بھی اس الجھن سے گھبرا جاتے ہیں اور کچھ تنوع تلاش کرتے ہیں۔ جہاں مجلس پر یہ حالت طاری ہوئی اور صدرِ مجلس نے مرزا صاحب کو کھڑا کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے محفل کا رنگ بدل گیا۔ ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور ہر شخص ہنستا ہنستا پایا گیا۔ وہ گرما گرمی ا و ر مرحوم کی وہ خاص لَے اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

مرحوم ظریف ادب کے مردِ میدان تھے آج حیدرآباد میں ان کا کوئی بدل نہ مل سکے گا۔ میں نے ان کو قریب سے بھی دیکھا اور دور سے بھی۔ ہر وقت میں یہی سوچتی رہی کہ یہ قدرت کا کتنا زبردست شاہکار ہیں۔

اُردو دانی کا شوق، سلیقہ سے انگریزی الفاظ کی کھپت، بات میں بات پیدا کرنے کا انداز، پاکیزہ اور دھیمی

مشہور مؤرخ نصیر الدین ہاشمی

ظرافت جس کا اثر عوام اور خواص دونوں پر ہوتا تھا۔ مرزا صاحب کو مصوری و نقاشی سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ میں یہاں ان کی شخصیت کی ایک عام جھلک دکھانے کی کوشش کروں گی۔ اگر ان کے علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ لوں تو ایک کتاب بن جائے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اکبر کا ایک جانشین غلط چیزوں کی خبر لے رہا ہے لیکن اکبر کی طرح کھلم کھلا وقت سے انحراف کرنے کے عادی نہیں تھے۔ بلکہ حسن طلب کا رنگ ہی اور رہتا۔ وہ وقت کے تقاضوں کا ساتھ پوری قوت سے دیتے تھے اور اپنی ظرافت کے باریک تاروں سے بڑی بڑی گتھیوں کی گرہ کھول کر رکھ دیتے تھے۔ ان کی

غلام ربانی تاباں، مخمور جالندھری، ہنسراج رہبر پرکاش، پنڈت اختر انصاری ★

کوئی نظم باتر اٹھا تیے۔ اس میں دہ حال سے باخبر ماحول سے بے چیں اور صداقت کی تلاش میں ملیں گے۔

ان کو ایک نظر دیکھتے ہی سے محسوس ہوتا تھا کہ اس تحص میں کوئی خاص بات ہے۔ الفاظ اس کے اظہار کی قوت نہیں رکھتے۔ کوئی نرالی اور انوکھی بات جو عام انسانوں میں نہیں ملتی۔ گویا وہ اس دنیا کو ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

ع بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ان کی متلاشی آنکھیں دیکھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتی تھیں۔ ہنستے کم تھے، ہنسلاتے زیادہ تھے۔ آخر دنوں میں ایک میگزین "تماشا" کے نام سے جاری کیا تھا۔ خود ادارت کرتے تھے۔ تماشے کے تمام صفحات انداز تمسخر میں سچی باتوں سے بھرے ملتے ہیں۔

بشیر النساء بیگم بشیرؔ:۔ آپ دکن کی وہ واحد شاعرہ ہیں جن پر طبقۂ اناث کو ناز و فخر ہے۔ میں جب ان کے اشعار انہی سے سنتی تھی تو سر دُھنتی رہ جاتی تھی۔ شعر ایسے فطری پاکیزہ جیسے موتی ڈھل رہے ہیں۔ جذب و تاثیر میں ڈوبے ہوئے الفاظ پر پوری قدرت کی شان لیے ہوئے لہجہ میں انفرادیت اور بانکپن، تخیل اونچا اور منجھا ہوا، سچ تو یہ ہے کہ یہ شاعرہ بنی نہیں، پیدا ہوئی ہیں۔

یوں عام طور پر محترمہ شاعرہ معلوم نہیں ہوتیں۔ سج دھج سے ایسا لگتا ہے کہ ایک مکمل کامیاب گھریلو خاتون ہیں۔ اجنبی انہیں شاعرہ نہ کہے گا لیکن کسی محفل میں انہوں نے اپنے اشعار پیش کیے اور سب کی نگاہیں معنی خیز طور پر محترمہ کی طرف جھک گئیں اور محترمہ نے ازراہِ انکساری سر جھکا لیا۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ سچائی ملے گی، آرزو بھرا دل ملے گا، سکون کی تلاش ملے گی، جذب و اثر کا یہ عالم رہے گا کہ بات دل سے نکل کر دلوں میں سما جائیگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی گوشہ سے دکھ درد کی آواز آئی اور محترمہ نے اسے شعر میں سمو لیا۔ انسانیت کے خادم کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ دکھ درد سے دور نہیں رہتا، بلکہ اس میں ڈوب کر اُبھرتا ہے۔ وہی کامیاب

پروفیسر ہیرالال چوپڑہ۔ مخمور دہلوی۔
جوش ملیح آبادی۔ جگن ناتھ
آزاد۔ فراق گورکھپوری۔
سرور تونسوی
(ایک مشاعرہ)

شاعرہ ہے جو سراپا دکھی ہے۔ زمانہ کے نشیب وفراز پر ایک خاص نظر اور اتار چڑھاؤ کے مرحلوں نے انھیں کہنہ مشق شاعرہ بنا دیا ہے۔ ان کا فن پختہ ہے جس کا اعتراف بھی کرتی ہیں ؎

تجھ پہ کیا خاک اے رئیس ہوتا
ہم نہ ہوتے تو کچھ نہیں ہوتا

رفیعہ سلطانہ:۔ رفیعہ سلطانہ سے گفتگو کیجئے۔ دھیما انداز اور شیریں بیانی آپ کو ان کے قریب کر دے گی۔ گویا موسیقی کی جھلک مل رہی ہے۔ لیکچر دینے کھڑی ہیں تو مجمع کو اس قوت سے متاثر نہ کر سکیں گی۔ علمیت بہت رکھتی ہیں۔ اس کے اظہار میں اکثر ناکام رہ جاتی ہیں۔ مطالعہ وسیع ہے۔ زاویۂ نظر جچا تلا ہے۔ اپنی بات منوانے اور اپنے نظریات عام کرنے کی متمنی رہتی ہیں لیکن خیالات گنجلک اس لیے نظر آتے ہیں کہ وقتِ واحد میں بہت سی باتیں کہہ دینا چاہتی ہیں۔ "کچے دھاگے" اس کی تفسیر ہیں۔ ان کے مضامین مغربی خیالات سے متاثر رہتے ہیں۔ یہ ایک اچھی نشانی ہے لیکن گھر سے زیادہ گھر بردار ہونے والے اثرات دیرپا زندگی نہیں پاتے۔ اطراف واکناف کے وہ مسائل جو اپنے اندر درد بھری آواز رکھتے ہیں، ان پر اگر یہ سوچنے لگیں تو بہت کارآمد چیزیں ان کے ہاتھ سے نکلنے لگیں۔

سلطانہ نے طبیعت بڑی بااخلاق پائی ہے۔ دشمن کی بھی تعریف ایسی کریں گی جیسے قریب کے دوست کی کر رہی ہیں، قناعت پسندی اور بے نیازی نے انہیں اتنا آگے نہیں بڑھایا جتنا وہ بڑھ سکتی تھیں۔ بڑی مہمان نواز اچھی دوست ——— نقصان پہنچانے کا جذبہ ان میں نہ ملے گا ——— سوسائٹی سے واقف ——— فیشن کی دلدادہ ——— لہجہ اور رنگ آبادی جس میں مقامی رنگ اور علمیت کی جھلک ملتی ہے۔ زمانہ سے بھی ایک حد تک بے نیازی برتتی ہیں۔ ایک خاص شخصیت کی مالک ہیں۔ اپنی مثال آپ ہیں۔ حریف کی مدمقابل نہ ہو سکیں گی۔ خاموش اپنے راستہ پر چلتی رہیں گی۔

(ماخوذ از نقوش جنوری ۱۹۵۵ء)

★★

داغ کی محبوبہ منی بائی کلکتہ والی

ادارہ

نواب رام پور کلب علی خاں مرحوم ایک میلہ "میلہ بے نظیر" کے نام سے ہر سال پابندی کے ساتھ منعقد کراتے تھے۔ اس میلہ میں دور دور سے ہزارہا لوگ پابندی سے شرکت کرنے آیا کرتے۔ نواب رامپور خود بھی اس میلے میں جاتے اور داغ دہلوی (جو رامپور میں ان کی ملازمت میں تھے) کو بھی ساتھ لے جاتے۔ ایک سال کلکتہ سے منی بائی حجاب بھی میلے میں شرکت کے لیے پہنچی۔ دل بھی عجیب شے ہے۔ داغ جو حسن سے صرف کھیلا کرتے تھے، حسن کے جال میں ایسے پھنسے کہ عمر بھر وہ دام محبت میں گرفتار رہے۔ ہوا یوں کہ "بے نظیر میلے" میں داغ کی نظریں جب حجاب سے ٹکرائیں تو داغ ہوش و حواس کھو بیٹھے اور حجاب کے دام عشق میں گرفتار ہو گئے۔

چنانچہ ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے ایک مضمون میں اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے کہ "ایک مہینے تک انہوں نے حجاب کو اپنے یہاں رکھا۔ اس کے بعد دوسرے سال بھی حجاب بے نظیر کے میلے کے دنوں میں رام پور آئی اور داغ نے مہمان داری کی لیکن اس بار جب وہ کلکتہ لوٹی تو پھر رام پور نہیں گئی۔ اس کے دوسرے سال (یعنی ۱۸۹۹ء میں) مجبور ہو کر خود داغ عظیم آباد ہو کر کلکتہ حجاب کو دیکھنے گئے۔ وہ کوئی تین چار ماہ تک کلکتہ میں رہے اور وہاں کے مشاعروں میں شرکت کی۔ حجاب نے بھی داغ کی خوب قدر کی اور ان کو اپنے یہاں مہمان رکھا۔ کلکتہ میں داغ کا قیام اور حجاب سے اپنی محبت کا ذکر داغ نے اپنی مثنوی "فریاد داغ" میں کیا ہے۔ کسی شاعر کا سب کلام اس کے دلی جذبات کا نمائندہ نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اشعار ایسے ہوتے ہیں جو شاعر کسی مقصد کے تحت کہتا ہے۔ خاص طور سے قدیم شعرا، جن کا تعلق مختلف نوابوں یا بادشاہوں کے درباروں سے تھا۔ انہوں نے جو قصیدے بادشاہوں، رئیسوں، نوابوں یا حاکموں کی تعریف میں کہے ہیں ان کا مقصد محض ان حاکموں کی تعریف کے پل باندھنا اور اپنے لیے کوئی خطاب، انعام یا اعزاز وغیرہ پانا رہا۔ لہٰذا ایسے قصائد یا اشعار ان شعرا کے دلی جذبات کے آئینہ دار نہیں کیے جا سکتے۔

داغ کا بھی یہی حال ہے۔ انہوں نے نواب رامپور یا نظام حیدرآباد کی خوب تعریف کی ہے لیکن داغ کے کلام کی سادگی، جذبات کی گہرائی، بیان کی ترو تازگی ہمیں مثنوی "فریاد داغ" میں ہی ملتی ہے، کیونکہ اس مثنوی کی بنیاد کسی فرضی واقعہ پر نہیں ہے، بلکہ داغ کی اپنی آپ بیتی ہے۔ اس میں ان کے دل کی دھڑکنیں ہیں، بیتابی عشق ہے اور یہی مثنوی "فریاد داغ" کی ایک بہترین اور کامیاب مثنوی ہونے کی بنیادی وجہ ہے۔ دیکھیے حجاب کو رامپور کے میلے میں دیکھ کر داغ کی حالت کیا ہوئی:

آفتِ جان ناتواں دیکھی
یک بیک مرگ ناگہاں دیکھی
جلوہ دیکھا جو حور طلعت کا
سامنا ہو گیا قیامت کا

دیکھ کر اس پری شمائل کو
رہ گیا تھام تھام کر دل کو
دل کو میں ڈھونڈھتا رہا نہ ملا
آنکھ ملتے ہی پھر پتا نہ ملا
رنگ چہرے سے اڑ گیا کوسوں
دل سے میں، مجھ سے دل جدا کوسوں
آبرو کا لحاظ و پاس کیسے
ہوش میں آؤں یہ حواس کیسے

یار و غم خوار و مونس و ہمدم
کہہ رہے تھے تجھے خدا کی قسم
داغؔ تو ماجرا بیان تو کر
تجھ کو کیا ہو گیا بیان تو کر

اس کے بعد داغؔ اپنے دوست احباب کی پریشانی بیان کرتے ہیں۔ پھر حجابؔ کے اپنے یہاں آنے کا حال۔

دیکھیے کس انداز سے داغؔ نے حجابؔ کا سراپا الفاظ میں کھینچا ہے:

وہ اٹھتی ہوئی نظر آہا
وہ لچکتی ہوئی کمر آہا
نشۂ حسن کی ترنگ غضب
نوجوانی کی ستی امنگ غضب
شوخیاں ہیں حجابؔ میں کیسی
لن ترانی جواب میں کیسی
اُف رے عہدِ شباب کی مستی
بے پیئے ہے شراب کی مستی
ہائے تیرا کلام مستانہ
ہائے تیرا خرام مستانہ
گرتے گرتے کبھی سنبھل جانا
ادھر آنا اُدھر نکل جانا

حسن کی آن بان ہائے غضب
بے نیازی کی شان ہائے غضب
رقص طاؤس بانت سے اچھا
شعر کا لطف داغ سے اچھا
جس طرف اٹھ گئی وہ شوخ نگاہ
شور اٹھا کہ بس خدا کی پناہ

اس کے بعد حجاب کے ساتھ ان کی رنگ رلیاں بیان ہوئی ہیں، حجاب کی مہربانیوں اور عاشق نوازیوں کا ذکر ہے۔ پھر یہ رومان کے دن پورے ہونے کو آتے ہیں حجاب کلکتہ جانے لگتی ہے۔ وہ جانے سے پہلے اپنے دل کا حال یوں کہتی ہے

جی نہیں چاہتا ہے جانے کو
پر چلے ہیں قلق اٹھانے کو
ہم کو کچھ آرزوئے مال نہیں
اس کا واللہ کچھ خیال نہیں
رہے معمور ہے ہمارا شہر
کون سا دوسرا ہے ایسا شہر
ہے حکومت کی شان کلکتہ
سلطنت کا نشان کلکتہ
انتخاب زماں ہے کلکتہ
فخر ہندوستاں ہے کلکتہ
ہم تو بھوکے ہیں آدمیت کے
آدمیت کے ساتھ الفت کے
ایسے دیسوں سے جی نہیں ملتا
داغ سا آدمی نہیں ملتا

یہ داستان عشق خاصی طویل ہے۔ مختصر یہ کہ داغ حجاب سے ملنے کے لیے کلکتہ تک آئے اور حجاب کے مہمان رہے لیکن نواب رام پور کے یاد کرنے پر مجبوراً پھر رامپور چلے گئے۔ رامپور جانے کے بعد داغ کی فرمائش پر حجاب نے اپنی ایک تصویر بھیجی تھی جو صرف بدن کے اوپری نصف حصے کی تھی۔ اس تصویر کے ملنے پر داغ نے سات رباعیاں کہہ کر حجاب کو بھیجیں، جن میں سے ایک یہ ہے۔

اس شکل کی دنیا میں نہیں کوئی نظیر
صورت ہے طبیعت کی طرح شوخ و شریر
اللہ رے حجاب بدگمانی تیری
بھیجی ہے مجھے نصف بدن کی تصویر

ایک اور رباعی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجاب کے ایک ہونٹ پر مسا تھا اور اس مسے کی بدولت داغ کو ایک حسین شعر کہنے کا موقع ہاتھ آیا ؎

تم تو فلک حسن پہ ہو ماہ منیر
سائے کی طرح ساتھ ہے داغ دل گیر
خال لب گل فام ہے شاہد اس کا
بے داغ نہ کھنچ سکی تمہاری تصویر

اگر منی بائی حجاب خود شعر نہ کہتی، تو بھی محض مثنوی "فریاد داغ" کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہتی۔ لیکن حجاب خود بھی ایک اچھی شاعرہ تھی اور بنگال کے نامور شاعر عصمت اللہ انسخ سے ۱۸۷۲ء کے لگ بھگ وہ اصلاح سخن لیتی رہی تھی۔ بقول مولانا عبدالباری آسی ۱۲۹۹ھ میں حجاب عالم شباب پر تھی۔ نمونۂ کلام کے طور پر حجاب کے چند اشعار جو مختلف تذکروں میں ملتے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

ایک دم بھی کسی کروٹ نہیں ملتا آرام
ہائے بے چین ہیں ہم درد جگر سے کیا کیا

ان سے کہہ دو کہ نہیں تم سے یہ امید نہ تھی
وعدہ ہم سے ہوا رہے غیر کے گھر وصل کی رات

حالِ حجاب قابل شرح و بیاں نہیں
آنسو نہ ٹپکے سن کے یہ وہ داستاں نہیں
وہ اور میرے گھر میں چلے آئیں خود بخود
سو پر میرے حجاب مگر آسماں نہیں
رقیب نے اسے رُسوا کیا سرِ محفل
عضب یہ ہے کہ اُس پر بھی شرمسار نہیں

گلستاں میں آج پھر سیرِ یار آنے کو ہے
مژدہ باد اے بلبلو فصلِ بہار آنے کو ہے

دھوم ہے گھر میں ہمارے یار آنے کو ہے حجاب
پھر استقبال لب پر جانِ زار آنے کو ہے

حجاب ایک طوائف تھی لیکن صرف یہ کہہ کر ہم حجاب کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت ہے کہ منی بائی حجاب عرف منجھلی، کلکتہ کی مشہور زمانہ خوش باش تھی وہ محلہ کولوٹولہ میں رہتی تھی لیکن چند طوائفیں ایسی بھی تھیں جن کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم اور بلند مقام حاصل ہے، اور حجاب ان ہی میں سے ایک ہے

★★

اُردو کی وہ پہلی کتاب

جس کی جلدیں شارع عام پر نذرِ آتش کر دی گئیں

• سید حسین احمد زاہری

اُمہات الامت (امت کی مائیں) اردو کی وہ پہلی کتاب ہے جس کی سیکڑوں جلدیں نذر آتش کر دی گئیں۔ یہ کتاب ڈپٹی نذیر احمد کی لکھی ہوئی تھی! اس کے لکھنے کا خاص مقصد اسلام پر اعتراض کرنے والوں کی باتوں کا جواب دینا تھا۔ اگرچہ یہ مقصد صحیح و درست تھا لیکن ڈپٹی نذیر احمد کی بے اعتدالی کی بنا پر اس کتاب میں کچھ ایسے بیانات شامل ہو گئے۔ جن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان پر حرف آتا تھا۔ لہٰذا اس کتاب کے منظر عام پر آتے ہی ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا اور چاروں طرف سے ان پر کفر و بے دینی کا فتویٰ صادر کیا جانے لگا

ڈپٹی نذیر احمد نے دیدہ و دانستہ ایسی غلطی کی تھی یہ کہنا درست نہیں۔ اصل میں ان کی طرز تحریر ہی ایسی تھی ڈپٹی صاحب اصلی دہلوی نہ تھے لیکن مستقل قیام دلی میں ہی کرنا چاہتے تھے اور دلی کی زبان کو اہل زبان کی طرح استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ اسی زبان میں افسانے وغیرہ تحریر کرنے لگے۔ افسانہ کی شروعات زنانہ انداز میں اپنی بچیوں کے لیے کی تھی اور ایک عرصہ تک اسی انداز میں افسانے لکھتے رہے۔ جس کی وجہ سے انہیں ٹھیٹ زبان کی عادت پڑ گئی۔ اس کے بعد وہ ہر تصنیف کے لیے اسی انداز بیان کو استعمال کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے دل سے یہ خیال جاتا رہا کہ ہر موضوع کے لیے ایک ہی انداز بیان مناسب نہیں! اس لیے جب انہوں نے قرآن حکیم کا ترجمہ کیا، مذہبی کتابیں لکھیں اور سیرت و سوانح مرتب کیے تو ان میں بھی وہی عامیانہ الفاظ، محاورے وغیرہ استعمال کیے جن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، بزرگانِ دین اور صحابہ کرام کی شان

ایک تاریخی تصویر چند قدیم ہستیاں (دائیں سے بائیں) ۱۔ مرزا شجاع ۲۔ احسان ۳۔ عبدالعلی آسی ۴۔ امیر اللہ تسلیم ۵۔ میر مہدی مجروح ۶۔ نواب شجاع الدین خاں ۷۔ آغا شاعر ۸۔ مفتون دہلوی ۹۔ فانی ۱۰۔ حسرت موہانی ۱۱۔ آغا ۱۲۔ محمد حمید

میں گستاخی ہوتی تھی۔

غرض اس طرزِ تحریر نے ہر سنجیدہ موضوع کو مضحکہ خیز اور قابل اعتراض کر دیا تھا۔ لیکن اُمہات الامۃ میں انھوں نے بکثرت ایسے محاورے استعمال کئے کہ ان سے بے ادبی صاف جھلکتی تھی جس کے خلاف عوام نے کافی اعتراضات و احتجاجات کیے اور مطالبہ کیا کہ اس کتاب کی تمام جلدیں ان کے حوالے کر دی جائیں تاکہ وہ انہیں تلف کر دیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے پہلے تو کافی پس و پیش کیا لیکن جب علماء نے باضابطہ کفر کا الزام عاید کر دیا تو بحالت مجبوری تمام کتابیں ان لوگوں کے حوالے کر دیں جنہیں کانپور کے جلسۂ علما میں پیش کیا گیا۔ جہاں رات گئے تک اس کے بارے میں بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر کثرت رائے سے یہ بات منظور کی گئی کہ ان تمام کتابوں کو جلا ڈالا جائے۔ چنانچہ آخر کتابوں کو ایک جگہ ڈھیر کیا گیا۔ اور مولوی حبیب الرحمٰن خاں بہادر صاحب نے تیل چھڑک کر انہیں آگ لگا دی! اس طرح ہزاروں روپے کی کتابیں چند لمحوں میں جل کر خاک کا ڈھیر بن گئیں۔

★

آخری تاجدار اودھ کے منظوم خطوط

• سید اقبال عظیم

ہم آخری تاجدار اودھ یعنی سلطان عالم نواب واجد علیخاں اختر کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے زندگی کے دو مختلف اور متضاد دور ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک روشن اور دوسرا تاریک۔ روشن دور کا تعلق اس زمانہ سی ہے جب زندگی کی تمام رنگینیاں سلطان عالم کے قدموں پر سجود تھیں۔ یعنی تخت وتاج دولت و ثروت۔ جاہ وحشمت اور عز ووقار کے ساتھ ساتھ انہیں وہ سب کچھ میسر تھا جو شاہی اقتدار کا حصّہ ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اس لئے کہ رنگ وشباب کے اس دور میں جہاں رقص وسرود اور لہو ولعب کا بازار گرم تھا سلطان عالم نے اپنے فرائض منصبی کی طرف سے بھی آنکھیں بند کرلی تھیں تاکہ زندگی کا ایک واحد لمحہ بھی فکر وبے اطمینانی سے مکدر نہ ہونے پائے یہی وجہ ہے کہ ان کا وہ کلام جو اس دور کی پیداوار ہے شوخ وشاداب تو ضرور ہے لیکن بے اثر اور بے کیف ہے۔ اس میں وہ ہوک نہیں جو دلوں کو تڑپا دے، وہ کسک نہیں جو روح کو بھڑکا دے۔ بقول حالیؔ:-

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو

شعر اسی وقت شعر ہے جب اس میں سوز وگداز ہو، اور اس سوز وگداز کیلئے درکار ہے ایک دردمند حسن ناکامی اور حزن ویاس کی تڑپ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ سلطان عالم کی زندگی جس رنگین ماحول میں سانس لے رہی تھی وہاں ان چیزوں کا ذکر کہاں! نتیجہ لازمی طور پر وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا یعنی ابتداً تا انتہا ان کا وہ کلام جو اس زمانہ سے متعلق ہے پھیکا اور بے مزہ ہے۔

لیکن زمانہ کی گردش کو اپنا کمال دکھانا مقصود تھا۔ وقت کا پانسہ پلٹا اور زندگی نے کروٹ لی۔ اودھ کی وہ پرکیف فضائیں جو گھنگروں کی جھنکار اور شیریں نغموں کی الاپوں سے گونج رہی تھیں یک بیک خاموش اور اداس ہوگئیں یعنی تاجدار اودھ نے ہمیشہ کیلئے تخت وتاج کو خیرباد کہا اور حاکموں کی صف سے نکل کر محکوموں کی صف میں جا کھڑا ہوا۔ دل پر ایسا کاری زخم لگا کہ وہ درد وکرب کی شدت سے چیخ اٹھا اور یہ شعر پڑھتا ہوا با حسرت ویاس اپنے وطن سے رخصت ہوا:-

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

یہ شعر گویا سلطان عالم کے دیوان کا مطلع اول تھا جو ان کی زندگی کے تاریک دور کے ہاتھوں مرتب ہوا۔ اب سلطان عالم شاہ اودھ نہ تھے بلکہ ایک شاعر تھے اور محض ایک

شاعر اس لئے کہ اب ان کے سامنے عالم رنگ و بو کے بجائے
محرومی و ناکامی کا ایک بحر ناپیدا کنار تھا اور ان کے دل میں تڑپ
تھی جو ایک شاعر سے شعر کہلواتی ہے یہی سبب ہے کہ جب ہمارے
سامنے ان کا وہ کلام آتا ہے جو اس دور کی تصنیف ہے تو اکثر
بیشتر ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور ہمارا دل
دھڑکنے لگتا ہے۔

اس سلسلے میں ان کے کلام کا جو حصہ بالخصوص قابل
توجہ ہے وہ سلطان عالم کے وہ منظوم خطوط ہیں جو انھوں نے
عالم غربت میں اپنی محبوب بیگمات کے نام لکھے ہیں۔ چنانچہ
ان کی وہ شہرۂ آفاق مثنوی جس کا خطاب سیتن کی طرف سے ہے
اور جس میں لکھنؤ سے لے کر کلکتہ تک کی دل ہلا دینے والی روداد
غم بیان کی گئی ہے اپنی مثال آپ ہے۔ فن اور بیان کے
لحاظ سے تو خیر اس کی جہاں تک تعریف کی جائے کم ہے لیکن
اس کے ساتھ ساتھ اس میں روانی، سلاست اور فصاحت
اس بلا کی ہے کہ وہ اردو کی کسی اچھی سے اچھی مثنوی سے ٹکر لے
سکتی ہے۔ تلخ حقائق کو شاعر نے تاثرات قلبی میں کچھ اس طرح
حل کیا ہے کہ اسی مثنوی کو ایک ادبی شاہکار تسلیم کرنے ہی بن
پڑتا ہے۔ اگر سلطان عالم تقدیر کے ہاتھوں ایسی گہری چوٹیں نہ
کھاتے تو شاید ان کا یہ کارنامہ کبھی عالم ظہور میں نہ آتا۔ اس خط کی
ابتدا ملاحظہ ہو ؎

اے مری جان مونس و غمخوار
حال لکھتا ہے تیرا اختر زار

دل بھر آتا ہے خدا کی قسم
کیا ہی بیدست و پا ہوئے ہیں ہم

درد سر لب پہ آہ زار و نزار
نے کوئی دوست نے شفیق نہ یار

خوف صحرا و خار حسرت وطن
پھاڑے کھاتا ہے مجھکو سندر بن

جب سے آئے ہیں شہر کلکتے
دامن دل کے ہو گئے لتے

سیتن تیری یاد میں واللہ
کھو گیا رونے روتے نور نگاہ

کبھی آنکھوں سے اشکباری ہے
کبھی یہ شعر لب پہ جاری ہے

اپنے اختر کی لے خبر جانی
کشتی دل ہوئی ہے طوفانی

اس چار کاہ سفر کے دوران نواب کو جن جن مصائب
و مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ان کا دردناک بیان بالتفصیل
اس خط میں منظوم ہے۔ کانپور میں جو مکان انہیں قیام کے لئے
ملا تھا اس کا ذکر خود انہیں کی زبانی سنئے ؎

وہ برنڈاں کا ایک بنگلہ تھا
اپنی ٹوپی سے بھی تھا تنگ سوا

رات دن سب کے دل میں خطرہ جان
پاؤں پھیلے تو پھر عدم کو روان

پانچ پتے کا کہنہ سا چھپر
ساتھ سائے کے دھوپ آٹھ پہر

لو کے جھونکے ہوائے گرم و تیز
جائے ماندن کہیں نہ پائے گریز

گویا صاف شفاف پانی کا ایک چشمہ ہے کہ ابلا چلا جاتا ہے۔
نادر تشبیہات، خوبصورت استعارات اور پھر محاورات فارسی
کا اسقدر بے تکان صرف! اس قیام کے سولہ دن بعد جہاز
کا سفر شروع ہوتا ہے۔ پڑھئے اور دیکھئے کہ جس نازک نواب
نے کبھی پھولوں کی سیج اور مخمل و کمخواب کے فرش سے باہر قدم نہ
نکالا تھا اپنی بدنصیبی کی بدولت کہاں سے کہاں پہونچتا ہے ؎

سولہویں دن جہاز پر بیٹھے
جوں مگس جا کے باز پر بیٹھے

کیا کہیں کیسے رنج و غم پائے
کیسے دورے فلک نے دکھلائے

آندھیاں وہ جہاز پر دن رات
نکلتی تھی منہ سے بھی کچھ بات

برق کا شور، رعد کا وہ زور
برق کی روشنی سے چشم تھی کور

دور تجھ سے جو سیتن ہوں میں
مثل فرہاد کوہکن ہوں میں

لیلیٰ دلربا مہربانی کر
اپنے ہاتھوں سے کچھ نشانی کر

سلطان عالم کو زبان پر جو ملکہ اور قدرت حاصل ہے
ہر ہر لفظ اس کا گواہ ہے بالخصوص آخری دو شعر قابل صد تحسین
و آفریں ہیں کہ شاعر نے کس خوبصورتی سے گریز کیا ہے۔ یہ
خلوص تخاطب اور یہ التجائے معصوم! سبحان اللہ!!

غالب نے نثر میں خطوط نویسی کا ایسا نرالا ڈھنگ نکالا
ہے کہ آج تک صحیح معنوں میں اس کی تقلید کسی سے نہ ہو سکی
لیکن اب یہ بھی دیکھئے کہ سلطان عالم نے کس خوبی سے نظم میں
اسی نثر کا لطف پیدا کیا ہے جو غالب کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہی سلطا

خطاب۔ وہی بے تکلفی۔ وہی روزمرہ اور وہی دید و گفتگو کی چاشنی معاملات حسن و عشق کو اس برجستگی اور سادگی سے نظم کرنا کچھ آسان کام نہیں ؂

یاد رخ میں یہ حال پہونچا ہے ۔۔۔ روگٹوں تک ملال پہونچا ہے
ملکۂ سیمتن خدا کے لئے ۔۔۔ خط لکھو یا تو خوب رنج دے
ایک پرچہ لکھا نہ اے گل تر ۔۔۔ اپنے احوال کی بھی کی نہ خبر
اپنے عاشق کو بھول جاتے ہیں ۔۔۔ اتنا پردیس میں ستاتے ہیں؟
جلد لکھ کر جواب بھجوانا ۔۔۔ اپنے اختر کے پاس پہونچانا

ایک دوسرے خط کا جو ملکہ امتیاز محل کے نام ہے آغاز یوں ہوتا ہے ؂

اے مری جان امتیاز محل ۔۔۔ یاد کرتا ہوں میں تمہیں پل پل
خط جو آیا تو مہربانی کی ۔۔۔ محضر عشق پر نشانی کی
دیکھ کر اس کو دل ہوا خرم ۔۔۔ اشک شادی مرے بہے پیہم

اس کی ہر بیت بیت ابرو تھی ۔۔۔ سطر ہر ایک چشم آہو تھی

کچھ دور آگے بڑھ کر شاعر نے دو شعر ایسے لکھ دیئے ہیں جو نفسیاتی نقطۂ نظر سے اپنا آپ جواب ہیں ؂

گو نہ آتے تھے ہم مہینوں پاس ۔۔۔ پر بندھی رہتی تھی یہ دل میں آس
پاس رہتی ہے وہ پری جہاں ۔۔۔ جا ہی پہونچینگے ایک پل میں وہاں

سب کچھ کہے جانے کے بعد سلطان عالم اپنی اس ملکہ کو دلاسا دیتے ہیں جو ان کی جدائی میں بے چین اور بیتاب ہے اور اس دلاسے میں اپنی تسکین قلب بھی منظور ہے۔ یہ وہ منزل ہے جب انسان پئے در پئے ناکامیوں کے بعد تھک کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کا سہارا صرف وہ امید رہ جاتی ہے جو دم توڑ رہی ہو لیکن اس انتہائی مایوسی کے عالم میں بھی تقدیر سے جنگ جاری ہو ؂

درد دل کی ہمیں دوا سمجھو ۔۔۔ مرض ہجر کو گیا سمجھو
کیا جدائی کبھی نہیں ہوتی ۔۔۔ ہجر میں آنکھ کیا نہیں روتی
وصل بھی پھر نصیب ہوتا ہے ۔۔۔ روئے جاناں قریب ہوتا ہے
بندگان خدا ہیں دست کشا ۔۔۔ خالی جائیگی کیا سبھوں کی دعا

ہم آسمان سے لاتے ہیں ان زمینوں کو ـــ (پیارے صاحب رشید)

غرض یہ کہ سلطان عالم نے اپنے اس دور میں جو کچھ بھی کہا ہے اس کا بیشتر حصہ ان کے کلام کے برعکس سوز و گداز کا حامل ہے۔ چنانچہ ان کے متعدد خطوط ان کی محبوب بیگمات کے نام نظم کی صورت میں موجود ہیں اور ان سب میں بالعموم یادِ وطن، عالم غربت اور فراقِ دور ماضی کی المناک روداد بیان کی گئی ہے۔ جن بیگمات کے نام نمایاں طور پر اس سلسلے میں لئے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں۔ ملکۂ پریوش بلقیس النساء۔ نواب سلیمان محل صاحبہ۔ نواب خرد محل صاحبہ۔ نواب سلطان جہاں صاحبہ۔ نواب جہتر محل صاحبہ۔ نواب بیگم صاحبہ۔ نواب شہنشاہ محل صاحبہ اور نواب اختر پیاری صاحبہ۔

گو جیسے جیسے نواب کے زخم مندمل ہوتے گئے ہیں انکے خطوط کا رنگ بھی پھیکا ہوتا گیا ہے لیکن ان میں جہاں کہیں جذبات و محسوسات کو دخل ہے اکثر و بیشتر تیز نشتر بن جاتے ہیں۔ اور یہ سب کارفرمائی ہے ان بے پناہ چرکوں کی جو نواب نے اپنے دور ادبار میں کھائے

جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے شاعروں اور ادیبوں کے تخلیقی کارنامے

• عبدالمجید قریشی

ادیبوں شاعروں اور دوسرے اہلِ قلم حضرات نے جن میں ہمارے مذہبی اور سیاسی رہنما بھی شامل ہیں قید خانوں میں قیام کے دوران میں بڑے اہم اور شاہکار تخلیقی کارنامے انجام دیے۔ مگر یہاں اس امر کا اظہار کرنا خالی از مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر یہ حضرات قید خانوں میں تشریف نہ لاتے تو ان کی بعض علمی اور ادبی کاوشیں کبھی عالمِ وجود میں نہ آتیں اور خاص طور سے وہ کتب جو کسی نہ کسی صاحب نے حوالۂ زنداں و سلاسل کے موضوع پر [illegible] ہمارے ادب کا ایک وسیع، دلچسپ اور عبرت خیز حصہ ہے۔

۱۸۵۷ء کا جہادِ آزادی انگریزوں کی فتح اور مسلمانوں کی شکست پر منتج ہوا۔ آخری مسلمان بادشاہ بہادر شاہ ظفر گرفتار کر لیے گئے اور انہیں وہاں سے سینکڑوں میل دور رنگون کے ایک غیر معروف مقام پر نظر بند کر دیا گیا۔ بادشاہ کا مقدر دیکھیے کہ حالات کے اس مکین و کسمپرسی کے عالم میں ... بادشاہ نے اپنی زندگی کے آخری پانچ برس قیدِ فرنگ میں اس مقام پر گزارے۔ ان پانچ برسوں میں بادشاہ پر کیا گزری، کونسی مصیبت انہوں نے یہاں نہیں جھیلی اور کونسا دکھ انہوں نے یہاں نہیں اٹھایا۔ غالب کا یہ شعر جیسے انہی کے لیے کہا گیا تھا۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

بہرحال تاریخ اس معاملہ میں بالکل خاموش ہے انگریزوں نے تاریخ کے اس دور پر اتنے دبیز اور تاریک پردے ڈال دیئے ہیں کہ اب اس موضوع پر کوئی بھی محققانہ کاوش کامیاب ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ رنگون کے اس قید خانے میں حسرت و یاس کے عالم میں اس شاعر بادشاہ نے جو غزلیں کہیں وہ اس کے دوسرے کلام سے بالکل مختلف اور اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض تو سراسر الہامی کیفیت کی حامل نظر آتی ہیں۔ بادشاہ کے مقطعے:

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

بسِ مرگ مرے مزار پہ کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اسے ٹھوکروں نے دبا دیا

اسی کیفیت کی خاص مثالیں ہیں اور اسی قسم کی دوسری غزلیں اسی قید خانے کی یادگار ہیں۔ اور یہ ایسا کلام ہے جو اردو زبان کی شاعری میں زندہ و پائندہ رہے گا۔ خدا جانے حقیقت ہے یا افسانہ بہرحال کہا جاتا ہے کہ اس زنداں میں بادشاہ کو قرطاس و قلم کی سہولتیں بھی میسر نہیں اور ظفرؔ کا کافی حصہ ان کے انتقال کے بعد اس زنداں کی دیواروں پر کوئلے سے لکھا ہوا ملا۔

۱۸۵۷ء میں اگرچہ انگریزوں نے برصغیر کی حکومت پر قبضہ کر لیا تاہم رہنمایانِ تحریکِ آزادی نے جن میں مولانا احمد اللہ شاہ، جنرل عظیم اللہ خاں، ملکہ حضرت محل، شہزادہ فیروز شاہ، مولینا محمد جعفر تھانیسری، مولوی یحییٰ علی صادق پوری اور ڈاکٹر وزیر خاں خاص طور پر شامل تھے انگریزی حکومت کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ انگریزوں نے تحریک آزادی کے رہنماؤں پر جبر و تشدد اور ظلم و تعدی کی انتہا کر دی لیکن

پھر بھی اِس تحریک کو پوری طرح دبانے میں کئی سال لگ گئے متعدد علماءِ کرام اور تحریک آزادی کے دوسرے قائدین شہید کر دیئے گئے بعض کو کالا پانی کی سزا ملی۔ کچھ جلاوطن ہو گئے اور کچھ کو حوالۂ زنداں کر دیا گیا۔ غرض اس پورے دور میں مسلمان من حیث القوم انگریزوں کے انتقام کا نشانہ بنے رہے۔

بہرحال وقت گذرتا گیا۔ انگریزی حکومت کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں اور آخر کار وہ وقت آگیا کہ سرسید کے کالج میں تحریک آزادی کے مستقبل کے رہنماؤں نے جنم لیا۔ اور ایک مرتبہ پھر وہ انگریزی حکومت کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑے ہو گئے ہمارے ان رہنماؤں میں مولینا حسرت موہانی سرِفہرست تھے۔

مولانا سید فضل الحسن موہانی سیاسی افق پر اس زمانے (۱۹۰۷ء) میں جلوہ گر ہوئے جب انگریزی عروج و اقبال کا آفتاب اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ چمک رہا تھا۔ مہاتما گاندھی جنوبی افریقہ میں وکالت کر رہے تھے مولینا محمد علی اور مولینا شوکت علی دونوں بھائی ریاست بڑودہ کے محکمۂ افیون میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ مولانا ظفر علی خاں حیدرآباد دکن میں اسسٹنٹ ہوم سیکریٹری کی کرسی سنبھالے ہوئے تھے۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد اخبار "وکیل" امرتسر کی مسندِ ادارت کو زیب دے رہے تھے۔ مولانا حسرت موہانی "مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا" کے مصداق زمانۂ طالب علمی میں ہی محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کے پرنسپل سے ٹکر لے چکے تھے اور تین مرتبہ اپنے آزادانہ خیالات کی بناء پر ہوسٹل سے نکالے جا چکے تھے۔

مولانا حسرت موہانی بلاشبہ وہ مردِ مجاہد ہیں جنہیں اِس صدی کے مسلمان رہنماؤں میں سب سے پہلے جیل جانے کا شرف حاصل ہوا اس زمانے میں قیدخانوں میں درجہ بندیاں نہ تھیں اور اخلاقی اور سیاسی قیدیوں میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا جاتا تھا بلکہ بسا اوقات سیاسی قیدیوں سے اخلاقی قیدیوں کی نسبت زیادہ مشقت لی جاتی تھی کیونکہ حکومتِ وقت کے "باغیوں" کے ساتھ کسی رعایت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان کا "جرم" ان کے

اردو کی پہلی لغت

۱۷۷۲ء میں لارڈ وارن ہیسٹنگز کے زمانہ میں جارج ہیڈلے (GEARGE HADLEY) نے اردو کی صرف نحو پر ایک کتاب لکھی جس میں انگریزی ہندوستانی لغت بھی شامل ہے جو اردو زبان میں سب سے پہلی لغت ہے گو وہ اس زبان کو "مور" (MOOR) کہتا ہے ابتداء میں اہلِ یورپ اردو یا ہندوستانی کو موریا مورش کہتے تھے، اس وقت چونکہ کوئی اور لغت نہ تھی اس لئے یہ بہت مقبول ہوئی اور متعدد بار چھپی اور ۱۸۰۹ء تک سات بار چھپ کر شائع ہوئی۔

ماہنامہ "اردوئے معلّٰے" (علی گڑھ) میں اس مقالہ کی اشاعت تھی جس کا عنوان "مصر میں انگریزوں کی پالیسی" تھا۔ یہ مقالہ مولانا حسرت کے قلم سے نہ تھا کس کے قلم کی تخلیق تھا؟ اس پر آج تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ مولانا حسرت نے مضمون نگار کا نام نہ اس وقت حکومت کو بتایا اور نہ بعد میں کسی اور کو بلکہ اس کی اشاعت کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ چنانچہ ان پر مقدمہ چلا اور دو سال قید با مشقت اور پانچ سو روپے جرمانہ کی سزا ملی۔ یہ ۱۹۰۸ء کا قصہ ہے۔ انہیں الٰہ آباد جیل میں رکھا گیا اور کوئی سال بھر تک روزانہ ایک من آٹا پیستے رہے۔ مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر ان کے اس زمانے کے احساسات کا بہترین ترجمان ہے

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی ٭ اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

اسی طرح ان کی کلیات میں متعدد نظمیں اور غزلیں ایسی ملتی ہیں جو انھوں نے مختلف جیلوں میں رہتے ہوئے کہی تھیں۔

ستمبر ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی جوہر مع مولانا شوکت علی۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ پیر غلام مجدّد سندھی۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولوی نثار احمد کانپوری گرفتار کر لئے گئے۔ انگریزی حکومت کی نظر میں ان کا جُرم یہ تھا کہ انہوں نے ۹ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی خلافت کانفرنس میں بحیثیت صدر باغیانہ تقریر کی تھی اور اس

اجتماع میں انھوں نے یہ قرارداد بھی منظور کروائی تھی کہ مسلمان پر انگریزی فوج میں کسی وقت نوکر رہنا کفر ہونا یا اس میں دوسروں کا بھرتی کرنا شرعاً حرام ہے اور مسلمانوں کا باعموم اور علما کا بالخصوص یہ فرض ہے کہ اس بات کی تشہیر کریں کہ انگریزی فوج کے مسلمان ملازموں تک پہنچائیں جس کی بنا پر یہ حضرات گرفتار کر لیا گیا اور انہیں کراچی سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ مولانا محمد علی نے اسی جیل کی ایک کوٹھری میں بیٹھ کر اپنے خلاف جملہ الزامات کا تحریری جواب تیار کیا تھا۔ اس مقدمہ میں مولانا محمد علی اور ان کے مسلمان رفقا کو دو دو سال قید کی سزائیں دی گئیں جس کی بازگشت پورے ملک میں سے

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

کی صورت میں سنی دی۔ مقدمہ کا فیصلہ ہونے کے بعد مولانا محمد علی بیجاپور جیل تبدیل کر دیے گئے۔ کلام جوہر کا کافی حصہ اور ان کی یہ مشہور نعتیہ نظم

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں تجھ سے خلوت میں ملاقاتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

اسی جیل میں لکھی گئی تھی۔ اسی جیل میں قیام کے دوران میں انہوں نے ترکی کی فتح کی خبریں سنیں تو وہ گنگنا اٹھے

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی
سن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی

ابھی ایام میں ان کی صاحبزادی آمنہ بیگم بعارضہ دق صاحب فراش ہوئیں تو باپ کی زبان سے نکلا:

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
امتحاں سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

مولانا جوہر کی یہ پوری نظم بڑی دردانگیز جاں گداز ہے اور اردو شاعری میں بلا مبالغہ اپنی مثال آپ ہے۔

علی پور جیل میں آزاد ہند کلکتہ کے ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی بھی مولانا آزاد کے ساتھ تھے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے اصرار پر مولانا آزاد نے اپنے حالات اپنے سن ولادت ۱۸۸۸ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک ملیح آبادی صاحب کو تحریر کروا دیے۔ اس طرح مولانا بولتے جاتے تھے اور ملیح آبادی صاحب لکھتے جاتے تھے اور یوں کتاب "ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی" کا مسودہ اس جیل میں عالم وجود میں آ گیا۔ اس مقصد کے سلسلے میں انہوں نے انگریزی عدالت میں اپنا وہ معرکہ آرا اور ولولہ انگیز بیان دیا کہ انگریز جج ان کی بے باکی اور جرأت ایمانی پر حیران و ششدر رہ گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اس بیان پر مشتمل کتاب "قول فیصل" یقیناً ایک ایمان افروز اور زندہ جاوید کتاب ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنا یہ مکمل بیان علی پور جیل ہی میں مرتب کیا تھا۔

۱۹۴۲ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کو جب وہ انڈین نیشنل کانگرس کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے کانگرس کی مجلس عاملہ کے دوسرے ارکان کے ہمراہ گرفتار کر کے احمد نگر جیل بھیج دیا گیا۔ یہی وہ جیل ہے جہاں رہتے ہوئے مولانا آزاد نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام اپنے وہ مشہور و معروف خطوط تحریر فرمائے جو بعد ازاں "غبار خاطر"

اردو صرف ونحو کی پہلی کتاب

اردو صرف ونحو پر "دریائے لطافت" کے نام سے ہندوستانیوں کی لکھی گئی یہ سب سے پہلی کتاب ہے جسے انشا اور قتیل نے ۱۸۰۲ء میں تالیف کیا اور جو ۱۸۴۲ء میں شائع ہوئی۔

جگن ناتھ آزاد - ہری چند اختر - سابق گورنر جنرل غلام محمد مرحوم - عرش ملسیانی - اور ممتاز حسن

اور "کاروانِ خیال" کی شکل میں اشاعت پذیر ہوئے میری تحقیق کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر "ترجمان القرآن" کے بعض اجزا بھی مختلف جیلوں میں لکھے گئے تھے۔

مجلس احرارِ اسلام کے رہنما چوہدری افضل حق کی شہرۂ آفاق کتاب "زندگی" گورکھپور جیل میں ان کے ایام اسیری کی یادگار ہے اس کتاب کو قبولیتِ عامہ کا جو شرف حاصل ہوا اس کی تردید بھلا کون کرسکتا ہے "زندگی" غالباً ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی چوہدری افضل حق مرحوم کی دوسری مشہور کتاب "محبوبِ خدا" ہے جو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ ہے اور جسے اردو زبان کی کتب سیرت میں خاص مرتبہ حاصل ہے چوہدری صاحب کی یہ کتاب ملتان اور راولپنڈی کی جیلوں میں مرتب ہوئی تھی۔

مولانا ظفر علی خاں نے تمام زندگی غیر ملکی سامراج کے خلاف علم جہاد بلند رکھا۔ انھوں نے اس جرم کی پاداش میں سالہا سال قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن انگریزی حکومت کے سامنے اپنا سر خم نہ کیا۔ مولانا ظفر علی خاں آتش بیان خطیب اور فقید المثال صحافی ہونے کے ساتھ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ مولانا بدیہہ گوئی کے بادشاہ تھے اور حقے کے کش کے ساتھ ساتھ شعر کہتے تھے۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام "بہارستان" "نگارستان" اور "چمنستان" کی بہت سی نظمیں پسِ دیوارِ زنداں ہی کہی گئی تھیں۔ بلکہ ان کے ایک اور مجموعۂ کلام "حبسیات" کی تو تمام نظمیں منٹگمری جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کی ہی مرہونِ منت ہیں منٹگمری جیل میں انہوں نے کچھ مضامین کا اردو میں بھی ترجمہ کیا تھا۔ یہ مضامین ان کے ایام اسیری ہی میں جیل سے برآمد ہوئے اور "زمیندار" میں "نقاش" کے قلمی نام سے چھپے تھے۔ مہاتما گاندھی کی خودنوشت سیرت STORY OF

MY EXPERIMENTS WITH TRUTH کا ایک بڑا حصہ یرودا جیل میں مکمل ہوا جہاں مہاتما گاندھی اپنے ایام اسیری گذار رہے تھے۔ اس کتاب کا ترجمہ بعد ازاں جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی کے پروفیسر حامد حسین نے "تلاش حق" کے زیر عنوان دو جلدوں میں کیا اور مکتبہ جامعہ نے اسے شائع کیا تھا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی زندگی کا ایک حصہ قید و بند کی حالت میں گذارا تھا قید خانوں میں لمحات فرصت بسر کرنے کے لئے ان کے مشاغل میں سے ایک مشغلہ تصنیف اور تالیف بھی تھا چنانچہ ان کی آپ بیتی "میری کہانی" کی ابتدا ڈیرہ دون جیل میں ہوئی۔ ڈاکٹر سید محمود بھی مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ہمراہ احمد نگر جیل میں مقیم تھے ڈاکٹر صاحب سیاست دان ہونے کے باوجود شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے انھوں نے اس قید خانے میں عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے اپنے پسندیدہ اشعار کا ایک انتخاب مرتب کیا جو ان کی رہائی کے بعد "زمان آلام" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی ہمشیرہ مسز وجے لکشمی پنڈت کو بھی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے دوران میں گرفتار کیا گیا تھا۔ انہوں نے اپنی اسیری کا زمانہ ۱۲ اگست ۱۹۴۲ء تا ۱۱ جون ۱۹۴۳ء نینی تال جیل میں گذارا۔ اس جیل میں ان کے یہ ایام کیسے بسر ہوئے ان کی ہلکی پھلکی روداد انھوں نے اپنی کتاب MY DIARY میں لکھی تھی۔ اس کتاب کا ترجمہ "میری ڈائری" آزادی سے کافی عرصہ پہلے لاہور میں شائع ہوا تھا جس کے مترجم راجندر نام کے ایک صاحب تھے۔ انھوں نے اپنی اس کتاب کے ایک مقام پر جیل خانے کی چائے کا ذکر کرتے ہوئے بڑے مزے سے لکھا تھا کہ "میرا چائے کا تجربہ بڑا وسیع ہے۔ میں نے میڈم چیانگ کائی شک کی بھیجی ہوئی اعلیٰ درجے کی خوشبودار چائے سے لیکر اس شربت جیسی دوغلی چائے کا استعمال بھی کیا ہے جو انتخابات کے دوران میں نگلنی پڑتی تھی۔ لیکن جیل کی چائے ایسی کوئی چائے میں نے نہ دیکھی ہے اور نہ پی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی خاص قسم کی اور مہلک چائے ہے جو ہمارے بدنصیب قیدیوں کے لئے کاشت کی جاتی ہے۔ اگر میں جیل خانے کے افسران کو جیل کے راشن پر ایک ہفتہ گذارنے پر مجبور کر سکوں تو مجھے بڑا لطف آئے۔

فیض احمد فیض کے مجموعۂ کلام "دست صبا" کی اکثر و بیشتر غزلیں اور نظمیں حیدر آباد سینٹرل جیل میں کہی گئی تھیں۔ ان کے تیسرے مجموعۂ کلام "زنداں نامہ" کا تمام کا تمام شعری اثاثہ منٹگمری جیل اور لاہور سینٹرل جیل میں ان کے قیام کا نتیجہ ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے مجموعہ ہائے کلام "شعلۂ گل" اور "دشت وفا" کی بعض غزلیں، کوثر نیازی کے مجموعۂ کلام "زرِ گل" اور نعیم صدیقی کے "شعلۂ خیال" کی تمام کی تمام غزلیں اور نظمیں قیام زندان ہی کی مرہون منت ہیں بلکہ نعیم صدیقی نے تو کتاب "شعلۂ خیال" کا سرعنوان ہی اپنے اس شعر کو قرار دیا ہے۔

آخر ہے کس کے بس میں مرا شعلۂ خیال
سنگین و آہنی مرا زنداں ہوا کرے

مولانا عبدالمجید سالک ۱۹۲۲ء میں تحریک خلافت کے سلسلے میں میانوالی جیل میں ایام اسیری گذار رہے تھے اسی جیل میں مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا اختر علی خاں، مولانا داؤد غزنوی، مولوی لقاء اللہ پانی پتی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور جناب عبدالعزیز انصاری بھی مقید تھے۔ سالک صاحب مولانا احمد سعید صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ایک بلند پایہ عالم دین اور

مجموعہ تعزیرات ہند

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد نے برطانوی حکومت کے حکم سے قانون کا اردو ترجمہ کیا۔ مجموعہ تعزیرات ہند اس سلسلے کی اردو میں پہلی مبسوط اور منضبط کتاب ہے جس کی اصطلاحات آج بھی ان عدالتوں اور تھانوں کے زیر استعمال ہیں جہاں سے اردو کو حرف غلط کی طرح اڑا دیا گیا ہے۔

شیوا بیان خطیب ہونے کے باوجود ہم لوگوں میں بیٹھ کر دن بھر لطیفہ بازی کیا کرتے تھے بلکہ جب ہم لوگ رات کو وقت گزاری اور تفریح کے لئے قوالی کرتے تو مولانا اس مجلس میں صدر کی حیثیت سے متمکن ہوتے۔ مولانا داؤد غزنوی اور مولوی عبدالعزیز انصاری بعض اوقات حال کھیلتے کھیلتے مولانا کی توند پر جا پڑتے، مولانا ہنستے بھی جاتے اور بُرا بھلا بھی کہتے جاتے، ایک دفعہ ہم نے مولانا کو ایک گیت سنانے پر مجبور کیا۔ مولانا نے بڑے مزے لے لیکر گایا۔ یہاں ہماری زندگی کا ایک خاص انداز شروع ہوا میں نے اور عبدالعزیز انصاری صاحب نے مولانا احمد سعید سے عربی صرف ونحو، ادب اور منطق کا سبق لینا شروع کر دیا، ایک آدھ گھنٹہ پڑھ لیتے پھر ایک دو گھنٹہ آموختہ دہراتے اور اُردو سے عربی میں ترجمہ کر کے مولانا کو دکھاتے۔ مولانا کا انداز تدریس اگرچہ وہی اساتذہ قدیم کا سا تھا لیکن وہ اس میں خاص دلآویزی پیدا کر دیتے تھے، جس میں بے زاری اور ناگواری کا شائبہ تک نہ ہوتا اور ہم بے تکان پڑھتے چلے جاتے۔

آردو ادب میں زنداں و سلاسل کے موضوع پر کتابوں کی تعداد چنداں حوصلہ افزا نہیں، تاہم قید و بند کی یہ داستانیں نہ صرف دلکش اور پُرلطف بلکہ اپنے دامن میں سامان عبرت بھی سمیٹے

باپ مدّاح کا مدّاح ہے دادا مدّاح (میر خلیق)

ہوئے ہیں۔ "کالا پانی" اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ جسے مولانا محمد جعفر تھانیسری نے ۱۸۸۵ء کے لگ بھگ قید فرنگ سے رہائی کے بعد تحریر فرمایا تھا۔ محترم مصنف اس جنگ آزادی کے اہم کردار ہیں جو فرنگی اقتدار کے خلاف پوری ایک صدی لڑی گئی۔ انھوں نے اس کتاب میں انگریزوں کے جبر و استبداد کی ایک ایسی ناقابل فراموش اور زندہ جاوید داستان بیان کی ہے جسے پڑھ کر ایک طرف فرنگی حاکموں کے ظلم و ستم کا صحیح اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف مجاہدین حریت کی مظلومیت، بے کسی، ایثار اور اعلیٰ کردار کے صحیح نقش و نگار سامنے آجاتے ہیں۔ "کالا پانی" نام کی

دلّی کا پہلا اردو اخبار

۱۹۳۶ء تک پریس پر متعدد پابندیاں عائد تھیں اور جب اسی سال پریس کو آزادی حاصل ہوئی تو مولانا محمد باقر نے دلّی سے اردو کا سب سے پہلا اخبار جاری کیا۔ اس اخبار کی نوعیت ادبی تھی اور اس میں ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ اور دیگر معاصرین کی منظومات بھی شائع ہوتی رہتی تھیں اس اخبار میں زبان اور محاورات پر طویل بحثیں شائع ہوتی رہتی تھیں۔

ہما کے اردو نمبر کے لئے

آخری غیر مطبوعہ غزل

علامہ نوح حمزہ پوری

جورِ خزاں نے باغ کو خارستاں بنا دیا
بلبل زار سے چمن پھولا پھلا چھڑا دیا

محوِ فغاں ہوں رات دن آہ نشیمنِ چمن
برق کے اک اشارے نے نام و نشاں مٹا دیا

قصرِ بہشت تھا مکاں، گلشنِ خلد رہ گذر
اُف نئے انقلاب نے پل میں سب کو ڈھا دیا

آتے ہیں حادثات بھی ہوتے ہیں انقلاب بھی
پر یہ ستم تو دیکھنا سر پہ فلک گرا دیا

طعنے نصیب پر فضول شکوے رقیب کے عبث
خوب کیا بجا کیا جس نے مجھے مٹا دیا

کیجئے رحم آخرت کے سفری کے حال پر
عفو کریں کہا سنا بخش دیں سب لیا دیا

مرسلہ:- ناوک حمزہ پوری

ایک دوسری کتاب مشہور ہندو مہا سبھائی سندر بھائی پرمانند کے قلم سے بھی ہے جس میں انھوں نے جزیرہ انڈمان میں اپنی قید و بند کے حالات سے پردہ اُٹھایا ہے مولانا حسرت موہانی سے ۱۹۰۸ء میں کچھ وارداتیں ان پر گذریں انھیں اپنی رہائی کے بعد "مشاہداتِ زندان" کا نام دیا جو "قیدِ فرنگ" کے نام سے کراچی میں شائع ہوئی ہیں۔ مشہور سیاسی تحریک "ریشمی رومال" کی صدائے بازگشت ۱۹۱۵ء میں سرزمین حجاز میں سنی گئی۔ جہاں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی بہ ارادۂ حج مقیم تھے۔ شریف مکہ نے شیخ الہند کو گرفتار کر کے انگریزوں کی خواہش کے مطابق ان کے حوالے کر دیا اور وہ انھیں جزیرہ مالٹا لے گئے وہاں انھیں جن مصائب و آلام سے گذرنا پڑا اس کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس دورِ ابتلا میں شیخ الہند کے ہمراہ مولانا حسین احمد مدنی بھی تھے جنہوں نے "سفرنامہ اسیرِ مالٹا" کے عنوان سے اس رُوح فرسا اور جاں گداز داستان کو رقم کیا۔ زعیم الاحرار چودھری افضل حق نے اپنی آپ بیتی "میرا افسانہ" میں جہاں اپنی زندگی کے بہت سے دلچسپ اور پُرلطف واقعات کا ذکر کیا ہے۔ وہاں انکے جیل خانے کے متعلق تاثرات ناقابل فراموش حد تک عبرتناک ہیں۔ ان کی دوسری کتاب "دنیا میں دوزخ" کا تعلق بھی اسی دنیا سے ہے۔ ادبی رسائل میں مطبوعہ مضامین میں شورش کاشمیری کا "بوئے گل نالۂ دل دُودِ چراغ محفل" م۔ش کا "میری جیل یاترا" احمد ندیم قاسمی کا "زنداں و سلاسل" اور "مہر لب" اور نعیم صدیقی کی "جیل کی ڈائری" کو ہر لحاظ سے دلچسپ اور پُرلطف کہنا چاہیئے۔ یہ تو تھیں وہ کتابیں اور مضامین جن کا تعلق متحدہ ہندوستان کی مختلف جیلوں اور قید خانوں سے ہے۔ اب ایک انوکھی کتاب "قیدِ یاغستان" کے متعلق سنئے جس میں لاہور کے میاں محمد اسلم اور ان کے ایک ہندو رفیق نے جس بے جاں کی ایک ایسی دلدوز اور بھیانک کہانی دہرائی ہے جسے پڑھ کر انسان کا دل دہل جاتا ہے میاں محمد اسلم اور ان کے ساتھی کو ۱۹۱۰ء میں قبائلی پٹھانوں نے اغوا کر کے یاغستان لے گئے اور وہاں انھیں قید کر دیا تھا۔ اس قید ستم سے راہِ فرار انھوں نے کیسے اختیار کی اور کن کن مصائب اور دشواریوں کے بعد وہ سرحد میں داخل ہوئے ان تمام واقعات نے اس کتاب کو ایک لرزہ خیز اور دہشتناک داستان میں تبدیل کر دیا ہے۔

★★

آزاد ہندوستان میں

ادارہ

اردو کی پہلی فریاد

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور ہندوستانی زبان و ادب کے دشمن انگریزوں کا دور ختم ہوا اور ہندوستان پر خود ہندوستانیوں کی حکومت قائم ہوگئی ــــ ۲۶ جنوری ۱۹۵۱ء کو ہندوستان میں آئین کا نفاذ ہوگیا اور تاج برطانیہ سے ہندوستان کی رہی سہی وابستگی بھی ختم ہوگئی آئین نے تمام ہندوستانی باشندوں کو مساوی حقوق دئے اور چودہ قومی زبانیں تجویز کیں جن میں اردو کو بھی شامل کیا گیا لیکن عملی طور پر اردو کو اس کے تمام حقوق سے محروم کردیا گیا۔ سرکاری دفتروں عدالتوں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں تک سے اردو کو نکال دیا گیا یا نکال دینے کی کوششیں جاری رکھی گئیں۔ درحقیقت اردو کے ساتھ یہ ظلم اور ناانصافی آزاد ہندوستان کا پہلا ثقافتی حادثہ تھا جس نے نہ صرف اردو سے والہانہ عشق کرنے والوں بلکہ اس خالص ہندوستانی زبان کو ہندوستانی ثقافت کا ایک جزو سمجھنے والوں کو بھی تڑپا دیا۔ ایک طرف اردو کو ختم کرنے کی سازشیں ہوتی رہیں اور دوسری طرف اردو کو اسکے اپنے وطن میں جائز مقام دلانے کی کوششیں بھی جاری رہیں، کچھ لوگوں نے اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے ڈائرکٹ ایکشن کی بات کہی اور کچھ لوگوں نے جمہوری طریقوں سے اردو کو بحال کرنے کی راہ کو درست قرار دیتے ہوئے ایک دستخطی مہم شروع کردی۔ اس دوسرے طبقہ نے انجمن ترقی اردو ہند کی نگرانی میں ۲۱ لاکھ دستخط فراہم کرکے ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کرکے یہ سمجھ لیا کہ اردو کو بچانے کا کام پورا ہوگیا اور اب اردو کو اس کا حق مل جائے گا۔

۱۵ فروری ۱۹۵۴ء کی شام کو ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں ۲۱ لاکھ دستخط کے ہمراہ اردو کی پہلی فریاد صدر جمہوریہ ہند کو پیش کردی گئی۔ صدر جمہوریہ سے حامیان اردو کے وفد کی ملاقات اس لحاظ سے تاریخی قرار پائی کہ اردو کو اپنے ہی وطن میں اپنی حکومت سے شکایت کرنی پڑی ــــ لیکن تاریخ ایک ساکت و جامد چیز ہے اس لیے یہ یادداشت یا شکایت بھی تاریخ کے اوراق میں منجمد ہوکر رہ گئی اور ۱۹ سال گزر جانے کے باوجود آج تک اس استغاثہ کا کوئی جواب ایوان حکومت سے نہیں ملا ہے۔

اردو کے اس استغاثہ پر دستخط کرنے والے تمام افراد بالغ تھے اور ان کا تعلق ہر فرقہ و ملّت سے تھا۔ وفد میں ڈاکٹر ذاکر حسین صدر انجمن ترقی اردو ہند (لیڈر) پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، مسز اوما نہرو، مولانا حفظ الرحمٰن علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی (جو اس زمانہ میں انجمن ترقی

بائیبل اردو میں

بائیبل کا مکمل اردو ترجمہ سیرام پور کے پادریوں نے ۱۸۱۹ء میں شائع کیا جس نے عیسائیوں میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں اہم رول ادا کیا تھا

اردو وفد کے ایک صدر تھے، وہ تھے صدر العلماء پنڈت سندر لال، پروفیسر مسعود حسن رضوی، حضرت حیات اللہ انصاری، بیگم حیات اللہ انصاری، پنڈت کشن پرشاد کول کرتے تھے یہ صدر، قاضی عدیل عباسی شامل تھے۔ ۱۸ فروری [illegible] کے روزنامہ [illegible] کے مطابق سے پتہ چلتا ہے کہ صدر جمہوریہ ہند نے وفد سے دس منٹ تک بات چیت کی تھی اور یہ وعدہ بھی فرمایا تھا کہ وہ اس سلسلہ میں حکومت سے مشورہ کریں گے لیکن اس وعدہ کا انجام سب کے سامنے ہے۔ بہرحال اردو وفد کی طرف سے یادداشت میں اردو کے گیارہ مطالبات پیش کیے گئے تھے۔ یادداشت کا متن مندرجہ ذیل ہے۔

عالیجناب صدر جمہوریہ ہند نئی دلّی۔

جناب والا۔

آل انڈیا انجمن ترقی اردو اور اتر پردیش کی اردو بولنے والی آبادی کی جانب سے ہم ممبران وفد نہایت ادب سے جناب والا کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے ہم جناب والا سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں بعض امور کی تصریح کرنے کی اجازت عطا فرمائیں جو حال ہی میں ہمارے وفد کے مقصد کے متعلق زیر بحث آئے ہیں اور جن سے بعض امور میں کسی قدر غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارے ملک کے دستور کے فقرے ۳۴۳ کی رو سے قرار پایا ہے کہ "یونین کی سرکاری زبان دیوناگری رسم الخط میں ہندی ہوگی۔"

آل انڈیا انجمن ترقی اردو اور سب لوگ جن کی ہم نمائندگی کرتے ہیں اپنی دستور ساز اسمبلی کے اس فیصلہ پر سر تسلیم خم کرتے ہیں اور دیوناگری رسم الخط میں ہندی پڑھنا اور فقرہ ۳۵۱ میں جو طریقہ بتایا گیا ہے، اس طرح ہندی زبان کی ترقی اور ترویج میں مدد کرنا اپنا اور ہندوستان کے ہر شہری کا فرض سمجھتے ہیں۔

۱۹۵۱ء میں اتر پردیش کی قانون ساز جماعتوں نے دستور کے فقرے ۳۴۵ کے تحت قانون بنا کر دیوناگری رسم الخط میں ہندی زبان کو ریاست کی تمام سرکاری اغراض میں استعمال کرنے کے لیے اختیار کر لیا لیکن اس فیصلہ میں جو فی نفسہٖ بہتر تھا اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا کہ اسی علاقہ میں اردو زبان اور رسم الخط بھی رائج ہے۔ ہم قانون ساز جماعتوں کے فیصلہ کو فرض شناسی کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ہم محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اردو کے متعلق اس فیصلہ میں فقرہ ۳۴۵ کے تحت صدر کے ہدایات نامہ کے ذریعے سے اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی غرض سے ہم نے جناب والا سے رجوع کرنے کی جرأت کی ہے۔

ایک ایسے بلند مقام صاحب علم و فضل کے روبرو جیسے کہ جناب ہیں ہم اس بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتے کہ آیا ہندی اور اردو دو مختلف زبانیں ہیں یا ایک ہی بنیادی زبان کے دو ادبی اسلوب ہیں۔ ہمارے مقصد کے لیے یہی کافی ہے کہ موجودہ حالات کے متعلق واقعیت پسند اور حقیقی نقطۂ نظر اختیار کر کے دستور کی آٹھویں فہرست میں ہندی اور اردو دونوں کو ہندوستانی زبانوں میں شمار کیا گیا ہے۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ اردو زبان

(ایک یادگار فوٹو) فرش پر بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں:- سردار جعفری۔ خواجہ احمد فاروقی۔ خورشید الاسلام۔ گوپی ناتھ امن۔
کھڑے ہوئے:- آل احمد سرور۔ جگن ناتھ آزاد۔ خواجہ غلام السیدین۔ مرزا محمود بیگ۔ ثریا سلطان۔ پروفیسر احتشام حسین
اور ڈاکٹر عبدالعلیم (وائس چانسلر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی)

جس نے صدیوں کے دوران میں ایک ایسا اسلوب اور ادب پیدا کر لیا ہے جس پر کوئی قوم بھی فخر کر سکتی ہے۔ آج اتر پردیش میں تمام مذہبوں اور فرقوں کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی بولی ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ان کی مادری اور ادبی زبان ہے۔ یہ سب لوگ باوجودیکہ دیوناگری رسم الخط میں ہندی زبان کو سیکھنا پڑھنا اور لکھنا ضروری سمجھتے ہیں، پھر بھی اردو کو اسی کے رسم الخط میں لکھتے پڑھتے ہیں اور نہایت معقول وجوہ کی بنا پر چاہتے ہیں کہ یہ قومی وراثت محفوظ رہے۔ اس سلسلہ میں ہم حکومت ہند کے روزلیوشن مورخہ ۱۰ راگست ۱۹۴۸ء کی طرف جناب والا کی توجہ مبذول کرانے کی اجازت چاہتے ہیں جس میں بنیادی مدارس میں تعلیم کے متعلق حکومت کی پالیسی کا تعین کیا گیا ہے اس روزلیوشن کے الفاظ حسب ذیل ہیں:-

"جونیر بنیادی منزل پر تعلیم اور امتحان کا ذریعہ بچے کی مادری زبان ہونا چاہیے، جہاں علاقائی اور سرکاری زبان سے مادری زبان مختلف ہو وہاں مادری زبان میں تعلیم دینے کا یہ انتظام کرنا چاہئے کہ جب تمام مدرسہ میں اس زبان کے بولنے والے ہم طلبا سے کم یا ایک درجہ میں ۱۰ سے کم نہ ہوں تو ایک استاد ان کی تعلیم کے لیے مقرر کیا جائے۔ مادری زبان وہی مانی جائے گی جس زبان کو طالب علم کے والدین یا سرپرست کہیں یہ اس کی مادری زبان ہے۔"

اس پالیسی کی اترپردیش کے چیف منسٹر نے جن
ایک مراسلہ میں جو انہوں نے مسٹر زیڈ۔ ایم لاری کو جو اس
وقت لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن تھے بھیجا تھا تصدیق کی اور
پھر اترپردیش کے سکریٹری تعلیمات شری اے۔ این سیور
نے بھی اس پالیسی پر اپنے مراسلہ موسومہ ڈائرکٹر تعلیمات
پر زور دیا تھا لیکن باوجود اس کے شری آر۔ ایس سنہا
نے جو جبری تعلیم کے خاص آفیسر تھے میونسپل بورڈوں کے
چیئرمینوں کو حسب ذیل تحریر بھیجی۔

"مجھے یہ کہنے کی ہدایت ہوئی ہے کہ حکومت
کا حکم یہ ہے کہ تمام ابتدائی مدرسوں میں
ہندی کو لازمی مضمون ہونا چاہیے۔ اردو
کی تعلیم پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اگر
اردو کو پڑھانا چاہیں تو وہ ایک اختیاری
مضمون ہو لہٰذا تمام طلبا پر بلا لحاظ ذات
اور قوم لازم ہوگا کہ وہ ہندی پڑھیں اور
وہی نصاب کے دوسرے مضمونوں کے
پڑھانے کا ذریعہ ہو۔"

یہ حکومت ہند کی ہدایت اور ریاستی حکومت کے
مقصد کی ایک خلاف ورزی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
اردو تمام میونسپل اسکولوں سے خارج ہوگئی۔ اسی زمانہ
میں ان اسکولوں میں بھی جو ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ماتحت
تھے اردو کی تعلیم روک دی گئی۔ اور باوجود بار بار
معروضے اور یاد دہانیاں پیش کرنے کے ریاستی حکومت
اس بے انصافی کو رفع نہ کر سکی اس سب کا نتیجہ یہ ہوا ہے
کہ ان بچوں کو جن کی مادری زبان اردو ہے بنیادی تعلیم
بھی مادری زبان میں حاصل کرنے کی اجازت نہ رہی
اور اس طرح اردو ریاست کے تمام بنیادی مدرسوں
کے ابتدائی درجوں سے بھی خارج ہوگئی۔ اس سے بھی
زیادہ حیرت انگیز یہ واقعہ ہے کہ بہت سے بچوں کی مادری
زبان جو کل تک ان بنیادی اسکولوں میں اردو لکھی ہوئی
تھی بچوں کے سرپرستوں سے مشورہ کئے بغیر یکایک ہندی
ہوگئی۔ جب یہ صورت حال انجمن ترقی اردو کے علم
میں آئی تو اس نے ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ وہ
اس معاملہ کی تحقیقات کرے! اس کمیٹی کی رپورٹ جب
انجمن کو وصول ہوگئی اور اسے اس بات کا یقین ہوگیا
کہ لوگوں کی شکایتیں جائز ہیں، تب انجمن نے فیصلہ کیا کہ
اس کے اراکین کا ایک وفد ریاستی وزیر تعلیمات
کی خدمت میں بھیجا جائے تاکہ وہ ان شکایات کو موصوف
کے سامنے رکھے۔ چنانچہ، ۱۱ اراکین کا ایک وفد بسرکردگی
ڈاکٹر ذاکر حسین صدر انجمن ۲۲ مئی ۱۹۵۱ء کو ڈاکٹر سمپورنانند
کی خدمت میں حاضر ہوا جو اس وقت اترپردیش کے وزیر
تعلیم تھے۔ یہ وفد اپنے ساتھ صرف شہر لکھنؤ کے ۱۰ ہزار
سے زیادہ سرپرستوں کی درخواستیں لے گیا جو چاہتے
تھے کہ اردو زبان کے ذریعے سے ان کے بچوں کی تعلیم
ہو۔ اس وفد سے وزیر صاحب نے ہمدردانہ طریقہ پر
ملاقات کی۔ اس کی شکایات کے جواز کو تسلیم کیا اور از راہ
مہربانی تسلیم کیا کہ جبری تعلیم کے خاص افسر شری سنہا نے
جو گشتی جاری کی تھی وہ حکومت کے پالیسی کے مطابق
نہ تھی۔ وفد کو اس کا یقین دلایا گیا کہ آئندہ سیشن کے

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں (میر مونس)

آغاز کے ساتھ ہی یعنی جولائی ۱۹۵۱ء سے یہ خرابیاں رفع کر دی جائیں گی لیکن یہ وعدہ کبھی وفا نہ ہوا۔ موجودہ وزیر تعلیم نے بھی ۱۴ جولائی ۱۹۵۲ء کو لیجسلیٹو کونسل میں اس وعدے کو دہرایا اور صاف فرمایا کہ ڈائرکٹر تعلیمات کو یہ ہدایات دیدی گئی ہیں کہ اگر کسی مدرسہ میں بچے ایسے ہیں جو اردو میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہاں اس کا انتظام کیا جائے لیکن ان ہدایات پر بھی عمل نہیں ہوا۔ اور حالات اب بھی وہی ہیں جو تھے۔ ۷ راگست ۱۹۵۲ء کو امتحاناً ایک درخواست جسپر صاحب گنج اسکول کے جو لکھنؤ کے حلقۂ دولت گنج میں ہے۔ طلبا کے ۹۰ سرپرستوں کے دستخط تھے، وزیر تعلیمات اور میونسپل بورڈ لکھنؤ کے سپرنٹنڈنٹ تعلیم کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اس درخواست میں استدعا کی گئی چونکہ ان کے بچوں کی مادری زبان اردو ہے۔ اس لیے ان کو اسی زبان میں تعلیم دی جائے! اس درخواست کا کوئی جواب نہیں ملا اور نہ مطلوبہ انتظام کیا گیا۔

اس سلسلہ میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ نارمل اسکولوں میں بھی طریقۂ تعلیم اس طرح بدل دیا گیا ہے کہ وہاں بھی اردو کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی پہلے تو ابتدائی مدارس کے استادوں کے لیے لازمی تھا کہ ہندی اور اردو دونوں زبانیں جانتے ہوں مگر اب اردو کے استادوں کی تربیت ہی بدل گئی ہے۔ علاوہ بریں ہندی اور اردو کی نصابی کتابوں کی اشاعت میں ایک غیر منصفانہ امتیاز قائم کر دیا گیا ہے۔ محکمۂ تعلیم نے ہندی کی نصابی کتابوں کے لیے ٹنڈر طلب کئے اور ناشروں کو ہر کتاب کی ایک معینہ تعداد کے چھاپنے کی ہدایت کر دی اس طرح ان کتابوں کی فروخت کا بھی گویا ذمہ لے لیا۔ برخلاف اس کے اترپردیش کے ڈائرکٹر تعلیم نے ایک گشتی اس مضمون کی نکال دی ہے کہ ناشر اگر اردو کی نصابی کتابیں چھاپیں تو وہ نقصان اور فائدے کے خود ذمہ دار ہوں گے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب اردو کی نصابی کتابیں شاید ہی بازار میں مل سکیں۔

ان حالات میں ہمارے لیے کوئی دوسرا دستوری راستہ کھلا ہوا نہ تھا سوائے اس کے کہ ہم دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت جناب والا کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اس دفعہ کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"اگر ایسا مطالبہ کیا جائے اور پریسیڈنٹ کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ ریاست کی آبادی کا ایک معقول حصہ چاہتا ہے کہ اس زبان کو استعمال کرے جو وہ بولتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ ریاست بھی اس کو تسلیم کرے تو انھیں یہ اختیار ہے کہ وہ ہدایت کریں کہ ایسی زبان تمام ریاست میں یا اس کے کسی حصہ میں ایسے کاموں کے لیے جن کی وہ تصریح کر دیں سرکاری طور پر تسلیم کی جائے۔"

مندرجہ بالا دفعہ کی تمنا کو پورا کرنے کے لیے انجمن نے فیصلہ کیا کہ ایسے بالغوں کے دستخط جمع کرے جو یہ چاہتے ہیں کہ اردو زبان اترپردیش میں تسلیم کی جائے ۲۰ لاکھ ۵ ہزار سے زیادہ دستخط جمع کر لیے گئے ہیں دستخط کرنے والوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے خاندانوں میں نابالغوں کی تعداد کیا ہے۔ ایسے نابالغوں کی تعداد بھی ۲۲ لاکھ سے زیادہ ہے۔

عام جلسوں، مظاہروں اور نعروں سے بہت احتیاط کے ساتھ پرہیز کیا گیا۔ اس طرح جو دستخط حاصل ہوئے ہیں ان کو ضلع وار اور قوم وار چھانٹ لیا گیا ہے۔ اور جو دستخط مشتبہ سمجھے گئے ان کو بہت احتیاط سے جانچ کے بعد خارج کر دیا گیا ہے۔ یہ کام ایک منظم طریقہ سے کم و بیش مردم شماری کی طرح کیا گیا ہے۔

ہمیں یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ اردو زبان اور اس کے ادب نے "ہندوستان کے مشترکہ کلچر" کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے اور وہ اب بھی اس کلچر کا ایک اہم عنصر ہے۔ اس نے اترپردیش کی مشترکہ تہذیب، مشترکہ زندگی اور مشترکہ سماجی روایات کی ترقی میں بھی خاص طور پر بہت قابل قدر حصہ لیا ہے۔

ہم یقین کرتے ہیں۔ اور نہایت خلوص کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ اردو زبان اپنے بیش بہا ذخیرۂ الفاظ اپنی حسین روزمرہ اور شاندار طرز بیان اور ہمہ گیر اور ترقی پسند ادب کے ذریعہ سے اب بھی دستور کی دفعہ ۳۵۱ کے مطابق یونین کی سرکاری زبان ہندی کے جس میں اضافہ کرنے اور اسے مالا مال کرنے اور اس کی ترقی کی تکمیل میں جس کے متعلق دفعہ مذکور میں لکھا ہے کہ وہ اس طرح ترقی کرے کہ "ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے تمام عناصر کے لیے اظہار خیال کے ذریعہ کا کام دے" بہت اہم حصہ لے سکتی ہے۔

لہٰذا ہم اترپردیش کے اردو بولنے والوں کی طرف سے "جو ریاست کی آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ ہے جیسا کہ اس یادداشت کی تائید میں ۲۰ لاکھ سے زیادہ دستخطوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ استدعا کرتے ہیں کہ جناب والا مہربانی فرما کر دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت ہدایت جاری فرمائیں کہ اردو زبان بھی اترپردیش میں ایک

قرآن پاک کا اردو ترجمہ

سب سے پہلے قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کرنے والے شاہ رفیع الدین تھے، جو ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۱۷ء میں رحلت فرما گئے۔ ان کے والد شاہ عبدالعزیز بن مولانا شاہ ولی اللہ کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے جو ۱۷۵۳ء سے لے کر ۱۸۱۴ء تک زندہ رہے صحیفۂ آسمانی کو اردو زبان میں منتقل کیا۔ جو نہایت سلیس اور بامحاورہ ہونے کی وجہ سے آج بھی مقبول عام و خاص ہے۔

علاقائی زبان تسلیم کی جائے اور اس طریقہ سے سرکاری کاموں میں استعمال کی جائے کہ وہ حسب ذیل مقاصد کو پورا کرسکے۔

(۱) ایسے بچوں کے لیے جن کی مادری زبان اردو ہے ابتدائی درجہ میں وہ ذریعہ تعلیم ہو، اور جہاں کہیں اردو بولنے والے بچوں کی تعداد کافی ہو یعنی ہر کسی مدرسہ میں ہو یا کسی کلاس میں وہاں اردو کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے۔ ایسے مقامات پر جہاں اردو بولنے والی آبادی زیادہ ہے ایسے اسکول قائم کیے جائیں جن میں ذریعہ تعلیم اردو ہو۔ اس کا فیصلہ کہ بچہ کی مادری زبان کیا ہے اس کے والدین یا سرپرستوں کے کہنے کے مطابق ہونا چاہیے۔

(۲) ابتدائی درجوں میں اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کی قابلیت رکھنے والے استادوں کو کافی تعداد میں تربیت دینے کے انتظامات کیے جائیں۔

(۳) ایسے انتظامات کیے جائیں کہ اردو زبان میں کافی نصابی کتابیں مہیا ہوسکیں۔

(۴) ایسے ثانوی مدارس کو جو اردو کے ذریعہ تعلیم دیتے ہوں ریاست تسلیم کرے اور دوسرے ثانوی مدارس کی امداد دینے کے جو قواعد ہوں ان ہی کے مطابق ان مدارس کو بھی سرکاری امداد دی جائے۔

(۵) اترپردیش میں کم از کم ایک یونیورسٹی ایسی ہو جہاں اردو زبان کو بتدریج ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

(۶) اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرنے والے اور اردو کے ذریعہ سے ادب اور سائنس کی اشاعت کرنے والے مشہور اداروں کو کافی مالی امداد ملنی چاہیے۔

(۷) اردو کے ایسے اہل قلم اور اہل علم کی جو اپنی قابلیت کی وجہ سے ممتاز ہوں ریاستی حکومت کی طرف سے انعامات اور عطایا کے ذریعے سے ہمت افزائی کی جائے۔

سب سے پہلی اردو گرامر

۱۷۱۵ء میں جان جوشوا کیٹلر نام کے ہالینڈ کے ایک باشندے نے تحریر کی۔ وہ شاہ عالم اول کے دور میں ۱۷۱۲ء میں ہندوستان آئے تھے۔ موصوف نے ہندوستانی زبان کی ایک لغت بھی ترتیب دی، جسے ۱۷۴۳ء میں زیور اشاعت سے آراستہ کیا گیا۔

(۸) ہندوستانی ایکڈمی میں اردو کے اہل قلم کو کافی نمائندگی دی جائے۔

(۹) سرکاری اور سرکاری امداد پانے والے کتب خانوں کے لیے اردو کی کتابیں بھی مہیا کی جائیں۔

(۱۰) اردو میں لکھی ہوئی عرضیاں ریاست کی عدالتوں اور دفتروں میں قبول کی جائیں اور ان پر توجہ کرنے اور ان کا فیصلہ کرانے کی آسانیاں مہیا کی جائیں۔

(۱۱) گورنمنٹ کی شائع کردہ ضروری اطلاعات، قوانین اور مطبوعات اردو میں بھی شائع کی جائیں۔

آخر میں ہم جناب والا کی خدمت میں اس امر پر گہرے تشکر کے اظہار کی اجازت چاہتے ہیں کہ جناب نے ہم کو اپنے حضور میں ایک ایسے مسئلہ کو پیش کرنے کا موقع دیا جو ہندوستان کی آبادی کے ایک بڑے حصہ کے دلوں کو بہت عزیز ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ جناب والا کی طرف سے ایک لطف آمیز اشارہ بھی اس عظیم الشان سرزمین کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد کو مضبوط کرنے میں بڑا کام کریگا اور ایک دل شاد اور متحد ملک کے نصب العین کے حصول میں معاون ہوگا۔

(معروضہ اراکین وفد انجمن ترقی اردو ہند) ★

لکھنؤ کی دو طوائفیں

زہرہ اور مشتری

تلخیص صابر علی

زہرہ اور مشتری خیرآباد کی دو ڈیرے دار طوائفیں تھیں جنہوں نے غالب کی زندگی میں ان کے خلاف ایک اچھا خاصا ادبی محاذ قائم کیا ہوا تھا۔ ان دونوں بہنوں کے تنقیدی مضامین اودھ وغیرہ میں شائع ہوا کرتے تھے۔ طوائفوں کے بازار میں زہرہ — بی چھتن ،، اور مشتری ” قمرن جان عرف منجھو کے نام سے مشہور تھیں۔ یہ دونوں تعلیم یافتہ اور آغا علی شمس کی شاگرد تھیں۔ ان دونوں کی علمی قابلیت اور شعری صلاحیتوں کے بارے میں مورخین نے پورے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ ان کی ذاتی قابلیت اور ذہنی صلاحیت کا نمونہ ہیں اور ان میں ان کے استاد شمس کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا اس دور کے کسی استاد سے ان کے لائق شاگرد کو مل سکتا ہے۔

امام باندی عرف چھوٹی بی، طوائف کی یہ دونوں لڑکیاں اپنی ماں اور خالہ الٰہی بخش کے ساتھ بچپن ہی میں خیرآباد سے لکھنؤ چلی آئی تھیں۔ لکھنؤ کی شائستہ محفلوں میں پلی بڑھیں اور لکھنؤ ہی میں پیوند خاک ہو گئیں — مولانا حسرت موہانی مرحوم ان دونوں طوائفوں کے تذکرے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

لکھنؤ ہی نہیں دونوں بہنوں کی دھوم سارے ہندوستان میں مچ گئی اور وہ بھی اس شان سے کہ زہرہ اور مشتری دو جداگانہ ہستیاں ہونے کے باوجود کچھ اس طرح لازم و ملزوم کر دی گئیں کہ آج زہرہ و مشتری کے ذکر میں کوئی تفریق نظر نہیں آتی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کسی ایک ہی منفرد ہستی کا نام ہے۔ حالانکہ شعرائے اردو فارسی کے تمام تذکروں میں ان دونوں کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ تذکرہ بہارستان ناز، جو ان دونوں بہنوں کی زندگی میں چھپا تھا، اس میں دونوں کا ذکر موجود ہے۔

” زہرہ — تخلص۔ امراؤ جان نام۔ بی چھتن صاحبہ مشہور۔ حرکوں میں مشاق۔ شوخ طبعی میں شہرۂ دور دور۔ میر آغا علی خاں کی شاگرد ہیں اور انھوں نے بی ما بدولت میرزا، کا شہرہ اظہر من الشمس ہے۔ زہرہ کی زبان کو انھوں نے چمکایا ہے۔ شاگرد اچھا ہو تو فخر استاد ہے۔ زہرہ کی بدولت میاں شمس کی ہر دم سب کو یاد ہے۔ اور مشتری کی تحریر سے معلوم ہوا کہ پانچ برس سے شاعرہ نے کسی رئیس سانی خاندان سے عقد کر لیا —

اپنا دامن تر گوہر ہائے توبہ و استغفار سے بھر لیا۔ شعر گوئی کو بھی ترک کر دیا۔ دیکھیے اچھوں کی صحبت نے اچھا ہی اثر دیا۔ خدا کرے کہ چیک کی عادت نہ اختیار کرے۔ ہمیشہ کے لئے پردہ نشینی ہی اپنا شعار کرے۔"

اس کے بعد زہرہ کے اردو کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔ دوسری جگہ مشتری کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے:

"مشتری تخلص، موسوم قمرن جان معروف بہ لکھنؤ کی رہنے والی۔ شاعری میں خیال بے مثالی، طبیعت نہایت تیز، فکر رسا ہے، میاں شمس کی تعلیم یافتہ ہے، ماشاءاللہ جیسے استاد کی مشہور طبیعت ہے ویسی ہی زہرہ و مشتری کو شہرت ہے۔ اور کیوں نہ ہو، جب تعلیم میں استاد صاحب اس قدر خیال سے بتائیں تو شاگرد کیوں نہ گھر گھر شہرت پائیں واقعی یہ کہ حضرت شمس نے ان دونوں برکالۂ آتش کو ایسا چمکایا ہے کہ فلک پر زہرہ و مشتری کا رنگ اڑا دیا ہے اگر چندے اسی طرح تعلیم پائیں گی تو مشتری اپنے تئیں فلک پر پہنچائیں گی، سات برس کی عمر سے اس شاعرہ کو شوق نوشت و خواند ہے۔ یہ ستارہ جلوہ ریزی حضرت شمس سے سامانِ ظاہری سے درست اور اللہ کی دی ہوئی کچھ جائداد ہے، مسجد، امام باڑہ، باغ۔ مکان قدیم الایام بمقام خیرآباد ہے، اور فارسی نظم و نثر اور تاریخ گوئی۔ ان کے سوا مشق خط خفی و جلی سب میں طاق ہے۔ مگر پندار میں بھی شہرہ آفاق ہے خوش ایسے استاد شفیق کے سبب سے فن شعر کا کوئی دقیقہ نہیں باقی ہے۔ وہ کون بزم مشاعرہ ہے جہاں شمس و زہرہ و مشتری کی نہیں مشتاقی ہے۔ یہ شاعرہ بھی فن میں کامل کیوں نہ ہو اس کا استاد بھی تو صاحبِ کمال ہے۔ دیکھیے، مشتری عطارد رقم کا ۲۳ برس کی عمر میں ایسا ہو جانا استاد کی صاحبِ کمالی پر دال ہے۔ سبحان اللہ کیا ذہن آسمان پیوند ہے کوئی جھوٹ سمجھے یا سچ، ایک کے دل کی دوسرے کو کیا خبر مگر ہمیں تو جی سے اس کا کلام پسند ہے، ہاں اس قدر افسوس ہے کہ اس لیاقت علمی پر اپنے نزدیک بہت دور ہے جیسی آدمی میں جوہر لیاقت بھی ہے اور انکسار بھی ہے وہ تو نور علیٰ نور ہے۔

بتوں نے حسن پر نخوت اگر سیکھی تو کیا سیکھی
مکروہ ہو کے بد خصلت اگر سیکھی تو کیا سیکھی

مگر یہ جو اس کو نخوت ہے، کب خالی از حکمت ہے۔

ہماری رائے میں یہ وہ ٹیکہ ہے جس نے نظر بد سے اس کو بچا

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

لکھا ہے، المختصر جو انداز ہے اچھا ہے اب صفحۂ بہارستان ناز " ۱۳ ، غنچہ دہن کے اشعار سے گل بداماں ہے۔"
اس کے بعد مشتری کے بھی اردو فارسی اشعار کا ایک اچھا خاصا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔
یہ اقتباس کچھ کم ایک صدی ادھر کے ایک اردو تذکرے سے لیا گیا ہے جو غالب کی حیات میں چھپ چکا تھا، اگر دو تین سال ترتیب و تدوین کے بھی شامل کر لئے جائیں تو یہ انداز بیان پورے سو برس ادھر کا ظاہر ہے جس میں جگہ جگہ زہرہ و مشتری ہی پر نہیں ان کے استاد شمس پر بھی چوٹیں کی گئی ہیں۔
مشتری کے متعلق خان بہادر رضا علی وحشت نے لکھا ہے۔ مشتری سیتاپور ضلع خیر آباد (خیر آباد ضلع سیتاپور صحیح ہے) کی ایک مشہور رقاصہ تھی مگر ہمیشہ لکھنؤ میں رہی، نام قمرن جان تھا عرف بی مجھو علم موسیقی میں گھسیٹ خاں اور حیدر علی خاں قوال کی شاگرد تھی۔ شاعری کا سن شعور سے شوق تھا۔ آغا شمس کی شاگرد تھی، مشتری کا ایک دیوان فارسی موسوم " خانۂ خیال " طبع ہو گیا ہے۔
یہ شعر بہت جلد کہتی تھی۔ جب مہاراجہ مہندر سنگھ..... والیٔ پٹیالہ لکھنؤ آئے تو مشتری نے سرِ محفل چند اشعار مدح میں نظم کئے اور اجازت لے کر ان کو پڑھا۔ مہاراجہ بہت محظوظ ہوئے اور ایک ہزار روپے انعام میں مرحمت فرمائے، آخر میں تائب ہو کر ناچنا گانا چھوڑ دیا تھا اور سید اعجاز حسین اعجاز سے عقد شرعی کیا تھا جو مرنے کے بعد اس کی تمام جائداد کے مالک ہوئے۔ جہاں حسن و جمال نے اس کے کمالات کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ صفاتِ حمیدہ نے عزیزِ خلق کر دیا تھا۔ فنِ شعر سے جیسا اس کو انس تھا ویسی ہی وہ اہلِ فن کی قدردان تھی۔ اطرافِ ہند کے مشاہیر سے روشناس تھی۔ لکھنؤ میں ناسخ۔ . سے اس کا تعارف ہوا اور... دونوں کا تعلق بہ درجہ تعشق پہنچ گیا۔
عبدالغفور نساخ نے سخنِ شعرا میں لکھا ہے (ص ۵۰۹)
"مشتری تخلص قمرن جان عرف مجھو طوائف، ساکنہ لکھنؤ۔ شاگرد آغا علی خان شمس۔ خوش طبع و خوش نویس و خوشگوار ہے۔ راقم الحروف سے اس شوخیٔ مجسم سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی —"
زہرہ مشتری سے بڑی تھی، مگر کسی تذکرے سے زہرہ کا سن پیدائش معلوم نہیں ہوتا۔ تذکرہ، بہارستانِ ناز کی اشاعت (۱۲۸۱ھ) کے وقت مشتری کی عمر ۲۳ سال تھی۔ اس حساب سے مشتری کا سن ولادت ۱۲۵۸ھ نکلتا ہے۔ مشاہیر نسواں میں مشتری کا سن وفات ۱۳۱۵ھ لکھا ہوا ہے
"مشتری لکھنؤ کی قمرن جان عرف مجھو طوائف کا تخلص ہے۔ یہ شاعرہ آغا علی شمس کی شاگرد تھی۔ بڑی اچھی طبیعت پائی تھی ۱۳۱۵ھ میں نذر اجل ہوئی۔"
گویا بوقتِ وفات مشتری کی عمر ۵۷ سال تھی۔
مشتری کی ماں امام باندی (وفات ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء) اگرچہ شاعرہ نہیں تھی لیکن اتنی حاضر جواب، پُرمذاق اور بذلہ سنج عورت تھی کہ بڑی بڑی محفلوں میں اچھے اچھے منہ کی کھا جاتے تھے ■■

اُردو کے ظریف شعراء

• بصیر نعیمی

کسی کو رُلانے کے مقابلہ میں ہنسانا ایک دشوار ترین کام ہے۔ اور پھر شاعر جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ہی دنیا میں مگن رہتا ہے اگر لوگوں کو ہنسانے کا بیڑا اٹھالے تو یہ ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ اُردو شاعری میں بہتات ایسے شعراء کی ہے جو بھونروں کی طرح رومانی پھولوں کے گرد ہی منڈلاتے رہے یا پھر درد و غم کے انتہاہ سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔ جو شعراء محبت کے راگ الاپتے ہیں بہت جلد ان کی شاعری غموں کا نقاب اوڑھ لیتی ہے۔ کیونکہ محبت کا انجام ہمیشہ ٹریجڈی پر ہوتا ہے۔ اگر محبوب بچھڑ جائے تو بھی ٹریجڈی اور اگر محبوب سے شادی ہو جائے تو بھی ٹریجڈی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شاعر کبھی اپنی بیوی کو موضوع بنا کر شاعری نہیں کرتا۔ اگر وہ چار چار بیویاں رکھتا ہو پھر بھی شاعری کرتے وقت اس کے تخیل میں ایک بھی بیوی نہیں آئے گی۔ شاعر صرف خیالی محبوبہ پر ہی اشعار کہتا ہے۔ اکثر یہ بھی دیکھا اور سنا گیا ہے کہ شاعر خیالی محبوبہ کے دن رات کے مظالم کی داستانِ پُر الم گنگناتا رہتا ہے۔ اور زوجہ محترمہ کی ذرا سی غلطی پر اس کے ہاتھ میں ڈنڈا نظر آتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ تو شاعر ہی جانے بہرحال اس سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ رُومانی شعراء کی شاعری محض خیالی ہوتی ہے۔

اس کے بجائے طنزیہ و مزاحیہ شاعری حقیقی شاعری کا ایک روپ ہے۔ ایک شاعر جو کچھ کہتا ہے یا محسوس کرتا ہے وہ طنزیہ یا مزاحیہ انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ طنزیہ و مزاحیہ شاعر صرف اپنی ہی خیالی دنیا میں بھٹکتا نہیں پھرتا ہے۔ بلکہ آنکھیں کھول کر اپنے چاروں طرف دیکھتا ہے وہ اپنے سامعین کو اپنا درد سنا کر غمگین بنانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو ہنسانا ہی اپنا نصب العین بنالیتا ہے۔ وہ سامعین کے ذہنوں کو ہلکے پھلکے خیالوں کی سیر کراتا ہے۔ وہ تھکے ہوئے ذہنوں کو مسرت کی غذا بہم پہونچاتا ہے۔ اس کے باوجود بھی ظریف شاعر کو وہ مقام حاصل نہیں ہو پاتا ہے جو کہ سنجیدہ شاعر کو حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہنسنے ہنسانے کے لئے ایک خاص قسم کے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے ایک احمق نہ تو کسی کو ہنسا سکتا ہے نہ خود تمیز سے ہنس سکتا ہے۔ کسی کو ہنسانے کے لئے ذہین ہونا ضروری ہے۔

جب سے اُردو نے جنم لیا ہے ظریفانہ شاعری نے مردہ دلوں میں کلیاں کھلانی شروع کر دیں اور پھر بلند قہقہوں سے زعفران زار کھلنے لگے۔ جیسے جیسے اُردو نے ترقی کی ویسے ویسے ظریفانہ شاعری بھی ترقی کی سمت لپکتی رہی۔ ہر دور میں اُردو نے بہترین طنزیہ و مزاحیہ شعراء پیدا کئے۔ آج دامنِ اُردو اس قسم کے شعراء سے مالا مال ہے۔ یہاں اُردو کے چند قابل ذکر طنزیہ و مزاحیہ شعراء کا مختصر تعارف اور نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

جعفر زٹلی :- اُردو نظم میں جعفر زٹلی کو پہلا ظریف شاعر مانا جاتا ہے جعفر کا زمانہ عالمگیر کا آخری دور ہے۔ اس دور

میں ہندوستان جس پر انسان بس اٹھتے جاتے وہ بخش تھی کیوں نہ ہو۔ ظرافت شعور کی حالی تھی۔ جعفر زٹلی ۱۶۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ ان کا آبائی وطن دلی تھا یا ٹھٹھہ۔ بچپن ہی سے مزاج میں ظرافت تھی۔ شاعری کا ذوق تھا۔ اس لیے جعفر زٹلی نے ظرافت شاعری کی

آپ نے اردو میں ایک ہزار سے زائد کتابیں لکھیں

مولانا اشرف علی تھانوی تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر۔ ہندوستان) مولانا کا مولد۔ پیدائش ۱۹ مارچ ۱۸۶۳ء وفات ۹ جولائی ۱۹۴۳ء۔ سلسلہ دیوبند سے متعلق تھے۔ ان کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ "دائرہ معارف اسلامیہ" اردو میں لکھا ہے کہ ان کی کتابوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔ یہ کتابیں زیادہ تر تفسیر، حدیث، منطق، کلام، عقائد اور تصوف سے متعلق ہیں۔ انکی اہم کتابوں میں قرآن پاک کی تفسیر بیان القرآن اور بہشتی زیور (عورتوں کے لئے اسلامی تعلیمات کا خلاصہ) نمایاں درجہ رکھتی ہیں۔

تھانوی اردو کے بڑے جوش بیان خطیب بھی تھے۔

ان کے مواعظ کا سلسلہ بھی چھپ چکا ہے فکر دینی میں ان کے امتیازی اوصاف یہ ہیں کہ انہوں نے دین کو سہل انداز میں پیش کرنے کے لئے اور اسلام کے احکام سے عام لوگوں کو روشناس کرانے کے لئے تقریر و تحریر دونوں سے کام لیا وہ علمائے دیوبند کے فکری مسلک سے متعلق ہونے کے باوجود ان کی سیاسی سرگرمیوں سے الگ رہے اور تصنیف و تالیف میں عمر گزاری۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت بھی کی اور اس طرح علوم ظاہری اور سلسلۂ طریقت میں پیوند قائم کیا۔ دینی فکر میں جدید نظریات و خیالات کا اثر بہت کم قبول کیا اور بطور حنفی مسلک کے احکام دین کی تشریح و تسہیل کی۔

ابتدا کی۔ ۱۷۱۳ء میں انتقال فرما گئے۔ نمونہ کلام: بوڑھی دلہن کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

کھول گھونگھٹ کیا دیکھوں بیچ — دھیمے بیٹھا گھونگھٹ بیچ
گھونسی گھاسی لنڈی منڈی — مہا انساحوں ساپ کی گنڈی
بالوں کا کیا کروں احوال — جیسے خچر کی ہوئے ایال
دانتوں کا کیا کروں بیان — جیسی کہ ماماں کی بان

سودا:۔ ۱۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ظریفانہ شاعری میں بھی جوہر دکھائے۔ جس سے ناراض ہوئے اس کی شان میں ہجو دے ماری۔ مزاج میں ملا کی بدلہ سنجی تھی۔ ۱۱۹۵ھ میں انتقال ہوا۔ ایک بوڑھے نے شادی کی تو سودا پھڑک کر بولے۔

جورو کہے ہے شیخ سے اے شیخ تم سنو
کھوئے کو تم نے دی ہے دعا چپکے ہو رہو
میں جانتی ہوں تم کو کہ تم فیلسوف ہو
سودا زیادہ کیا کہیے ہے بات گو مگو
جیسے ہیں تیسے تو ماں کھاتے ہیں شیخ جی

میر تقی میر:۔ فروری ۱۷۲۲ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور چھیاسی برس کی عمر پا کر ۱۸۱۰ء میں انتقال ہو گیا۔ میر کی زندگی نہایت عسرت میں گذری اسلئے ان کے کلام میں ایک درد پنہاں ہے۔ لیکن جب ہجو لکھنے پر آئے تو بے جھجک میدان ظرافت میں کود پڑے۔ ایک ہجو میں فرماتے ہیں ؎

سن لو ملے اہل سخن بعد از سلام — چھیڑتا ہے مجھکو اک تخم حرام
بیت بیتے سے رہا ہوں باوقار — کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار
مر کروں کیا لا علاجی ہی کا باب — غصے کے مارے چڑھی ہے مجھکو تپ
ایسے کہتے ہیں جواب شاعرینے — مدتوں یہ لونڈے آئے مجھ کنے
سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا
بیت کہنا چاہتا ہے سو ہنر — شاعری سمجھا تھا کیا خالہ کا گھر

انشاء:۔ سید انشاء اللہ خاں نام انشاء تخلص ۱۷۵۶ء میں مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۷۷۱ء میں لکھنؤ چلے گئے طبیعت میں غضب کی ظرافت تھی۔ لکھنؤ میں اکثر مصحفی سے معرکے ہوتے

آخر ۱۸۱۰ء میں انتقال ہوگیا مصحفی کی ہجویں کہتے ہیں۔

آئینے کی گر سیر کرے، شیخ تو دیکھے
سرخر کا، منھ خوک کا، لنگور کی گردن

حاسد تو ہے کیا حیز کرے نصد جو انشار
تو توڑ دے جھٹ بلغم باعور کی گردن

معرفات :-

جی چاہتا ہے شیخ کی پگڑی اتاریئے
اور ہاں کر چٹاخ سے اک دھول ماریئے

یہ جو بوڑھا سا ہے دربان تمہارا اے کاش
کوئی چور آوے اور اس کی کوئی گردن مارے

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر
فعلِ بد تو خود کرے لعنت کرے شیطان پر

ٹک ریخ سیہ رو کے تبسم کو نہ دیکھو
معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہنستا ہے توا گرم

بڑی داڑھیوں پہ نہ جاد لا، یہ سب آہوؤں کے ہیں مبتلا
یہ شکار کھیلتے ہیں سر ملا انہیں ٹٹیوں کی تو آڑ میں

مصحفی :- شیخ غلام ہمدانی مصحفی ۱۷۴۹ء میں اکبر پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی اس کے بعد کچھ دن دہلی میں قیام کیا اور پھر لکھنؤ آگئے اور ۱۸۲۵ء میں لکھنؤ میں ہی انتقال ہوا۔ ساری زندگی انشار سے دو دو چونچیں ہوتی رہیں۔ غضب کے عاشق مزاج تھے۔ کھٹملوں سے پریشان ہوکر کہتے ہیں ؎

کھٹملوں کی زبسکہ ہے افراط ۔ تلخ ہے ان سے اپنا خواب نشاط
بانچے میں کبھی گھس آتے ہیں ۔ کبھی نیفے میں سرسراتے ہیں
مارے جو موٹے موٹے چن چن کر ۔ چھینٹ کا تھان بن گئی چادر
دشمنِ حال یہ مصحفی کے ہیں ۔ تشنۂ خوں یہ ہر کسی کے ہیں

رنگین :- سعادت یار خاں رنگین ۱۷۵۶ء کے لگ بھگ سرہند میں پیدا ہوئے۔ بچپن دہلی میں بڑے عیش و آرام میں گذرا۔ پندرہ سال کی عمر سے ہی شعر کہنا شروع کر دیئے۔ ریختی میں تقریباً ایک سپارہ

میر مہدی مجروح

مجروح، میر حسین فگار کے بیٹے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ انہیں غالب کی شاگردی پر فخر تھا، اور غالب بھی انکو اپنا محبوب شاگرد سمجھتے تھے۔ آخر میں رامپور چلے گئے تھے۔ ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء کو حالت نابینائی میں وفات پائی

غزلیں کہیں۔ ۱۸۳۵ء میں انتقال ہوگیا۔

نیند آتی نہیں کمبخت دوائی آجا ۔ اری بی کوئی کہہ اپنی کہانی آجا
بال ماتھے کے جو ڈورے سے کر لئے ہیں تو ۔ شکل لگتی ہے بڑی آج ڈرانی آجا
یا رب شب جدائی تو ہرگز نہ ہو نصیب ۔ تندی کو روں تو چاہے کو ٹھے میں پٹی ڈال

ہدہد :- عبدالرحمٰن نام ہدہد تخلص تھا۔ بہادر شاہ کے دور میں دہلی آئے اور یہیں بس گئے ان کا بہت کم کلام ملتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں قصیدہ لکھ کر دربار میں پیش کیا تو بہادر شاہ نے طائر الاراکین، شہپر الملک، ہدہد الشعراء منقار جنگ بہادر کے خطاب عطا فرمائے۔

قصیدہ کے چند اشعار لوں نقل ہے ؎

جو تیری مدح میں تیں چونچ اپنی وا کردوں
تو رشکِ باغِ ارم اپنا گھونسلا کردوں

جو آئے یہ زکر سے مرے آگے موسیقار
تو اسکے کان مروڑوں کر بے سرا کردوں

جو رکھتی کبھی آگے مرے ہما آکر
تو اس کے توت کے پر شکل نو لا کردوں

تاتی: محمد سا رم اور تاتی تخلص ساتھاں آ . . . کے رہنے
والے تھے۔ ملاکے تر مذاج تھے۔ راہ چلتے جس سے الجھ لے
اسے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ نادر شاہ نے جب ہندوستان پر
حملہ کیا اس وقت تاتی دہلی میں تھے۔ حالی مزاحیہ شاعر تھے۔
ان کا کلام ہے

یہ ڈر کو یار کو کہ خط رکھا بابا منہ آتا ہے
مسرت کی خاطر لطف دوسری بار آتا ہے

سب کرا دہ لطف کردل مال بادشا علام ہے میرا

صدر جمہوریہ سے اردو وفد کی ملاقات

۱۵ فروری ۱۹۵۴ء کی شام اردو کی تاریخ میں ایک ناقابل فراموش شام بن چکی ہے۔ اس شام مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں انجمن ترقی اردو ہند کے ایک وفد نے تقریباً ۲۱ لاکھ دستخطوں کے ہمراہ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ اردو کو یوپی کی علاقائی زبان تسلیم کیا جائے۔ یادداشت کے ہمراہ لاکھوں دستخطوں کے ہزاروں بنڈل بھی تھے جو انجمن ترقی اردو ہند کے دفتر علی گڑھ سے ایک ٹرک میں لاد کر دہلی لائے گئے تھے اور صدر جمہوریہ ہند کو پیش کئے گئے تھے۔ انجمن ترقی اردو کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے ہمراہ وفد میں ۱۲ ممبران تھے۔ وفد تقریباً ۴۵ منٹ تک صدر جمہوریہ ہند کے پاس ٹھہرا تھا۔ صدر جمہوریہ ہند نے وفد سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں حکومت سے مشورہ کریں گے۔

وظیفہ راگنی کے سر میں زاہد کفر ہے پڑھنا
نہیں تسبیح تیرے ہاتھ میں یہ راگ مالا ہے

نظیر اکبر آبادی:- شیخ ولی محمد نظیر ۱۷۳۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے احمد شاہ ابدالی نے جب دہلی پر حملہ کیا تو نظیر آگرہ چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ معلمی گذر اوقات کا ذریعہ تھی۔ نظیر کو جدید شاعری کا موجد مانا جاتا ہے۔ ۱۸۳۰ء میں انتقال ہوا۔ نظیر نے مزاح کو طنز کے تیروں میں پرو کر پیش کیا ہے۔ نظیر ملا کی تعریف یوں کرتے ہیں ؎

ملا جو دینے ہاتھ گھر گھر میں جاتے ہیں
حلوہ کہیں، کہیں وہ چپاتی اڑاتے ہیں

مفلس کوئی بلائے تو منہ کو چھپاتے ہیں
شکر کا حلوہ سنتے ہیں تو دوڑے جاتے ہیں

کہتے ہوئے نہ دل میں ابابیل شب برات

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں اور نمازیاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

(آدمی نامہ)

جان صاحب:- میر یار علی نام اور جان صاحب تخلص اختیار کیا۔ وطن لکھنؤ تھا لیکن پریشاں حالی سے مجبور ہو کر ۱۸۴۴ء میں دہلی جا کر سکونت اختیار کی۔ شاعری میں صرف ریختی کو ہی اپنایا اور لطف یہ کہ مشاعروں میں بھی زنانہ لباس میں جاتے تھے۔ عورتوں کے محاورات اور عام بول چال کو نہایت خوب صورتی سے اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔

نہ دیکھ دولھا کو ساس نندوں کے آگے گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر
نئی نویلی دلہن ہے بچی ابھی تو دو چار دن جتا کر
نصیب سیدھا اگر ہے میرا لکھی نکلے گی گھات اس کی
وہ سکھ نہ پائے گی جس نے بھیجا ہے راشی بنی تمہیں پڑھا کر

ہمسائی میرے سر کی قسم آئیو ضرور
کونڈا کروں گی جمعہ کو سید جلال کا
خوب بھڑکایا تھا اس کو سوت نے
یں ہوئی جب گرم ٹھنڈا ہوگیا
گرگٹ کی طرح کالا کبھی لال ہوگیا
غصہ سے مردوے کا عجب حال ہوگیا

محسن :- محمد محسن خاں محسن کا آبائی وطن خان پور تھا لیکن ملازمت کے سلسلہ میں لکھنؤ آئے اور یہیں ریختی گوئی کو اپنایا۔ ان کے کلام میں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہوں کی زبانوں کی چاشنی ملتی ہے۔ محسن کے علاوہ منتہا بھی تخلص اختیار کر رکھا تھا ؎

بگاڑوں گی میں بھی حال گھر کا، وہ ڈالیں مجھ پر وبال گھر کا
کھلائیں رنڈی کو مال گھر کا، نکالیں مجھ پر غبار اپنا
خاک گائے گا نگوڑا شیخ اپنی بزم اپنی
جانتا سُر ہی نہیں بھڑوا جو اپنی تان کا

کہاں سے لائے گا دم موا وہ، بڑا ہی دمیانہ ہے بوا وہ
سراپا سلفہ موا ہوا وہ، چرس نگوڑی کی اڑا اڑا کر

اکبر الہ آبادی :- سید اکبر حسین رضوی اکبر ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو الہ آباد کے قصبہ بارہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے بعد نائب تحصیلدار ہوگئے اور ترقی کرتے کرتے جج کے عہدے تک پہونچ گئے۔ حکومت نے خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔ طبیعت میں بلا کی ظرافت تھی۔ قوم کی گرتی حالت دیکھتے اور سوتے ہوئے ذہنوں کو طنز کے نشتروں سے جگانے کی کوشش کرتے۔ کلام میں مزاح کے ساتھ طنز نمایاں نظر آتا ہے۔ ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء میں انتقال ہوا۔
نمونہ کلام ؎

اب تو پھس پھس کر لیا اور چلدیئے گودام کو
جن سے مسجد گونجتی تھی وہ نمازی اب کہاں
پکالیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا
انھیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی

نظیر اکبر آبادی

نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہوکر
دھمکا کے بوسہ لوں گا رخِ رشکِ ماہ کا
چندہ وصول ہوتا ہے صاحب دباؤ سے

گل پھینکے ہیں یورپ کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے نیچر و سائنس بھلا کچھ تو ادھر بھی
تعلیم دختراں سے یہ امید ہے ضرور
ناچے دلھن خوشی سے خود اپنی برات میں
جب کہا میں نے کہ پیارا آتا ہے مجھ کو تم پر
ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو آتا کیا ہے

حالی:۔ مولانا الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ جب صرف نو برس کے ہی تھے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ حالی دلی چلے گئے۔ غدر کے بعد لاہور میں [illegible] کو شعر و شاعری سے [illegible] طبیعت میں سادگی، خلوص [illegible] تھی [illegible] ۱۹۰ [illegible] حالی نے [illegible] ہندوستانی روایت [illegible] کی طرح [illegible] پیش [illegible] سمجھے حالی نے [illegible] اس مقصد کیلئے [illegible] وقف کئے۔

[illegible]

[illegible]

کی ہوس کسی نے کیجے اب کیا ہے علاج

دنیا کو کھا لی جان جی ہے وبال

دیکھو جس ملت کی جانب [illegible]

کھو کے دیاں سے کوئی برکت کا قدم

تو کوئی سنگم ہے منبع دولت

سنا ہے کوئی مولوی وزیر اعظم

چھیڑ کر واعظ کو حالی، خلد سے

بستر اکیوں اپنا بچکوانے ہیں آپ

ریاض خیرآبادی:۔ سید ریاض احمد نام ریاض تخلص ۱۸۵۵ء میں خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ ایران سے آئے تھے ریاض کا ابتدائی دور گورکھپور میں گذرا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر پولیس میں نوکری کی لیکن بعد کو نوکری چھوڑ کر اخبار نویسی کو پیشہ بنایا اور یکے بعد دیگرے کئی اخبار نکالے جیسے "تار برقی" "گلکدہ ریاض" "معطر فتنہ" وغیرہ وغیرہ۔ مزاج میں شوخی زیادہ ملتی ہے۔ ریاض نے ۲۸ جولائی ۱۹۳۴ء میں وفات پائی۔ نمونہ کلام:۔

اک ٹیپ ماری رور سے زاہد کے لیے ریاض

اب ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں

یہی داڑھی نے آبرو رکھ لی

قرض پی آئے اک دوکان سے آج

اتر گئی سر بازار شیخ کی پگڑی

گرہ میں دام نہ ہونگے ادھار پی ہوگی

مہدی افادی

مہدی حسن نام، گورکھپور وطن ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے علی گڈھ میں تعلیم پائی اور ۱۹۲۱ء میں انتقال ہوا مہدی حسن مشہور انشا پرداز ہیں اور اسی انشا پردازی

نے ان کو زندہ رکھا ہے۔ اردو لٹریچر کا نہایت لطیف اور صحیح مذاق رکھتے تھے ان کی نثر میں انشا پردازی کی چاشنی اور زبان و بیان کا بانکپن ہے۔ یہ نثر میں شاعری کرتے تھے۔ ان کی نثر میں وہ خصوصیات ملتی ہیں جو زندہ ادب میں ہونی چاہئیں۔ انہوں نے چند مضامین لکھے ہیں لیکن اپنی نثر کی رنگینی اور لطافت کی وجہ سے اردو زبان کے انشا پردازوں میں ممتاز حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ان کے مضامین میں جدید تنقید نگاری کے بہترین نمونے، ادبی منصوبے، ادبی تجاویز، ادبی اشارے اور مختلف ادبی شخصیتوں کے متعلق جامع خیالات ہیں۔

سایۂ تاک میں واعظ کو جگہ دی ہم نے
آج شیشے میں اسے ہم نے اتارا کیسا
قرض لایا ہے کوئی بھیس بدل کر شاید
مے فروشوں کا ہے واعظ سے تقاضا کیسا

ڈاکٹر اقبال :- شاعر مشرق نہ صرف فلسفی شاعر تھے بلکہ طنزیہ و مزاحیہ رنگ میں بھی شعر کہے ہیں۔ اقبال نے سوئے ہوئے ذہنوں کو اپنے ترانوں سے جگایا، وہ سدا آسماں کی سمت مائل پرواز رہے مگر انھوں نے مسکراہٹ کی کلیاں بھی چٹکائی ہیں، طنز کے تیر بھی چلائے ہیں۔ مثلاً

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

دستور تھا کہ ہوتا تھا پہلے زمانہ میں
ملّا کا محتسب کا، خدا کا، نبی کا ڈر
دو خوف رہ گئے ہیں ہمارے زمانہ میں
مضمون نگار بیوی کا، سی آئی ڈی کا ڈر

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسال کابل سے، کفن جاپان سے

ظفر علی خاں :- مولانا ظفر علی خاں ۱۸۷۰ء میں کوٹ مہرتھ ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے بی اے کیا، کچھ دن وہیں محسن الملک کے سکریٹری رہے پھر محسن الملک کی سفارش پر فوج میں چلے گئے۔ مولانا جذبۂ توحید سے سرشار تھے۔ انگریزوں کے دشمن تھے۔ اور اس دشمنی نے کئی بار جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچایا۔ "زمیندار" میں طنز و مزاح کے پھول بکھیرتے رہے۔ اخبار مفت منگانے والوں سے فرماتے ہیں ؎

ڈاکٹر اقبال کا ایک نادر و نایاب فوٹو

کارڈ اک بیرنگ لکھا ہے منگانے کے لئے
بند ہو کر ڈاک میں اخبار مفت آ جائے گا
اک نئے پرچے کی میں ہر روز کر لیتا ہوں سیر
یوں ہی قاصد سال بھر تا مے یہ نامہ لائیگا
کونڈی ڈنڈا مجھ رنگیلے کا سلامت چاہئے
بھنگ ہر چیلے مرا داتا مجھے پلوائے گا
ہے غرض پرچے سے مطلب اسکے مالک سے نہیں
مجھ کو اس سے کیا وہ اسکو کس طرح چھپوائیگا

صدر اعظم کی سخاوت میں نہیں ہم کو کلام
لیکن ان سے پوچھتے ہیں ہم کہ ہم کو کیا دیا
اپنے پینے کیلئے شمپین بھر لی جام میں

سد کے رہدان و رد آتشام کو ٹھکرا دیا
مسوہ حوری کے لیے جینے لگے جب گول میز
رکھ لیے خود معترضلکوں پر تمیں ٹھکرا دیا

فوق، منشی محمد الدین فوق ۱۸۷۷ء میں کشمیر میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کے بعد اخبار نویسی کے میدان میں قدم رکھے۔ پہلے پہل ہفتہ وار "کشمیر" سے جاری کیا۔ اس کے بعد ماہنامہ "کشمیر میگزین" جاری کیا۔ فوق نے اخبار نویسی کے ساتھ ساتھ معلوماتی کتب لکھیں۔ اخبار کے قارئین کی دلچسپی کیلئے مزاحیہ رنگ میں شاعری بھی کی۔

خدا ہی آبرو رکھے تو رکھے فوق اس گھر کی
میاں ہو جس کا جاہل اور ہو اخبار خواں بی بی
کاش کچھ ان کے دلوں میں بھی خدا کی یاد ہو
گو رمانوں پر بہت ہے "با خدا" کشمیر میں
ہو گئیں ٹھنڈی مری اہل وطن کی گرمیاں
"کانگڑی" کی جگہ ہے اب "کانگڑا" کشمیر میں
خون مسلم تیغ مسلم سے جہاں ہو رات دن
کی یزیدوں نے وہ پیدا کربلا کشمیر میں

جوش ملسیانی، پنڈت لبھو رام جوش جالندھر کے قصبہ ملسیاں

مولانا یعقوب گمنام

مولانا یعقوب تخلص گمنام ۱۳؍صفر ۱۲۴۹ھ کو نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ آپ مولانا مملوک علی کے صاحبزادے تھے دہلی کالج سے تعلیم پانے کے بعد آپ اجمیر کے اسکول میں ملازم ہوئے۔ پرنسپل نے آپ کی ذہانت و ذکاوت دیکھ کر آپ سے پوچھے بغیر گورنمنٹ کو سفارش کر کے ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ منظور کرا لیا۔ جب آپ کو اس کی اطلاع دی تو آپ نے تعلیم و تدریس کو مقدس سمجھ کر اس کو منظور نہیں کیا۔ اجمیر سے بنارس اور بنارس سے دلی میں تبادلہ ہو گیا۔ وہاں سے ڈپٹی انسپکٹری پر سہارنپور تشریف لے گئے۔ ڈیڑھ سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد غدر کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے فرو ہونے کے بعد آپ کو سہارنپور کے اسکول سے چھ مہینے کی تنخواہ نو سو روپے بھیجی گئی اور ملازمت پر بلا لیے گئے۔ آپ نے وہ نو سو روپے واپس کر دیئے اور کہا کہ میں نے ان چھ مہینے میں کچھ کام نہیں کیا۔ اس لئے اس تنخواہ کا میں مستحق نہیں ہوں۔

۱۲۸۲ھ میں دیوبند کے مدرسے کا خاکہ بنایا جا رہا تھا، اس وقت مولانا قاسم کی چٹھی پہنچی کہ آپ دیوبند تشریف لے آئیے۔ چنانچہ جب دیوبند چھتے کی مسجد میں مختصر سا مکتب قائم ہو گیا تھا اور ۲۱ طالب علم تھے، آپ اس کے سب سے پہلے مدرس مقرر ہوئے اور ڈیڑھ سو روپے کی ملازمت کو لات مار دی اور ۳۰ روپے تنخواہ لینی منظور فرمائی۔

مولانا یعقوب شاعری بھی فرماتے تھے۔ اس علمیت کے بعد اور ایسے باپ کے بیٹے ہوتے ہوئے کسی کے شاگرد نہیں ہوئے تاریخ گوئی میں آپ کو خاص ملکہ تھا۔ آپ نے بڑا طویل شجرہ چشتیہ خاندان کا لکھا ہے۔ نمونہ کلام

شیخ کو مسجد ہوئے اور مغ کو بت خانہ نصیب
کر طلب کا اپنی مجھ کو جوشِ مستانہ نصیب
خلق کو ہوتا ہے حج زیارتِ خانہ نصیب
کر مجھے اپنی مدد سے حجِ مردانہ نصیب
حاجی امداد اللہ ذوالعطا کے واسطے
بس چھڑا دے نفسِ شیطاں سے الٰہی دل مرا
کر مشرف عشقِ رحماں سے الٰہی دل مرا
پاک کر ظلمتِ عصیاں سے الٰہی دل مرا
کر منور نورِ عرفاں سے الٰہی دل مرا
حضرتِ نورِ محمد پُر ضیا کے واسطے

میں یکم فروری ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ جوش کے کلام میں محض زبان کی الٹ پھیر نے ایسی شگفتگی، شوخی اور ظرافت کا ثبوت دیا ہے کہ لبوں پر بے اختیار تبسم رقص کرا ٹھتا ہے۔ جوش نے طنز کی تیزی کو متانت میں چھپا کر مزاح سے تعمیری کام لیا ہے۔

بنگلہ ہی نہیں گور بھی انساں کیلئے ہے
یہ مٹیا محل بھی اسی مہماں کے لئے ہے

دل لے کے کہتے ہیں کہ نوشت اسکی دیجیے
ایسا نہ ہو کہ بعد میں جھگڑا کرے کوئی

راہ عدم میں چور ہی اتنا کرم کرے
چپکے سے لے اڑے میری گٹھڑی گناہ کی

یقیں اے دل نہ کر تو حضرتِ واعظ کی باتوں کا
یہ لمبی داڑھیوں والے بڑے عیار ہوتے ہیں

وہ شست باندھ کر کہتے ہیں لیجیے حضرت
یہ تیر آپ کلیجے کے پار دیکھیں گے

عدل یہ تھا حسن والوں سے بھی ہوتی باز پرس
کیوں فرشتوں کو اسیرِ چاہ بابل کر دیا

ہمارے عشق نے مفہوم لفظوں کا بدل ڈالا
کہ جو دم پر بنا دے ہم اسے ہمدم سمجھتے ہیں

ظریف لکھنوی:- سید مقبول حسین ظریف حضرت صفی لکھنوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ طبیعت میں غضب کی شوخی اور ظرافت تھی شاعری کی ابتدا "اودھ پنچ" سے کی اور بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ نمونہ کلام ؎

بھائی مولا بکس جس بستی میں ہم آباد ہیں
اس جگہ شاعر بڑے پڑھیا ہیں مادرجاد ہیں
ان سبھوں میں سیکھ بدلو اک جگت اساد ہیں
ان کو ہر موکے کی کجلیں منھ جبانی یاد ہیں
جس جگہ استاد نے دو تین کجلیں جھاڑ دیں
شاعروں نے ہو کے سرمندہ بیاجیں پھاڑ دیں
سن لیجے بغیر اس کے بے تشبیہ بھی نازک

مولانا ظفر علی خاں

عیسیٰ ہیں اگر آپ تو اک پالیئے خر بھی
جب مسیحا سے نہ اچھے ہو سکے بیمار غم
ہو کے کھسیانے سبھوں کو شکھیا دینے لگے

دور تک آہ رقیبوں کو بھگا آتی ہے
پھر اڑ جاتے ہیں جس وقت ہوا آتی ہے

احمق پھپھوندوی:- مصطفیٰ خاں نام، احمق تخلص، پھپھوند ضلع اٹاوہ وطن ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کئی بار جیل کی سیر کی۔ احمق نے سیاست، مذہب اور معاشرت کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ۸ر اگست ۱۹۵۷ء کو انتقال فرما گئے۔ نمونہ کلام ؎

ہی حد بندیاں ہونے کو ہیں آئینِ گلشن میں
کہو بلبل سے اب انڈے نہ رکھے آشیانے میں

جو ارزاں ہے تو ہے ان کی متاعِ آبرو ورنہ
ذرا سی چیز بھی بے حد گراں ہے اس زمانے میں

دل دیوانہ اپنا مبتلائے زلفِ پیچاں ہے

دستش ملیانی جانشین حضرت داغ دہلوی

یہ سوچ ہمارے جیل میں جانے کا ساماں ہے
سمجھی جاں کسی سے ایسے جو جاب بہادر
لولی اصل اگر ماات ہم لحد میں جا کے
میرے سنبھالنے کی فکریں لو لحد کی حس
پہلے ذرا تم اپنا تلون تو سنبھالو
صحبتِ صالح میں رہ کر ہو گئی اصلاحِ حال
مں گدھا تھا سیخ کے پاس آ کے خچر ہو گیا
ایسے وعدے سے تو اچھا تھا کہیں انکارِ وصل
دو جیسے ہو گئے ظالم کو ترغاتے ہوئے
لڑکپن ہی میں حسن کو دل چرا لینے کی عادت ہے
ڈکیتی پر بھی آ جائیں گے وہ تا بد جواں ہو کر
دل جس پہ مٹا ہے بس ہے وہی دل آرا
مانا ہیں داغ رخ پر، مانا ہے گچھ سر میں
کہتے نہ تھے کہ دیکھو دشمن سے دور رہنا
اب کیا بتائیں تم کو کیوں درد ہے کمر میں

شاد عارفی :- خان احمد علی شاد ریاست لوہارو میں ۱۹۰۳ء
میں پیدا ہوئے لیکن مستقل سکونت رام پور میں اختیار کی۔

خوبصورت الفاظ کے پردے میں ہلکی ظرافت کے ساتھ نازک طنز
کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ایک نظم "آپ کی تعریف" میں فرماتے ہیں

یہ مدرس ہیں کسی اسکول میں
پانچ بچے، ایک بیوی ایک ماں   بس ماہانہ، بہت میں کم کہاں؟
ایک جوڑے بیچ کر سیتے ہیں   سول بھی غائب اگر پیسے نہیں
لوٹ کر آئے ہوں جیسے دھول میں   یہ مدرس ہیں کسی اسکول میں
بی ٹی لے ایم اے خاں ہے۔
یہ شکایت بے حد اسے آپ کو   کیوں نہ مغرب نے اتارا باپ کو
عہد کالی ماں "سے فرمانے رہے   اور مشرق میں جنم پائے رہے
ناچتے جا جا کے" اُن مال" میں   پھانستے شہزادیوں کو جال میں
ان کی جگت پر تو حیران ہے   بی ٹی لے ایم اے خان ہے

محمد لاہوری :- عبدالمجید چوہان نمک لاہوری ۱۹۱۳ء میں مقامِ
گجرات پیدا ہوئے۔ ذریعہ معاش صحافت تھا۔ "نمکدان" لاہور اور
"جنگ" میں لکھتے تھے۔ مزاحیہ شاعری میں کافی شہرت حاصل کی۔
۲۶ جون ۱۹۵۷ء کو عالمِ فانی سے کوچ کر گئے۔ "منکہ ایک منسٹر
ہوں" مشہور نظم ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مرغوں پر بھی کر سکتا ہوں اظہارِ خیال
اور سانڈوں پر بھی ہوں محفل میں سرگرمِ مقال
ریس کے گھوڑوں پہ بھی تقریر کر سکتا ہوں میں
اکبر و اقبال کی تفسیر کر سکتا ہوں میں
بوعلی سینا کی حکمت بات افلاطون کی
ایگریکلچر ہو یا شق ہو کوئی قانون کی
داغ کا دیوان ہو یا ہو وہ ایٹم بم کا راز
ماہی گیری ہو کہ ربط و ضبطِ محمود و ایاز
کشتۂ فولاد ہو یا شربتِ دینار ہو
ہے ضروری سب پہ میری رائے کا اظہار ہو
جتنے بھی شعبے ہیں ان سب پر ہوں میں چھایا ہوا
ہوں منسٹر مستند ہے میرا فرمایا ہوا

جیسیں تمیر کاشمیری :- ۱۸۹۴ء میں کشمیر میں پیدا ہوئے

ابتدا سے ہی صحافت سے دلچسپی تھی۔ پہلے خود ایک پرچہ نکالا بعد میں "زمیندار" کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ شاعری میں کھانے کی چیزوں کا زیادہ ذکر آتا ہے۔

جو کوفتوں کو چکھ چکے تو فیرنی کو چٹ کیا
جو تو رہے یہ آگرے تو خالی ایک مٹ کیا

المدد اے جذبۂ مرغِ مسلم! المدد!
آج ڈربے میں مچانا ہے ذرا اودھم مجھے
ہیں شہید دیگ ہوں ہوٹل میں ہو تربت مری
خانساماؤں کے کندھے پر اٹھے میت مری
عقدہ بریانی کا جس وقت تنجن سے ہوا
لٹ گئے مفت میں واں شیخ چھوہارا ہوکر

پنڈت ہری چند اختر :- ۱۹۰۱ء میں ہوشیار پور میں پیدا ہوئے مزاج میں بلا کی ظرافت تھی۔ تمام عمر مشاعروں کی جان بنے رہے ؎

زمانے کو کیا کیا دیا دینے والے
ہمیں تو نے ٹرخا دیا دینے والے

؎ زمانے کو تو ہیں بھی دیں مال و زر بھی
ہمیں تو نے چرخا دیا دینے والے

بیٹھتا ہوں تو درد اٹھتا ہے
درد اٹھتا ہے بیٹھ جاتا ہوں

سید محمد جعفری :- لاہور میں پیدا ہوئے۔ آج کل پاکستان میں ایک ذمہ دار افسر ہیں۔ ان کے طنز میں شگفتگی اور زندہ دلی خوب ہے۔ دوسرے شعراء کے مشہور مصرعوں سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہندوستان میں ان کا کلام شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے ؎

بھنگیوں کی آج کل ہڑتال ہے
کبترو مہتر کا پتلا حال ہے
گردشِ دوراں نے ثابت کر دیا
رفع حاجت بھی بڑا جنجال ہے

احمد ندیم قاسمی

۱۹۴۷ء سے پہلے اور ۱۹۴۷ء کے بعد دونوں زمانوں میں لکھتے رہے۔ زمانہ کی قید کا لحاظ رکھے بغیر ان کے کام پر مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے شدید ترین تعصبات سے متاثر ہوتے ہوئے بھی اعتدال، ملائمت اور میانہ روی اختیار کر سکے ہیں۔ وہ لہجے کی تندی سے زیادہ موضوع کی اندرونی کشش اور بیان کی اندرونی تاثیر پر اعتقاد رکھتے معلوم ہوتے ہیں۔ شہریت کے باوجود دیہاتی معصومیت اور نرم مگر سنجیدہ آواز، سنجیدہ مگر دل کش انداز بیان ان کا خاصہ ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اس لئے قدرتاً ان کی نثر شعریت کی چاشنی لئے ہوئے ہے۔ جو کبھی کبھی ہیجان و اضطراب کی مانند دلفریب ہے۔ طلوع و غروب ان کے افسانوں کے مجموعے کا نام ہے۔

ضبط کی حد پر کھڑے ہیں شیخ جی
سانس کھینچے ہیں مگر منہ لال ہے
پیٹ پکڑے پھر رہے ہیں سیٹھ جی

جیسے دعوتی میں بہت سالان ہے
آگیا رو کے سے رک سکتا نہیں
اپنا اپنا نامۂ اعمال ہے

ظریف جبلپوری :- عام کتبی صلع جبلپور میں ۲۲ نومبر ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ اصل نام حامد رہا ہے مگر ظریف کے نام سے ہی مشہور ہیں۔ رباعی اور نظم بھی کہتے ہیں اور اپنے کلام سے جنگ، گرانی اور سیاست پر طنز کے تیروں کی بوچھار کرتے ہیں ؎

عقلیں درست ہو گئیں مہنگائی کے سبب
سب بیوقوف جنگ میں چالاک ہو گئے
کیا سیاست ہے کہ ہیں وہ جنگ سے بیزار بھی
فرنگی جانب بھی ہیں اور غیر جانب دار بھی
میں ہو پنڈت ہی لوں گا تم سے کہ "ہاں" تو کہہ دو
آخر عدد عدد ہے ماتیس مار خاں ہے
اس سے ملنے کو جو پوچھا تو تنک کر بولے
تم تو سنتے ہی نہیں کہہ جو دیا عید کے دن
ڈھونڈتے ہیں وہ میرے ٹکڑوں کو
سگ در پر بڑی کھدائی ہے

ماچس لکھنوی :- مرزا محمد اقبال نام تھا۔ ۱۹۱۳ء میں میرزا مہدی حسین کے یہاں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ۱۳-۱۴ برس کی عمر ہی میں ماچس کو شاعری کی چیٹک لگ گئی تھی۔ الور حسین آرزو مرحوم اور ان کے شاگرد سید آل رضا سے استفادہ کیا۔

علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق

سرسید احمد خاں نے ۱۸۶۶ء میں شائع کیا۔
اور ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق کی اشاعت شروع ہوئی۔

مرحوم شوکت تھانوی ان کے نام کے ساتھ ظریف الملک لکھا کرتے تھے طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں ماچس کا مقام بہت بلند ہے۔ ۲۶ اگست ۱۹۷۰ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔ نمونہ

شیخ آئے حشر میں، تو اعمال ندارد
جس مال کے تاجر تھے، وہی مال ندارد
ماں باپ، بھائی ان کے بھی ساتھ ہیں میرے
اب گھر مرا سسرال ہے، سسرال ندارد
معلوم کیا ان کا شجرہ، تو یہ پایا
کچھ تو ہی سی ننھیال ہے، ددھیال ندارد

ضمیر جعفری :- سید ضمیر جعفری کا قیام لاہور پاکستان میں ہے ان کا شمار موجودہ طنز و مزاح نگاروں میں بلند مقام پر آتا ہے۔ لیکن ہندوستانی قارئین ان کے طنز و مزاح سے محروم ہیں ؎

ہو نہ ہو لیڈر ہے کوئی نا رسیدار آدمی
اس گرانی میں وگرنہ اتنا تیار آدمی
کتنی تیزی تھی طبیعت میں مگر شادی کے بعد
رفتہ رفتہ ہو گیا کسی درجہ ہموار آدمی
میری آہٹ پا کے وہ چلا کے بولے کون ہو؟
بڑبڑایا میں کہ میں ہوں میں ہوں سرکار آدمی

لوکل مہاجرین پہ تارہ نکھار دیکھ
مکھیوں کے تاؤ دیکھ نظر کی بہار دیکھ
موٹر پہ اڑ رہا ہے وہ تلا کمہار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
اے مرحبا یہ حسن ادائے الاٹمنٹ

واقف مرادآبادی :- سید یعقوب الحسن نام ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو سنبھل میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کر کے مدرسی کا پیشہ اختیار کیا۔ طبیعت میں مزاح کا مادہ تھا اور پڑھنے کا انداز ڈرامائی اور بے ساختہ اسی وجہ سے فلم والوں کی نظر بھی ان پر پڑی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کافی دن بیکار اور پریشان رہے۔ آخری دنوں کیمپ کالج اور دیال سنگھ کالج دہلی میں اردو پڑھانے کی

ملازمت مل گئی تھی۔ وہاں سے الگ ہوئے تو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ان کا پانچ ہزار روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۹ء کو دہلی میں انتقال فرمایا۔ رباعیات عمر خیام کا اردو ترجمہ ان کی زندگی ہی میں چھپ گیا تھا۔ باقی کلام ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ نمونہ کلام :-

اس ترقی کے زمانے میں، ترقی خوش خصال
لڑکے البیلے بنے اور لڑکیاں البیلیاں
ریڈیو ہر گھر میں، ہے یوں تو مچائے اک بال
بیدنی بر آج سڑکوں پر نئی اک چھیڑ چال
کائنات شوق ہے، باوقت کی سوغات ہے
آج جس رسیا کو دیکھیں ٹرانزسٹر ساتھ ہے

راجہ مہدی علی خاں :- دور جدید کے طنزیہ و مزاحیہ شعرا کی فہرست میں راجہ مہدی علی خاں کا نام صف اوّل میں آتا ہے پیروڈی میں ان کا جواب ملنا دشوار ہے۔ برسوں فلمی دنیا سے وابستہ رہے اور بمبئی میں ہی انتقال ہوا۔ ضرورت رشتہ اور تصویریں کے چند نمونے ملاحظہ ہوں ؎

(۱)

نہیں اتنا برا لیکن یہ اوورایج لگتا ہے
کتاب عاشقی کا آخری یہ پیج لگتا ہے
نہیں ماما نہیں لگتا ہے یہ تو ہو بہو ڈیڈی
اسے تو اپنا دل دینے پہ ہو جاؤ گی تم ریڈی
"اری لڑکی۔ اری لڑکی"
یہ ایل ایل بی ہے پر اللہ بچائے ان وکیلوں سے
یہ ہر اک بات منوا لے گا قانونی دلیلوں سے
یہ ڈائی وورس، مائی فورس دے سکتا ہے حیلوں سے
میرا گھر لوٹ لے گا قرضوں سے اور اپیلوں سے
نہیں دیکھو پرے پھینکو

(۲)

غزالی آنکھ، چہرہ پھول، شرمیلی نظر اس کی

یعقوب پر چھاپی گئی لکھنؤ کی پہلی کتاب

۱۸۴۱ء میں سائنس کے فوائد پر لارڈ بروہم نے ایک کتاب شائع کی جس کا نہایت سلیس اردو میں ترجمہ کیا۔ یعقوب پر چھاپی گئی لکھنؤ کی اس پہلی کتاب کا نام جو مذکورہ کتاب کا ترجمہ تھی "شرح الفیہ" تھا۔

حسین گالوں پہ دو تل ہیں، ہے غائب کمر اس کی
یہ ممی! اس قدر لڑکی نہیں میرے نصیبوں میں
یہ بٹ جائے گی فوراً شاعروں میں اور ادیبوں میں
نہیں آمی نہیں آمی
یہ نیلی نیلی آنکھیں ہونٹ پیلے ہو بہو ہو تم
اسے تک کر میرے ڈیڈی کا دل بھی ہو نہ جائے گم
سمجھ کر یہ ڈیڈی جوم لیں گے انکو دھوکے سے
نہیں امید مجھ کو رک سکیں گے میرے رونے سے
نہیں آمی نہیں آمی

دلاور فگار :- دلاور فگار بدایوں میں پیدا ہوئے۔ پہلی بار دہلی سے مولانا عبدالوحید صدیقی کی سرپرستی میں شائع ہونے والے مشہور روزنامہ "نئی دنیا" کے ذریعہ ادبی دنیا سے ان کا تعارف ہوا۔ ابتدا میں ان کے قطعات "نئی دنیا" میں "شاعر خاص" کے نام سے پھر ان کے نام سے شائع ہوئے اور بہت کم عرصہ میں انھوں نے مقبولیت حاصل کی۔ کلام کے علاوہ پڑھنے کا انداز بھی سب سے جدا ہے۔ آج کل پاکستان میں قیام پذیر ہیں۔
لیٹے ہوئے تھے ریل کے ڈبہ میں اک بزرگ
گویا کہ پوری برتھ وہی لے چکے تھے مول
ٹوکا کسی نے ان کو تو کہنے لگے جناب
نہرو کا حکم ہے کہ کرو برتھ کنٹرول"

فرقت کاکوروی :- غلام احمد فرقت کاکوروی موجودہ دور

کے ممتاز طنز و مزاح نگاروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ انھوں
نے زیادہ تر نظمیں کہی ہیں کئی کتب شائع ہو چکی ہیں جنوری ۷۶ء
میں بہار کے ایک مشاعرہ سے دہلی واپس آتے ہوئے سفر
میں رحلت فرما گئے۔

کتوں نے نعش کے پیچھے رپٹ لکھا دیا
تھی وہ نعش عشق تیرا اس سے بھی بڑا
تب بھی سانپ کے گھر پر ہے جھگڑا
"میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا"

شہباز امروہوی:- سلطان احمد شہباز ۲۳ جنوری ۱۹۱۰ء
کو امروہہ میں پیدا ہوئے تعلیم سے فارغ ہو کر سیدو بانی
اسکول امروہہ میں اردو کے مدرس ہو گئے۔ بصارت سے
محروم ہو جانے پر نوکری سے سبکدوش ہو گئے آجکل امروہہ
کے ایک اسلامی ادارہ میں بچوں کو درس دینے میں ان کا مزاحیہ
رنگ کسی کی تقلید کا نتیجہ نہیں بلکہ اپنا رنگ ہے ؎

حضرت اکبر سے جا کر کوئی کہدے شاباش
جس کو ڈر اس نے سنایا تھا وہ ہونا چل چکا
اب تو رائج ہے کھڑاؤں شہر پیلی بھیت کی
یعنی لکڑی چل رہی ہے اور چمڑا چل چکا

سہنے کو جب جہاں میں کوئی جگہ نہ پائی
دنیا سے رکھ کے سر پہ میں اپنی کھاٹ نکلا
عقبیٰ میں جا کے دیکھا دوزخ تو وہ مکان بھی
شیطان روسیہ کے حق میں الاٹ نکلا

جھونپڑی میری سرچھپانے شہباز
ٹوٹی پھوٹی تھی اور چھوٹی تھی
پھر بھی کسٹوڈین سے کیوں بچتی
بھاگتے بھوت کی لنگوٹی تھی

ڈاکٹر طارق امروہوی:- ڈاکٹر سید محمد طارق حسن نقوی نام
طارق تخلص ۱۹۴۳ء میں امروہہ کے ایک معزز اور عالم
خاندان میں پیدا ہوئے۔ آگرہ یونیورسٹی سے بی اے کیا اور
فارسی میں سب سے زیادہ نمبر پا کر میڈل حاصل کیا پھر مسلم
یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم اے کیا اور اول آ کر سنہری تمغہ حاصل
کیا آج کل شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فارسی کے
استاد ہیں۔ طارق کے کلام میں علامہ حسن میر کاشمیری کی طرح غرابت
کافی نظر آتی ہے۔ نمونہ کلام ؎

لٹھ جاتے ہیں جہاں دیگ گڑی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز بہاری اور ٹلی ہوتی ہے

بھوک میں کیا شاعری، ہاں بات تو جب ہے
رکھ دے کوئی بھونا ہوا مرغا میرے آگے
مانگے ہے جو چیز تو جاتا ہے وہ قرضہ
جوتی میرے پیچھے ہے تو بنیا مرے آگے
غالب کا تو کیا جشن؟ پر ہاں اُردو زباں کا
ہوتا ہے تب ورنہ تماشہ مرے آگے

دل تو ہتھیا لیا تو جگر کھینچا لیا
لگے ہو تم تو مرکزی سرکار کی طرح

موجودہ دور میں طنزیہ و مزاحیہ رنگ کا میدان بڑا
زرخیز ہو گیا ہے۔ کتنے ہی شعرا اس میدان میں اپنے قدم جما
رہے ہیں، واہی، کباب علیگ، سگار لکھنوی، فیض الرحمٰن
جلال ملیح آبادی، جوہر سیوانی، قادر حیدرآبادی، راہی قریشی، اعجاز
وارثی سنبھلی، امام رائچوری، سید معظم پاشا، احمد محی الدین عرشی
ہلال رضوی رام پوری، خوشدل خان پوری، طنز بدایونی، برق
آشانوی، قیس جالندھری وغیرہ وغیرہ اُردو کے ابھرتے ہوئے
ظریف شعرا ہیں۔

سرزمین ہند سے دو مزاحیہ پرچے نکلتے ہیں ایک "شگوفہ"
حیدرآباد اور دوسرا "ہنسی پنچ" علی گڑھ۔ یہ دونوں پرچے طنزیہ
و مزاحیہ شعرا کا کلام شائع کر کے اردو ادب کے اس خاص رنگ
کی جو خدمت کر رہے ہیں وہ تعریف کی مستحق ہے۔ اور ان سے
بھی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا مستقبل بہت تابناک نظر آتا ہے

شاگرد بناتے تھے تو شیرینی ضرور لیتے تھے

شاہد احمد دہلوی راوی ہیں کہ "منشی وحید الدین بیخود دلی کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے تعلیم واجبی واجبی ہی تھی۔ داغ کے محبوب شاگرد تھے، داغ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے پوتے مرزا ــــ خورشید عالم نے جانشینی کی پگڑی بیخود صاحب کے باندھ دی مگر دیکھتے ہی دیکھتے استاد کے سینکڑوں جانشین پیدا ہو گئے ان میں سائل دہلوی بھی تھے جن سے الجھنا بیخود صاحب نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ دلی کے مشاعرے اکھاڑے اور دنگل بن گئے اور وہ بے ہودگی پھیلی کہ بھلے آدمیوں نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا۔

بیخود صاحب انگریزوں کو اردو پڑھایا کرتے تھے۔ اس سے ان کی معقول آمدنی تھی۔ شہسواری کا شوق تھا منہ زور سے منہ زور گھوڑے ان کے پاس سدھانے جانے کے لئے بھیجے جاتے۔ جوانی میں اچھے جاندار آدمی ہوں گے ہم نے تو انہیں اسی برس کی عمر میں بھی یہی دیکھا کہ ان کی ران تلے گھوڑا چیں بول جاتا تھا۔

بیخود صاحب نے شاعری میں تو خیر نام پایا ہی ــــ ایک زمانے میں جن بھوت اتارنے میں بھی کافی شہرت رکھتے تھے۔ مرچوں کی دھونی دے کر جب جوتے اڑ اسنے شروع کرتے تو جن تو جن دیوتا بھی کوچ کر جاتے۔

جب عمر ستر سے اوپر ہو گئی تو مزاج کی حدت میں کمی آگئی۔ مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا۔ کسی شاگرد کے ہاتھ اپنی غزل بھیجدیتے۔ بعض آل انڈیا قسم کے مشاعروں میں بادل نخواستہ شریک ہو جاتے تھے۔ کسی سُریلے شاگرد سے اپنی غزل پڑھواتے۔ خود برابر میں بیٹھے داد و تحسین وصول کرتے رہتے۔ ایک دفعہ کی بات ہے دلی کے ٹاؤن ہال میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا۔ بیخود صاحب بھی شرکت کرنے پر مجبور کئے گئے۔ بڑے بڑے سُریلے شاعر پڑھ کر ہٹے تھے کہ بیخود صاحب کا نمبر آگیا۔ انہوں نے اپنے سب سے سریلے شاگرد کو غزل پڑھنے کے لئے دی۔ وہ صاحب رسیے ہوئے تھے۔ ایک مصرعہ کسی دھن میں ناموزوں پڑھا دوسرا کسی میں۔ بیخود صاحب کے کان کھڑے ہوئے، گھور کر شاگرد کو دیکھا۔ مگر وہ لہک لہک کر پڑھے جا رہے تھے اور مشاعرہ ہنس رہا تھا۔ تیسرا مصرعہ تیسری دھن میں پڑھ کر چوتھے کے لئے راگ انتخاب فرمانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک دم سے جیسے بجلی کا تڑاخہ ہوا اور دھواں دھار گالیاں برسنی شروع ہو گئیں۔ بیخود صاحب نے شاگرد کے ہاتھ سے اپنی غزل کا پرچہ چھینا اور اسے دھکا دے کر خود

▲ بیخود دہلوی

تحت اللفظ پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کی آوا
تک کانوں میں گونجتا ہے۔ بیخود صاحب نے بڑ
جوانی کی تصویر کھینچ دی۔

اردو بازار میں کتب خانہ علم و ادب اد
کا اڈا بن گیا تھا۔ بیخود صاحب بھی روزانہ شام
ضرور لیتے تھے۔ ایک ناول روزانہ پڑھنے لے ج
دن اسے واپس کر کے دوسرا لے جاتے۔ ہا
کھٹا کھٹ چلتا رہتا۔ باتیں خاص دلّی والوں
کرتے اور یہ باتیں بڑی دلچسپ ہوتیں مثلاً
ابا کے ساتھ دادا غالب کے ہاں پانچ سال
بلوری صراحی اور گلاس رکھا تھا۔ ایک طشتری
بادام اور پستے تھے۔ ایک چسکی لگاتے اور دو
لیتے۔ ابا تو ادھر ادھر کی باتیں کر کے نماز پڑھ
اور دادا غالب مجھ سے باتیں کرنے لگے۔
لو کچھ کھاؤ۔ میں نے تھوڑے سے بادام ا
مذاق کی باتیں کرتے رہے۔ پھر بولے: "یار
سر پر ایک دھول تو کس کر لگاؤ"۔ یہ کہہ کر
میرے آگے کر دیا۔ میں بچپن میں بہت شر
رسید کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ ابا نے جلدی
"ہوں ہوں" کہہ کر مجھے گھورا اور مرزا سے بو
اللہ نے بڑی خیر کی۔ مجھے تو منہ دکھانے کو
شیطان ہے۔ اس کا کیا ہے، یہ تو مار بیٹھتا ا
نہ رہتا ــــ۔

ہیں اگر کوئی پرانا لفظ یا محاورہ
صاحب سے پوچھ لیتے اور وہ بے تکلف
غالب کی تو انہوں نے شرح ہی کر دی تھی
اشعار کا مفہوم بھی اس خوبی سے سمجھا
ایک دفعہ خود ان کے ایک مقطع کا مطلب
بیخود کے لب کبھی تر نہ ہوئے و

انہیں کوئی نہیں جانتا

سید محمد الیاس بہار الہ آبادی۔ الہ آباد کے ایک معزز
گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ادب سے بہت لگاؤ ہے۔
شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ ان کے دادا عبدالصمد علوی اور
والد سید محمد سعید حسینی عروج بھی شاعر تھے۔ بہار صاحب کو
جمیل الہ آبادی سے تلمذ حاصل ہے۔ کم کہتے ہیں لیکن جو کچھ
کہتے ہیں جذبات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ عام طور پر شعر
سنانے کے عادی نہیں خوش گلوئی کے باوجود مشاعروں میں
شرکت نہیں کرتے۔ اس لئے انہیں شاعر کی حیثیت سے کوئی
نہیں جانتا ۱۹۴۷ء میں دہلی آئے اور پھر یہیں ہارڈنگ
لائبریری میں ملازمت کر لی۔ آجکل لائبریری کے سپروائزر
ہیں۔ نمونۂ کلام

اس سے چھوڑ دی امواج بلا میں کشتی
حوصلہ ٹوٹ نہ جائے کہیں طوفانوں کا

دیکھئے ایک بار پھر مجھ کو نگاہِ ناز سے
آپ نے پہلے پہل دیکھا تھا جس انداز سے

یقیں کی حد میں عزم مستقل معراجِ عظمت ہے
اے ذوقِ طلب! وہم و گماں سے کچھ نہیں ہوتا

آلودۂ شراب گریبان ہی رہا

فرمانے لگے: "دراصل یہ شعر ایک واقعہ سے متعلق ہے۔ میں فلاں ریاست میں ملازم تھا۔ رئیس کی محفلِ خاص روزانہ رات کو جمتی۔ جب دورِ شراب چلتا تو رئیس کی منظورِ نظر طوائف جام بھر بھر کر مقربین کو پیش کرتی۔ انکار کی مجال کسی کو نہ ہوتی تھی۔ میں بھی اس سے جام لے لیتا اور منہ تک لے جاکر چپکے سے اپنے گریبان میں الٹ لیتا تھا۔"

بڑے آدمیوں کی بڑی کمزوریاں۔ ہر سوال کا جواب ضرور دیتے تھے۔ لاعلمی کا اظہار کبھی نہ کرتے۔ اور جب کہیں مجبور ہو جاتے تو ناراض ہو کر بات کو ٹال جاتے۔

ایک زمانے میں سہراب مودی کو 'غالب' فلم بنانے کا خیال ہوا۔ مکالمے اور سیناریو منٹو نے لکھا تھا۔ اس سلسلے میں وہ مجھے بھی بمبئی بلوانا چاہتے تھے مگر میں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ان کے ایک ڈائرکٹر نندا مجھ سے ملنے دلی آئے اور سو سال پہلے کے لباس وغیرہ کے متعلق مجھ سے کچھ پوچھنے لگے۔ مجھے بہت کم باتیں معلوم تھیں میں انہیں لے کر بیخود صاحب کے ہاں پہنچا۔ بیخود صاحب ملاقات کی غایت سن کر کچھ خوش نہیں ہوئے۔ اوپر آکر بولے "پوچھئے" نندا صاحب نے کہا: "مثلاً پالکی اور نالکی میں کیا فرق تھا اور ان کی شکلیں کیسی ہوتی تھیں؟" بیخود صاحب چیخ کر بولے: "پالکی پالکی ہوتی ہے، نالکی نالکی! پالکی نالکی کیسے ہو سکتی ہے، نالکی پالکی کیسے ہو سکتی ہے؟" میں نے دیکھا کہ یہاں دال نہ گلے گی۔ مزاج بھی برہم ہے۔ میں نے نندا صاحب سے کہا: "آپ ایسا کیجئے کہ ایک فہرست بنا لیجئے، پھر کسی دن حضرت کو زحمت دیجئے۔" زحمت دینے کی پھر نوبت نہ آئی۔

شاگرد بناتے تو شیرینی ضرور لیتے۔ ایک مہربان ایک صاحبزادہ کو لے کر پہنچے۔ بیخود صاحب کبوتر اڑانے میں چھت پر مصروف تھے۔ بہت مکدر ہو کر نیچے بیٹھک میں آئے۔ مہربان نے مٹھائی کی ٹوکری پیش کی اور عرض مدعا کیا۔ ٹوکری تو ان کا پوتا فوراً اندر لے گیا۔ اور بیخود صاحب نے پوچھا: "صاحبزادے شعر کہتے ہو؟" اس نے کہا، "جی ہاں۔" فرمایا: "سناؤ۔" شامتِ اعمال، وہ غریب نہ جانے کس سے لکھواتا تھا۔ ناموزوں شعر سنانے لگا بیخود صاحب ایک دم سے بپھر گئے۔ گالیوں کا سیلاب امنڈ پڑا: "نکل میرے گھر سے، نکل!" اور کوئی گالی ایسی نہ تھی جو اس پر صَرف نہ کی گئی ہو۔ کھڑے کھڑے اسے گھر سے نکالا اور کنڈی لگا اوپر جاکر پھر کبوتر اڑانے لگے۔ آخری دور میں حکومتِ ہند نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

ظ۔ انصاری

سہارنپور کے رہنے والے ہیں۔ یورپ خصوصاً روس میں اردو میں بہت کام کیا ہے۔ آجکل بمبئی میں ہیں

اُردو زبان کی ترقی میں ہندوؤں کا حصّہ

• ایم اے وحید خان

یہ امر مسلّمہ ہے کہ قدیم الایام میں تمدّنِ انسانی کا سب سے ممتاز اور عظیم الشان درخت جو تاریخ میں آریہ قوم کے نام سے مشہور ہے، وسط ایشیا کے ایک مردم خیز خطے میں پھلا پھولا اور جب اس کی ایک ابتدائی قلم اس سے جدا ہو کر ارضِ مغرب و یونان و روم میں نصب ہو چکی تو اور زیادہ پھیلا اور اس کی دو زبردست شاخیں اِدھر اُدھر بڑھنے اور پھیلنے لگیں۔ یہاں تک کہ ایک مشرق کی طرف بڑھ کر ہندوستان پر سایہ فگن ہوئی اور دوسری مغرب میں پھیل کر ملک عجم پر چھاگئی۔ ان دونوں شاخوں نے یہاں تک فروغ پایا کہ قدیم درخت کا اصلی تنہ فنا ہو کر صفحہ ہستی سے غائب ہو گیا اور ان دونوں ممتاز اور سرسبز شاخوں نے ہندوستان اور ایران کی سرزمینوں میں اپنے اپنے تنے پیدا کر لئے۔ اب مقامی آب و ہوا کے اثر نے ان کو ایک دوسرے سے جدا اور مختلف خصوصیات سے متصف کرنا شروع کیا اور دونوں میں جدا جدا خصائص پیدا ہو گئیں۔ آریہ قوم کی ان دونوں شاخوں کے دوبارہ مل کر پھر ایک ہو جانے کی سچی تاریخ ہماری اردو زبان ہے۔

مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا در اصل ہزارہا سال کی مفارقت کے بعد دونوں شاخوں کا ہم آغوش ہونا تھا۔ اردو زبان دنیا کی جدید زبانوں میں سے ہے اور ابھی ابھی اس نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھا ہے۔ زبان کسی کی ایجاد نہیں ہوتی ہے بلکہ جس اصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی ہے، پتے نکلتے ہیں۔ شاخیں پھیلتی اور پھل پھول لگتے ہیں اور ایک روز وہی ننھا سا پودا ایک تناور درخت ہو جاتا ہے اسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔

اردو اس مبارک زمانہ کی یادگار ہے جب مسلمان ہندوستان آئے اور اہلِ ہند سے ان کا میل جول روز بروز بڑھتا گیا اس وقت سے ملک کی زبان میں برابر تغیر پیدا ہونا شروع ہوا جس نے آخر ایک ایسی نئی صورت اختیار کر لی جس کا کسی کو گمان بھی نہ تھا مسلمان فارسی بولتے آئے تھے اور ایک زمانہ تک ان کی زبان فارسی ہی رہی۔ دربار و دفاتر میں بھی اسی کا سکہ جاری رہا ـــــ ہندوؤں نے اس کا خیر مقدم کیا اور بڑے شوق سے سیکھا۔ اس زمانہ میں فارسی کی بڑی قدر تھی۔ اس کا پڑھنا داخل تہذیب سمجھا جاتا تھا اور دستارِ فضیلت کا ملنا بغیر تحصیل زبانِ عربی و فارسی ناممکن تھا کیونکہ مسلمانوں کے علوم و فنون

مرزا ہرگوپال تفتہ

کا خزانہ انہیں زبانوں میں موجود ہے۔ پراکرت یا قدیم ہندی زبان جو اس وقت ملک میں رائج تھی۔ اس کو مسلمانوں نے بھی سیکھا کیونکہ عوام وہی زبان بولتے تھے۔ رفتہ رفتہ فارسی کے ساتھ اس مخلوط زبان میں بھی جو بھاشا اور فارسی کی آمیزش سے بنی تھی داد سخنوری دی جانے لگی اور اس میں بڑے بڑے شاعر ہوئے اس کی ترقی کا سہرا امیر خسرو کے سر ہے اور "خالق باری" اس کا ایک زندہ نمونہ ہے۔ غرض تمام باتیں صاف طور پر بتلا رہی ہیں کہ ان دنوں مسلمانوں اور ہندوؤں میں میل جول اور ربط ضبط کس قدر بڑھا ہوا تھا اور اس اتفاق و یکجہتی کا میل جو قیامت تک ہمارے اتحاد کو نہ بھولنے دے گا وہ ہماری زبان اردو ہے۔

اول اول ثقہ لوگ اس نئی زبان کے استعمال سے بچتے رہے لیکن رفتہ رفتہ یہ منافرت دور ہوتی گئی اور مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں شعراء نے اس بچے کو اپنے سایہ عاطفت میں لیا اور بہت کچھ صفائی اور تراش خراش کے بعد اس کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا۔ مسلمانوں کے بعد انگریزوں نے اس کی ترقی کی طرف توجہ کی اور فارسی کی بجائے اسی کو حکومت کے دفتروں میں جگہ دی گئی۔

الغرض اردو تین جلیل القدر قوموں یعنی ہندوؤں مسلمانوں اور انگریزوں کی متفقہ کوششوں سے ترقی پزیر ہو کر موجودہ حالت کو پہنچی۔ اب اس کا وقار دنیا کی دوسری زبانوں کی نظر میں قائم ہو گیا اور ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس مضمون میں صرف ان ہندو اصحاب کا ذکر مجملاً کیا گیا ہے جنہوں نے اردو کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اردو مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے ساتھ ہی عالم وجود میں آئی اور رفتہ رفتہ برابر ترقی کرتی رہی لیکن یہ حقیقت میں اردو ہندی نژاد ہے کیونکہ بیرونی زبانوں کا اثر صرف اسماء و صفات تک محدود ہے اور زبان کی بنیاد ہندی پر ہے۔ تمام حروف فاعلی و مفعولی اضافت و ربط وغیرہ ہندی ہیں۔ عربی اور فارسی وغیرہ کے الفاظ ایک عزیز اور پسندیدہ مہمان کی طرح اس میں آ ملے اور ملکر شیر و شکر ہو گئے۔ ان زبانوں کے الفاظ نے اردو کے لئے زیور کا کام دیا جس سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا اور وہ زیادہ وسیع اور کار آمد بن گئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں کا تعلق اردو سے بہ نسبت مسلمانوں کے کتنا زبردست ہے۔ خاندان مغلیہ کے آخری تاجداروں کا دور تھا۔ عیش و عشرت کی محفلیں جمی ہوئی تھیں سلاطین بذات خود رنگین طبیعت تھے۔ اور فنون لطیفہ خصوصاً شعر و سخن سے ان کو بے حد دلچسپی تھی۔ اس لئے دربار میں ارباب علم کا جمگھٹا لگا رہتا تھا اور روزانہ نئی نئی ترکیبیں اور جدید اسلوب بیان پیدا کئے جاتے تھے جب حاکم وقت کو اردو کی سرپرستی پر آمادہ دیکھا تو عوام بھی فطرتاً اس کی طرف متوجہ ہوئے اور ہر ایک اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کی ترقی میں کوشش کرنے لگا اگرچہ مسلمانوں کو اردو زبان کی ترقی میں نمایاں حصہ لینے پر ناز ہے لیکن حقیقت میں ہندوؤں نے بھی اسکی خدمت مسلمانوں سے کچھ کم نہیں کی میں یہاں پر ان ہندو اہل قلم اور سخنور حضرات کا ذکر کروں گا جنہوں نے اپنی شیریں کلامی اور سخن سنجی سے دنیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور اردو کی بہت کچھ خدمات انجام دیں۔

(۱) جناب رائے سورج نرائن صاحب خاطر ایک خوش گو شاعر تھے جن کے چند اشعار پیش ہیں ؂

مرغوب ہے اس درجہ انہیں اپنی نمائش
آئینے لگا رکھے ہیں دیوار میں در میں

پڑتے ہیں زباں پر مرے چھالے دم گفتار
کیا قہر کی گرمی ہے مرے سوز جگر میں

دل چھین لیا دیکھتے ہی دیکھتے اس نے
کیا سحر ہے اس شوخ کی دزدیدہ نظر میں

(۲) حکیم برج لال صاحب خمار بریلوی نے ۱۸۷۱ء
میں آپ کا دیوان مرتب ہوا تھا ؎

تاسف کیا کریں ہم سر کے جانے کا بھلا قاتل
چلو اچھا ہوا گردن سے اپنی بار سر سر کا

(۳) پنڈت بلدیو کشن صاحب نکو خورشید لاہور میں
انسپکٹر چنگی تھے۔ آپ کا ایک دیوان مرتب ہو چکا ہے۔
کلام میں سادگی ہے زبان شستہ ہے۔ کلام میں عموماً
اخلاقی رنگ ہوتا ہے ؎

نہ وہ اوصاف ہیں ہم میں نہ وہ الفت رہی دل میں
ہماری غفلتوں سے دیکھئے سارا وطن بگڑا
ذرا دیکھو تو بگڑی کس قدر حالت ہماری ہے
روش بگڑی چلن بگڑا ہمارا پیرہن بگڑا

(۴) شاعر شیوا بیان سخنور شیریں زبان منشی
جگن ناتھ پرشاد صاحب خوشتر نواب واجد علی شاہ کے
زمانہ میں سرکار شاہی میں کسی عہدہ پر مامور تھے۔
آپ نے رامائن اور سری بھاگوت وغیرہ کی کئی مذہبی روایا
وحکایات کو بہت خوبی اور فصاحت سے نظم کیا ہے۔
آپ کی منظوم رامائن مقبول خاص وعام ہو چکی ہے۔

(۵) پنڈت گنگا پرشاد کشمیری رند۔ زبان بہت
صاف وشیریں اور روزمرہ پاکیزہ ہے۔ محاورات کا
استعمال بہت مناسب طور سے کرتے ہیں ؎

سیل خوں تھا جو بہا آنکھوں سے ؛ تم نے دل کو نہ جگر کو دیکھا
دیکھ پھر ہم کو نہ دیکھے گا تو! ؛ یار جو تو نے ادھر کو دیکھا
حسن پریوں کا سنا کرتے تھے ؛ عشق دیکھا تو بشر میں دیکھا

یہ چند نمونے ان سخنوروں کے کلام کے ہیں—
جنہوں نے ابتدائی زمانہ میں اردو میں داد سخن گوئی دی
ہے ان کے علاوہ اور بھی بہت سے بزرگ ہیں جن میں

راجہ رام موہن رائے

خاص خاص کے نام لکھے جاتے ہیں۔ منشی مہاراج بہادر
برق دہلوی، پنڈت نندلال کول طالب، منشی بنواری لال
شعلہ، منشی سکھدیو پرشاد بسمل، پنڈت برج نرائن چکبست
لکھنوی، منشی شیو شنکر سہارئے آسی مرزاپوری، پنڈت
دیا شنکر نسیم، منشی نوبت رائے نظر، منشی پیارے لال
شاکر میرٹھی، پنڈت اندرجیت شرما وغیرہ۔

مصنف سیر المصنفین کا بیان ہے کہ تیرہویں صدی
ہجری اور تقریباً انیسویں صدی کے آغاز سے نثر اردو
کی ابتدا ہوئی جبکہ میر عطا حسین خاں تحسین نے "چہار
درویش" کا قصہ اردو میں لکھ کر "نوطرز مرصع" نام رکھا۔
اس کے بعد بہت سی فارسی اور ہندی کتابیں اردو میں
ترجمہ ہوئیں۔ بابو نہال چند لاہوری نے ایک قصہ کو جو

فارسی زبان میں تھا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام مذہب عشق معروف بہ "گل بکاؤلی" رکھا۔ مذہب عشق تاریخی نام ہے۔ یہ کتاب ۱۲۱۷ھ میں ترجمہ ہوئی اس کے بعد پنڈت دیا شنکر نسیم نے اس کو اردو نظم کا جامہ پہنایا اور یہ مثنوی گلزار نسیم مقبول خاص و عام ہوئی۔

سری للو لال کوی نے اگرچہ فصیح ہندی نثر کی بنیاد ڈالی اور درحقیقت ہندی نثر کے حق میں مسیحائی کی تاہم آپ کا ذکر یہاں پر اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ ہندی سے جو بعض ترجمے اردو میں ہوئے ان میں آپ نے مدد دی مثلاً "شکنتلا ناٹک" کے ترجمہ میں مرزا کاظم علی جوان کو آپ سے امداد ملی اسی طرح مظہر علی ولا اور آپ نے مل کر "بیتال پچیسی" لکھی جس کی زبان اردو ہندی آمیز ہے اردو نثر کی ترقی میں آپ کی خدمت قابل داد ہے۔ منشی بینی نرائن جہاں نے کپتان رومک کے ایما سے "دیوان جہاں" کے نام سے ہندوستانی شعراء کا تذکرہ مع منتخب کلام کے مرتب کیا۔ علاوہ ازیں آپ نے چہار گلشن کا بھی ترجمہ کیا

چند کتابوں کے نام بقید نام مصنف و تاریخ طبع لکھے جاتے ہیں اس انتخاب میں قصداً وہی کتابیں لی ہیں جو علمی کتابیں کہی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ناول اور ناٹک بھی لکھے گئے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اہل ہنود کی کوششوں نے اردو کو کس قدر ترقی بخشی۔

(۱) سدا سکھ لال۔ گنگا کی نہر ۱۸۵۰ء
(۲) موتی لال آگرہ۔ پندنامہ کاشت کاری اور ریشم کا کیڑا ۱۸۵۲ء۔
(۳) منشی کیول کشن جے پور اردو اشا بکر ۱۸۶۹ء۔
(۴) رام چندر دہلوی۔ عجائب روزگار۔
(۵) بدری لال بنارس۔ ہوا کا بیان۔
(۶) بھولا ناتھ آگرہ۔ خلاصۃ الصنائع۔
(۷) دھرم نرائن دہلوی۔ اصول علم انتظام مدن۔
(۸) پنڈت برج نرائن چکبست ــــ بھارت درپن وغیرہ۔

پنڈت کشن پرشاد کول جو متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور منشی پریم چند، کرشن چند، سدرشن، اجن کے افسانے مشہور جہاں ہیں۔ منشی پریم چند نے اردو نثر میں وہ نئی روح پھونکی ہے جو ہرگز بھلائی نہیں جا سکتی۔ آپ ناولوں کے طرز نو کے بانی ہیں۔ ہر اردو خواں آپ سے واقف ہے آپ نے اردو نثر کو اتنا عام فہم، صاف اور دلچسپ بنایا ہے کہ ہندی داں بھی اس سے لطف اٹھاتے ہیں آپ کا احسان اردو زبان پر بہت بڑا ہے اور جب تک اردو زبان قائم رہے گی اس بارِ احسان سے سبکدوش نہ ہو گی۔ متعدد کتابیں آپ کے زور قلم کا زندہ نمونہ ہیں۔

پنڈت منوہر لال زتشی ایم۔ اے خلف پنڈت کنہیا لال زتشی ایک نہایت ذکی فہم بزرگ تھے۔ آپ کی عالی دماغی کا ثبوت زمانہ، ادیب، کاشمیری درپن میں شائع شدہ مضامین ہیں۔ آپ کی زبان نہایت شستہ اور عام فہم ہے۔ طرز غالب کے پیرو ہیں۔ غالب اور چکبست پر آپ نے کئی مضمون لکھے ہیں۔

لالہ سری رام ٹنڈن دہلی کے ایک عالی خاندان سے تھے۔ آپ نے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ منشی ٹیک چند بہار، پنڈت چندر بھان برہمن اور راجہ پیارے لال الفتی مستند فارسی کے شاعر ہوتے ہوئے بھی صف شعراء میں جگہ نہ پا سکے تھے مگر آپ نے (ان) کے اردو کلام کو ڈھونڈ نکالا اور ان کو دنیا سے روشناس کرا کے حیات جاوید بخشی۔

مہاراجہ سر کرشن پرشاد بہادر شاد دیوان ریاست حیدرآباد کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ نے تقریباً ۴۰ کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن میں بزم خیال، رباعیات

شاد، فریاد شاد بہت مشہور ہیں ـــ

جام اک بھر کے دے اسے پیر خرابات مجھے
کردے اب بہرِ خدا مستِ مئے ذات مجھے

یار بر میں ہے اِدھر جام لئے ہے ساقی
کس لئے راس نہ آئے گی برسات مجھے

چشمِ موسیٰ یہی کہتی ہے کہ اے جلوۂ طور
یاد اب تک ہے وہ اندازِ ملاقات مجھے

وہ عالی دماغ اور علم دوست ہندو حضرات بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے اپنی خاص کوششوں سے اردو اخبارات، رسائل کو ہر دلعزیز بنا کر اردو کی ترقی میں نمایاں حصّہ لیا ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلے منشی نول کشور بانی نول کشور پریس لکھنؤ قابلِ ستائش ہیں، کہ جنہوں نے اردو کی بہت خدمت کی ہے۔ عربی، فارسی ـــ سنسکرت، انگریزی وغیرہ زبانوں کی کتابوں کا آپ نے بڑی کوشش سے ترجمہ کرایا اور ان کو طبع کرا کے اہلِ ملک کو ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا ہے۔ اس کے علاوہ اسی سلسلہ میں ان اصحاب کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو اردو کے باغ کی آبیاری کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔

پنڈت کرشن پرشاد کول، آنند نرائن ملّا، رام پرساد کھوسلہ، مہاراج بہادر برق، اوتار کرشن، سورج نرائن مہر علامہ برج موہن دتا تریہ کیفی، سکھدیو پرشاد بسمل ـــ بالک رام شاد، شیو شنکر سہائے آسی، سیتو نرائن شمیم، منشی پریم چند، کرشن چندر، سدرشن، گنگا دھر فرحت، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، جوش ملسیانی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، نند لال گویا، منشی مہیش پرشاد، نانک چند ناز سر تیج بہادر سپرو، رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری۔ پیارے لال شاکر، عرش ملسیانی، بیتاب بریلوی، گوپی ناتھ امن لکھنوی، جگر بریلوی وغیرہ وغیرہ۔

سعادت حسن منٹو

اردو کے مشہور ترین افسانہ نگاروں میں ہیں، ان کی شہرت کا دار و مدار فن پر بھی ہے مگر اس میں ان کی ایک خاص تدبیر بھی کام کرتی رہی ہے۔ اہل الرائے کا خیال ہے کہ وہ گاہے گاہے چونکا دینے والی چیزیں لکھ دیتے تھے جن میں معاشرت کے عزیز اصولوں اور روایتوں کی تضحیک ہوتی تھی، اس کے خلاف قدرتی طور پر سخت احتجاج ہوتے تھے اور بعض اوقات مقدمے بھی چلے، اس سے ان کی شہرت کی ایک صورت پیدا ہوتی تھی ـــ اس کے باوجود منٹو نے عمدہ نمونے پیش کئے، بہت موثر کہانیاں لکھیں۔ بڑے نادر شاہکار تخلیق کئے، ان کی ذہانت اور تخلیقی جوہر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ منٹو کے مجموعے، ٹھنڈا گوشت، اوپر نیچے اور درمیان، ۹ (سوالیہ نشان) خالی بوتلیں خالی ڈبے، یزید، سیاہ حاشیے، منٹو کے افسانے، نمرود کی خدائی، وغیرہ ہیں۔

جہاں تک غور کیا جائے اردو زبان کی ترقی میں ہندوؤں نے مسلمانوں سے کم حصّہ نہیں لیا اور آج بھی ہندو اہلِ قلم حضرات اس خدمت کو بوجہ احسن انجام دے رہے ہیں اور وہ مسلمانوں کے ساتھ شانہ بشانہ اردو کو بھارت کی زبان بنانے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ ★

تبرکاتِ سائل دہلوی مرحوم

بے حجابی میں سوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو
اور انگشت نما ہوتے ہو کیا کرتے ہو

تم گلے مل کے جدا ہوتے ہو کیا کرتے ہو
ابھی کیا تھے ابھی کیا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

بے سبب ہم سے خفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو
دشمنِ اہلِ وفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

اب وہ بچپن کا زمانہ نہیں دیکھو دیکھو
ناسمجھ اور سوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

آگ دینے کے لئے آئے تھے یا لینے کو
جب تم آتے ہو ہوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

غیر کے شکوۂ بیجا سے تو ہو شرمندہ
میری منت پہ خفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

پردہ داری میں قباحت ہو تو بتا دو کیا ہے
پردہ درِ روزِ جزا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

خوگرِ جور و ستم سے یہ عداوت کیوں ہے
تارکِ وضعِ جفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

اور انجان بنے جاتے ہو ہو کر سیانے
کیا سے کیا نام خدا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

وقت پر کام نہ آئیں گے تمہارے اغیار
ضد سے تم اور سوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

اس بناؤ سے بگڑ جائے گا بیمار کا حال
تم تو پیغامِ قضا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

کھولتا ہوں میں تمہیں وصل میں جتنا، اتنے
اور پابندِ حیا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

جانشینِ داغ سے شاعر کا یہی سائل ہے
اور تم اس پہ خفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

باغ و بہار

مصنف، میرامّن دہلوی

جب تک اردو زبان زندہ ہے، میرامّن کا نام زندہ رہے گا اور ان کی کتاب "باغ و بہار" کی بہار تازہ رہے گی۔ میرامّن زبان کی سند کا ذکر کرتے ہوئے "باغ و بہار" کے دیباچے میں لکھتے ہیں: "جو شخص دلّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں، اور اس نے دربار اُمرا کے دیکھے اور میلے ٹھیلے، عُرس، چھڑیاں، سیر و تماشا اور کوچہ گردی، اس شہر کی، کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا، اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے"

قصّہ بادشاہ آزاد بخت کا: میرے قبلہ گاہ نے جب وفات پائی اور میں تخت پر بیٹھا، عین عالمِ شباب کا زمانہ تھا اور یہ سارا ملک "روم" کا میرے حکم میں تھا اتفاقاً ایک سال کوئی سوداگر "بدخشاں" کے ملک سے آیا۔ اور اسباب تجارت کا بہت سا لایا۔ خبرداروں نے میرے حضور میں عرض کی کہ ایسا سوداگر آج تک اس شہر میں نہیں آیا۔ میں نے اس کو طلب فرمایا۔ وہ تحفے ہر ایک ملک کے، لائق میری نذر کے لے کر آیا۔ فی الواقع ہر ایک جنس بے بہا نظر آئی۔ چنانچہ ایک ڈبیا میں ایک لعل تھا۔ نہایت خوش رنگ اور آب دار، قدوقامت میں درست اور وزن میں پانچ مثقال کا۔ میں نے باوجود سلطنت کے ایسا جواہر کبھی نہ دیکھا تھا۔ "دائی پھر آئی اور مجھے اپنے ساتھ جس محل میں بادشاہزادی تھی، لے گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دو رویہ صف باندھے دست بستہ سہیلیاں، خواصیں اور قلماقلنیاں، ترکنیاں، حبشنیاں اُزبکنیاں، کشمیرنیاں جواہر میں جڑی، عہدے لئے کھڑی ہیں اندر کا اکھاڑہ کہوں یا پریوں کا اُتارا؟ بے اختیاری سے ایک آہِ بے خودی زبان پر آئی اور کلیجہ تھرانے لگا۔ پاؤں سو سو من کے ہو گئے۔ ایک طرف چلون پڑی تھی اور مونڈھا جڑاؤ بچھا رکھا تھا اور ایک چوکی بھی صندل کی بچھی تھی۔ میں مونڈھے پر بیٹھ گیا۔" "حاتم کو جب نوفل کے روبرو لے گئے۔ اس نے پوچھا کہ اسے کون پکڑ لایا؟ ایک بدذات سنگ دل بولا کہ ایسا کام سوائے ہمارے اور کون کر سکتا ہے۔ یہ فتح ہمارے نام ہے۔ ہم نے عرش پر

جھنڈا گاڑا ہے۔ ایک اور لن ترانی والا ڈینگ — مارنے لگا کہ میں کئی دن سے دوڑ دھوپ کر جنگل سے پکڑ لایا ہوں، میری محنت پر نظر کیجئے اور جو قرار ہے سو دیجئے۔ جب اپنی اپنی دلاوری اور مردانگی سب کہہ چکے، تب حاتم نے بادشاہ سے کہا کہ اگر سچ بات پوچھو تو یہ ہے کہ وہ بوڑھا جو سب سے الگ کھڑا ہے مجھ کو لایا ہے، میرے پکڑنے کی خاطر جو قول کیا ہے پورا کرو۔" مفلسی۔ "کوئی بات پوچھنے والا نہ رہا جو کہے کہ تمہارا کیا حال ہے سوائے غم اور افسوس کے کوئی نہ ٹھہرا۔ اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں دو تین فاقے جو کڑا کے کے گئے تاب بھوک کی نہ لا سکا۔" (باغ و بہار ۱۸۰۲ء)

فسانۂ عجائب

مصنف: رجب علی سرور

جانِ عالم کا طوطا:- بلبلِ نوا سنج ہزار داستان، طوطیِ خامہ، زمزمہ ریز خوش بیان، گلشنِ تقریر میں یوں چہکتا ہے کہ ایک دن "ماہ طلعت" نے غسل کیا اور لباسِ تکلف سے جسم کو آراستہ، زیورِ پُر تکلف سے پیراستہ ہو، جواہر نگار کرسی پر بیٹھی۔ ہوا جو لگی آئینہ میں صورت دیکھ خود محوِ تماشا ہوئی۔ خواصوں نے حسنِ خداداد کی داد دی۔ ماہ طلعت طوطے سے مخاطب ہوئی۔ "تو نے ایسی صورت کبھی دیکھی ہے؟" طوطے نے کہا۔ "شاید تمہیں سچی ہو" یہ سن کر شہزادی مشتعل ہوئی۔ جب شہزادہ آیا تو ماہِ طلعت نے کہا۔ "اگر میری بات کا طوطا جواب صاف نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ اپنے تلوؤں سے اس کی آنکھیں ملوں گی۔ جب دانا پانی کھاؤں پیوں گی" جانِ عالم نے کہا۔ "تم تو بھی ہو جانور کی بات سے آزردہ ہو، گو، گویا ہے پھر طائر ہے۔" مدفن

کسی نے بعد دفن سنگِ مرمر کا مقبرہ بنایا، کسی نے مر مرکے گور گڑھا پایا، کسی کا مزار منقش رنگا رنگ ہے۔ کسی کا مانند سینۂ جاہل، گور تنگ ہے۔ جو حرفِ دنیا سے کفن کچا ہوا۔ بستر دونوں کا فرشِ خاک ہوا۔ جب گردشِ چرخ نے گنبد گرایا تو ایک نے نہ بتایا کہ دونوں میں یہ گورِ شاہ ہے، یہ لحدِ فقیر ہے، اس کو مرگِ جوانی نصیب ہے تو یہ استخوانِ بوسیدہ پیر ہے۔" (فسانۂ عجائب)

نیرنگِ خیال

مصنف محمد حسین آزاد

بقائے دوام کا دربار:- اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا۔ وہ مخمورِ نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحبِ جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا اسی کے نورِ جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اسی کی زبان سے کہتا تھا، اس کے بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے، مگر چوں کہ دولت اس کے ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا اس لئے بدمست بھی نہ ہوتا تھا جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ "جہانگیر" تھا اور بیگم نور جہاں "تھی"۔ (نیرنگِ خیال ۱۸۹۰ء)

تختِ طاؤس۔ "بارہ مرصع ستونوں پر مغرق محرابیں اور جڑاؤ مینا کاری کی چھت دھری تھی، چھت سے پائے تک خالص کندن اور آبدار جواہرات سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا اور تین سیڑھی بلند چبوترے پر یہ عالم تھا گویا ایک ستارے کا نگینہ ہے کہ انگوٹھی پر دھرا ہے، اس کی رو کار کی محراب پر ایک درخت طلائی دھرا تھا جو سبزہ و الماس سے سرسبز اور لعل و یاقوت سے گلرنگ

کیا گیا تھا، اِدھر اُدھر اس کے دو مور زرنگار نگ کے جواہرات سے مرصع چونچ میں موتیوں کی تسبیحیں لئے اس طرح کھڑے تھے گویا اب ناچتے ہیں۔ چاروں طرف چتر زرنگار جن میں موتیوں کی چادر جھلملاتی تھی آگے ایک شامیانہ جواہرات اور موتیوں کی آبداری سے دریائے نور کی طرح لہراتا تھا۔

فسانۂ آزاد

مصنف: رتن ناتھ سرشار

اردو ناول کی تاریخ میں "فسانۂ آزاد" ہمیشہ زندہ رہے گا۔ سرشار اردو کے مشہور مصنف، زبردست زبان دان، ظریف، بذلہ سنج اور ایک طرزِ خاص کے مُوجد بھی ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد دکن میں انتقال ہوا۔ بٹیر: لکھنؤ کے نواب صاحب، میاں آزاد کو بٹیر خانے لے گئے۔ مصاحب نے ایک بٹیر دکھا کر کہا کہ اللہ رکھے کیا منجھولا جوان ہے۔ "صف شکن" جو آپنے سنا یہی حضرت ہیں۔ لندن تک خبر کے کاغذ میں اس کا حال چھپ گیا ہے، میری جان کی قسم ذرا اس کی آن بان تو دیکھئے (بوسہ دے کر) ہائے کیا بانکا بٹیر ہے۔ یہ نواب صاحب کے "دادا جان" کے وقت کا ہے۔ یہ بزرگوں کی نشانی ہے۔ بیٹر کیا، ہفت خوان منازل پہلوانی ہے ہفت اقلیم میں لاثانی ہے۔ مرغ کو ایک کر لات مارے تو وہ بھی چیں بول جائے۔ جیسے پانز اور پٹے کی لڑائی شاہی فوج میں جب دلگے والی پلٹن بگڑی تھی تو ہمارے حضور ہی بھیجے گئے تھے۔ "خوجی" بوڑھے ہیں۔ مگر وہ اپنے آپ کو جوان، کبھی بچے سمجھتے ہیں۔ کمزور اتنے کہ اگر ہوا چھو جائے تو گر پڑیں۔ دبلے پتلے ایسے کہ کوئی بچہ چپت جڑ دے تو سات لڑکنیاں کھائیں۔ بدصورت اِس قدر کہ کوئی دیکھ لے تو ڈر جائے۔ مگر سمجھتے یہ ہیں کہ میں نہایت موٹا تازہ، نہایت طاقتور، نہایت خوبصورت ہوں۔ حوصلہ ایسا کہ ہزار مرتبہ پٹے، جوتیاں کھائیں، مگر خم ٹھونک کر لڑنے کو تیار، میاں خوجی میں ایک وصف یہ تھا کہ بے سوچے سمجھے بے دیکھے بھالے لڑ پڑتے تھے۔ چاہے اپنے سے دگنا چوگنا ہو یہ جھٹ ہی جائیں گے، دوسرا وصف یہ تھا کہ پٹ پٹا کر، جھاڑ پونچھ کے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ کیا ممکن کہ ذرا اُف کریں، وہی تیور، وہی دم خم — میاں خوجی نے ٹٹو کو چھوڑ دیا کہ جہاں جی چاہے آزادی سے چرے۔ وہ سیدھی ٹوٹ کے کھیت میں پہنچی اور لگی چرنے۔ اتنے میں کسان اور اس کی جورو بھی لپک کر پہنچی کوسنا شروع کیا۔ کسان نے ٹٹو کو خوب مارا۔ اتنے میں میاں خوجی نے للکارا۔ خبردار خبردار! اِس حرکت ناشائستہ سے باز آ، ورنہ فرقدان پر ایک بال باقی ملے گا، ضربت پاپوش سے بوکھلا جائیگا۔ کسان نے اتنی بڑی گستاخی کی کہ ٹٹو کو مارا۔ پھر بھلا ان کو تاب کہاں۔ تڑپ گئے۔ وہ گنوار آدمی اور انتہا کا کرارا۔ یہ دبلے پتلے ہیں آدمی، ہوا کے جھونکے میں اُڑ جائیں۔ اس نے اِن کی گردن دبوچی اور گدّے سے زمین پر پھینکا۔ پھر چھٹنے کی کوشش کی تو کسان کی جورو چمٹ گئی۔ اور لگی ہاتھا پائی ہونے، اس نے گھونسا جمایا اور ان کے پٹے پکڑ کر پھینکا تو چاروں خانے چت، دو تھپڑ رسید کئے ایک اِدھر ایک اُدھر اور کسان کھڑا ہنس رہا ہے، کسان کی جورو تو ٹھونک ٹھانک اور پیٹ پاٹ کر چلدی۔ آپ نے پکارنا شروع کیا۔ "قسم بابا جان کی جو کہیں قرولی پاس ہوتی تو اِن دونوں کی لاشیں اس وقت پھڑکتی ہوتیں۔" اِس پر گاؤں والوں نے خوب قہقہہ اڑایا تو خوجی نے کہا۔ بھئی عورت ذات تھی، رحم آگیا۔ "لکھنؤ کا محرم۔ شیعہ غمِ حسینؑ میں برہنہ سر، برہنہ پا، سیاہ ماتمی پوشاک

پہنے، ماتم و گریہ زاری کرتے "تال کٹورے" کی کربلا جا رہے ہیں"۔ (فسانۂ آزاد ۱۸۷۹ء)

داستانِ اردو

مصنف: نصیر حسین خیالؔ

"اردوئے معلّٰی تیمور کے پوتے بابر کے پیار اور اخلاص کا حال گزر چکا۔ اب شاہجہاں کی حکایت بھی پڑھو۔ شاہجہاں کو زبانِ اردو پر وہی حق دعوٰی ہے جو کسی صنّاع کو اپنی صنعت و کاری گری پر ہوا کرتا ہے۔ شاہجہاں اسی کی گود میں پیدا ہوا اور اسی کے دامن میں پلا۔ اذان کے بعد جو پہلی آواز اس کے کانوں میں پڑی وہ اسی زبان (اردو) کی صدائے خوش تھی (کیونکہ دادی اور ماں ہندو رانیاں تھیں) شہزادہ کی پیدائش پر جو جشن ہوا اور حرم سرا میں جو خوشیاں منائی گئیں وہ ترکانہ نہیں بلکہ ہندوانہ تھیں۔ یہ پیدا ہوا تو ساری راجپوتی رسمیں برتی گئیں۔ زچہ خانہ تک گایا گیا۔ لوریوں، چھٹی چھلے کے گیتوں اور راگوں کی دھنیں اسی زبان میں ہوئیں"۔ "شاہجہاں آباد (دہلی) بن چکا اور بادشاہ کے مبارک قدم ادھر آئے تو اردوئے معلّٰی کا شیرخوار بھی دامنِ دولت سے لپٹا ہوا ساتھ ساتھ آیا۔ اس دن سے یہ طفل "لال قلعہ" میں اور شاہجہاں کے سے سرپرست کی نظر کے سامنے پلنے اور بڑھنے لگا۔ شاہجہاں نے اس شیرخوار پر صرف زبانی مہر و شفقت نہیں دکھائی، بلکہ دلی الفت سے اسے گود میں لیا اور منہ سے منہ ملا کر ہمیشہ پیار کیا۔" دلّی کی تین بیٹیاں فیض آباد اور لکھنؤ گئیں۔ پہلی صاحبزادی "بہو بیگم" تھیں، جنہیں محمد شاہ، بادشاہ نے اپنی بیٹی بنایا، چھاتی پر سُلایا اور اپنے وزیرزادے" نواب شجاع الدولہ والیٔ اودھ سے بیاہ دیا۔ دوسری صاحبزادی یہ دلہن بیگم تھیں جو دلّی کے محلوں سے بڑے چاؤ ارمان کے ساتھ فیض آباد آئیں اور نواب آصف الدولہ (خلف شجاع الدولہ) سے بیاہی گئیں۔ دلی کی تیسری بیٹی ہماری یہ اردو تھی جو لال قلعہ (دہلی) میں پروان چڑھ کر آخر اودھ (لکھنؤ) آئی اور وہاں دلہن بنی۔ دلہن بیگم اپنی زبان (اردو) دہلی اور قلعہ معلّٰی سے ساتھ لائیں۔ شاعری بھی جہیز کی طرح دامنِ دولت سے لپٹی ان کے ہمراہ اودھ آ گئی۔ انگریزوں نے پہلے فارسی کو ختم کیا۔ پھر اردو کو نکال کر انگریزی کو دفتری زبان بنایا۔ ان واقعات کو خیالؔ اس طرح ظاہر کرتے ہیں: "اب مغلوں کی دفتری زبان "فارسی" کا گلا گھونٹ دینا کیا مشکل تھا۔ مگر دانا جلد باز نہیں ہوتا۔ مچھلی زور سے پھنسائی نہیں جاتی۔ تجربہ کار دریا میں اپنی ڈور اور چارہ چھوڑ کر بیٹھ جاتا اور سانس نہیں لیتا کہ مچھلی نے چارہ کھایا اور بھاگی۔ سمجھی کہ بے آڑی، مگر دانا شکاری اس وقت زور نہیں کرتا بلکہ ڈھیل دیتا ہے، مچھلی کے منہ میں ڈور کا کانٹا ہے جائے گی کہاں؟ وہ پانی میں دوڑی دھوپی، آخر تھکی، گری اور مرتے میں پکڑی گئی۔ سیاست کا جال بھی یوں ہی بچھایا جاتا ہے اور غریب مچھلیوں کو پہلے چارہ دے کر تھکایا جاتا، پھر نکال کر ان کا چھلکا اُدھیڑا جاتا ہے۔" (داستانِ اردو ۱۹۳۳ء)

امراؤ جان ادا

مصنف مرزا محمد ہادی رسوا

(طوائف) "برسات کے دن ہیں، گھٹا آسمان پہ چھائی ہوئی ہے۔ پانی تل دھار، اوپر دھار برس رہا ہے، بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہا ہے۔ میں بڑا حبشن کی کوٹھری میں اکیلی پڑی ہوں۔ چراغ گل ہو گیا ہے اور اندھیری وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ جب

بجلی چمکتی ہے مارے ڈر کے ڈلائی سے منہ ڈھانپ لیتی ہوں ٹ۔" ایک خاص قسم کی رسم (جس سے میں بالکل ناواقف تھی) کے ادا ہونے کے بعد بسم اللہ سے بسم اللہ جان، اور خورشید سے خورشید جان ہوگئیں۔ بیباکی کی سند حاصل ہوگئی، آزادی کا خلعت مل گیا، وہ مردوں کے ساتھ بے تکلف ہنسی مذاق کرنے لگی تھیں، ان کے کمرے جدا جدا سج دیئے گئے۔ نواڑ کے پلنگ، ڈوریوں سے کسے ہوئے تھے، فرش پر ستھری چاندنی بچھی ہوتی۔ بڑے بڑے نقشی پاندان، خس دان۔ خاصدان، اگالدان اپنے اپنے قرینوں سے رکھے ہوئے دیواروں پر جلی آئینے، عمدہ تصویریں، چھت میں چھت گیریاں لگی ہوئی، جس کے درمیان ایک مختصر سا جھاڑ، اِدھر اُدھر عمدہ ہانڈیاں، سرشام دو کنول روشن ہو جاتے، دو، دو مہریاں، دو، دو خدمت گار، ہاتھ باندھے کھڑے ہیں، خوبصورت نوجوان، رئیس زادے ہر وقت دِل بہلانے کو حاضر، چاندی کی گڑگڑی منہ سے لگی ہوئی ہے۔ سامنے پاندان کھلا ہوا ہے، ایک ایک کو پان لگا کے دیتی جاتی ہیں، چہلیں ہوتی جاتی ہیں، اٹھتی ہیں تو لوگ "بسم اللہ" کہتے ہیں، چلتی ہیں تو لوگ آنکھیں بچھاتے جاتے ہیں۔ یہ ہیں کہ کسی کی پرواہی نہیں کرتیں جو ہے انہی کے حکم کے تابع ہے، حکومت بھی وہ کہ زمین آسمان ٹل جائے مگر ان کا کہنا نہ ٹلے۔ فرمائشوں کا تو ذکر ہی کیا بن مانگے لوگ کلیجہ نکال کے دے دیتے ہیں، کوئی دل ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے، کوئی جان قربان کرتا ہے۔ یہاں کسی کی نذر ہی قبول نہیں ہوتی، کوئی بات نظر میں نہیں سماتی، بے پروائی یہ کہ کوئی جان بھی دیدے تو ان کے نزدیک مال نہیں، غرور ایسا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت ان کی ٹھوکر پر ہے، ناز وہ جو کسی سے اُٹھایا نہ جائے، مگر اٹھانے والے اٹھاتے ہیں، انداز وہ جو مار ہی ڈالے، مگر مرنے والے مر ہی جاتے ہیں، اِدھر اس کو رلایا، اُدھر اُسے ہنسایا، کسی کے کلیجے میں چٹکی لے لی، کسی کا دِل تلووں سے مسل ڈالا، بات بات میں رُوٹھی جاتی ہیں، لوگ منا رہے ہیں، منت کر رہے ہیں، قول کیا اور مکر گئیں، قسم کھائی اور بھول گئیں، محفل میں سب کی نگاہ ان کی طرف ہے، یہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں، پھر جدھر دیکھ لیا ادھر سب دیکھنے لگے۔ جس پر ان کی نگاہ پڑتی ہے اس پر ہزاروں نگاہیں پڑتی ہیں۔ رشک کے مارے لوگ جلے جاتے ہیں اور یہ جان جان کے جلا رہی ہیں اور لطف یہ کہ دِل میں کچھ نہیں، وہ بھی پیچ، یہ بھی پیچ، — فقط بناوٹ "

(امراؤ جان ادا)

غالب کے خطوط

مصنف: مرزا غالب

غالب نے اردو خطوط نویسی کی جو طرز ایجاد کی اور اس میں جو جدتیں پیدا کیں، اس میں غالب اول سے آخر تک غالب رہے۔ مولانا حالی "یادگار غالب" میں لکھتے ہیں: "مرزا غالب کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ انکے بعد کسی سے اس کی پوری پوری تقلید ہو سکی، ادائے مطلب کا طریقہ بالکل ایسا ہے، جیسے دو آدمی آپس میں بات چیت یا سوال جواب کرتے ہوں، مرزا غالب کی جس چیز نے ان کے مکاتیب کو ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ ان کی شوخیٔ تحریر ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سر بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور قوتِ متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت

تھی جو قوتِ پرواز کو طائر کے ساتھ۔ بلحاظ دلچسپی اور لطفِ بیان کے، مرزا کے خطوط اپنی نظیر آپ ہیں"۔
مولانا سید سلیمان ندوی "نقوشِ سلیمانی" میں لکھتے ہیں۔ "مرزا غالب کیا کیا خونِ جگر کھا کر اپنے فارسی نامے لکھا کرتے تھے، مگر تقدیر کی عجائب کاری دیکھئے کہ اُن کے اِس خونِ جگر کا ایک قطرہ بھی ہمارے ادبی خزانے کا کوئی قیمتی لعل نہ بن سکا اور ان کی اردو کے چند فقرے جو ہنستے بولتے چلتے پھرتے ان کی زبان قلم سے نکل گئے، ان کا ہر لفظ قدر دانوں میں موتیوں سے زیادہ قیمتی ٹھہرا اور آج وہ ہمارے ادبی خزانے کا بیش قیمت سرمایہ ہے"۔——

خطوطِ غالب: مرزا صاحب نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو، کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو کہ یہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہوگئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ ... کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں، دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی، قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو "ہند" میں اس نام کا تھا۔— شفیق کے نام "پیر و مرشد بارہ بجے تھے، میں ننگا پلنگ پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ ایک آدمی نے آکر خط دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا، بھلے کو انگرکھا یا کرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا، حضرت کا کیا جاتا میرا نقصان ہوتا"— کیوں صاحب روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی، اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو، میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا، ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو، ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے میری دل لگی ہو جاتی ہے، ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں وقت گزر جاتا ہے۔ خط لکھو صاحب! نہ لکھنے کی وجہ لکھو، آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔ (خطوطِ غالب)

سی پارۂ دل

مصنف، خواجہ حسن نظامی

شہزادی گُل بانو۔ "غدر کے بعد درگاہ

حضرت چراغ دہلی کے گوشہ میں ایک حسین دوشیزہ پھٹا ہوا کمبل اوڑھے رات کے وقت ہائے ہائے کر رہی تھی، سردی کا مہینہ، دھُواں دار مینہ برس رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے بوچھاڑ اس جگہ کو تر کر رہی تھی جہاں اس دوشیزہ کا بستر تھا۔ یہ سخت بیمار تھی، پسلی کے درد، بخار اور بے کسی میں اکیلی تڑپتی تھی۔ مینہ سناٹے سے برس رہا تھا، بجلی چمکی تو ایک سفید قبر کی جھلک دکھائی دی جو اس کے باپ کی تھی، اس دوشیزہ نے باپ کی قبر پر پہنچ کر ایک ... مارا اور کہا۔ "بابا میں آپ کی گل بانو ہوں، دیکھو اکیلی ہوں۔ مجھے بخار چڑھ رہا ہے، میری پسلی میں شدت کا درد ہو رہا ہے، مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میری اماں مجھ سے بچھڑ گئیں۔ دادا حضرت (بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار دہلی) جلا وطن ہوگئے، میرا لال قلعہ کا چھپر کھٹ کیا ہوا، میری سیج کدھر گئی، میں نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا، میں اینٹ پر سر رکھے لیٹی ہوں، میرے بدن میں کنکر چبھ رہے ہیں، بابا اٹھو، کب تک سوؤ گے، ہائے درد، اُفوہ، سانس کیوں کر لوں۔" یہ کہہ کر باپ کی قبر سے لپٹی اور رُوح پرواز کر گئی۔ "بیگمات کے آنسو" **دعا**۔ میرے مالک پچھلی رات ہے، سب سوتے ہیں، تو جاگتا ہے، میں جاگتی ہوں۔ ... سامنے کے آسمان میں ہے یا خود میرے اندر کے مکان

میں ہے، جہاں ہے میری التجا، کوشش، صبح کا نور چمکنے سے پہلے، تاروں کی روشنی چھپنے سے پیشتر، پرندوں کی نغمہ خوانی سے قبل، میری مراد پوری کردے "۔ جھینگر بے چارہ غریب تھا، خلوت نشین تھا، خلقت میں حقیر و ذلیل تھا، خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا، ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں، کسی سوراخ میں، بوریئے کے نیچے، آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا، نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن، نہ کوّے کی سی شریر چونچ تھی، نہ بلبل کی مانند پھولوں کی عشق بازی تمام کے وقت عبادت رب کے لئے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ غافلوں کے لئے صور ہے اور عاقلوں کے لئے جلوۂ طور ہے۔" (صبح یادۂ دل ۱۹۱۶ء)

غبارِ خاطر

مصنف: ابوالکلام آزاد

تاج:۔ "(حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں، حسن ہے، اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے) رات کا سناٹا، تاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف تاج کے مینارے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی رو پہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے، نالہ ہائے بے خوف اُٹھے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگے، آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے۔ کچھ دیر تک فضا تھمی رہی، گویا کان لگا کر خاموشی سے سن رہی تھی، پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگا۔ چاند بڑھنے لگا، یہاں تک کہ سر پر آ کھڑا ہوا، ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آ آ کر جھومنے لگیں، رات کے سیاہ پردوں کے اندر عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیں، بارہا تاج کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں، اور کتنی ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ مینارے اپنے کاندھوں کی جنبش نہ روک سکے، آپ باور کریں یا نہ کریں، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں اور جب کبھی تاج کے گنبدِ خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے۔" (غبارِ خاطر ۱۹۴۶ء)

شریر بیوی

مصنف عظیم بیگ چغتائی

جب گھی میں بھنی ہوئی سوجی میں سے خوشبو نکلنے لگی تو بجائے شکر کے جو پسی ہوئی تھی خوب اچھی طرح سے نمک ڈالا جلدی سے تیار کر کے حلوہ اتار لیا اور نہایت تکلف سے اس کو زعفران اور کیوڑ۔۔۔ کی خوشبو دے کر پلیٹوں میں رکھ کر سنہری ورق لگائے گئے اور میوے کی افشاں چھڑکی گئی، اب مرغ کے قورمے کا حال سنئے، اس میں بجائے نمک کے نہایت اطمینان سے شکر ڈالی گئی اور سب چیزوں میں سے تھوڑا تھوڑا ہماری شریر بیوی نے بیرسٹر صاحب کے ہاں بھیج دیا تاکہ کھانے کے وقت پہنچ جائے، شام کو بیرسٹر صاحب ملنے آئے اور حلوہ کا شکریہ ادا کیا۔ اب بیگم نے ہم پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہا۔ ہم باہر سے کلی کر کے آئے تو ہم نے اپنی شریر بیوی کے چہرے پر وہ خاموشی دیکھی جو نہایت ہی شرارت سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم نے جو چائے کی پیالی کی طرف دیکھا تو وہ ہنسنے لگی، ہم نے کہا کہ کیا دیوانی ہوئی ہو، کیوں ہنستی

ہو؟ اس پردہ اور بنسی اور پان والے کا قصہ کہنے لگی، ہم اس طرح چائے چسکا رہے تھے کہ ہمارا شبہ کچھ مٹ گیا تھا اور ہم نے چائے کی پیالی پینے کے لئے اُٹھائی کہ اس کو پھر ہنسی آ گئی جس کو اس نے تھوکنے کے بہانے ٹالنا چاہا، وہ آتش دان میں تھوکنے اٹھی اور ادھر ہم نے موقع پا کر احتیاطاً اس صفائی سے چائے کی پیالی بدلی کہ اس کو شبہ تک نہ ہوا، ہم اس چائے سے کھیل رہے تھے کہ جیسے اس کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کر رہے ہیں کہ اس نے اپنے آگے کی چائے کی پیالی اٹھائی جو ہمارے لئے کونین سے زہر ہلاہل کر کے رکھی تھی، پہلے ہی گھونٹ میں اس کو بس مزہ آ گیا اور ہم نے جھک جھک کر سلام کئے۔ اس کا بھی ہنسی کے مارے برا حال تھا کہ تھوکنا مصیبت ہو گیا۔"

(شریر بیوی ۱۹۲۴ء)

★★

اردو کی پہلی کتاب

۱۷۳۳ء میں شاہ فضل اللہ نے جو فضل علی فضلی کے نام سے بھی مشہور تھے۔ اردو ادب کو پہلی کتاب نذر کی جو نثر میں تھی۔ آب حیات کے صفحہ ۲۳ پر مولانا محمد حسین آزاد نے "کربل کتھا" یا "دہ مجلس" کے باب میں تحریر کیا ہے کہ:-

"محمد شاہ کے عہد ۱۱۴۵ ہجری (۱۷۳۳ء) میں فضلی نے دہ مجلس لکھی اور غالباً یہی نثر اردو کی پہلی تصنیف ہے۔"

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اس کتاب کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ وہ فارسی زبان میں تحریر کی گئی۔ "روضۃ الشہدا" کا ترجمہ ہے جسے ملا حسین واعظ کاشفی نے تصنیف کیا تھا۔

مولانا احسن مارہروی، مالک رام، شمس اللہ قادری، صفیر بلگرامی وغیرہ نے کربل کتھا کو شمالی ہندوستان کی پہلی کتاب تسلیم کیا ہے۔

لیکن پروفیسر محمود شیرانی نے پنجاب میں ایک اور کتاب کی نشاندہی کرتے ہوئے "پنجاب میں اردو" نام کی کتاب میں لکھا ہے کہ:-

"پنجاب میں مولانا عبدی کی تصنیف رسالہ "فقہ ہندی" (جو محشر نامہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔) سب سے قدیم ہے جو سنہ ۱۰۷۵ھ ہجری ۱۶۶۵ء میں بہ عہد اورنگ زیب عالمگیر میں لکھی گئی ہے۔"

اس کتاب کے آخر میں مندرجہ ذیل دو شعروں سے سال تصنیف کی نشاندہی ہوتی ہے:

فقہ ہندی کوں مومناں آنوں زباں پر یاد
مسئلہ آویں دین کے مول نہ ہووے فساد

سنہ ہزار چوہتر پنج رمضان تمام
اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

مشہور محقق پروفیسر حامد حسن قادری کی تلاش و جستجو نے ایک اور کتاب کو اردو کی پہلی کتاب تسلیم کیا ہے۔ انکے بقول یہ رسالہ اخلاق و تصوف ہے جسے ۸۰۸ھ میں خواجہ سید جہانگیر اشرف سمنانی نے تصنیف کیا تھا۔ اردو کی پہلی کتاب ان میں سے کسے قرار دیا جائے، یہ فیصلہ خود قارئین کر سکتے ہیں۔

• پروفیسر قوی دسوی

اُردو شعراء کی انوکھی مجلس 'دائرۃ الکہلا'

جگر صاحب کا پہلی بار تقریباً تین ماہ بھوپال میں قیام رہا۔ اس کے بعد وہ واپس چلے گئے اور ایک سال بعد دوبارہ تشریف لائے اور محمود علی خاں جامعی کے یہاں قیام کیا۔ جو اس وقت بھوپال میں مردم شماری کے آفیسر تھے۔ پھر محفلیں جمنے لگیں اور بھوپال کے تقریباً تمام اچھے شعرا اس محفل میں حصہ لینے لگے۔ ان میں کم عمر بھی ہوتے تھے جوان اور پیر بھی۔ اور رات کے تین تین بجے تک محفل جمی رہتی تھی۔ یہ زمانہ موسم برسات کا تھا۔ اور بھوپال میں برسات کا موسم بہار کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس موسم میں آرام طلبی کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور مزاج میں سستی آجاتی ہے۔ اس لئے کاہلی کی تحریک شروع کی گئی۔ ایک بات اور سامنے آئی۔ چھوٹے بڑے ایک دوسرے کے سامنے بے تکلف نہیں ہو پاتے تھے۔ اور بے تکلفی کے بغیر کام نہیں چلتا تھا اس لئے بھی ضرورت محسوس کی گئی کہ ایک ایسی انجمن بنائی جائے جس میں فرق مراتب کا خیال ختم کر دیا جائے۔ اور ان بے فکروں کو آداب محفل سے کچھ حد تک بے نیازی حاصل ہو جائے۔

مولوی مہدی بھی اسی جگر نوازوں کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ جب وہ آتے تو فوراً ہی لیٹ جاتے اور ہلکی چادر جسم پر ڈال لیتے اور صرف ایک پیر کو جنبش دیتے رہتے۔ صبح سے رات تک انکا یہی معمول تھا چونکہ سب سے زیادہ معمر تھے۔ اس لئے ہر فرد انکا ادب و احترام کرتا تھا۔ ان کی سستی اور کاہلی کو دیکھکر ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ کیوں نہ ہر شخص کے لئے کام سے بچنے کے مواقع پیدا کئے جائیں چنانچہ کئی دنوں کی بحث و مباحثہ کے بعد ایک انجمن قائم کی گئی جس کا نام 'دائرۃ الکہلا' رکھا گیا۔

جس کی بنیاد محمود علی صاحب کے گھر پر رکھی گئی پھر اسے دارالکہلا کا نام دیا گیا۔ اس انجمن کی بنیاد کی وجہ یہ بتائی گئی کہ دنیا میں جتنی پریشانیاں اور مشکلات پیدا ہو رہی ہیں وہ سب سرعت رفتار کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں۔ اسی کی وجہ سے جنگیں بھی ہو رہی ہیں اور جنگوں کے نئے آسانیاں بھی پیدا ہو رہی ہیں۔ اسی کی وجہ سے دنیا والے مشکلات اور تکالیف میں گرفتار ہوتے چلے جا رہے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اس کی روک تھام کی جائے۔ سستی اس سلسلے میں بڑی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی غرض سے کاہلوں کی انجمن بنائی گئی تاکہ کاہلی اور سستی کی اشاعت کی جا سکے اور جنگ اور دوسری مشکلات کا سدباب ہو سکے۔

انجمن کی فیس ایک تکیہ رکھی گئی۔ جو شخص بھی اس انجمن کا رُکن ہوتا تھا وہ ایک تکیہ لا کر دارالکہلا میں ڈال دیتا تھا۔ ایک بات یہ طے پائی کہ لیٹا ہوا آدمی اوّل درجہ کا کاہل شمار کیا جائے گا۔ بیٹھا ہوا دوم درجہ کا۔ اور کھڑا ہوا سوم درجہ کا۔ اس لئے لیٹا ہوا بیٹھے ہوئے اور بیٹھا ہوا کھڑے ہوئے کو کسی کام کا حکم دے سکتا ہے۔ مثلاً چلم بھرنا، پانی پلانا وغیرہ۔ کام سے بچنے کے لئے اکثر ممبران دروازے پر پہنچتے ہی کھڑے کھڑے لیٹ جاتے تھے اور لیٹے لیٹے کمرے میں داخل ہوتے تھے تاکہ کسی قسم کا حکم نہ دیا جا سکے۔ ہونٹ کو رکی پیالی میں چائے پینا ایک دم ممنوع قرار پایا۔ اس لئے کہ اس میں منہ زیادہ کھولنا پڑتا ہے جو کاہلی کے لئے نقصان دہ ہے۔

انجمن کے صدر جگر صاحب ہوئے اور صدرالکہلا، رئیس الکہلا کہلائے۔ حسرت لکھنوی نائب صدر بنے اور نائب الکہلا یا معین الکہلا، کہے گئے۔ محمود علی خاں اس کے ناظم مقرر ہوئے اور انہیں ناظم الکہلا، کہا گیا۔ ناظم کے ذمہ انجمن کی ضروریات پوری کرنا تھا۔ اور آئندہ کا پروگرام مرتب کرنا تھا۔ غلام حسین خان عزم بنارسی کو نقیب الکہلا کا نام دیا گیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ انجمن کی کارروائی کو بلند آواز سے سنائیں۔ یہ عہدہ انہیں اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ طویل قد تھے اور بھاری آواز کے مالک تھے۔

ان کے علاوہ انجمن کے ۱۲ ممبران اور تھے جن کو ان کی خصوصیات کی بنا پر خطابات دیئے گئے تھے۔ سید علی اکبر کاظمی دراز قد تھے۔ اس لئے طویل الکہلا، کہلائے۔ محمود اعظم فہمی قلیل الکہلا، (پست قدی کی وجہ سے) باسط بھوپالی ضخیم الکہلا، (موٹاپے کی وجہ سے)، جلیل صاحب وزیرالکہلا، شاکر علی خاں تنبیہ الکہلا، (سب کی پکڑ دھکڑ کا کام ان کے ذمہ تھا)

محمد شریف فکری قوت الکہلا، کہلائے (قبلہ نما توند کی وجہ سے)، مہدی صاحب جدالکہلا، کہلائے۔ مالک رام صاحب نے عمّ الکہلا تحریر کیا ہے۔ کچھ تو اپنی بزرگی اور مشفقانہ رویے کی وجہ سے اور کچھ اس واقعہ کی وجہ سے کہ ایک روز حقہ آیا جس کی چلم میں دہکتے ہوئے انگارے تھے۔ اتفاقاً چلم الٹ گئی اور انگارے مہدی صاحب کے زانو پر آ گرے۔ اس وقت وہ دیوار کے سہارے آدھے لیٹے ہوئے اور آدھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے کپڑے جل گئے۔ یہاں تک کہ ان کا جسم بھی جل گیا لیکن وہ ذرا بھی نہ ہلے۔ البتہ چلم کے گرتے ہی کچھ لوگ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ مہدی صاحب نے فوراً اٹھنے والوں کو انگارے ہٹانے کا حکم دیا۔ اس واقعہ نے انہیں جدالکہلا، بنا دیا۔

عبداللطیف برادر باسط بھوپالی مرحوم جن کا ناک نقشہ اور رنگ سانولا تھا۔ ملیح الکہلا، کہلائے۔ سید عبداللطیف بن اولاد حسین سفید شلجمی رنگ کی وجہ سے صبیح الکہلا، کہلائے اور احمد اللہ تسا کی شریر الکہلا کہلائے۔ ذوالفقار علی کیفی دعوتیں وغیرہ طے کرنا ان کے ذمہ تھا اس لئے سفیر الکہلا، شعری بھوپالی اور مولانا طرزی مشرقی باغی الکہلا، کہلائے۔ اس لئے کہ دونوں نے قاعدے توڑے اور سستی اور کاہلی کے خلاف کام کئے تھے۔ اور پابندی سے حاضر نہیں ہوتے تھے۔ احمد مکی دبلے پتلے ہونے کی وجہ سے نحیف الکہلا، کہے گئے۔ ان کے علاوہ منظور سروش عبدالکریم ذکی۔ سید حسن۔ عبداللہ زیدی۔ سید احمد خاں صاحب بھی اس انجمن کے رکن تھے۔

یہ تمام خطابات بہت غور و فکر کے بعد ممبروں کی خصوصیات مدِنظر رکھتے ہوئے ایک نشست میں تقسیم کئے گئے

تھے۔ یہ نشستیں رات ۹ بجے سے تین بجے تک جمتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی ممبر تاش، شطرنج یا کیرم کھیلنے کی تجویز پیش کرتا یا چائے پینے کی خواہش ظاہر کرتا تو عام ممبروں کی رائے سے صدر اس کی منظوری دیتا۔ جگر صاحب بغیر دودھ کی چائے بیحد پسند کرتے تھے۔ جب اس انجمن کی نشستیں برخاست ہوتی تھیں تو ایک ایک پیالی بغیر دودھ کی چائے کا دور چلتا تھا۔ اور یہ تقریباً ہر رات کا دستور تھا۔

انجمن میں کبھی کبھی ساتھ کھانے کا پروگرام بنتا۔ جس میں تمام ممبر شریک ہوتے۔ ہر ممبر اپنے یہاں کی بنی ہوئی مخصوص چیز لاتا لیکن اس کا خیال کہ کھانا دو آدمیوں کے لئے کافی ہو ضروری تھا۔ اس سے زیادہ لانا جُرم تھا لیکن اس جرم کا کبھی کوئی ممبر مرتکب نہیں ہوا۔ طریقہ یہ تھا کہ ہر ممبر کا کھانا محمود خاں صاحب کے یہاں پہونچ جاتا جہاں سے ترتیب دیکر دارالکہلا بھیج دیا جاتا۔

اس زمانہ میں جگر صاحب اکثر کہیں نہ کہیں مدعو ہوا کرتے تھے چنانچہ یہ طے ہوا کہ آئندہ سے جو صاحب جگر صاحب کو مدعو کریں انہیں چاہئے کہ تمام ممبروں کو بھی مدعو کریں۔ ورنہ جگر صاحب کسی بھی دعوت میں شریک نہ ہوں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ دعوتوں کے سلسلے میں کمی ہوئی۔ لیکن جگر صاحب کے شیدائی پھر بھی باز نہیں آئے۔ اکثر دعوتیں ہوتی تھیں۔ اور تمام ممبروں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ کھانے کے بعد دارالکہلا کی پوری محفل میزبان ہی کے گھر پر جمتی تھی۔

اس انجمن کے تقریباً دس ممبر شاعر تھے۔ اس لئے شعر و شاعری کی محفلیں بھی جمتی تھیں۔ ایک بار شعر و شاعری کا مقابلہ ہوا اور جگر صاحب کے اس شعر پر فی البدیہہ شعر طلب کئے گئے ؎

ہم کو دعوائے عشق بازی ہے ✽ مستحقِ عذاب ہیں ہم لوگ

ایک صاحب نے کہا ؎

صبح اٹھتے ہیں نو بجے سو کر ✽ یعنی بالکل نواب ہیں ہم لوگ

دوسرے نے کہا ؎

اور سوتے ہیں رات تین بجے ✽ یعنی بالکل خراب ہیں ہم لوگ

اسی قسم کے بہت سے شعر کہے گئے لیکن سب سے زیادہ مولوی مہدی صاحب کا شعر پسند کیا گیا۔ اور جگر صاحب نے خوب داد دی شعر یہ تھا ؎

ہر گنہ میں کمال رکھتے ہیں ✽ مستحقِ ثواب ہیں ہم لوگ

دائرۃ الکہلا میں ایک دن تمام ممبران کو ایک دوسرے کا نام پلٹنے کی سوجھی۔ چنانچہ ایک دوسرے کے نام پلٹے گئے۔

محترم ممتاز مفتی

پرانے دور کامیاب نفسیات نگار ہیں۔ انہوں نے نفسیات اور جنسیات کا علمی مطالعہ کیا ہے اور اس سے اپنے افسانوں میں خوب کام لیا ہے۔ یہ منٹو سے اس معنی میں مختلف ہے کہ منٹو نے جنسیات کو سماجی انتقام یا مجلسی اصلاح کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی مگر ممتاز مفتی نے ان سے زیادہ جنس نگاری کرنے کے باوجود اس کو فن اور علم کی حد کے اندر رکھا۔ بہرحال مفتی ممتاز زیر بحث دور میں بھی لکھتے رہے۔ اس زمانے کی تخلیقات میں "لیکن" اور "دودھیا سویرا" جیسی چیزیں انہوں نے پیش کیں۔

بابائے اردو مرقع غالب میں مرزا غالب کی وہ تصویر ملاحظہ فرما رہے ہیں جو قلعہ معلی میں محفوظ ہے

جگر صاحب کا نام جگر مراد آبادی کی جگہ "جگر جراد آبادی" ہوا۔ شریف فکری صاحب "شریف کفری" ہوئے۔ "شاکر علی خاں" کا شر علی خاں ہوئے۔

سب سے زیادہ مشکل ذوالفقار علی کیفی کے نام پلٹنے میں آئی جب کچھ نہ بن پڑا تو نام بیچ سے پلٹ دیا گیا یعنی ذوالفقار سے فل ذقار ہوگیا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ دار الکہلا میں تقریباً دس شاعر تھے۔ اس لیے شعر و شاعری کا بھی کافی مشغلہ رہتا تھا جس کی وجہ سے فضا شاعرانہ بن گئی تھی۔ اور لوگ اچھے سے اچھا شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ جگر صاحب نے بھی خوب شعر کہے۔ یہ حقیقت ہے، اس دوران جگر صاحب جس قدر زیادہ غزلیں کہی ہیں۔ اور کسی شہر میں نہ کہہ سکے۔ اس دور میں مندرجہ ذیل غزلیں (بحوالہ محمود علی خاں) جگر صاحب نے کہیں ؎

جو اب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا تو بس ہاتھ ملتے ہی رہ جائیے گا
نظر ملا کے مرے پاس آ کے لوٹ لیا نظر ہٹی تھی کہ پھر مسکرا کے لوٹ لیا
ہجوم تجلی سے معمور ہو کر نظر رہ گئی شعلہ طور بن کر
عشق میں لاجواب ہیں ہم لوگ ماہتاب، آفتاب ہیں ہم لوگ

حسن معنی کی قسم، جلوۂ صورت کی قسم تو ہی فردوس ہے فردوس محبت کی قسم
محبت میں یہ کیا ستم دیکھتے ہیں بہت فرصت شوق کم دیکھتے ہیں
تڑپ کر دل انہیں تڑپا رہا ہے قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہے

اے محتسب نہ پھینک ارے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

یہ انجمن ایسی پر کشش تھی کہ ہر ممبر خواہ کسی حال میں ہو کھنچا چلا آتا تھا۔ اور اس وقت تک اٹھنے کا نام نہ لیتا تھا جب تک کہ محفل برخاست نہیں ہو جاتی تھی۔ یہ سلسلہ تقریباً رات تین بجے تک رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں بعد ہر ممبر کے گھروں میں عورتیں فکر مند ہونے لگیں اور آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ گچھ ہونے لگی۔ انہیں حیرت یہ تھی کہ آخر جگر صاحب میں کیا بات ہے کہ لوگ ان کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ حیرت نے شک کی صورت اختیار کی اور آخر تمام ممبروں کی بیویوں نے متفقہ طے کر لیا کہ جگر صاحب کوئی شاعر نہیں ہیں بلکہ کوئی طوائف ہیں جس نے تمام لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ جب جگر صاحب کو تمام ممبروں نے اس بات سے آگاہ کیا تو وہ خوب ہنسے۔ ●●

● حیدر آباد میں قیام کے دوران ایک شام استاد داغ اور بیخود دہلوی خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ ایک شاعر اُن سے ملنے آیا اور داغ سے پوچھا کہ حضرت آپ اتنی جلد شعر کیسے کہہ لیتے ہیں۔ داغ نے ان سے جواباً کہا "آپ اور جناب کیسے کہتے ہیں؟" انہوں نے کہا حقہ پیتا ہوں، پلنگ پر بیٹھتا ہوں پھر لیٹ جاتا ہوں کروٹیں بدلتا ہوں تب کوئی شعر موزوں ہوتا ہے یہ سن کر داغ نے کہا۔

"تو یوں کہئے کہ جناب شعر کہتے نہیں جنتے ہیں۔"

اور وہ شخص لاجواب ہو گیا۔

● ایک دفعہ اکبر الٰہ آبادی دہلی میں خواجہ حسن نظامی کے مہمان تھے۔ جب رواج خانقاہی دو طوائفیں سلام کرنے حاضر ہوئیں۔ خواجہ صاحب نے انہیں ٹال دیا مگر اکبر کب چوکنے والے تھے، کہنے لگے "میں تو سمجھتا تھا کہ اس گھر میں فرشتے ہی نازل ہوتے ہیں، اب معلوم ہوا کہ حوریں بھی اترتی ہیں۔" ساتھ ہی یہ شعر بھی کہہ دیا ؎

فقیروں کے گھروں میں لطف کی راتیں بھی آتی ہیں
زیارت کے لیے اکثر مستاتیں بھی آتی ہیں

● ایک مرتبہ عرب کے ایک عالم مولانا آزاد سے ملنے آئے، مولانا نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور ان کے لیے خاص طور پر چائے تیار کی جس کا رنگ گہرا سرخ تھا۔ عرب عالم نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور منہ بنا کر کہا "بے حد تلخ ہے"۔ مولانا آزاد نے مسکرا کر کہا "پیے جاؤ پیے جاؤ! حق ہمیشہ تلخ ہوتا ہے۔"

● جناب یوسف علی خاں والیٔ رامپور (جن کی طرف سے غالب کو وظیفہ ملتا تھا) کا انتقال ہو گیا تو مرزا غالب تعزیت کے لیے رامپور گئے۔ چند روز بعد نواب کلب علی خاں (ولی عہد ریاست) کو نواب لیفٹیننٹ گورنر سے ملنے بریلی جانا پڑا۔ ان کی روانگی کے وقت مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے معمولی طور پر کہا "خدا کے سپرد" مرزا نے کہا "حضرت! خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا تھا آپ پھر الٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں کچھ تو خیال کیجیے۔"

● ایک مرتبہ مولانا شوکت علی مدن پورہ (بمبئی) میں عام جلسہ میں تقریر کر رہے تھے، دورانِ تقریر انہوں نے فرمایا "برطانوی وزیر اعظم گلیڈسٹون کہا کرتا تھا کہ ہم ترکوں کو یورپ سے بوریا بستر سمیت نکال دیں گے، لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم ہندوستان سے انگریزوں کو نکالتے وقت بوریا بستر یہیں رکھوا لیں گے۔ یہ چیزیں ہماری ہیں۔"

● مولانا حسرت موہانی کے پیچھے ہر وقت سی۔ آئی۔ ڈی کے سپاہی لگے رہتے تھے۔ مولانا انہیں بے حد پریشان کرتے لیکن سپاہیوں کی ملازمت خطرے میں دیکھ کر مولانا حسرت نے پھر ان سے سمجھوتہ کر لیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا "مجھے ان سپاہیوں کی موجودگی سے ہمیشہ فائدہ پہنچتا ہے۔ دورانِ سفر میں وہ میرا سامان اٹھا کر لے چلتے ہیں اور میری خدمت کر کے مجھے آرام پہنچاتے ہیں۔"

دراصل وہ میرے باڈی گارڈ ہیں اور مجھ سے جدا ہونا پسند نہیں کرتے پھر میں انہیں کیوں ملامت کروں۔"

● مجاز اور فراق کے درمیان بڑی سنجیدگی سے گفتگو ہو رہی تھی۔ فراق نے مجاز کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ "تم نے کباب بیچنے کیوں بند کر دیئے" مجاز نے سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا "آپ کے یہاں سے گوشت آنا جو بند ہوگیا"

● مقبول حسین وصل بلگرامی بڑے زندہ دل اور ظریف بزرگ تھے مولانا نیاز فتحپوری سے یہ مسئلہ حل ہونے میں نہ آتا تھا کہ وصل صاحب کو ساری دنیا وصل بلگرامی کہتی ہے مگر بیگم صاحبہ (بیگم پیارے) مقبول حسین کہتی ہیں۔ آخر ایک دن رہ نہ گیا۔ پوچھ بیٹھے، آخر اس میں مقبول حسین کہنے میں کونسی مصلحت ہے۔ سیدھی طرح وصل کیوں نہیں کہتی ہو، بیگم سادگی اور بھولے پن سے بولیں۔
"تو کیا میں بھی گالی بکوں؟"

● یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جب ہندوستان و پاکستان دو الگ ملک نہیں تھے۔ ملتان میں ایک عظیم الشان مشاعرہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس میں اس زمانہ کے نامی چوٹی کے شعرا شریک تھے، اس مشاعرہ میں ہری چند اختر بھی تھے انہوں نے جو غزل پڑھی وہ سامعین کو بہت پسند آئی اور انہوں نے "ایک اور، ایک اور" کا تقاضا کیا، اس پر پنڈت ہری چند اختر صاحب نے کہا۔
"ایک صاحب تھے افیونی، انہوں نے افیوں کی پینک ہی میں سائیس کو حکم دیا کہ گھوڑے پر زین کس دو، سائیس نے جواب دیا کہ جناب کس دی ہے، انہوں نے کہا کہ ایک اور بھی کس دو"
اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

● مولوی فضل حق مرزا غالب کے بڑے دوست تھے ایک دن مرزا ان کی ملاقات کو گئے۔ مولانا کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتا تو خالق باری کا یہ مصرعہ پڑھا کرتے تھے۔
"بیا برادر آؤ رے بھائی"
چنانچہ مرزا صاحب کی تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور یہی مصرعہ پڑھا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ ایک طوائف دوسرے دالان سے آئی، مرزا صاحب مسکرائے اور بولے "ہاں مولانا اب شعر کا دوسرا مصرعہ بھی فرما دیجئے۔
"نشیں مادر بیٹھ رے مائی"
اور مولانا بے ساختہ مسکرا دیئے۔

● بجلی خراب ہونے کی وجہ سے منور لکھنوی موم بتی کی روشنی میں مصروف مطالعہ تھے کہ اچانک ایک پروانہ موم بتی کی لو سے ٹکرایا اور پروانے کے جلنے کے ساتھ موم بتی بھی بجھ گئی۔ منور صاحب نے یہ دیکھ کر ذرا سوچنے کے بعد یہ شعر کہہ دیا

الٰہی آگ ہی لگ جائے اس ذوقِ محبت کو
جلے کوئی مرے کوئی اندھیرا میری محفل میں

● فناؔ عارفی نے جب پہلی بار جوشؔ ملیح آبادی کی وہ نظم سنی، جن میں انہوں نے ایک گوالن کے حسن و جمال کی بہت تعریف کی ہے تو کبیدہ خاطر ہو کر اس نظم کے جواب میں اسی وقت یہ شعر موزوں کر دیا

صرف کہنے سے صداقت کا اگر چل جائے کام
بھینس کو دیجئے جنگل کی شہزادی کا نام

● شیخ امام بخش ناسخؔ ایک روز نواب نصیر الدین کے حضور میں تھے، اور نواب صاحب اس وقت حقہ پی رہے تھے انہوں نے فرمائش کی کہ شیخ صاحب اس حقے پر کوئی شعر کہئے۔ ناسخؔ صاحب نے تعمیل ارشاد میں اسی وقت یہ دو شعر کہہ دیئے

حقہ جو ہے حضور معلےٰ کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

ناسخ یہ سب بجا ہے ولیکن تو عرض کر
بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

● ایک بار داغ دہلوی اجمیر گئے۔ جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو ان کے شاگرد نواب عبداللہ خاں مطلب نے کہا استاد آپ تو جا رہے ہیں، جاتے ہوئے اپنی کوئی نشانی تو دیتے جائیے۔ یہ سن کر حضرت داغ نے بلا تامل کہا ؎

داغ کیا کم ہے نشانی کا یہی یاد رہے

● چند دیہاتی افراد شہر بغرض سیر و تفریح گئے گھومتے پھرتے رات کے وقت ایک ایسے مشاعرہ گاہ میں پہنچے، جو بہترین قسم کے پنڈال میں چکا چوند کر دینے والی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ شعرا عمدہ قسم کے صاف ستھرے ملبوس میں ایک شاندار قسم کے اسٹیج پر رونق افروز تھے۔ طرحی مشاعرہ پورے شباب پر تھا جس کا ردیف قافیہ تھا۔ زندگی دے دو۔ ابھی دیدو۔ آج ہی دے دو۔ وغیرہ وغیرہ۔

دیہاتیوں نے سمجھا کہ اجتماعی طور پر شہر کے تمام فقیر غالباً "یوم الفقرا" منانے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں اور بھیک مانگ رہے ہیں لیکن نہ جانے کیوں کوئی بھی انہیں کچھ دے ہی نہیں رہا ہے۔ یہ سوچ کر پاس بیٹھے ہوئے ایک شہری بابو سے انہوں نے کہا کہ کیوں بھائی یہ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے لوگ باری باری کھڑے ہو کر آپ لوگوں سے گڑگڑا کر بھیک مانگ رہے ہیں۔ پھر بھی آپ لوگوں کو ان کی عاجزی اور انکساری پر رحم کیوں نہیں آتا۔ شہری بابو نے انھیں یہ سمجھایا کہ یہ لوگ اتنے مغرور فقیر ہیں کہ اللہ کے نام پر نہیں مانگ رہے ہیں۔ ورنہ ابھی خیرات کی بارش ہونے لگتی۔

* *

غدر کے بعد کی ایک صحبت

از:
خواجہ عبدالمجید

میخانہ کی خرابی دیکھی تو جی بھر آیا
کیسا بھرا پڑا تھا کل تک یہ گھر خدایا (خواجہ)

دلی آباد تھی، غدر پڑا، اجاڑ ہوگئی، پھر آباد ہونی شروع ہوئی۔ یہ اس زمانہ کا مذکور ہے۔ نواب فضل اللہ خاں ایک دہلی کے شریف زادے۔ یہ تین بھائی دیوان جی۔ بخشی جی، نواب صاحب۔ قسمت نے یاوری کی، کسی حیلہ سے الور جا پہنچے۔ دیوان جی، دیوانی کے عہدے پر سرفراز ہوئے، بخشی جی بخشی افواج، نواب صاحب راجہ کے مصاحب۔ وہ اوج موج ہوئے کہ خدا دے اور بندہ لے راجہ پلے پر، ساری ریاست پر تصرف۔ یہ غدر سے پہلے کا واقعہ ہے۔ غدر کے چند سال بعد راجہ کے بھائی بھتیجے ان سے برافروختہ ہوگئے۔ فساد برپا کیا۔ گھر پر چڑھ آئے ہر ایک نے بھاگ کر چھپ کر جس طرح بن پڑا اپنی جان بچائی۔ ایک نوشتہ دار قتل ہوا۔ راج کے پہرے چوکی میں شہر سے نکال دیئے گئے۔ سرکار ہند نے بنارس میں نظر بند کیا۔

چند سال بعد دلی میں رہنے کی اجازت ہو گئی۔ یہاں آ کر اپنے آبائی مکانات میں آباد ہوئے۔ راجہ ان کا دوست، مخفیہ خط و کتابت جاری۔ آئے دن ٹھاکر آ جا رہے ہیں، اشرفیوں کی تھیلیوں پر تھیلیاں وصول ہوتی ہیں۔ دن عید، رات شب برات، جس کی سفارش کر دی اسی کا کام بن گیا، کیا مجال راجہ ان کا کہنا ٹالے۔

جاڑے کے دن ہیں، مہاوٹ ابھی برس کر کھلی ہے۔ پورے سات دن کی جھڑی تھی۔ ہوا سینہ کے پار ہوئی جاتی ہے۔ خدا کا شکر ہے مینہ ایک دن پہلے کھل گیا، نہیں تو عید کر کری ہو جاتی۔ عید الفطر کا دن گزرا، رات آئی۔ آج دیوان جی کے ہاں عید کی محفل آراستہ ہو گی۔ شہر کے سارے روادار آدمیوں سے یاد اللہ۔ سب مدعو ہیں۔ کھانے کی دعوت نہیں۔ اس کا موقع نہیں۔ سارے دن خوب کھایا ہے رات کو کھا کر کیا کریں گے۔ ہاں نقل اور کشمیری چائے سے تواضع ہو گی۔ یہی موسم کا میوہ ہے۔ رقص و سرود کی محفل ہے۔ گلاب دئی، شہر کی نامی نامدار رقاصہ کا مجرا ہے۔ آدھی رات تک جشن رہے گا۔ مکان ان کا آبائی ہے۔ دیوان خانہ بڑا تو بہت، مگر بھدا بھدا۔ یہ اس زمانہ کی عمارت ہے جب تک اس گھر میں کبھی لے جنم نہیں لیا تھا۔ یہاں تک کبھی شاندار نہیں نہ جلوہ خانہ۔ صبح سے اہتمام ہونا شروع ہوا۔ صحن میں تین سرو چراغاں کھڑے کئے گئے۔ دالان در دالان کے دروں پر کھاروے کے پنتی پردے پڑے ہیں۔ اندر قالینوں کا فرش۔ زربفت اور کمخواب کے گاؤ تکیے چاروں طرف لگے ہوئے۔ بیدری، گنگا جمنی، نقرئی کلیاں، تکیں، پیچواں قرینے سے رکھے ہوئے ہیں۔ سب میں لکھنؤ کا عنبری خمیرہ بھرا ہوا ہے۔ چلمیں اور ان کے چنبر پیچ رس کے منٹ منٹ پر رنگ بدلیں۔ حقے ایسے بھرے ہوئے کہ گھنٹہ بھر تک دمک دیں۔ عود سوزوں میں عنبر ہے۔ گھر سے باہر تک مہک رہا ہے۔ جگہ جگہ گشتاں رکھی ہیں۔ ان پر رنگ برنگ کے کارچوبی کشتی پوش پڑے ہیں۔ ان میں سلونے پستے بادام، الائچی دانہ اور نقل لگے ہوئے ہیں۔ جب مہمان جمع ہو جائیں گے تو چائے کا دور شروع ہو گا۔ کشمیری چائے کا کیا کہنا۔ یہ چائے کا ہے کو ہوتی ہے ایک خوش مزا حریرا ہوتا ہے جس نے پی ہو بس وہی جانے۔

چھت پر جھاڑ ٹنگے ہوئے۔ قلمیں شمعیاں سب بلور کی جھلل جھلل کر رہی ہیں۔ دیواروں پر دیوار گیریاں آویزاں۔ فرش پر چاندی کے شاخے، سہ شاخے، جگہ جگہ مردنگیں رکھی ہوئی۔ تمام گھر جگمگا رہا ہے۔ روشنی کا عکس قد آدم آئینوں پر عجیب نظارہ فریب ہے۔ آنکھیں چندھائی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے مرزا قربان بیگ سالک تشریف لائے۔ یہ رات دن کے ہمنشیں ہیں۔ بالا قامت، سرخ و سفید رنگ، غالب کے شاگردوں میں دلی میں بہت نام پایا، سینکڑوں شاگرد ہوئے۔ پھر پیٹ کی خاطر حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہیں فوت ہوئے۔ دوسرے صاحب جتا مل آئے ہیں۔ یہ بھی گھر ہی کے آدمی ہیں۔ سر پر مارواڑی پگڑی، بر میں جامہ، جامہ دار کی اونی چھینٹ کا۔ یہ ہمارے دیوان جی کے ساہوکار ہیں۔ روپیہ پیسہ انہی کے پاس رہتا ہے۔ چٹھی پرچہ پر دیتے لیتے رہتے ہیں۔

اطلاع ہوئی مرزا غالب تشریف لا رہے ہیں — فینس پر آئے ہیں۔ سن رسیدہ ہیں۔ ترکمانی لباس زیب تن، سر پر کلاہ قبچاق، بدن پر انگرکھا۔ اس پر پوستین کی الخالق۔ دیوان جی لب فرش تک تعظیم کو آئے۔ اپنے برابر لے جا کر بٹھایا مزاج پرسی کی، عید کی مبارک باد دی۔ اتنے میں اطلاع ملی کہ نواب ضیاء الدین خاں کی سواری آئی ہے۔ یہ ٹٹو پر سوار ہیں۔ دو سوار آگے دو پیچھے۔ صاحب خانہ شاعت کے لئے آگے گئے اور ہاتھ پکڑ کر لائے۔ ان کے سر پر سپاہیانہ بانکا انگوچھا بندھا ہوا ہے۔ پوستین کا چغہ زیب تن، پوستین شیر و شکر صورت سے وقار برستا ہے۔ ہر قدم انداز سے رکھتے

ہیں ساتھ میں نواب شمس الدین تشریف لائے۔ نوجوان ہیں بدن ایسا سڈول کہ باید و شاید۔ دلّی میں ان کے حسن کی نظیر نہیں۔ چوگوشیہ ٹوپی سر پر۔ اس موسم میں جامدانی کا انگرکھا پہنے ہوئے ہیں۔ اس کے اوپر کمخواب کا سینہ بند ہے۔ ان کو سردی کیوں لگنے لگی تھی۔ جوان ہیں، رنگ میدہ اور شہاب۔ بولتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ بات بات پر مسکرا دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا کی مسرت انہی کے حصے میں آئی ہے۔

لیجئے حکیم محمود خاں آگئے۔ گھوڑے پر سوار آئے ہیں۔ گھوڑا میانہ قد، نقرہ سائیس کو گھوڑا پکڑا مکان میں داخل ہوئے۔ داڑھی چڑھی ہوئی، رنگ میں موتی کی آب، بدن گٹھا ہوا، جوانی میں خوب ورزشیں کی ہیں۔ اب ادھیڑ ہیں۔ شبنم کا انگرکھا پہنے ہوئے ہیں۔ حکیم صاحب ہیں کشتے کھا رکھے ہوں گے، سردی لگے ان کے دشمنوں کو۔ ہاں! چار باغ دوشالہ کی ایک فرد اوڑھ رکھی ہے، لیجئے جاڑے کی تو اصلاح ہو گئی۔ مفتی صدر الدین صدر صدور دہلی بھی آن موجود ہوئے۔ ان کا یہاں کیا موقع۔ یہ محفل تو ان کے لائق نہیں۔ سر پر سفید عمامہ، گلے میں گھٹنوں تک کا کرتہ۔ اس پر پرمٹے کی مرزئی، کشمیری کام کا چغہ۔

دیوان جی نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ کیوں نہ ہو عالم وقت ہیں۔ جید مولوی ہیں۔ علم دین میں فرد فرید سمجھے جاتے ہیں۔ یہ سرود شروع ہونے سے پہلے رخصت ہو جائیں گے ایسی محفل میں شرکت ان کے تقدس کے خلاف ہے۔

دیوان جی کے بلاوے پر ان کی خاطر آگئے۔ ان سے کچھ بعید رشتہ داری بھی ہے۔ منشی محمد شفیع خاں عرف آغا جان میر منشی ایجنٹ راجپوتانہ اور ان کے بھائی مولوی محمد تقی خاں عرف میاں جان بھی مدعو ہیں۔ آنے سے انکار کر دیا۔ ایسی محافل میں ہم شریک نہیں ہو سکتے بعد میں حاضر ہوں گے اگرچہ قرابت قریبہ تھا اور دیوان جی کے ان پر ایام غدر میں احسانات بھی ہیں۔ بہشتی داس تشریف لا رہے ہیں۔ خوشرو کبیر سن آدمی ہیں۔ صورت شکل سے شرافت کے آثار نمایاں ہیں۔ بدن بھی ورزشی، سرو قامت، گندمی رنگ، داڑھی منڈی ہوئی۔ مونچھیں بڑی بڑی۔ ان کو چڑھا رکھا ہے۔ لباس میں ملہرمات جامہ دانکا جامہ و تیمہ۔ سر پر پگڑی خاص انداز کی ذرا بانکی رکھی ہے۔

اب رات خاصی آگئی۔ مہمان بھی ایک ایک کر کے سب جمع ہو گئے۔ بی گلاب دئی بڑی دیر کی حاضر ہیں۔ نوازندے سب موجود، کمرہ میں ساز ملائے جا رہے ہیں۔ گانا شروع ہونے والا ہے۔ گلاب دئی نو عمر یہی چندرہ یا کہ سولہ کا سن۔ پاتر ہیں۔ دلی کی ڈیرہ دار طوائفوں میں سے ہیں۔ کچھ دن سے یہاں آگئی ہیں۔ بہت نام پایا ہے کوئی محفل ان سے خالی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ صورت ایسی پائی ہے کہ کم پاتریں اس سن کی دیکھنے میں آئی ہیں۔ نقشا ایسا کہ کسی مصور کی قلم مو سے اترا ہے۔ بدن سڈول، بوٹا سا قد رنگ کی آب موتی کی آب کو شرمائے۔ لباس میں وہ تراش خراش کہ لال قلعہ کی بیگموں کو بھی مات کیا۔ آسمانی دوپٹہ اس میں ستارے بکھرے ہوئے۔ زربفت کی تہ پوشی۔ دوپٹہ کے ہم رنگ، پائنچے ہاتھ میں پکڑے ہوئے۔ اٹھلاتی ہوئی محفل میں داخل ہوئیں۔ سب سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ ساری محفل پر چھا گئیں۔ آتے ہی جھک کر مجرا بجا لائیں۔

دیوان جی نے مسکرا کر ہاتھ اٹھایا اور فرمایا: بیٹھ جاؤ۔ یہ سہما سکڑا کر بیچ کے در میں ہو بیٹھیں۔ ابھی سفر دائیوں کی طلبی کا حکم صادر نہیں ہوا۔ نوکر نے ان کے آگے گنگا جمنی خاصدان اور نقل کی کشتی رکھ دی۔ دیوان جی کے ہاں کا پان کوئی معمولی پان نہیں ہے۔ چھالیہ دودھ میں پکی ہوئی، ہر ایک ڈلی برابر کی کتری ہوئی، کتھ گلاب میں بسا ہوا۔ ست کی گولیاں چاندی کی ڈبیہ میں الگ رکھی ہیں۔ دیوان جی کی فرمائش پر لکھنؤ سے بن کر آتی ہیں۔ زیادہ تیز نہیں۔ خوشبو ایسی کہ کئی

ظفر قریشی

سید وقار عظیم

رفیق خاور

کہنے پر بھی منہ پڑا بہکا کرے۔ انہوں نے بڑے انداز سے ایک گلوری اٹھائی۔ لونگ نکالی اور چڑیا سامنہ کھول ہاتھ لپکا کر منہ میں رکھ لی۔ پھر ایک ست کی گولی کھائی۔ دیوان جی بولے دو تین کھاؤ۔ یہ بالکل تیز نہیں —— دست بستہ عرض کی اور کچھ اس انداز سے کہ ان ہونٹوں کو پیار آئے حضور میرے سر میں چکر آجائے گا۔ مجھے عادت نہیں۔ پھر پہروں دل ٹھکانے نہیں لگے گا۔ تھوڑی دیر خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ بعض نے چھیڑ چھاڑ بھی کی مگر یہ حرفوں کی بنی ہوئی تھی۔ پی گئی اور بڑی متانت سے جواب دیتی رہی۔ یہ محفل اس قابل نہیں تھی کہ شوخی طبع آزمائی جائے یوں تو ضلع جگت میں یہ اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دے۔ کچھ دیر بعد دیوان جی نے نوکر کو اشارہ کیا۔ سفرداؤں کو بلا لیا جائے۔ سفر دے آئے تو یہ اٹھ کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پشواز پہن کر گھونگرو باندھ آن بیٹھی۔ پھر گانا شروع ہو گیا۔ پہلے پکا گانا گایا گیا۔ موسیقی داں ہر گٹکری پر لوٹے جاتے تھے مگر جو بے ذکھے تھے۔ ان کو خاک لطف نہ آیا۔

غزل کی فرمائش ہوئی۔ دادرے کے سُروں میں ساز ملائے گئے۔ بی صاحبہ نے مرزا غالب کی طرف اشارہ کرکے یہ غزل شروع کی ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

سو سو نزت سے ایک ایک بول ادا کیا۔ ہر نزت پر مرزا صاحب کی طرف اشارہ ہوتا تھا۔ چاروں طرف سے تحسین اور آفرین کے نعرہ بلند تھے۔ سلام کرتے کرتے بی صاحبہ کے ہاتھ ٹوٹے جاتے تھے۔ اس میں داد مشترک تھی۔ کچھ گانے کی اور کچھ شعر کی۔ غرض سماں بندھ گیا اور غزلوں کی فرمائش ہوئی۔ کئی غزلیں گائی گئیں مگر وہ بات کہاں۔ اب فارسی کی فرمائش ہوئی۔ عراقی کی یہ غزل شروع کی ؎

بہ طواف کعبہ رفتم ز حرم ندا برآمد
کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی

پھر پہلا ہی سا سماں بندھ گیا۔ بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ چڑھ کر۔ سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اب ناچ کی باری آئی۔ یہ جو کھڑی ہوئیں تو اس طرح قدم اٹھاتی ہیں کہ سو سو گھونگرو ایک ایک پاؤں میں بندھے ہوئے ہیں مگر ایک کی آواز نہیں۔ سبک رفتاری کا وہ عالم کہ بتاشے بچھا دو تو نہ ٹوٹیں۔ اب ناچ شروع ہوا۔ دو مشعلچی مشعلیں روشن کر حاضر ہوئے۔ مشعل کی روپہلی ڈنڈی ہے۔ کمر کے سرخ پٹکے میں اڑی ہوئی۔ ایک ہاتھ میں مشعل تھام رکھی ہے دوسرے میں کپی ہے۔ اس پر بھی لمبی روپہلی شام چڑھی ہوئی۔ جدھر بی صاحبہ ناچتی ہوئی جاتی ہیں یہ دونوں منکر نکیر اس کے ساتھ ہیں۔ پیچھے دو سارنگیے، بیچ میں طبلچی، آزو بازو دو منجیرے والے نو عمر لڑکے۔ ناچ سبحان اللہ! کسی اچھے کتھک کی بتائی ہوئی ہیں۔ اب آدھی رات آ گئی۔ ناچ بند ہوا۔ بی صاحبہ مجرا کرکے رخصت ہوئیں۔ سب اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔

■■

ذرا تصور کیجیے کہ آپ بلی ماران یا کوچہ چیلان کے کسی مکان میں ہیں، مکان مغل طرز کا ہے، دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک بیٹھک ہے جو مردانہ ملاقاتیوں کے لئے استعمال کی جاتی ہے اس کے بعد اندر صحن ہے۔ ذرا آگے بڑھ کر چبوترہ ہے اور اسی کے سامنے دوہرا دالان ہے۔

اگلے حصہ میں دری بچھا کر معمولی قسم کا دو لہرا ڈال دیا گیا ہے، مگر اندرونی حصے میں ایک دبیز دری کے اوپر سفید چاندنی ہے، اور چاندنی کے اوپر قالین پشتی دیوار کے ساتھ گاؤ تکیے سلیقے سے لگے ہیں، دالان سہ درہ ہے پہلے در میں دیوار کے ساتھ چھپر کھٹ بچھا ہے، تیسرے در میں بیگم صاحبہ کا خاصدان تخوری کی چوکی پر سلیقے سے رکھا ہے۔ گرد و غبار سے محفوظ رکھنے کے لئے اوپر کا مدانی کا سرخ پوش ہے، بیگم صاحبہ خاصدان کے پاس بیٹھی پان کی قطع و برید میں مصروف ہیں اگر فرصت ملی تو چھالیہ کے دو چار دانے بھی کتر لئے۔

اتنے میں دروازے میں ایک عورت داخل ہوتی ہے۔ سر پر برقعہ ضرور ہے مگر نقاب، سے بے نیاز۔

ان کو دیکھتے ہی بیگم نے دور سے کہا "آؤ بی شریفن کی اماں۔ کدھر کا راستہ بھول پڑیں، تم تو عید کا چاند ہو گئیں۔ برسوں سے برس لگ گیا اور تمہاری صورت آج دیکھنے میں آئی ہے۔ خیریت تو ہے۔

شریفن کی والدہ (منہ بنا کر ذرا بیزاری سے) بیوی خیریت تو کمبختوں کے یاں، مجھ نگوڑی کے ہاں خیریت ویریت کہاں (یہ کہہ کر وہ عورت دو لہرے پر اکڑوں بیٹھ جاتی ہے)

بیگم پان بنا کر شریفن کی ماں کو دیتی ہیں اور پوچھتی ہیں۔

بیگم:- "کہو آج کیسے آنا ہوا۔؟"

شریفن کی ماں:- "آنا کیا ہوا، مجھے تو میری ماںتا گھیسٹے گھیسٹے پھرتی ہے۔ ایک ایک کے پاس داد فریاد لے کر جاتی ہوں کہ کوئی تو اللہ کا بندہ میری سنے اور حق ایما؟

اردو اندرون خانہ

• یونس جعفری • تلخیص، شاہد صدیقی

اردو نمبر

کی کہے۔"

بیگم:۔ "اے ہے کچھ کہو گی بھی یا یوں ہی پہیلیاں بجھواتی جاؤ گی۔ منہ سے بولو، سر سے کھیلو، یہ کیا کہ جو منہ میں آئے کہے جا رہی ہو۔"

شریفن کی ماں:۔ "بیوی، کہنا سننا کیا ہے، مجھ اس شریفن کا دکھ کھا گیا۔ اللہ رکھے میں نے خالی کے مہینے میں اس کو بدا کیا تھا۔ خالی سے آج تک دسواں مہینہ ہے (خود ہی انگلیوں پر گنتی ہے) خالی ایک، بکرعید دو، محرم تین، تیرہ تیزی چار، بارہ وفات پانچ، میراں جی چھ، مدار سات، خواجہ معین الدین آٹھ، رجب نو، اور شبرات دس۔ آج دسواں مہینہ ہونے کو آیا ہے، کیا مجال کیا مقدور جو کوئی چادر یا دوپٹہ اس کو اس کے ساس سسر نے منگا کر دیا ہو یا آج تک دو چار پیسے کی کھٹی میٹھی چیز لا کر دی ہو اور تو اور کمبختوں کو یہ بھی نہیں جڑتا کہ دھیلے ٹکے کے پھول یا عطر یا کنگھا ہی لا دیں۔

(بیگم سے مخاطب ہو کر) بیوی میں نے تو کوئی اوکھلی نہیں بھر داج تھی یا جھولی بھر روپے نہیں مانگے تھے، میں نے سیدھے سبھاؤ، جس طرح دنیا کرتی ہے بھری برادری کے سامنے بیٹی بیاہی تھی۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ مجھے یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا۔"

بیگم:۔ "دیکھو شریفن کی اماں، ہم اس معاملہ میں کچھ نہیں بول سکتے اور نہ اب تم کو ہی اختیار ہے بیاہی بیٹی پڑوسن داخل، اور پڑوسیوں کو کیا مطلب پڑا ہے کہ کسی کے گھر کی بات میں دخل دیں، اب وہ اس کا گھر ہے برا ہے تو اس کے لئے اور بھلا ہے تو اس کے لئے۔ تم اس طرح بر قعہ پھڑ پھڑاتی پھرو گی تو اس کی ساس نندیں اُلٹے کچھ کہ دیں گی۔"

شریفن کی ماں (بات کاٹ کر) "اور اب کیا چھوڑ دیتی ہیں۔ جو آئی کہتی ہے وہ تو کہہ کر رکھ دیتی ہیں باپ دادا کو پننا تو ایسا ہے جیسے گاجر مولی۔"

بیگم۔ (بیچ میں مداخلت کرتی ہے) "وہ تو کہیں گی، ساس نندیں چون کی بیٹی، افلاطون کی ساس نند پڑ زمانے کی کہتی چلی آئی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اس طرح آستین چڑھا کر جانے سے گھر نہیں ہوا کرتا، اب تو تم اپنی بیٹی سے یہ کہو کہ بیٹی مرنا اور بھرنا۔ (بیگم کو ذرا جوش آ گیا تھا۔ اب ذرا متانت کے ساتھ آہستہ سے سمجھاتی ہیں۔)

دیکھو شریفن کی اماں "زبان شیریں ملک گیری۔ زبان ٹیڑھی ملک بانکا" اگر وہ کچھ کہتی ہیں تو سن کر چپ ہو جائیے۔ دیکھیں کب تک کہتی ہیں۔ ایک دفعہ کہیں گی، دو دفعہ کہیں گی، جب جواب نہیں ملے گا تو آپ تھک ہار کر بیٹھ رہیں گی، تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، اگر تُم کہو گی تو تُم سنو گی نہ موت میں ڈھیلا ڈالو نہ چھینٹیں اڑیں اگر برا کہو گی تو برا سننا بھی پڑے گا۔"

شریفن کی ماں:۔ "بیوی میرا تو رات دن کی کل کل سے نس تنگ آ گیا ہے۔ بس ہو لیا جو گھر ہونا تھا۔ اب تو وہ میری لڑکی میرے گھر بھیج دیں۔ پھر تو میں پلٹ کر اس دہلیز پر تھوکوں بھی نہیں۔"

بیگم:۔ "اے بوا۔ اللہ اللہ کرو۔ آج تم کیسی ستری بتری باتیں کر رہی ہو، عقل کے ناخن لو۔ بیاہی بیٹی کو لا کر رکھنا ہنسی ٹھٹھا سمجھا ہے، وہی بات ہے کنواری کھائے روٹیاں، بیاہی کھائے بوٹیاں، تم کس بوتے پر اپنے گھر میں رکھو گی، کچا تمہارا ساتھ، چھوٹے چھوٹے تمہارے بچے، بچوں کا پورا ڈالو گی یا اس جوان جان کا بھرتا بھر دو گی۔ جیتی جاگتی جان کو کیا نہیں چاہیئے۔ صبح کو حلوہ پوری یا پوری پراٹھا نہیں تو آدھی کے چنے ضرور ہوں۔ زربفت کمخاب کے نہ سہی لٹھے ململ کے دو اجلے جوڑے تو ہوں، نہانے دھونے کے لئے تیل صابن بھی ضرور چاہیئے تم کس کس چیز کا پورا لگاؤ گی

چھوٹا سا تمہارا گھر، اگر داماد بھی آگیا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر نکالو گی کہ چل لمبا بن، چلتا پھرتا نظر آ۔ بوا ایسی باتیں نہ کرو کہ جگ ہنسائی ہو اور دنیا دیکھے تو کہے جو بابل میں سماتا نہیں دم سے باندھے چھاج، تم پہلے ہی جیٹھوں بھرا کباب ہو اور اگر اللہ نے کوئی بال بچہ دے دیا تو اس خرچ کو بھی تم نبیڑ دو گی"

شریفن کی اماں: "اچھا میں نے بیاہ کیا۔ میں تو عذاب میں پھنس گئی۔ کمبخت حلق کی ہڈی ہو گئی نہ اگلا جائے نہ نگلا جائے۔"

بیگم (ذرا تمسخر سے) "حلق کی ہڈی نہیں، سانپ کے گلے چھچھوندر کہو۔"

شریفن کی ماں: "اے ہاں بیگم تمہاری یہ مثل کہنے پر یاد آیا (ذرا طنز سے) وہ نندیلی بسنت تو چکی ہی تھیں وہ ساس اپلوں کی گھاس جن کا بوڑھا چونڈا ہے کہتی ہیں کہ میرے بچے کے گلے میں مرا وا سانپ ڈال دیا۔ (بیگم سے مخاطب ہو کر) بیوی اب تم ہی بتاؤ، تھو تھو، اس کی جان سے دور اس کو کوئی کھانسی کھر آتی تھی، نزلہ زکام تھا، یا جاڑا بخار تھا یا کوئی بڑی بیماری تھی (ذرا وقفے کے ساتھ) کمبختیں کھانے کو روٹی نہ دیں۔ دن رات کچوکے دے دے کے کھائے جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں لونڈیا کے چار چلو خون بڑھے گا یا سوکھ کر کانٹا ہو گی۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر اور دوپٹے سے پونچھتے ہوئے) میری بچی تو سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ بتیسی کے دانت ہی دانت نظر آ رہے ہیں۔"

بیگم: "اے شریفن کی اماں صبر کرو۔ لو پان کھاؤ۔ تمہارے ہاتھ میں پان سوکھ رہا ہے۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مہترانی داخل ہوتی ہے "الٰہی بھاگ مال کی خیر۔ بھائی بہنوں کی جوڑیاں بنی رہیں۔ میری بیگم ست پوتی ہوں۔ بہویں آئیں بیٹوں کے سہرے بندھیں۔ داماد آئیں، ان کا سہاگ بنا رہے۔"

مہترانی دعائیں دیتی ہوئی چبوترے پر بیٹھ جاتی ہے اور بیگم سے کہتی ہے۔ "بیوی منہ سوکھ رہا ہے ذرا پان کا ٹکڑا دو۔"

شریفن کی ماں کی پیٹھ مہترانی کی طرف ہے۔ وہ تعجب سے پوچھتی ہے۔ "یہ کون ہے؟"

شریفن کی ماں مہترانی کی طرف منہ کر کے کہتی ہے "میں چلی۔"

مہترانی۔ "دری اپنی بچی کا تذکرہ نا یہاں بھی رو دیا ہو گی۔"

شریفن کی اماں (آہ بھر کر) "ہاں بوا، اب تو مجھے دن رات اسی کا دکھڑا کھائے جاتا ہے۔"

مہترانی: "اے جا رنڈی بیسوا، تو تو دنیا کو تسوے بہا بہا کر یہ دکھاتی پھرے کہ تیری بیٹی بڑی ستی سیتا ہے۔ ذرا اس کے بھی تو کرتوت دیکھو۔" (بیگم کی طرف مخاطب ہو کر)

"بیوی نہ مجھے اس کی قبر میں سونا نہ اس کی بیٹی کی قبر میں سونا ہے۔ جایا ان کی ہو گی۔ وہ لاکھوں میں کہوں گی چاہے کوئی گلے پر چھری ہی کیوں نہ رکھے۔"

(شریفن کی ماں چمک کر) "اے میں بھی تو سنوں تو کیا کہے گی۔"

مہترانی: "بس میری زبان نہ کھلوا۔ منہ میں بڑی لال ہے، منہ سے نکلی خاک ہے۔ میں تو کسی بات میں یوں ہی نہیں بولتی کہ ناحق بات بڑھے گی کیا فائدہ۔ ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔"

بیگم: "بوا سچ ہے۔ ایک چپ سو کو ہرائے، اتنی سیدھی بولنے سے تو یہی بہتر ہے کہ خاموش رہا جائے۔ بند مٹھی کا بھرم ہے۔"

شریفن کی ماں (ذرا تیوریاں بدل کر) "ذرا میں بھی تو سنوں، میری لونڈیا میں کون سے کیڑے ہیں۔"

مہترانی: "اے ایک دو ہوں تو گن بھی لے۔ وہ تو کیڑوں کی پوٹ ہے، کیا کہے گی اس کی سن کر۔"

بیگم :۔ "نہیں لالہ۔ اس میں برا ماننے کی کیا بات
اگر تم نے لڑکی میں کوئی نئی دیکھی ہے تو بتاؤ سمجھا دیں گے،
بچی آئندہ سے ایسی حرکت نہ کرنا۔"

مہترانی :۔ "بیوی میں نے تو اپنی رام دئی اور اس
کی شریفن میں کوئی فرق نہیں سمجھا۔ جیسی میرے لئے یہ ویسی
ہی میرے لئے وہ جہاں شریفن بیاہ کر گئی ہے وہ بھی میرا
محلہ ہے، نکے ڈولی پہ گھر ہے تم خود جا کر پوچھ سکتی ہو۔ شریفن
کی ساس نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ کوئی لڑکی ہو تو بتاؤ، میں
دس گھر چھوڑ کر شریفن کے ساتھ سخن لائی کہ اچھا ہے غریب
گھر کی دبی دہائی بچی ہے جتنی روٹی کھاتی ہے دال روٹی
کھائے گی خدا کا شکر ادا کرے گی اور ساس نند کے موے
پٹخے گی مگر بیوی اس نے تو وہاں جا کر وہ پیر نکالے کہ اللہ
کی پناہ۔ اس نے وہ مثل کر دی سیر تلے پو سیرا، نکل ساس
گھر میرا، بوا بہو نہ ہوئی بھونکڑا ہو گئی۔ جاتے ہی گھر میں
باؤ ہا ڈر مچا دی، یہ میرا، یہ میرے میاں کا، وہی بات ہوئی
کہ میں اور میرا اتنا باقی سب کو کیا رونا۔ بیوی تم نے وہ
گیت کے بول سنے ہوں گے۔ ذرا چہرے پر مسکراہٹ
لا کر کمبخت ہنسی کی ہنسی اور دکھ کا دکھ، ساس نندوں
کو اندھا کر دو تو جانوں پیرجی، سو وہی مثل اس لونڈیا
نے کر رکھی ہے اور میاں گھر گھر یہ ڈھونڈورا پیٹتی پھرتی ہیں
کہ میری بچی تو کچھ کھاتی ہی نہیں پھول سونگھ کر جیتی ہے اس
کو کوئی کھانے کو نہیں دیتا۔ یہ نہیں کہتی کہ میری بیٹی کی کاٹھی
ہی ایسی ہے کہ کھائے بکری کی طرح اور سوکھے لکڑی کی
طرح۔"

یہاں شریفن کی ماں نے بات کاٹی اور کہا "ہاں
بوا میری بیٹی میں دس کیڑے ہیں۔ جب سب نے پہلے دیکھ
لیا تھا کہ ہیرا ہے تو یہ، اور مٹی ہے تو یہ۔ اچھی طرح یوں
دیکھ لیا، بھال لیا، دن دو دن نہیں، پورے سوا سال
بات چیت چلی ہے، اس وقت تو کسی اللہ کے بندے
کو کوئی عیب نظر آیا نہیں، اب اس میں ستر سے بہتر
کیڑے پڑ گئے، پھوہڑ بھی ہے، کام چور بھی ہے، کانوں
پر بول بھی مارتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے
کہ زبان دراز ہے۔"

مہترانی بیچ میں بول پڑی "اسے ہے تم اس کو
زبان دراز کہہ رہی ہو اس کو تو کچھ اور بھی کہو تو تھوڑا
ہے۔ اس نے تو وہ کہاوت کر رکھی ہے، دلہن میری تھلی
دیکھ میرا ملا آتی گز کی جیب تو نے گز کا کلا۔"

یہاں بیگم نے لقمہ دیا "بیٹی جیب چلائیو اور روٹی
کھائیو۔"

مہترانی نے بیگم کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنی
بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

مہترانی :۔ "ابھی گھونگھٹ تک میلا نہیں ہوا۔
شادی کو جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے مگر واہ ری لڑکی
شاباش ہے تیری ہمت کو۔ ساس سے وہ ڈیدہ دوز
چلاتی ہے کہ کتے کو تے گھن کھائیں، کمینوں کو مات کر
شریفن کی ماں :۔ "اچھا میں یہ نہیں کہتی کہ ا
سے اچھا سلوک کرو، بھئی جیسے اور بہوئیں رہ رہی
ہیں ویسا ہی اس سے سلوک کرو۔"

مہترانی :۔ "تمہاری بیٹی کی دوسری بیٹیوں سے
نہیں ہو سکتی۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ بڑے بیٹے کی
میکے میں بیٹھ گئی تھی اور اس نے وہاں ہی فارخطی لے
اب وہ دوسری کر کے لایا ہے اور یہ تو بنی ہوئی بات
دو ہاتھ کی جورو سوداگر کا گھوڑا، جتنا اچھلے اتنا تھوڑا
اور رہی منجھلی بہو تو اس دکھیا کے تو ذکر سے رونا آتا
خدا سب کی گود ہری بھری رکھے۔ مرتے جاتوں میں
اس کا ایک بچہ تھا۔ وہ بھی کوئی ایک اٹھواڑہ رہ
گیا۔ بھلا ایسی دکھیا سے کوئی کیا کہا کرتا ہے کہ کام
سے تو کوئی کہہ نہیں سکتا کہ ہل کر پانی پی۔"

بیگم :- بوا سو کی ایک بات یہ ہے کہ اپنا دام کھوٹا تو پرکھنے والے کو کیا دوش۔ یہاں تو وہ مثل ہے کہ اپنی ٹانگ آپ کھولو اور آپ ہی لاجوں مرو۔ قصور نہ ساس کا نہ نند کا، دام بتلائے کام نکلے کریں باتیں، آج شریفن کا میاں کماتا ہوتا تو یوں جوتیوں میں دال نہ بٹتی، وہی نکھٹو ہے تو دوسرے کا کیا منہ بند کرے۔"

مہترانی :- "ہاں بیوی اللہ تمہارا بھلا کرے۔ خدا تم کو ایمان دے۔ الٰہی تم اپنی اولاد کا سکھ دیکھو، بجوگ تو اپنے ہی میں ہے دوسرے کو کیا الاہنا ہے۔"

شریفن کی ماں "- بس ری بس تو تو بے پیندے کا بدھنا ہے کبھی اُدھر لڑھک گئی کبھی اِدھر۔ موئی تو ابھی تو شریفن کی ماں کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھی اب جو ذرا بیگم صاحبہ نے کچھ کہا تو میرے داماد میں کیڑے نکالنے لگی، شسری ہے نا تھالی کا بینگن۔ تیرا منہ سوکھ گیا ہوگا ایک پان کے ٹکڑے کے لئے یہ لگائی بجھائی کر رہی ہے اور بیگم صاحبہ کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے۔ جہاں دیکھا توا پرات وہیں گزاری ساری رات۔"

مہترانی :- "اور کیا تو بی وہی بات ہے جس کا کھائیگا اس کا گائے گا۔ تو مجھے کچھ کھلا دیا کر میں تیری سی کہنے لگونگی"

شریفن کی ماں (مہترانی سے) ہاں بوا تو بھی سچ کہتی ہے مجھے شریفن کے ابا سے کب لہنا ہوا تھا جو داماد سے کچھ فیض ہوتا۔"

بیگم۔ (ایک ٹھنڈی آہ بھر کر) "ہاں بوا رونا تو بیٹی کے نصیب کا ہے۔ وہ بات ہے جلی روٹی کی جلی ٹکیا۔ اگر شریفن کی ماں تم نے سکھ اٹھایا ہوتا تو تمہاری بیٹی بھی اُٹھاتی۔"

مہترانی "- ہاں بوی جس کی بیٹی سکھی اُس کا جنم سکھی جس کی بیٹی دکھی اس کا جنم دکھی "

• ضیا ھانی

"ھماری زبان"

آبحیات اور تاریخ ادبِ اُردو کی روشنی میں

"**اردو** ادب کے ابتدائی دور سے آج تک ہزاروں جاں نثارانِ اردو نے بلا تخصیص مذہب و ملت (جس میں تمام قومیں شامل ہیں۔) اس کی ترویج، نشرو اشاعت اور ترقی کے سلسلے میں ہر دور میں قربانیاں دیں اور خدمتِ اردو کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ گلستانِ اردو کے پودے کو خونِ جگر سے سینچا۔ آبیاری کی اور پروان چڑھا کر قومی یکجہتی، ہندو مسلم اتحاد اور ایکتا کا عملی ثبوت دیا۔ بقول پرستار اردو سر تیج بہادر سپرو :- یہ وہ مشترکہ ورثہ ہے جو ہمیں اپنے آباواجداد سے ترکہ میں ملا ہے۔"

یہ وہ حقیقت افروز مخلصانہ وصیت ہے جو بہی خواہانِ اردو کے لئے مشعل راہ ہے لیکن آج ہماری پیاری زبان اردو آزمائش، کشمکش، بحران اور انحطاط کے نازک دور سے گزر رہی ہے۔ دشمنانِ اردو اس کو مٹانے، اس کا رسم الخط بدلنے اور اس کی ہیئت بگاڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس مسموم فضا میں نئی نسل کی فرقہ پرست ذہنیتیں بدلی ہوئی ہیں، اردو کشی کا دور دورہ ہے اس صورت میں محبانِ اردو و خادمانِ ادب سخت آزمائش و امتحان

میں بٹے ہوئے ہیں۔

ہر دور میں محبان اردو نے ملک کے گوشے گوشے میں زبان و ادب کی ترویج، فروغ اور نشر و اشاعت کے سلسلے میں اپنی زندگانی قربان کر دی اور شمع ادب پر پروانہ وار نثار ہوئے۔ ان سب کے ناموں اور کارناموں کا تفصیل سے ذکر کرنے کے لئے ایک ضخیم و جمیم دفتر کی ضرورت ہے پھر بھی میں نے ہزاروں، محسنین اردو میں سے چند ایسے مخلص ادبا، شعرا، علما، فصحا، مورخین، ناقدین اور محققین کے کارناموں پر مجمل روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جن کی بے لوث مخلصانہ خدمات اردو اظہر من الشمس ہیں۔

نظم کے بندوں میں مختلف ادوار کے شعرا، ادبا اور فصحا کا تسلسل آبحیات اور تاریخ ادب اردو کی ترتیب و تدوین کے مطابق برقرار نہ رہ سکا چونکہ جس ادیب یا شاعر کا نام یا تخلص نظم میں جہاں سمویا، وہیں پرو دیا اس لئے نام یا تخلص، ہر دور کے مطابق نظم نہ ہو سکے پھر بھی میں نے حتی الامکان تسلسل قائم رکھنے کی کوشش و سعی کی ہے۔

جاں نثاران اردو اور محبان ادب کے لئے میری ناچیز منظوم تاریخی پیش کش نئے عزائم نئے ولولوں اور نئے جذبوں کے ساتھ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے یقین محکم، عمل پیہم پر گامزن ہونے کی، رغبت دلائے گی ـــــ نظم کے ہمراہ محسنین اردو کی فہرست منسلک ہے تاکہ نظم کئے ہوئے ناموں کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ (ضیا بانی)

ہندوستاں کی یہ سدا پاسباں ہے ہندی کے باغ کی بھی یہی باغباں ہے
واللہ اپنے شعر و ادب کی یہ جان ہے اور حسن و عشق کا یہی رنگیں بیان ہے
اس کی فصاحتوں میں نئی آن بان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

دیکھا صرف صرف اسے ڈھونڈا میں موج موج صدیوں کے بعد مل گیا "دو زباں" کا کھوج
آپس کی بول چال نے اس کی بنائی فوج حاصل تب ہو گیا اسے بام کمال اوج
شکریہ وہ ہے "ہند" کا جو پاسبان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

بانی تھے اس زبان کے خسرو، قطب قلی حاتم و آبرو کے چمن کی حسیں کلی
پھل پھول کر شباب کی دیوی جواں ہوئی آرزو، شیفتہ ہوئے مظہر نے جان دی
اس کے جمال حسن پہ شیدا جہان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

مضمون و تاناشاہ کی محفل کا یہ سراج وجہی و آبرو کے دلوں پر تھا اس کا راج
اس کے شگفتہ بول ہیں، رنگین ہے مزاج گھل مل گئی سماج میں ہر سو ہوا رواج

شستہ و صاف ستھری زباں کی یہ شان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

اختر کے دور میں ہوئی اردو زباں نہال   نکھرا ظفر کے عہد میں اس کا رُخِ جمال
آصف نے آبِ زندگی سے کیا اس کو مالامال   عثمان کے زمانے میں حاصل ہوا کمال
اس کے محاوروں کا جہاں قدر دان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

معمار اس زبان کے تھے میر اور ولی   دلّی و لکھنؤ کے یہ "ٹکسال" میں ڈھلی
بھارت کے جن بزرگوں کے آغوش میں پلی   افسوس! ان کے گھر میں جگہ تک نہیں ملی
جمہور کے دلوں پہ مگر حکمران ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

محسن زبان کے تفتہ و مجروح و ذوق تھے   مونس زبان کے شاد، سری رام و شوق تھے
جرأت! سحر و مصحفی، رسوا و فوق تھے   پہنے ہوئے گلے میں "ادب" کا جو طوق تھے
ان کا کلام شعر و ادب کا نشان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

سودا کے فکر و فن کی تراوش اسی میں ہے   انشا، نصیر و درد کی کاوش اسی میں ہے
مومن، ذکی و رند کی نگارش اسی میں ہے   کیفِ کلام ناسخ و آتش اسی میں ہے
اس کی لطافتوں کی عجب آن بان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

دوہے و گیت گائے کبیر و نظیر نے   گیسو! عروسِ فن کے سنوارے اسیر نے
مینائی جام بھر کے پلائے امیر نے   لکھے مراثی خوب انیس و دبیر نے
اس میں بلا کا سوز، غضب کی اٹھان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

غالب کے معجزانہ، محاکات بے بہا   چکبست! شاد! عزیز کے رشحات بے بہا
سید کے عالمانہ مقالات بے بہا   حالی کے عارفانہ خیالات بے بہا
گنجینۂ معانی کی گویا یہ کان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

منشی نولکشور کی خدمت کو دیکھئے   آزاد کے ادب کی حلاوت کو دیکھئے
سکسینہ رام بابو کی عظمت کو دیکھئے   سرشار کے "فسانے" کی جدت کو دیکھئے

تاریخ فن کی اس میں صحیح داستان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

حق اور ابوالکلام کی تفسیر بے مثال — خورشید اور برق کی تنویر بے مثال
مالک، سلیم، وزور کی تحریر بے مثال — اسلم، ذکا و شاہ کی تاثیر بے مثال

اس میں محققین عجم کا بیان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

لطف زبان داغ کی لذت کو دیکھئے — باغ نسیم صبح کی نزہت کو دیکھئے
اکبر کی ناصحانہ ظرافت کو دیکھئے — سرور، نظر و نظم کی جودت کو دیکھئے

اس کی بلاغتوں کی نرالی ہی شان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

سہرو کی مخلصانہ "وصیت" سے پوچھئے — کیفی کی والہانہ محبت سے پوچھئے
شبلی کی زندگانی کی عظمت سے پوچھئے — اقبال کی "خودی" کی حقیقت سے پوچھئے

ہندوستان کے "ادب" کا نشان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

ناطق کے نطق سے لئے بوسے زبان کے — بیخود نے مست کر دیا شعروں کے جام سے
احسن "زبان داغ" پر قربان ہو گئے — "دامن زباں" کا بھر دیا "طوفان نوح" نے

شاگرد داغ عظمت فن کا نشان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

خمخانۂ ریاض کے جرعات کیف زا — حسرت، اثر و فانی کے ابیات کیف زا
سیماب و آزاد و جوش کے رشحات کیف زا — وحشت، صفی و دل کے خیالات کیف زا

یہ عظمت ادب کی صحیح ترجمان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

سائل، جلال و حشر کے افکار اس میں ہیں — جوہر، منیر و مانی کے اشعار اس میں ہیں
اختر، شہاب و نور کے انوار اس میں ہیں — نامی، ظفر و تاج کے شہکار اس میں ہیں

اس کی فصاحتوں کی نرالی ہی شان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

منشی پریم چند کی حکایات دیکھئے — خواجہ حسن نظامی کی آیات دیکھئے
تمکین و ہاشمی کے افادات دیکھئے — راشد، عطا، نذیر کے رشحات دیکھئے

دنیا میں اپنے ملک کی یہ ترجمان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

تحقیقِ فن کا چشمہ، سلیمان اور نجیب — عبدالسلام و ہاشمی، مسعود اور ادیب
شامل ہیں بلگرامی، شرر، عسکری، مجیب — اس کے "مورخین" ہیں "تہذیب" کے نقیب
ہر ایک اس کی عظمتِ فن کا نشان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

مہدی حسن و حق کے افادات اس میں ہیں — نقادِ فن، نیاز کے رشحات اس میں ہیں
شاعر کا فن، جگر کے کمالات اس میں ہیں — اور جوش کے بلند خیالات اس میں ہیں
ملا کا بار بار یہی اک اعلان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

امجد کی صوفیانہ نگارش ہے دلپذیر — اصغر کی عارفانہ تراوش ہے دلپذیر
مہر و قمر کے نور کی تابش ہے دلپذیر — ضیا، رسا، دراز کی کاوش ہے دلپذیر
یہ طوطیوں کے فن کا حسیں بوستان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

پطرس کا لفظ لفظ ظرافت کا آئینہ — احمق کا حرف حرف لطافت کا آئینہ
طنزِ رموزی، واہی و فرحت کا آئینہ — مضحک کی ہر ہزل ہے سلاست کا آئینہ
اس آئینہ کے عکس میں حسنِ بیان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

کرشن کی ہر لطیف حکایت ہے خوب تر — محوی کے علم و فن کی حلاوت ہے خوب تر
سالک کے طنزیات کی ندرت ہے خوب تر — خوشتر کے نشتروں کی جراحت ہے خوب تر
قوموں کے اتحاد کی یہ ترجمان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

ماجد کا ہر صحیفہ صداقت کا آئینہ — عابد کی ہر کتاب ثقافت کا آئینہ
ذاکر کا انتقاد، سیادت کا آئینہ — عاقل کے تبصرے میں سیاست کا آئینہ
یہ وہ زبان ہے جو صحافت کی جان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

مخدوم اور سردکش کے افکار دلنواز — محروم، حق، سراج کے اشعار دلنواز
کرتے ہیں مست ساغر و سرشار دلنواز — افسر، رضا کی نظموں کا معیار دلنواز

روشن زمیں کے تاروں سے کل آسمان ہے

اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

مسلم[162]، سہیل[163]، حفیظ[164] کے نغمات کیف بار　　بہزاد[165]، شور[166]، عرشی[167] کے جذبات کیف بار
احسان[168] اور شمیم[169] کے رشحات کیف بار　　کوثر[170]، ہگم[171] و منشا[172] کے جرعات کیف بار

گہوارۂ ادب کی نرالی ہی شان ہے

اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

نقشے جمال[173] فن کے بنائے جمیل[174] نے　　گیسو، رخِ ادب کے سنوارے جلیل[175] نے
گائے ادب کے ساز[176] پہ نغمے قتیل[177] نے　　حسنِ غزل کو خوب نکھارا شکیل[178] نے

یہ طائرانِ شعر کا اک بوستان ہے

اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

سرمایۂ حیات[179] ہیں نغمات عندلیب[180]　　بزمِ سخن کی جان ہیں الطاف[181] اور ادیب[182]
نقد و نظر میں طاق ہیں عثمان[183] اور حبیب[184]　　مقبول[185] ہیں رشید[186] و ضیا[187]، صفدر[188] و منیب[189]

اس دور میں اسی کا مگر امتحان ہے

اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

ماہر[190]، حفیظ[191] و شاد[192] کے نغمات سرمدی　　ساحر[193]، سحر[194]، خمار[195] کے ابیات سرمدی
شوکت[196]، وقار[197] و ناز[198] کے جذبات سرمدی　　آزاد[199] اور کنول[200] کے خیالات سرمدی

یہ بلبلوں کے نغموں کا اک گلستان ہے

اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

شورش[201]، ظفر[202]، خلیق[203] و فرحت[204] کے زمزمے　　نازش[205]، ظریف[206] و آہ[207] و فرحت[208] کے زمزمے
کوکب[209]، سہیل[210] و فکر[211] و شوکت[212] کے زمزمے　　ثاقب[213]، ضیا[214]، کلیم[215] و ندرت[216] کے زمزمے

قوسِ قزح کی طرح ادب کی کمان ہے

اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

گلزار[217]، شوق[218]، عرش[219] کے افکار اس میں ہیں　　اختر[220]، روش[221] و وجد[222] کے اشعار اس میں ہیں
عباس[223] اور فراق[224] سے فنکار اس میں ہیں　　سردار[225] اور ظہیر[226] سے نثار اس میں ہیں

سندر[227] کی امن[228] اور منور[229] کی جان ہے

اردو ہے جس کا نام ہماری زبان ہے

بسمل[230] و تاجور[231] کے تغزل کی نزہتیں　　آسی[232]، کمال[233] و کیفی[234] و مجروح[235] کی جدتیں
ناظم[236]، شفا[237] و مہدی[238] کے شعروں کی ندرتیں　　کیف[239] و صبا[240]، نسیم[241] کے نغموں کی فرحتیں

یہ پُر بہار پھولوں کا اک گلستان ہے
اردو ہے جس کا نام ہماری زبان ہے

چرخِ ادب پہ شمس[242] کا ہے منفرد مقام
لکھتے ہیں خوب عابد[243] و مختار[244] اور سلام[245]
شاہد[246]، ابوالحسن[247] کی نگارش میں اک پیام[248]
ماہر[249] ہیں انتقاد میں مجنوں[250] و احتشام[251]
نقاد اس زبان کا پیر و جوان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

تھے سروری[252] و قادری[253] تاریخ کے امام
مشغولِ تالیفات ہیں نارنگ[255] اور نظام[256]
عصمت[257]، حسن[258]، کلیم[259] نے پیدا کیا ہے نام
مومن[260]، قمر[261]، خلیل[262] کا مخصوص ہے مقام
پُر لطف اس زبان کی ہر داستان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

غازی[263] کے عالمانہ مقالات دیکھئے
عشرت[264]، گیان[265] چند کے خیالات دیکھئے
احمد[266] و تاراچند[267] کے افادات دیکھئے
یوسف[268]، شکیل[269] و ظو[270] کے رشحات دیکھئے
باغِ ادب کا اس میں ہر اک باغبان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

قیصر[271] کے قصرِ نقد کی تعمیر پُر کشش
محمود[272] اور مسیح[273] کی تحریر پُر کشش
اختر[274] و آفتاب[275] کی تنویر[276] پُر کشش
ذاکر[277]، محی[278] و فیض[279] کی تسطیر پُر کشش
اس کی فصاحتوں کا جہاں قدردان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

احسن[280] کا انتقاد، شجاعت[281] کے تبصرے
عبدالقوی[282] کی نثر، سخاوت[283] کے تبصرے
ناظر[284] کی نقد رائے سلامت[285] کے تبصرے
قاضی[286]، حسن[287]، لطیف[288]، عبادت[289] کے تبصرے
نقاد! اس زباں کا صحیح ترجمان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

بے لوث کی زبان کی خدمت حمید[290] نے
شانِ ادب بڑھائی ہے یوسف[291]، وحید[292] نے
بے لاگ تبصرے کئے احمد[293]، سعید[294] نے
مسلم[295] نے، عابدی[296] نے، غلش[297] نے، ابوید[298] نے
ہر ایک حرف ان کا صحافت کی جان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

دلوی[299]، لسانیات کے بے شک ہیں راہبر
معروفِ تحقیقات ہیں یونس[300] اگاسکر
خاور[301]، ظفر[302] و لطفی[303] کے افکار خوب تر
راہی[304] و مہر[305] و نور[306] کی تحریر پُر اثر

خدمت گزار اس کا ہر اک نوجوان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

اردو کا ہے سرور کے دم سے وہی وقار | احمد زو شمس رزم صحافت کے شہسوار
قدوس و ظفر حسن زماں پر ہوئے نثار | اے وارثو! یہ ترکہ ہے آبا کی یادگار

اس کو بچاؤ مرنے نہ دو اس میں جان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

اردو زباں کا وصف ضیا کیا کروں بیاں | اس کا رواں جہاں میں ہے اک بحر بیکراں
اس کی خدا کے فضل سے عظمت ہے جاوداں | ممکن نہیں مٹا سکے اسے عزم دشمناں

نازاں، اسی کے نام سے ہندوستان ہے
اردو ہے جس کا نام، ہماری زبان ہے

فہرست معمار و محسنین اردو

(۱) حضرت امیر خسرو دہلوی (۲) سلطان محمد قلی قطب شاہ (۳) شیخ ظہور الدین شاہ حاتم دہلوی (۴) شاہ مبارک آبرو دہلوی (۵) مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی (۶) نواب مصطفیٰ خان شیفتہ دہلوی (۷) مرزا مظہر جان جاناں (۸) میر نظام الدین ممنون دہلوی (۹) ابو الحسن تانا شاہ گولکنڈہ (۱۰) سید سراج الدین سراج اورنگ آبادی (۱۱) ملا وجہی (۱۲) سراج الدین آرزو دہلوی (۱۳) واجد علی شاہ اختر (۱۴) بہادر شاہ ظفر (۱۵) میر محبوب علی آصف (۱۶) میر عثمان علی خاں (۱۷) میر تقی میر اکبر آبادی (۱۸) حضرت ولی دکنی (۱۹) منشی ہرگوپال تفتہ دہلوی (۲۰) میر مہدی مجروح دہلوی (۲۱) شیخ ابراہیم ذوق دہلوی (۲۲) میر محمد نواب مونس دہلوی (۲۳) علی محمد شاد عظیم آبادی (۲۴) لالہ سری رام خمخانہ جاوید (۲۵) حضرت شوق قدوائی (۲۶) شیخ قلندر بخش جرأت دہلوی (۲۷) حضرت سخا دہلوی (۲۸) شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی (۲۹) مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی (۳۰) محمد دین فوق لاہوری شاگرد داغ (۳۱) رفیع احمد سودا دہلوی (۳۲) سید انشاء اللہ انشا دہلوی (۳۳) شاہ نصیر دہلوی (۳۴) خواجہ میر درد دہلوی (۳۵) حکیم مومن خاں مومن دہلوی (۳۶) سید محمد زکریا رضوی ذکی دہلوی (۳۷) نواب محمد خان رند دہلوی (۳۸) امام بخش ناسخ لکھنوی (۳۹) خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی (۴۰) حضرت کبیر داس (۴۱) حضرت نظیر اکبر آبادی (۴۲) حضرت اسیر لکھنوی (۴۳) منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی (۴۴) میر ببر علی انیس لکھنوی (۴۵) مرزا سلامت علی دبیر لکھنوی (۴۶) سید محمد میر سوز دہلوی (۴۷) مرزا اسد اللہ خاں غالب (۴۸) پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی (۴۹) مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد حیدر آبادی (۵۰) محمد ہادی عزیز لکھنوی (۵۱) سر سید احمد خاں بانی مسلم یونیورسٹی (۵۲) خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی (۵۳) منشی نول کشور، مالک نولکشور پریس لکھنؤ، (۵۴) مولوی محمد حسین آزاد صاحب آبحیات (۵۵) ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مصنف تاریخ ادب اردو (۵۶) پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی (۵۷) مولوی عبد الحق حقانی

دہلوی (۵۸) مولانا ابوالکلام آزاد (۵۹) ڈاکٹر خورشید الاسلام (۶۰) مہاراج بہادر برق دہلوی (۶۱) حضرت سورج
تونیر (۶۲) مالک رام (۶۳) مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی (۶۴) ڈاکٹر محی الدین قادری زور (۶۵) مولانا اسلم
جیراجپوری (۶۶) مولانا ذکاء اللہ دہلوی (۶۷) مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی (۶۸) ڈاکٹر محمد دین تاثیر (۶۹) نواب
مرزا داغ دہلوی (۷۰) پنڈت دیا شنکر گلزار نسیم لکھنوی (۷۱) حضرت اکبر الہ آبادی (۷۲) منشی درگا سہائے سرور
جہاں آبادی (۷۳) پنڈت نوبت رائے نظر لکھنوی (۷۴) سید علی حیدر نظم طباطبائی (۷۵) ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو
(۷۶) علامہ پنڈت دتاتریہ کیفی دہلوی (۷۷) علامہ شبلی نعمانی (۷۸) علامہ اقبال (۷۹) حضرت ناطق گلاؤٹھی
(۸۰) حضرت بیخود دہلوی (۸۱) حضرت احسن مارہروی (۸۲) حضرت نوح ناروی (۸۳) حضرت ریاض خیرآبادی
(۸۴) حضرت حسرت موہانی (۸۵) حضرت اثر لکھنوی (۸۶) حضرت فانی بدایونی (۸۷) حضرت سیماب
اکبرآبادی (۸۸) پنڈت زتشی زار دہلوی (۸۹) پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی (۹۰) رضا علی وحشت کلکتوی
(۹۱) حضرت صفی لکھنوی (۹۲) حضرت دل شاہجہانپوری (۹۳) نواب مزمل سائل دہلوی (۹۴) حضرت جلال لکھنوی
(۹۵) آغا حشر کاشمیری (۹۶) مولانا محمد علی جوہر (۹۷) حضرت منیر شکوہ آبادی (۹۸) حضرت مانی جائسی (۹۹)
حضرت اختر شیرانی (۱۰۰) مولانا قہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی (۱۰۱) ڈاکٹر نور السعید اختر (۱۰۲) مولانا انوارالحق
حقی دہلوی (۱۰۳) ڈاکٹر عبدالعلیم نامی (۱۰۴) مولانا ظفر علی خاں ظفر (۱۰۵) سید امتیاز علی تاج (۱۰۶) منشی
پریم چند (۱۰۷) خواجہ حسن نظامی (۱۰۸) تمکین کاظمی حیدرآبادی (۱۰۹) نصیر الدین ہاشمی حیدرآبادی (۱۱۰) علامہ
راشد الخیری دہلوی (۱۱۱) حضرت عطاء اللہ ماوی (۱۱۲) علامہ سید سلیمان ندوی (۱۱۳) پروفیسر نجیب اشرف ندوی
(۱۱۴) مولانا عبدالسلام ندوی (۱۱۵) مولوی سید ہاشمی فرید آبادی (۱۱۶) ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی (۱۱۷) ڈاکٹر مسعود
حسین خاں (۱۱۸) ڈاکٹر مسعود رضوی ادیب (۱۱۹) ڈاکٹر سید علی بلگرامی (۱۲۰) مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی (۱۲۱) مرزا
محمد عسکری لکھنوی (۱۲۲) ڈاکٹر محمد مجیب جامعہ ملیہ دہلی (۱۲۳) مہدی حسن مہدی افادی (۱۲۴) بابائے اردو مولوی عبدالحق
(۱۲۵) علامہ نیاز فتحپوری (۱۲۶) آغا شاعر قزلباش دہلوی (۱۲۷) حضرت جگر مرادآبادی (۱۲۸) حضرت جوش ملیح
آبادی (۱۲۹) پنڈت آنند نرائن ملا (۱۳۰) علامہ امجد حیدرآبادی (۱۳۱) حضرت اصغر گونڈوی (۱۳۲) مولانا غلام
رسول مہر (۱۳۳) مولانا قمر بدایونی (۱۳۴) ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (۱۳۵) تابش نظامی کانپوری (۱۳۶) حضرت صبا
لکھنوی (۱۳۷) حضرت رسا ہمدانی گیاوی (۱۳۸) حضرت راز چاندپوری (۱۳۹) احمد شاہ بخاری پطرس (۱۴۰) حضرت
احمق پھپھوندوی (۱۴۱) ملا رموزی بھوپالی (۱۴۲) رضا نقوی واہی (۱۴۳) مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی (۱۴۴)
علامہ مضحک دہلوی (۱۴۵) کرشن چندر ایم اے (۱۴۶) علامہ محوی صدیقی لکھنوی (۱۴۷) مولانا عبدالمجید سالک
(۱۴۸) خوشتر گرامی مدیر بیسویں صدی (۱۴۹) مولانا عبدالماجد دریا آبادی (۱۵۰) ڈاکٹر عابد حسین (۱۵۱) ڈاکٹر
ذاکر حسین سابق صدر (جمہوریۂ ہند) (۱۵۲) حضرت عاقل عباسی (۱۵۳) مخدوم محی الدین (۱۵۴) حضرت رفعت
سروش (۱۵۵) پروفیسر تلوک چند محروم (۱۵۶) ڈاکٹر شیخ عبدالحق پونوی (۱۵۷) حضرت سراج لکھنوی (۱۵۸)
حضرت ساغر نظامی (۱۵۹) حضرت سرشار کسمنڈوی (۱۶۰) پروفیسر حامد اللہ افسر (۱۶۱) کالی داس گپتا رضا

(۱۶۲) حضرت مسلم مالیگاؤں (۱۶۳) حضرت سہیل عظیم آبادی (۱۶۴) ابوالاثر حفیظ جالندھری (۱۶۵) پروفیسر منظور
محمود (۱۶۶) امتیاز علی عرشی (۱۶۷) حضرت احسان دانش (۱۶۸) ڈاکٹر شمیم حنفی (۱۶۹) حضرت بہزاد لکھنوی (۱۷۰)
حضرت کوثر چاندپوری (۱۷۱) پنڈت شیام کشن نگم (۱۷۲) ڈاکٹر منشا ء الرحمن منشا (۱۷۳) مسعود اختر جمال
(۱۷۴) علامہ جمیل مظہری (۱۷۵) حضرت جلیل مانک پوری (۱۷۶) جلیل ساز ناگپوری (۱۷۷) حضرت عقیل شفائی
(۱۷۸) حضرت شکیل بدایونی (۱۷۹) حیات اللہ انصاری (۱۸۰) ڈاکٹر عندلیب شادانی (۱۸۱) الطاف مشہدی
مدیر ہلوگ (۱۸۲) حضرت ادیب مالیگانوی (۱۸۳) مولانا محمد عثمان فارقلیط مدیر الجمعیۃ (۱۸۴) پروفیسر محمد
مجیب ایم۔ اے (۱۸۵) مقبول حسین احمد پوری (۱۸۶) رشید احمد صدیقی ایم۔ اے (۱۸۷) پروفیسر ضیا احمد
بدایونی (۱۸۸) حضرت صفدر مرزا پوری (۱۸۹) ڈاکٹر منیب الرحمن (۱۹۰) ماہر القادری مدیر فاران (۱۹۱)
حضرت حفیظ مالیگانوی (۱۹۲) نریش کمار شاد (۱۹۳) حضرت ساحر لدھیانوی (۱۹۴) ڈاکٹر ابو محمد سحر
(۱۹۵) حضرت خمار بارہ بنکوی (۱۹۶) پروفیسر شوکت سبزواری (۱۹۷) سید وقار عظیم مدیر نقوش (۱۹۸)
محمد باقر ناز کلیانوی (۱۹۹) حضرت جگن ناتھ آزاد (۲۰۰) حضرت کنول پرشاد کنول حیدرآبادی (۲۰۱) حضرت شورش
کاشمیری (۲۰۲) حضرت ظفر گورکھپوری (۲۰۳) حضرت خلیق برہانپوری (۲۰۴) حضرت فرحت کانپوری (۲۰۵) حضرت
نازش پرتاب گڑھی (۲۰۶) حضرت ظریف لکھنوی (۲۰۷) ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری (۲۰۸) غلام احمد فرقت کاکوروی
(۲۰۹) حضرت کوکب شاہجہانپوری (۲۱۰) اقبال سہیل ایم۔ اے (۲۱۱) حضرت فکر تونسوی (۲۱۲) حضرت
شوکت تھانوی (۲۱۳) حضرت ثاقب کانپوری (۲۱۴) مہر لال سونی ضیا فتح آبادی (۲۱۵) حضرت کلیم احمد آبادی
(۲۱۶) حضرت ندرت میرٹھی (۲۱۷) حضرت گلزار دہلوی (۲۱۸) حضرت سریش چند شوق ایم۔ اے (۲۱۹) حضرت بالمکند عرش ملسیانی (۲۲۰)
پنڈت ہری چند اختر ایم۔ اے (۲۲۱) حضرت روش صدیقی (۲۲۲) سکندر علی وجد اورنگ آبادی (۲۲۳) خواجہ
احمد عباس مدیر بلٹز بمبئی (۲۲۴) حضرت فراق گورکھپوری (۲۲۵) علی سردار جعفری (۲۲۶) علی سجاد ظہیر مدیر حیات
(۲۲۷) پنڈت سندر لال دہلوی (۲۲۸) پنڈت گوپی ناتھ امن لکھنوی (۲۲۹) بشیشور پرشاد منور لکھنوی (۲۳۰)
سکھ دیو پرشاد بسمل الہ آبادی (۲۳۱) ابو محمد امام الدین آسی رامنگری (۲۳۲) علامہ تاجور نجیب آبادی —
(۲۳۳) حسن کمال (بلٹز) (۲۳۴) حضرت کیفی اعظمی (۲۳۵) حضرت مجروح سلطانپوری (۲۳۶) حضرت یوسف
ناظم (۲۳۷) حضرت شفا گوالیاری (۲۳۸) راجہ مہدی علی خاں (۲۳۹) حضرت کیف بھوپالی (۲۴۰) صبا
گیاوی (۲۴۱) حضرت نسیم امروہوی (۲۴۲) حضرت شمس کنول (گلن بمبئی) (۲۴۳) سید عابد علی عابد ایم۔ اے —
(۲۴۴) ڈاکٹر مختار الدین آرزو (۲۴۵) ڈاکٹر سلام سندیلوی (۲۴۶) پروفیسر شاہد صدیقی کلکتہ (۲۴۷) حضرت مولانا
ابوالحسن ندوی (۲۴۸) حضرت پیام فتحپوری (۲۴۹) حضرت اقبال ماہر (۲۵۰) ڈاکٹر مجنوں گورکھپوری (۲۵۱) پروفیسر
سید احتشام حسین (۲۵۲) پروفیسر عبدالقادر سروری (۲۵۳) پروفیسر حامد حسن قادری (۲۵۴) مظہر امام ایم۔ اے
(۲۵۵) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (۲۵۶) ڈاکٹر نظام الدین گوریکر (۲۵۷) پروفیسر عصمت جاوید (۲۵۸) ڈاکٹر
محمد حسن (۲۵۹) ڈاکٹر کلیم الدین احمد (۲۶۰) ڈاکٹر مومن محی الدین (۲۶۱) ڈاکٹر قمر رئیس (۲۶۲) ڈاکٹر خلیل الرحمن

اعظمی (۲۶۳) مولانا حامد الانصاری غازی (۲۶۴) ڈاکٹر امرت لال عشرت (۲۶۵) ڈاکٹر گیان چند (۲۶۶) ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (۲۶۷) ڈاکٹر تارا چند (۲۶۸) ڈاکٹر یوسف حسین خاں (۲۶۹) ڈاکٹر شکیل الرحمٰن (۲۷۰) ڈاکٹر ظ انصاری (۲۷۱) حضرت قیصر تمکین علوی (۲۷۲) حضرت محمود سعیدی ٹونکی (۲۷۳) ڈاکٹر مسیح الزماں (۲۷۴) جاں نثار اختر (۲۷۵) ڈاکٹر آفتاب احمد (۲۷۶) ڈاکٹر تنویر علوی (۲۷۷) ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی مدیر ہندوستان بمبئی (۲۷۸) ڈاکٹر محی رضا (۲۷۹) ڈاکٹر ابراہیم حنیف پونوی (۲۸۰) ڈاکٹر محمد احسن فاروقی (۲۸۱) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی (۲۸۲) حکیم عبد القوی دریا آبادی (۲۸۳) ڈاکٹر سخاوت مرزا حیدر آبادی (۲۸۴) مشیر احمد ناظر علوی کاکوڑی (۲۸۵) سلامت رضوی (۲۸۶) ڈاکٹر قاضی عبدالودود (۲۸۷) رشید حسن خاں (۲۸۸) عبداللطیف اعظمی (۲۸۹) ڈاکٹر عبادت بریلوی (۲۹۰) عبدالحمید خاں بوبیرے مدیر صبح امید (۲۹۱) حافظ محمد یوسف مدیر ماہنامہ شمع دہلی (۲۹۲) مولانا عبدالوحید صدیقی مدیر ہما ہدیٰ ڈائجسٹ نئی دہلی (۲۹۳) ڈاکٹر احمد فاروقی (۲۹۴) سعید احمد اکبر آبادی مدیر برہان (۲۹۵) مولانا محمد مسلم مدیر دعوت (۲۹۶) شہریار عابدی مدیر اردو ٹائمز (۲۹۷) حضرت خلش جعفری مدیر انقلاب بمبئی (۲۹۸) مولانا شمسی نوید (۲۹۹) ڈاکٹر عبدالستار دلوی (۳۰۰) یونس اگاسکر ایم۔ اے (۳۰۱) بدیع الزماں خاور (۳۰۲) ڈاکٹر ظفر الاسلام ظفر (۳۰۳) حضرت مصطفیٰ رضوانی (۳۰۴) احمد مصطفیٰ راہی (ہما پبلیکیشنز نئی دہلی) (۳۰۵) عبداللطیف قہر ردولوی (۳۰۶) نور پرکار ایم۔ اے (۳۰۷) پروفیسر آل احمد سرور سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند (۳۰۸) سید وقار عظیم مدیر نقوش (۳۰۹) اعجاز صدیقی مدیر شاعر (۳۱۰) شمسی علوی مدیر فروغ اردو (۳۱۱) عبدالقدوس مدیر ندائے ملت (۳۱۲) قیوم خضر بہاری (۳۱۳) حضرت نثار اٹاوی ایم۔ اے۔

• ڈاکٹر کبیر کوثر

اردو کا سرمایہ جو آج تک ضبط ہے

میدانِ وجود میں آتے ہی اردو نے ادبی، دینی، اخلاقی، درسی، معاشی اور سماجی تحریکات کو جو تحائف پیش کئے ہیں ان سے قطع نظر میں صرف اس لٹریچر کے بارے میں کچھ تفصیلات فراہم کرنا چاہتا ہوں جو ابھی تک عام نظروں سے ہی نہیں خاص کی نگاہوں سے بھی روپوش ہیں۔ دراصل یہ لٹریچر غلامی کی زنجیروں اور برطانوی شہنشاہیت کے خلاف کی گئی جدوجہد کا عظیم ریکارڈ ہے۔ اردو نے جس عزم اور حوصلہ کے ساتھ جنگ آزادی میں حصہ لیا اس کی نظیر کسی اور غلام ملک کی زبان میں ملنا مشکل ہے۔ انگریزوں کے خلاف غلام ملک کے عوام کو سر بکفن ہو جانے اور

سرفروشی کے جذبات سے آزادئ وطن کی خاطر ایثار اور قربانی کا مطالبہ کرتے ہوئے اَن گنت پمفلٹ، کتابچے، رسالے، روزنامے، ہفتہ وار اخبار اور صحیفے ضبط کیے گئے۔ یہ آگ ملک کے ہر حصے میں اردو کے ذریعہ ہی پھیلائی گئی تھی۔ کلکتہ سے بمبئی، مدراس سے کشمیر تک ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں نے اردو کو انگریزوں کی نفرت سے بھر دیا اور حکمراں طبقہ نے اس لٹریچر کو ضبط کرنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہ اتنا بڑا سرمایہ ہو گیا جس پر ہر اردو داں بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

اس ضبط شدہ لٹریچر میں آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی بھی کتاب ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی بھی ہندوستان سے باہر کیلی فورنیا (امریکا) وغیرہ میں شائع ہونے والا لٹریچر بھی ہے۔ لیکن سب سے تعجب خیز بات یہ ہے کہ یہ کتابیں جو انگریزی تسلط کے دوران ضبط ہوئی تھیں آزادی کے پچیس سال بعد تک ان ممنوعہ کتابوں پر سے پابندی نہیں ہٹائی گئی ہے۔

اگرچہ ضبط شدہ کتابوں وغیرہ کی یہ فہرست غیر مکمل ہے اور اس میں بہت سی کتابوں وغیرہ کے نام طوالت کی وجہ سے نظر انداز کر دیے گئے ہیں لیکن اس فہرست پر غائرانہ نظر ڈالنے کے بعد دو باتیں صاف ہو جاتی ہیں! اول تو یہ کہ اردو نے ۱۹۰۹ء کے بعد سے آزادی کے حصول تک ہر سال، ہر جگہ اپنی جدوجہد کو جاری رکھا، دوسری بات یہ ہے کہ اردو کی ان کتابوں کے لکھنے والے ہندوستان کے تمام فرقوں اور طبقوں سے متعلق ہیں جو اس کا بیّن ثبوت ہے کہ اردو کسی مخصوص مذہب یا طبقے کی زبان نہیں ہے بلکہ سارے ہندوستان کی زبان ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) پیغام زندگی از عبدالرحیم عزیز مطبوعہ سنائی پریس امرتسر (۲) قول فیصل از ابوالکلام آزاد مطبوعہ البلاغ پریس کلکتہ (۳) دکھیا ہند کی پکار از غازی محمد عبداللہ مطبوعہ روشن اسٹیم پریس لاہور (۴) ہفت روزہ افغان از ایف آر افغان مطبوعہ بلگرامی لتھو پریس بمبئی (اشاعت ۲۵ ستمبر ۱۹۳۹ء) (۵) متحدہ قومیت اور اسلام از مولانا سید حسین احمد مطبوعہ دہلی برقی پریس (۶) سردار اجیت سنگھ کے لیکچر از اجیت سنگھ مطبوعہ لاہور ۱۹۰۹ء (۷) وطن کا راگ از اکسیر مطبوعہ لاہور (۸) نعرۂ جنگ از سید علی حسین علی مطبوعہ لائل پور (۹) المجاہد اشاعت ۱۸ جنوری ۲۳ء (۱۰) آزادی کے ترانے از امر امرتسری مطبوعہ امرتسر ۱۹۳۱ء (۱۱) بسمل کی تڑپ از اسانند مطبوعہ ملتان (۱۲) ترانۂ آزاد از کنور پرتاپ چند آزاد مطبوعہ آنند پریس دہلی (۱۳) انگریزوں کی اکڑ فوں نکل جائے از بابو رام مطبوعہ جیت پور کلم (۱۴) ترانۂ شہیدی از امام الدین مطبوعہ اقبال برقی پریس گجرات (۱۵) برٹش گورنمنٹ اور آزادی کی لہر از بن اسٹوڈینٹ یونین (۱۶) مہاتما گاندھی از منظر بریلوی مطبوعہ منظور بک ڈپو دہلی (۱۷) یادرفتگان از رحمت اللہ (۱۸) خان عبدالقیوم خاں از مرزا بیگ مطبوعہ عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور (۱۹) انصاف کا خون از شیر لال بسمل مطبوعہ الیکٹرک پریس لائل پور (۲۰) لال جھنڈا اور انقلاب ہندوستان از رام سنگھ چکوالیہ مطبوعہ سیالکوٹ (۲۱) کاکوری کے شہید از رام پرشاد بسمل ۱۹۲۹ء (۲۲) چنگاری از سجاد ظہیر سہارنپور (جنوری جون ۱۹۳۹ء کے شمارے) (۲۳) مسلمانوں کو جنگ آزادی میں حصہ لینے کی دعوت از کانگریس کمیٹی امرتسر (۲۴) خونی کان پور عرف بہادر عورت از محمد ابراہیم ابرار دہلوی مطبوعہ رحیمی پریس بمبئی (۲۵) گاندھی گایان از دیو راج ــــ مطبوعہ لاہور (۲۶) آزادی کے گیت از دیوراج دِگور مطبوعہ لاہور (۲۷) انگریزوں کو

پولس بند از رام دت مطبوعہ آگرہ (۲۸) فریاد ہند جابر پریس لکھنؤ (۲۹) غدر از ایڈیٹر بلونت سنگھ مطبوعہ امرتسر (۱۰ رمئی ۱۹۲۹ء) (۳۰) مسلم خوابیدہ اٹھو از عبدالرحمٰن مطبوعہ انتظامی پریس کانپور (۳۱) انقلاب کی لہر از گوبند رام گپتا مطبوعہ دہلی (۳۲) دردِ وطن از حمید عثمانی مطبوعہ کراچی (۳۳) ہندوستانی آزاد جماعت از ہندوستانی آزاد جماعت مطبوعہ کانپور (۳۴) آزادی کی نظمیں از سبطِ حسن مطبوعہ لکھنؤ (۳۵) سوراجیہ کیا ہے اور کیسے مل سکتا ہے از انڈین کانگریس کمیٹی مطبوعہ پٹنہ (۳۶) ایک اہم اعلان از انڈین کانگریس کمیٹی مطبوعہ پٹنہ۔ (۳۷) اصلاح لاہور ـــــ مطبوعہ انقلاب اسٹیم پریس لاہور ۱۹۳۰ء (۳۸) جمعیۃ علمائے ہند کی چند اہم ملی خدمات کا مختصر تذکرہ۔ از دفتر جمعیۃ العلمائے ہند مطبوعہ لاہور (۳۹) زمین درد از اسلام نمبر اور ۵ رمئی ۲۷ء ۱۹ رنومبر ۱۹۲۷ء کے علاوہ ۸ ردسمبر ۱۹۳۱ء کے شمارے) مطبوعہ لاہور (۴۰) قومی ڈنکا یا سودیشی کھادی از چندریکا پرشاد مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۳۰ء (۴۱) آوے کس طرف آزادی کی لہر از شیو پرشاد منگل مطبوعہ جگادری (۴۲) کامل سوراج عرف ہند میں انگریزوں سے راج لینے کی کتاب از محبوب بخش مطبوعہ لاہور (۴۳) مسلم سیوک از عبدالکریم خاں مطبوعہ آگرہ، ۱۹۲۷ء (۴۴) روزنامہ خلافت بمبئی ایڈیٹر عبدالغنی، فروری، مارچ، اپریل اور مئی کے بیشتر شمارے ۱۹۲۳ء (۴۵) روزنامہ لاہور گزٹ ایڈیٹر مرزا محمد سلطان مطبوعہ لاہور ۵ ردسمبر ۱۹۳۰ء (۴۶) سوراج حاصل کرنے کا طریقہ از حکم چند مطبوعہ امرتسر (۴۷) اصل سنگیت جلیانوالہ کی ویرتا از لکھمی چند مطبوعہ گڑگانوں (۴۸) پیارا بھگت سنگھ از علیم الدین قہر مطبوعہ لاہور (۴۹) مستقبل کی سیاست ہند ــــ از فیروزالدین منصور مطبوعہ لاہور (۵۰) کمیونسٹ مینی فیسٹو (اشتمالی منشور) لاہور ۱۹۴۱ء (۵۱) گاندھی کا سدرشن چکر از مہر چند مست مطبوعہ گڑگانوں (۵۲) مزدور کسان ویکلی از ایڈیٹر رتن سنگھ مطبوعہ امرتسر (۳ و ۱۴ رجون ۱۹۳۱ء) (۵۳) روزنامہ ملاپ ۲۲ رجنوری ۲۷ء و ۲۲ رستمبر ۳۳ء کے شمارے لاہور (۵۴) دردِ وطن از کامریڈ محمد مطبوعہ کراچی ۱۹۳۰ء (۵۵) ایران وطن از رام نرائن مشتاق (۵۶) نینی تال کی سرد پہاڑیوں پر فرنگیوں کے ایجنٹوں کا نادر شاہی حکم مطبوعہ دہلی (۵۷) نوجوان مزدور ۳۵-۱۹۳۳ء تک کے گیارہ شمارے مطبوعہ امرتسر (۵۸) مہلت کے سات دن از پنڈت جواہر لال نہرو مطبوعہ دہلی ۱۹۳۰ء (۵۹) پیام جنگ ویکلی، ۱۹۳۰ء کے ۵ شمارے لاہور ـــــ (۶۰) سنگیت اور ڈائر عرف مظلوم پنجاب از سورج بھان مطبوعہ امرتسر (۶۱) شہیدانِ وطن از رام پرشاد (۶۲) لاہور کانگریس کا اعلان مطبوعہ دہلی (۶۳) فرنگیوں کا جال از امداد صابری مطبوعہ دہلی (۶۴) تاریخ آزاد ہند فوج از امداد صابری مطبوعہ دہلی (۶۵) پیام بیداری از صابر مطبوعہ دہلی (۶۶) شمع آزادی کے تین پروانے از نرائن دت سہگل مطبوعہ لاہور (۶۷) دردِ وطن از ادم پرکاش مطبوعہ لاہور (۶۸) پھانسی کے پجاری از سنت رام مطبوعہ لاہور (۶۹) جاں باز دیر ساور کر عرف ــــــــــــــ انقلاب زندہ باد کی لہر از شیو پرشاد مطبوعہ سہارنپور (۷۰) صدائے درد از سید حسین علی شاہ مطبوعہ لاہور (۷۱) شہیدِ اعظم از آتما رام شرما مطبوعہ دہلی (۷۲) مہاتما گاندھی کی لڑائی از رام چندر شرما مطبوعہ دہلی (۷۳) وطن کے عاشق کا بے گناہ خون مطبوعہ راولپنڈی (۷۴) وطن کا راگ از عاشق سیالکوٹی مطبوعہ لاہور (۷۵) غدر پارٹی کی سال گرہ مطبوعہ کیلی فورنیا (امریکہ) ۱۹۲۰ء۔

★ ★

شوکت تھانوی کی سودیشی ریل، مال گاڑی سے کچھ اس بری طرح ٹکرائی تھی کہ اس کی صورت ہی بگڑ گئی تھی لیکن چونکہ آزاد ہندوستان میں سودیشی ریل کا چلنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ رام راج کا خواب دیکھنا۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کی مرمت کر کے اسے پھر سے چلایا جائے چنانچہ ملک کے کونے کونے سے ٹنڈر طلب کئے گئے اور پھر سب سے زیادہ رقم کا ٹنڈر دینے والے سیٹھ کو اسکی مرمت کا کام سونپ دیا گیا۔ لیکن چونکہ یہ کام بھی بالکل ہی سودیشی ڈھنگ سے ہوا اس لئے اس کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے میں کئی پنجسالہ پلانوں کی مدت گزر گئی۔ بارے اسے کسی نہ کسی طرح قابل استعمال بنا کر "جمہوریت نگر" کے جنکشن پر لایا گیا اور اس سودیشی ریل کا نیو رجانے کے بجائے "ہندی گڑھ" کے لئے روانہ ہوئی۔ راستے میں اس کو پندرہ اسٹیشنوں سے گزرنا تھا جس میں "انگلش ٹاؤن" بھی آتا تھا اور "ملیالم پور" بھی "تلگو گرام" بھی پڑتا تھا اور "اردو نگر" بھی۔

سودیشی ریل جمہوریت نگر سے چھوٹی تو معلوم ہوا کہ اس کی رفتار بالکل پہلے ہی جیسی ہے یعنی بس اتنی کہ اگر کوئی مسافر چاہے تو کمپارٹمنٹ کے پیشاب خانے کو نظر انداز کر کے چلتی ٹرین سے نیچے اتر کر نہایت اطمینان کے ساتھ پیشاب کرے اور پھر فرداً سا دوڑ کر اپنے ہی ڈبے میں سوار ہو جائے۔ اس کی رفتار دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا گویا اس کے پہیوں کے نیچے لوہے کی پٹریوں کے بجائے عاشقوں کے دل بچھے ہیں اس لئے وہ بہت ہی سنبھل سنبھل کر چل رہی ہے۔

جمہوریت نگر سے چل کر سودیشی ریل "انگلش ٹاؤن" پہنچی مگر اسے باہری سگنل کے پاس ہی رک جانا پڑا کیونکہ وہاں پچاس ساٹھ آدمی ایک قطار بنا کر پٹریوں پر اس طرح لیٹے ہوئے تھے جیسے نامراد عاشقوں کی کوئی پارٹی خودکشی کا قصد کر کے لیٹی ہو۔ گاڑی کے رکتے ہی تمام مسافروں نے اپنے اپنے ڈبوں سے اتر کر ان جاں بازوں کو گھیر لیا اور ان سے اس دلیرانہ اقدام کا مقصد دریافت کرنے لگے۔ کافی دیر کی بازپرس کے بعد ان میں سے ایک آدمی نے جو شاید ان کا لیڈر تھا، لیٹے ہی لیٹے جواب دیا:۔

"ہم یہاں ستیہ گرہ کر رہے ہیں اور ہماری مانگ یہ ہے کہ سودیشی ریل اس اسٹیشن سے نہ گزرے کیونکہ اس کی منزل ہندی گڑھ ہے اور ہندی گڑھ جانے والی گاڑی کے لئے انگلش ٹاؤن سے گزرنا ہتک آمیز ہے۔"

یہ سن کر مسافروں کی بھیڑ میں سے ایک صاحب اس طرح آگے بڑھے جیسے بھوت کا کوئی ہاتھ دکھانے کا ارادہ رکھتے ہوں اور تیوری پر بل ڈال کر بولے "کیوں صاحب! یہ کیوں؟"

لیڈر نے جواب دیا: "کیونکہ انگلش ٹاؤن والوں نے ہمیشہ ہندی گڑھ کے باشندوں کو حقیر سمجھا اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ لیکن اب ہمارا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو چکا ہے اس لئے اب ہندی گڑھ جانے والی گاڑی کو انگلش ٹاؤن آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

ان جملوں میں نہ جانے ایسی کون سی بات تھی کہ یکایک

• اختر بستوی

ان صاحب کی چڑھی ہوئی تیوری اُتر گئی اور انہوں نے مسکرا کر لیڈر کی طرف دیکھا۔ شاید وہ اب اپنے حریف کو کمان سے نہیں بلکہ "غشکان" سے مارنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے انتہائی دوستانہ لہجے میں فرمایا: "مگر آپ یہ تو سوچئے کہ ہندی گڑھ جانے کا صرف یہی ایک راستہ ہے اور اس راستے میں ایک اسٹیشن یہ بھی پڑتا ہے پھر بھلا یہ گاڑی یہاں سے گزرے بغیر ہندی گڑھ کیسے پہنچ سکتی ہے؟"

یہ دلیل سن کر لیڈر اس طرح بھڑک اٹھا جیسے سڑک پر سے گزرنے والی گائیں موٹر کا ہارن سن کر بھڑک اٹھتی ہیں

اور اس نے جھلا کر جواب دیا: "ہم یہ سب کچھ نہیں جانتے۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ سودیشی ریل اب انگلش ٹاؤن سے ہرگز نہیں گزر سکتی۔ بس یہی ہماری مانگ ہے اور جب تک یہ مانگ پوری نہیں ہو جائے گی اس وقت تک ہم اسی طرح لیٹے رہیں گے۔" وہ صاحب کوئی دوسری دلیل پیش کرنے ہی والے تھے کہ گارڈ صاحب بھیڑ کو چیرتے ہوئے پہنچ گئے اور لیڈر کو مخاطب کر کے بولے: "آپ کا 'مانگ پتر' مجھے یہاں کے اسٹیشن ماسٹر سے مل گیا اور میں نے اس پر بہت ہی ٹھنڈے دل سے غور کیا۔ اصولی طور پر میں آپ کی مانگ کو درست سمجھتا ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ ہندی گڑھ جانے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اس لئے کافی غور و خوض کے بعد میں نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا ہے کہ سودیشی ریل آنے کو تو یہاں آئے لیکن اس اسٹیشن پر رکے بغیر آگے بڑھ جائے۔ بولئے آپ اس بات پر صلح کرنے کے لئے تیار ہیں؟"

گارڈ کی اس تجویز کو سن کر لیڈر کچھ دیر تک اسی طرح پڑا رہا جیسے روٹھ کر لیٹی ہوئی بیویاں اپنے شوہروں کی منت سماجت سن کر گم صم پڑی رہتی ہیں۔ لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا: "ٹھیک ہے! فی الحال ہم اتنے ہی پر صلح کئے لیتے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی دوسرے ستیہ گرہی بھی پٹریاں چھوڑ کر ہٹ گئے اور ایک جلوس بنا کر فتح کے نعرے لگاتے ہوئے آبادی کی طرف چل دیئے۔ اس مصیبت کے ٹلنے کے بعد مسافر پھر اپنے ڈبوں میں گھس گئے اور سودیشی ریل چھک چھک کرتی ہوئی انگلش ٹاؤن اسٹیشن پر رکے بغیر آگے بڑھ گئی۔ چند سرپھرے تو آہستہ رو ٹرین میں چھلانگیں لگا کر سوار ہو گئے۔ لیکن پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے با اصول مسافر ہاتھوں میں ٹکٹ دبائے سامنے سے گزرتی ہوئی ٹرین کو اس طرح دیکھتے رہ گئے جیسے روزہ دار مسلمان دن میں اپنے آگے سے گزرتے ہوئے چاٹ والے کو دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

اس کے بعد سودیشی ریل اگلے بارہ اسٹیشنوں سے کچھ اس طرح گزری کہ ہر ہر اسٹیشن پر اسے سیاہ جھنڈے اور مخالفانہ پوسٹر لگے ہوئے ملے۔ کئی جگہ تو کشت و خون کے وحشیانہ مناظر بھی دیکھنے میں آئے مگر اس نے اپنا سفر جاری رکھا اور اردو نگر کا رخ کیا۔ لیکن اردو نگر اسٹیشن سے تقریباً ایک میل پہلے وہ ایک بالکل اجاڑ سی جگہ پر ٹھہر گئی۔ مسافروں نے کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں ایک نیا اسٹیشن بن گیا ہے جس کا نام سنسکرت پور ہے۔ گاڑی کے ایک مسافر نے دوسرے مسافر سے کہا: "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس جگہ نیا اسٹیشن بنانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ یہاں سے ایک ہی میل کے فاصلے پر اردو نگر اسٹیشن موجود ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس جگہ کوئی آبادی بھی نہیں ہے جس کے لئے نئے اسٹیشن کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔"

دوسرے مسافر نے جواب دیا: "یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ اس جگہ کوئی آبادی نہیں ہے لیکن سنا ہے یہاں سے کچھ فاصلے پر ہزاروں سال پرانے کھنڈرات پائے گئے ہیں انہیں کھنڈروں کی تشہیر کے لئے حکومت نے یہاں نیا اسٹیشن بنوایا ہے۔"

پہلے مسافر نے پوچھا: "کیا ان کھنڈروں کے پاس

آبادی ہے؟"

دوسرا مسافر بولا "جی نہیں! آبادی تو وہاں بھی نہیں ہے"

یہ سنکر پہلے مسافر کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے دبے ہوئے لہجے میں کہا "جس مقام پر انسانوں کی آبادی معقود ہو وہاں اسٹیشن ہونا ایسا ہی ہے جیسے کوئی قبرستان میں دوکان سجا لے۔ لیکن اگر کسی کو اس قسم کے کام میں فائدہ نظر آتا ہے تو ہم اسے روکنے والے کون؟"

سودیشی ریل تقریباً نصف گھنٹے تک سنسکرت پور اسٹیشن پر کھڑی رہی لیکن ایک بھی مسافر نہ تو سوار ہوا اور نہ اترا آدھے گھنٹے بعد گارڈ صاحب نے اپنے ڈبے سے نکل کر تمام ڈبوں کے دروازے نہایت احتیاط کے ساتھ بند کیے اور پھر ان کی سیٹی کی آواز پر گاڑی روانہ ہو گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد اردو نگر اسٹیشن آگیا اور سودیشی ریل پھر ٹھہر گئی۔ بہت سے مسافر جلدی جلدی اپنا اسباب سنبھال کر ڈبے کے دروازوں کی طرف اس طرح لپکے جیسے شام کو بچے کچہری سے لوٹنے والے باپ کی طرف دوڑتے ہیں لیکن وہاں پہنچکر انہیں معلوم ہوا کہ تمام دروازے باہر سے بند ہیں اور ان میں کئی کئی سیر کے تالے پڑے ہوئے ہیں۔ اس اطلاع نے سب کے ہوش و حواس غائب کر دیئے اور لوگ اس طرح گھبرا گھبرا کر ایک دوسرے سے باہر نکلنے کی ترکیبیں پوچھنے لگے جیسے وہ سودیشی ریل کے بجائے بدیشی جیل میں ہوں۔ ایک ڈبے میں ایک شریف صورت بزرگ یہ خبر سن کر بے قراری کے عالم میں ٹہلنے لگے انہوں نے سفید چوڑی دار پائجامے پر سیاہ اچکن پہن رکھی تھی اور ان کا چہرہ بشرہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ انتہائی وضعدار قسم کے آدمی ہیں۔ بار بار انکی نگاہیں اپنے ڈبے کے ان سراسیمہ مسافروں کے چہروں کی طرف اٹھ جاتی تھیں جو اس وقت چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہوں کی طرح معصوم اور مظلوم نظر آرہے تھے۔ تقریباً دس منٹ بعد گاڑی نے سیٹی دی اور آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ یہ دیکھ کر وہ بزرگ کافی گھبرا گئے اور پھر جب ان کی سمجھ میں کوئی دوسری ترکیب نہ آسکی تو انہوں نے لپک کر زنجیر تھام لی اور اسے پوری قوت سے پکڑ کر لٹک گئے۔ ڈبے کے کچھ ایسے مسافروں نے انہیں روکنا چاہا جو اب تک اپنی اپنی سیٹوں پر آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ان بزرگ نے سب کو اس لاپرواہی سے جھٹک دیا جیسے کان پر رینگتی ہوئی چیونٹی جھاڑ دی ہو ——

کچھ دیر بعد گارڈ صاحب اسی ڈبے کے دروازے کا تالا کھولکر اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے کمپارٹمنٹ میں پہنچکر پہلا کام یہ کیا کہ دروازے کو فوراً ہی اندر سے مقفل کر دیا گویا وہ ریل کا ڈبہ نہ ہوا جنگلی کبوتروں کا کابک ہو گیا کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی "پھٹکی" کھلی رہ گئی تو سارے کے سارے کبوتر اڑ جائیں گے۔ اس کام سے فارغ ہوئے کے بعد گارڈ صاحب ان بزرگ کی طرف مڑے جنہوں نے اب تک زنجیر پکڑ رکھی تھی اور گرجدار آواز میں بولے "کیوں جناب! آپ نے یہ غیر قانونی حرکت کیوں کی؟ کیا نام ہے آپ کا ——؟"

ان بزرگ نے جواب دیا "میرا نام گورد ھن داس مخلص ہے اور میں نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا ہے کیوں کہ میں۔ صرف شاعر ہی نہیں ہوں بلکہ ہائی کورٹ کا جج بھی رہ چکا ہوں اور قانون سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اردو نگر اسٹیشن پر اترنے کا حق دیا جائے کیونکہ میں نے اسی اسٹیشن کا ٹکٹ لیا ہے۔ میری ہی طرح اس ڈبے کے یہ تمام کھڑے ہوئے مسافر بھی اسی اسٹیشن پر اترنے کے خواہشمند ہیں۔ آخر یہ کیا دھاندلی ہے کہ ہمیں یہاں اترنے سے روکا جا رہا ہے؟"

گارڈ صاحب نے فرمایا "مجھے اپنے محکمے کی طرف

سے یہ حکم ملا ہے کہ میں سنسکرت پور اسٹیشن پر تمام دروازوں کو مقفل کر دوں اور پھر انہیں ہندی گڑھ تک نہ کھولوں تاکہ درمیانی مقام اردو نگر میں کوئی بھی مسافر اُتر نہ سکے۔"

شعلہ صاحب جھلا کر بولے: "اگر آپ کا محکمہ یہی چاہتا ہے تو پھر اس نے یہاں اسٹیشن کیوں بنوایا اور ہم لوگوں کو اس اسٹیشن کے ٹکٹ کیوں دیئے؟"

گارڈ صاحب نے جواب دیا: "ٹکٹ تو آپ لوگوں کو اردو نگر اسٹیشن کے ضرور دیئے گئے ہیں لیکن آپ لوگ یہاں اتر نہیں سکتے کیونکہ ہمارا محکمہ یہ چاہتا ہے کہ سودیشی ریل ہندی گڑھ اسٹیشن پر بھری ہوئی پہنچے تاکہ وہاں چہل پہل نظر آئے۔"

یہ سن کر شعلہ صاحب کو بے اختیار ہنسی آگئی اور انہوں نے قہقہہ لگا کر کہا: "کیا خوب تاویل پیش کی آپ نے! مگر جناب کسی ایک اسٹیشن کی چہل پہل بڑھانے کے لئے دوسرے اسٹیشنوں کے مسافروں کو پکڑ کر لے جانا تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی اپنے مکان کی رونق بڑھانے کے لئے کسی غیر شخص کی بارات کو زبردستی اپنے دروازے پر لے جائے!" پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولے: "یہ رویہ مضحکہ خیز ہونے کے ساتھ ساتھ ظالمانہ اور غیر جمہوری بھی ہے۔"

شعلہ صاحب کے اس جملے کا اثر یہ ہوا کہ گارڈ صاحب تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے پھر انہوں نے کچھ سوچ کر کہا: "آپ کی زبان سے غیر جمہوری لفظ سن کر مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی ہے چونکہ ہمارے ملک میں ہر بات کا فیصلہ جمہوری ڈھنگ سے ہوتا ہے اس لئے آپ لوگوں کے معاملے میں بھی جمہوریت کا اصول لاگو ہونا چاہئے۔ چنانچہ میں نے یہ سوچا ہے کہ اس ڈبے کے تین آدمیوں سے پوچھوں کہ ان کے خیال میں آپ لوگوں کو اردو نگر اسٹیشن پر اترنے کا حق ملنا چاہئے یا نہیں۔ اگر ان میں سے دو آدمی ہاں کہہ دیں تو آپ لوگوں کے لئے دروازے کھول دوں ورنہ آپ سب اپنے حق سے دست بردار ہو جائیے۔ کہئے آپ کے لئے یہ تجویز قابلِ قبول ہے؟"

شعلہ صاحب نے قدرے تلخ لہجے میں جواب دیا: "بھلا یہ بھی کوئی ایسا مسئلہ ہے جس پر رائے شماری کی ضرورت محسوس ہو؟ اگر آپ ایسے ایسے مسئلوں پر ووٹ لیتے چلیں گے تو پھر کچھ دن بعد آپ کو اس بات کے لئے بھی ووٹنگ کرانی پڑے گی کہ سپیروں کو بین بجانی چاہئے یا نہیں؟ — پنواڑیوں کو پان بیچنے کا حق ہے یا نہیں؟ پھیری والے آوازیں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟"

گارڈ صاحب نے برا سا منہ بنا کر کہا: "تو پھر اس کے علاوہ میرے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔"

شعلہ صاحب کچھ دیر سوچ کر بولے: "خیر اگر آپ اسی بات پر مُصر ہیں تو میں اس وقت چار و ناچار آپ کی تجویز قبول کئے لیتا ہوں۔"

یہ سُن کر گارڈ صاحب کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ ایک سیٹ کی طرف بڑھے جس پر کچھ لوگ اس آرام کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے گویا انہیں ہمیشہ اسی ڈبے میں رہنا ہو۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک ایسے صاحب کو مخاطب کیا جن کے چہرے کی سیاہی دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا گویا وہ کسی تارکول کمپنی کا جیتا جاگتا اشتہار ہوں۔ گارڈ صاحب نے ان سے سوال کیا: "کیوں جناب! ان مسافروں کو اردو نگر اسٹیشن پر اُترنے کی اجازت دے دی جائے؟"

انہوں نے جواب دیا: "کچھ دن ہوئے مجھ کو ایک صاحب نے بتایا تھا کہ اردو نگر اسٹیشن کے پاس ۱۹۴۷ء میں ایک زبردست فساد ہو گیا تھا جس میں کافی لوگ قتل ہوئے تھے۔ ان تمام لوگوں کی لاشیں اب تک اسی جگہ پر پڑی سڑ رہی ہیں جس کی وجہ سے اس پورے علاقے کی فضا میں بہت ہی مہلک جراثیم پھیل گئے ہیں اس لئے میرے خیال میں مسافروں کو اس اسٹیشن پر اترنے کی اجازت

ہرگز نہیں دینی چاہئے کیونکہ اگر وہ یہاں اترے تو ان کی صحت پر بہت ہی خراب اثر پڑے گا۔"

اس کے بعد گارڈ صاحب نے ان کے بغل والے صاحب کو مخاطب کرکے اپنا سوال دہرایا۔ ان حضرت کے حلیے کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان کے بال تو بالکل "ارسطو" کی طرح کے تھے لیکن انہوں نے صورت "بدھو" جیسی پائی تھی۔ گارڈ صاحب کا سوال سن کر پہلے تو انہوں نے اپنے گھنگریالے بالوں کی لٹوں کو اس طرح پیچھے کی طرف پھینکا جیسے گھریلو لڑکیاں بات شروع کرنے سے پہلے لٹکتا ہوا دوپٹے کا آنچل پشت کی طرف پھینک دیتی ہیں۔ اس کے بعد وہ انتہائی خوابناک لہجے میں بولے :۔

"مجھے اطلاع ملی ہے کہ اردو نگر میں ایسی حسین و جمیل دوشیزائیں بستی ہیں جن کے رخساروں میں فارس کے گلابوں کی رنگت ہوتی ہے اور آنکھوں میں ہندوستانی کنول کا حسن، جن کے بال ساون کی گھٹاؤں کی طرح سیاہ ہوتے ہیں اور چال بہار کی ہواؤں کی طرح مست۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہ دوشیزائیں بنگال کی جادوگرنیوں کی طرح ہر آنے جانے والے کو اپنے دام میں گرفتار کر لیتی ہیں۔ اس لئے میرے خیال میں اس اسٹیشن پر مسافروں کا اترنا خطرناک ہے۔"

آخر میں گارڈ صاحب نے جن حضرت کے سامنے اپنا سوال دہرایا انہیں دیکھ کر ہندوستان کا قومی پرندہ "مور" یاد آتا تھا کیونکہ جس طرح مور کے سر پر تاج ہوتا ہے اسی طرح ان صاحب کے سر پر بھی ایک تاج تھا جسے عرف عام میں کھدر کی ٹوپی کہتے ہیں اور جس طرح مور کے پیر بھدے ہوتے ہیں اسی طرح ان کے پیر بھی بدشکل نظر آ رہے تھے کیونکہ انہوں نے انتہائی گندے چپل پہن رکھے تھے۔ ان حضرت نے جواب دیا: "اردو نگر کی اصل آبادی اس اسٹیشن سے بھی اتنے ہی فاصلے پر پڑتی ہے جتنی کہ ہندی گڑھ اسٹیشن سے۔ اس لئے میرے خیال میں اردو نگر اسٹیشن کے مسافروں کو بھی ہندی گڑھ اسٹیشن پر ہی اترنا چاہئے کیونکہ وہ ایک بڑا مقام ہے اور وہاں تانگے رکشے وغیرہ یہاں کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے مل جائیں گے۔" ان تینوں حضرات کی رائے معلوم کرنے کے بعد گارڈ صاحب نے شعلہ صاحب کی طرف مڑ کر فرمایا:

"لیجئے جناب! آپ مقدمہ ہار گئے۔ اب میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ اردو نگر اسٹیشن پر اترنے کا خیال ترک کر دیجئے اور سیدھے ہندی گڑھ تک چلے چلئے۔"

شعلہ صاحب جلے بھنے لہجے میں بولے: "آپ نے رائیں طلب کرنے میں صریحاً بے ایمانی کی ہے کیونکہ آپ نے صرف ایسے ہی لوگوں کے سامنے اپنا سوال دہرایا ہے جو نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور جنہیں یہاں اترنا نہیں تھا۔ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کوئی شہر کے ڈاکٹروں سے پوچھے کہ اسپتال سے دوائیں لینی چاہئیں یا نہیں؟ آپ نے جمہوریت کے نام پر انتہائی غیر جمہوری طریقۂ کار اپنایا ہے۔"

گارڈ صاحب نے ترش لہجے میں جواب دیا۔ "جمہوریت کا مطلب صرف یہ ہے کہ بات کا فیصلہ کثرت رائے سے کیا جائے۔ اس سے کوئی غرض نہیں کہ کس معاملے میں کس کی رائے لینی ضروری ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے دروازے کا تالا کھولا اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ پلیٹ فارم پر پہنچ کر انہوں نے دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا اور آگے بڑھ گئے۔ پھر کچھ دیر بعد سیٹی کی آواز سنائی دی اور گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ شعلہ صاحب چیختے رہ گئے: "میرا وطن تو اردو نگر میں ہے۔ میں ہندی گڑھ جا کر کیا کروں گا۔ میری بیوی اردو نگر میں بیٹھی میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ ذرا اس کے جذبات کا تو خیال کرو۔"

لیکن ان کی نحیف آواز سودیشی ریل کے فولادی پہیوں کی پُرشور آواز میں ڈوب گئی۔ ■

شباب تخلص، نام محمدی جان، پیشہ طوائف، کلکتے کی رہنے والی تھی، اور بنگال کے نامور شاعر و صحافی منشی عبدالرحیم شاہ آبادی سے مشورۂ سخن لیا کرتی تھی۔ مولوی عبدالحیٰ کے لکھنے کے مطابق شباب نہایت طبع سلیم، خوش رو اور خوش خو تھی۔ انیسویں صدی کے آخر تک زندہ تھی۔ نہایت عمدہ شعر کہتی تھی۔

نمونۂ کلام ؎

ہو گئی ہے زندگی آخر گنا ہوں میں مری
ہاتھ خالی ہے مرا زادِ سفر کچھ بھی نہیں

ان کی باتوں میں خدا کے لیے نہ آنا شباب
یہ حسینانِ جہاں کس سے وفا کرتے ہیں

وہ لے شوخی سے دکھا کر مجھے زلفیں اپنی
اس میں تجھ کو میں گرفتار کروں یا نہ کروں

عشق میں جان کے دشمن کو مسیحا سمجھے
اور پھر دل میں سمجھتے ہیں کہ ہم اچھے ہیں

ہنس کر رُلا دیا کبھی رو کر ہنسا دیا
اے فتنہ ساز دونوں میں تجھ کو کمال ہے

خرم تخلص عرف چھوٹی صاحبہ، باشندہ لکھنؤ، مقیم کلکتہ، پیشہ طوائف، مولوی عبدالغفور خاں بہادر نساخ نے لکھا تھا کہ انہوں نے اس کو کلکتے میں دیکھا ہے۔ نمونۂ کلام ؎

مردہ زندہ ہو گئے پازیب کی جھنکار سے
ہر قدم پر حشر برپا ہے تری رفتار سے

یہ کس رشکِ مہ کا نظارا ہوا ہے
کہ خورشید آنکھوں کا تارا ہوا ہے

ملے غیر سے یار آنکھوں کا تارا ہوا ہے
مری جاں یہ کس کو گوارا ہوا ہے

شوخ تخلص، نام مولا جان، وطن کانپور، پیشہ حسن فروشی کی غرض سے کلکتہ میں آ کر بس گئی تھی۔ منشی محمد عبدالرحیم شاہ آبادی سے مشورۂ سخن لیتی تھی۔ نہ صرف شعر خوب کہتی تھی بلکہ پڑھنے کا انداز بھی دلربا تھا۔ نمونۂ کلام ؎

غش مجھے آیا تو گھبرا کر یہ کہتا ہے وہ شوخ
میرے عاشق، میرے شیدا، میرے بسمل کیا ہوا

فاتحہ پڑھتے ہیں غیروں کے دکھانے کے لیے
ہائے کس ناز سے ٹھکراتے ہیں تربت میری

دل سی شے آپ کو یوں مفت دیئے دیتا ہوں
ہوں تو ناچیز مگر دیکھیے ہمت میری

شیریں تخلص، نام شیریں جان، طوائف، ساکنہ بازار چوک لکھنؤ لیکن کلکتہ میں آ کر بس گئی تھی۔ نمونۂ کلام ؎

دیر سے ہم سر جھکائے منتظر ہیں تیغ کے
دست و بازو کو ترے اس وقت قاتل کیا ہوا

رات باقی ہے ٹھہر جا ابھی جلدی ہے کیا
دلِ شیدا مجھے بے تاب نہ کر وصل کی رات

صنم تخلص، نام فہیمن، طوائف، قوم پنجابن، ساکنہ کلکتہ۔ غلام بھیک خان سے مشورۂ سخن لیا کرتی تھی۔ صرف

ایک ہی شعر مختلف تذکروں میں بطور نمونہ ملتا ہے جو درج ذیل ہے ؎

چھا گلیں یار کی کرتی ہیں قیامت برپا
سیکڑوں مار سماتی ہیں گجرِ وصل کی رات

امیر تخلص، نام امیر بخش، پیشہ طوائف، باشندہ ضلع پورنیا (مغربی بنگال)، مصنف "تذکرہ شمیم سخن" (۱۸۹۱ء) نے صرف دو شعر درج کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:۔

کھل گیا رازِ نہاں پیتے ہی اک ساغرِ عشق
اب تو پن لے گئے غافل ترے ہشیاروں پر

بیگم تخلص، خطاب رشکِ پری، قوم پنجابن۔ ایک باکمال رقاصہ تھی جو اپنے ہزار حسن صورت و سیرت کی بدولت واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کی زوجہ بنی تھی۔ آپ ہی کے بطن سے شہزادہ مرزا امان جاہ ہوئے اور شہزادے کو چھوڑ کر یہی بیگم واجد علی شاہ کے ہمراہ کلکتہ چلی آئی۔ اور یہیں رہ گئی۔ نمونۂ کلام ؎

ہے منظور باجی ستانا تمہارا
گلہ کرتی ہے جوڑ گانا تمہارا
نہ بھیجو گی سسرال میں تم کو خانم
نہیں مجھکو دوبھر ہے کھانا تمہارا
مری کنگھی چوٹی کی لیتی خبر ہو
یہ احساں ہے سر پہ دوگانا تمہارا

زہرہ تخلص نام منی جان۔ پیدائشی طور پر کشمیری لیکن عمر کلکتہ میں گزری۔ پیشہ حسن فروشی، مولوی عبدالغفور نساخ سے مشورۂ سخن لیا کرتی تھی اور اپنے وقت کی نامور شاعرہ تھی، اس کے انتقال پر نساخ نے یوں تاریخ وفات کہی ہے ؎

منی شد از دارِ فنا راہیِ گلزار بقا
خوں ناب دل از دیدہ ہائے اندوہ ہجر اَش فشاند
نساخ فوراً خادم سال رحلتش زد رقم
منی دریں عالم نماند منی دریں عالم نماند
سنہ ۱۳۰۰ ہجری

نساخ نے زہرہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "گل رو و گلبدن و گل اندام ہے خوشخو و خوش گلو و خوش خرام ہے۔ سخن سنجی و سخن فہمی و سخن طرازی میں آفت ہے۔ سخن چینی و سخن سازی و سخن پردازی میں قیامت ہے۔" نمونۂ کلام

دیکھ کر جو رنگ دل ہے عاشق دل گیر کا
سبزۂ رخسار سبزہ ہے مگر شمشیر کا
دل ہمارا درد کا پتلا بنا اے برہمن
ہے تصور دم بدم جو اس بُتِ بے پیر کا
کیا کسی مہوش کا زہرہ اس کو بھی ہے انتظار
دیدۂ عاشق کی صورت ہے جو بیدار آئینہ
دردِ غمِ فراق سے شب کو ہوئی جو بے کلی
دل کی کشش کشاں کشاں اس کی گلی میں لے چلی
روتے ہیں سر پٹکتے ہیں زندگی یک عذاب ہے
جب نہ ملے وہ جانِ جاں کیوں نہ ہو دل کو بیکلی
ہجر میں تیرے گلبدن وقفِ الم ہے جان و تن
بسترِ خار سے فزوں مجھکو ہے فرشِ مخملی!

نازاں تخلص، نام منی جان اور عرف چھل بل، پیشہ طوائف، ساکنہ کلکتہ، "تذکرہ شمیم سخن" میں آپ کا ذکر کیا گیا ہے

ساتھ فرقت کا مصیبت میں کسی نے نہ دیا
ہاں رفیق ایک جو نکلا تو میرا دل نکلا
پہلے اک غنچۂ پژ مردہ سمجھ کر پھینکا
پھر تڑپتے ہوئے دیکھا تو میرا دل نکلا

نقاب تخلص، نام حمیدن بائی، پیشہ طوائف، ساکنہ کلکتہ، رشتہ میں منی بائی حجاب کلکتہ والی کی چھوٹی بہن تھی۔

نقاب اس بت سے تو ملنا نہ ہرگز
وہ ظالم ہے ستائے گا ترا دل

وہ کیا دکھائیں گے محشر میں مجھ کو ٭ جو آنکھیں ابھی سے چرائے ہوئے ہیں ★

اردو کے گیت کار

اردو میں بھی گیت کا سرمایہ خاصا ہے۔ اردو میں اس صنف کا احیا، اودھ کے تہذیبی دور میں ہوا۔ امانت نے اندر سبھا میں گیت کو رواج دیا۔ آغا حشر نے اور بڑھایا۔ دور جدید میں گیت کو مقبول بنانے والے عظمت اللہ خاں، اختر شیرانی میراجی، کیفی اعظمی، حفیظ جالندھری، مقبول احمد پوری وغیرہ ہیں

میراجی نے اردو گیت کو ایک نئی جہت، ایک نیا ذائقہ عطا کیا۔ ان کے گیت کے موضوعات وہی ہیں جو ان کی نظم میں ہیں مگر ان کے گیتوں میں لوچ اور رس زیادہ ہے۔

گیت کی جو باقاعدہ تحریک میراجی سے شروع ہوئی اس میں تقسیم سے پہلے حصہ لینے والے شاعر یہ تھے۔

آرزو لکھنوی، اندر جیت شرما، قیوم نظر، حفیظ ہوشیار پوری، ضیا فتح آبادی، امر چند قیس، مقبول احمد پوری، وقار انبالوی، لطیف انور —— شکیل بدایونی، قتیل شفائی، مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، مجید امجد، منیر نیازی، جمیل الدین عالی، تنویر نقوی، اکرم انگار، تاج سعید، مظفر علی سید، سیف الدین سیف، ضمیر اظہر، سلیم الرحمن، ناصر شہزاد، صدیق

غزل کی مقبولیت

● ڈاکٹر سید عبداللہ

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۷ء تک غزل اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک نظم غیر مقبول ہی یہ صحیح نہیں۔ البتہ اس میں تھوڑا سا سچ یہ ہے کہ ۱۹۲۵ء کے بعد نظم کے ساتھ ساتھ غزل پھر مقبول ہو گئی اور بڑے بڑے شعراء جو غزل سے توجہ ہٹا چکے تھے پھر غزل کی طرف متوجہ ہوئے۔

۱۹۲۵ء سے پہلے غزل کے ممتاز نمائندے حسرت، فانی، اصغر، یگانہ اور شاد عظیم آبادی تھے۔ بعد میں جگر، حفیظ، سیماب، اثر اور فراق وغیرہ بھی اس صف میں شامل ہو گئے تھے۔ اور اقبال کو بھی غزل گوؤں کے زمرے میں امتیازی مقام دیئے بغیر چارہ نہیں۔ سالک، احسان دانش، تبسم، عابد، ساغر نظامی، آنند نرائن ملا جو ۱۹۴۷ء سے پہلے غزل گوئی کا سکہ بٹھا چکے تھے ان میں سے بعض ۱۹۴۷ء تک بلکہ ۱۹۴۷ء کے بعد تک لکھتے رہے۔

۱۹۲۵ء کے بعد کے غزل لکھنے والوں کی فہرست طویل ہے۔ بزرگ شعرا کے علاوہ جو ۱۹۲۵ء تک شہرت قائم کر چکے تھے۔ بعد کے شعراء کی فہرست (جو ممکن ہے نا تمام ہو) یہ ہے

فیض، احمد ندیم قاسمی، مجاز، جذبی، عابد تبسم، عبدالعزیز فطرت، حفیظ ہوشیار پوری، شور علیگ، یوسف ظفر، الطاف مشہدی، طفیل، عبدالمتین، خلیل اعظمی، سیف الدین سیف، ظہیر کاشمیری،

ایک یادگار فوٹو حفیظ جالندھری اور ہری چند اختر

قومی ترانے کا اردو منظوم ترجمہ

مالکِ قلبِ انس و جاں عزّ و جلّ شانہٗ
خالقِ نظمِ دو جہاں عزّ و جلّ شانہٗ

ملکِ بہار و ملکِ سندھ
کوہِ ہمالہ کوہِ وندھ
ہے تو ہی کارسازِ ہند
خم ہے سرِ نیازِ ہند
ملک دکن، کلنگ و بنگ
رودِ جمن و یاس و گنگ

جلوہ گہِ جلالِ تو
آئینۂ جمالِ تو

سب کی زباں پہ تیرا نام
لب پہ دعا یہ صبح و شام
قاسمِ لطفِ بے کراں عزّ و جلّ شانہٗ
مالکِ قلبِ انس و جاں عزّ و جلّ شانہٗ

(جادو رانے ناظم)

قیوم نظر، قتیل شفائی، فارغ بخاری، شہرت بخاری، فضلی، شان الحق حقی، باقی صدیقی، ادا بدایونی، عدم، مسعود حسین خاں، زخم رومانی، حشری گلکشانی، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، ماہر القادری، سوملا جعفری، اختر ہوشیارپوری، امجد بٹالوی، جعفر طاہر، مجید امجد، نظر امروہوی، عرش ملسیانی، ادا جعفری، آنند لکھنوی، وحید نسیم، جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی، غلام ربانی تاباں، گوپال متل، قیوم نظر، فضا جعفری، صفدر حسین، شعلہ امرتسری، ابن انشا، ساحر ہوشیارپوری، شاد عارفی، شہاب جعفری، شہزاد، ادیب سہارنپوری، احمد راہی، طفیل ہوشیارپوری، جمیل ملک، حسن طاہر، زہرہ نگاہ، عشرت رحمانی، حبیب جالب، مشفق خواجہ، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی، محسن احسان، وامق جونپوری، امین راحت چغتائی، احمد فراز اور صادق نسیم۔

ان سب کو اس مختصر روداد میں زیرِ بحث لانا ممکن نہیں، ان میں فیض، فراق، احمد ندیم قاسمی، مجاز، ظہیر کاشمیری، ناصر کاظمی اور آنند لکھنوی بعض خاص رجحانات کی بدولت معاصرین میں امتیاز رکھتے ہیں قیوم نظر، ابن انشا، مجروح سلطانپوری، حفیظ ہوشیارپوری، شکیل بدایونی، جگن ناتھ آزاد، فضلی، حقی، شہرت بخاری، باقی صدیقی، غزل کی مسلسل آبیاری کرتے رہے انہوں نے بہت گل پھول اُگائے ●●

آتشِ غم ——— سیّدہ اختر

رہنے دے ناصحا ہمیں ان کے کرم سے دور دور
لاکھ وہ مہرباں سہی پھر بھی ہیں ہم سے دور دور
اُن کے در حسیں سے ہیں جن کو لطیف نسبتیں
رہتا ہے وہ سرِ نیاز... دیر و حرم سے دور دور
رب جہاں کی قسم، لذتِ درد کی قسم
اہلِ فراق کب رہے آپ کے غم سے دور دور؟
اُن کے بغیر کیا کہوں؟ دل کا عجیب حال ہے
بادہ ہے کیفیت نہیں، جام ہے جم سے دور دور
اے دلِ مضطرب ٹھہر! حد سے نہ اپنی تو گزر
ان کے ستم کے پاس پاس اُن کے کرم سے دور دور
جس کو ملے گھڑی گھڑی قربتِ کوئے حبیب
کیوں نہ رہے وہ خوش نصیب بانگِ ارم سے دور دور
حاصلِ قرب کیا کہیں شکوۂ بُعد کیا کریں؟
ہم نہیں ان کے پاس پاس وہ نہیں ہم سے دور دور
حسن میں وہ جلوہ گر ہو ایسی ہیں وہ نخستہ ہو
وہ "غمِ جاں" مگر رہا دیدۂ نم سے دور دور
"نالۂ درد آرزو" شیوۂ اہلِ دل نہیں
اختر شعلہ آفریں آتشِ غم سے دور دور

اردو کی رزمیہ شاعری میں نصرتی کا مقام

• سراج پیکان ایم اے

اردو ادب میں رزمیہ شاعری کی ابتدا دکن کی ان چند رزمیہ مثنویوں سے ہوتی ہے جن میں سے بعض فارسی مثنویوں کا ترجمہ اور بعض اپجی ہیں۔ ترجمہ میں رزمیہ عنصر فارسی کے متن سے آیا ہے۔ اس کے باوجود ان مثنویوں کے ترجموں میں جو اپج اور جذبہ و جوش ہے وہ شاعر کے مزاج اور ماحول کی دین معلوم ہوتا ہے، دکن کے شعری ادب کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو پہلی مرتبہ ملا نصرتی کے پاس رزم نگاری کی بھرپور اور مکمل شان نظر آتی ہے، نصرتی سے قبل اردو رزمیہ شاعری کے اولین نقوش کمال خاں رستمی کے "خاور نامہ" میں مل جاتے ہیں جو ابنِ حسام۔ قہستانی کی مشہور فارسی مثنوی "خاوراں نامہ" کا ترجمہ ہے، اس مثنوی کا موضوع حضرت علیؓ اور ان کے رفقا کی معرکہ آرائیوں کی طویل داستان ہے۔

رستمی کے بعد نصرتی دکن کا پہلا عظیم رزمیہ شاعر ہے اس کا کمال ہی یہ ہے کہ اس نے ایسے نا مکمل نمونہ کی رزمیہ شاعری کے دور میں "علی نامہ" تصنیف کیا، جو بیجاپور کے بادشاہ علی عادل شاہ ثانی کی معرکہ آرائیوں کی تاریخی داستان ہے۔ "علی نامہ"، سلطنتِ بیجاپور کی ایسے وقت کی تاریخی تصویر ہے جب کہ سلطنت سیاسی اور معاشی انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔ خانہ جنگیوں اور بغاوتوں کی وجہ سے نوعمر بادشاہ تخت نشین ہوتے ہی امور سلطنت کی پریشانیوں میں گھر گیا تھا۔ نصرتی نے ہر چھوٹے بڑے واقعہ پر نظر ڈالی ہے اور ہر واقعہ اس قدر صحت کے ساتھ قلمبند کیا ہے کہ بعض مورخین کو تاریخ کی کڑیاں ملانے کے لئے اس کے کلام سے استفادہ کرنا پڑا۔

نصرتی، دبستانِ بیجاپور کا سب سے بڑا شاعر ہے بلکہ اگر اسے دبستانِ دکن کا سب سے بڑا شاعر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا دکن میں بیجاپور کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اول اول شعراء کو یہیں سے رزمیہ شاعری کا مذاق و رجحان ملا چنانچہ

دکنی ادبیات میں اردو کی ابتدائی رزمیہ شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں خواہ وہ ترجمہ ہوں یا تخلیق، شجاعت و معرکہ آرائی کا ذکر جس جوش و شکوہ کے ساتھ ملتا ہے ان میں دکن کی سلطنتوں کے حوصلہ معرکہ آرائی کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

تخلیق کی کارفرمائی کا جہاں تک تعلق ہے اردو رزمیہ شاعری میں نصرتی پہلا شاعر ہے جس نے زبان کی کم مائیگی کے دور میں تخلیقی تخیل (CREATIVE IMAGINATION) کے سہارے اپنی ایک دنیا تخلیق کی اور اس دنیا میں وہ اپنے تجربات اور واقعات اور ان کی جزئیات کو مربوط کرتا گیا۔ نصرتی کا یہ تخیل اِس قدر قوی ہے کہ اس تخیل نے مستقبل کی رزمیہ شاعری کی (جس کی جھلک مراثی انیس کے رزمی حصوں میں نظر آتی ہے) پُرشکوہ بنیاد رکھی۔ تخیل جذبے کی شدت، بیان کے زور اور الفاظ کی شوکت کے ساتھ اس کی ساری مثنویوں پر جادو بن کر چھا جاتا ہے ؎

دکھیا اس فتح کے نامے کا علی نامہ ناؤں
جس کا ہر رزمیہ رستم کے گلے کا ہیکل

تخیل کی ایک نادر و اچھوتی مثال یہ ہے ؎

متورنے فتح آدیکھے اجھوں واں آپنی صورت،

پڑیا ہے عکس جس رن میں کھڑگ کی تیغ تجلا کا
اجل ہر تیغ کے جل میں کتے بار آتنگ دھو دھو گئی
ہزاراں کار حیوں کسمل تجس کنفار کسمل کا

تخیل میں جو ندرت، الفاظ میں جس شان کا اظہار ہے وہ نصرتی کو فردوسی کا ہمسر و ہم پایہ بنا دیتا ہے۔

رزمیہ شاعری چونکہ معروضی واقعات اور سورما شخصیتوں کے درمیان معرکہ آرائی کی داستان ہوتی ہے اس لئے نصرتی نے اس خصوصیت سے استفادہ کرکے شاعری کے اس معروضی ڈھانچے میں وہ تمام کیفیات ڈھونڈ نکالی ہیں جو خود نفسِ انسانی کے اندر بسنے والے تضادات کی آئینہ دار ہے، غم و غصہ، نفرت و حقارت، رشک و حسد، دوستی و دشمنی، محبت و رقابت، یہ وہ احساسات ہیں جہاں شاعر اپنا کردار داستان گو کی حیثیت سے رزمیہ شاعری میں ادا کرتا ہے۔ اس کا ثبوت دو طرح سے ملتا ہے، ایک اس طرح سے کہ رزمیہ شاعری میں کبھی کبھی معرکہ آرائی، خیالی، تصوری و شاہانہ (REGENTRY) داستان کی بنیاد پر ہوتی ہے اور اس معرکہ آرائی کی افسانویت تخیل کا ایک ایسا ڈرامہ ہوتی ہے جس میں نفسِ انسانی اپنے آپ سے برسرِ پیکار ہوتا ہے، دوسرا ثبوت یوں ملتا ہے کہ ہر بڑا معرکہ مکالمے پر یا تو ختم ہوجاتا ہے یا مکالمہ ہر معرکہ کو نفسیاتی روپ عطا کرتا ہے، انہی مکالموں کے ذریعہ نفسِ انسانی کی ساری کشمکش اور اس کا سارا اتنا و ڈرامائی روپ دھار کر یا تو تحلیل ہوجاتا ہے یا پھر ترقی پا کر ہو کر اک نئے موضوع کی شکل اختیار کرلیتا ہے، سہراب و رستم کا معرکہ اسی نوعیت کے موضوع کی ایک مثال ہے

نصرتی نے اپنی رزمیہ شاعری کی بنیاد بیجاپور کے اس عظیم اولوالعزم بادشاہ کی معرکہ آرائی کے واقعات پہ رکھی ہے جس کا مرتبہ شاہانِ بیجاپور میں بعض اعتبارات سے سب سے اونچا ہے۔ نصرتی، علی عادل شاہ ثانی کے ساتھ کئی جنگوں میں شریک رہا ہے اس لئے اس نے تمام واقعات اور میدان جنگ کے سارے حالات کو جس قریب سے مشاہدہ کیا تھا تخیل کی رنگ آمیزی کیساتھ بیان کردیا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر واقعہ اور ہر منظر قاری کے دل و دماغ پر مرتسم ہو کر متشکل ہوجاتا ہے، شاعر انہی حقائق کی بنیاد پر تخیل کا یہ عالی شان قصر تعمیر کرتا گیا ہے لیکن برخلاف اس کے ایسا تخیلی قصر جو اپنی کوئی حقیقی بنیاد نہیں رکھتا اس کی حیثیت افسانوی اڑن کھٹولے کی سی ہوجاتی ہے، درحقیقت ہر تخیل اپنی کوئی نہ کوئی مادی بنیاد ضرور رکھتا ہے، اگر تخیل مادی بنیاد سے آزاد ہوجائے تو وہ تخیل نہیں بلکہ آوارہ خیالی (FANTASY) کہلاتی ہے۔ نصرتی کی تمام شاعری انہی اصولوں کے تابع ہے ـــ

جنگ کا ایک منظر

کھناکھن تے کھڑگاں کے یوں شور اٹھیا
جو تن میں پہاڑاں کے لرزہ چھٹیا
بلا نیند میں تھی سو ہشیار ہوئی!
اجل خوابِ غفلت سے بیدار ہوئی
ہوا زور کھڑگاں تے پانی کا پور
لگے تیرنے ہو کھڑک جس کے پور!
سلاغاں میں کھڑگاں چوں دھسنے لگے
اگن ہور رگت مل برسنے لگے
ہویاں لوہیاں چھٹکاں ہوا پر بخار
ستے تیغ جیباں سوں شعلے ہزار
ہوا دھک دھکی یک انگارہ ہو لال
سکل اوت پانی کیا جل اچھال!
ہوا پر شراباں کا ات کھیل تھا
اٹے لہو سو تس آگ پر تیل تھا
بچن یوں سو فادسوں کان میں
لگے دوڑنے تیر میدان میں!

گلابی اردو اگرچہ زبان، بیان، مزاج، اسلوب اور رسم الخط کے لحاظ سے کوئی جداگانہ زبان قرار نہیں دی جا سکتی لیکن اسے اردو زبان میں ایک ایسی مثالی اور نرالی انشاپردازی سے مماثلت دی جا سکتی ہے جو اس کے بانی کی پیدائش کے ساتھ پیدا ہوئی، اسی کے ساتھ اس نے توانائی حاصل کی، شباب پر پہنچی، بام عروج پر قیام کیا اور پھر اپنے موجد کی وفات کے بعد اسی کے ساتھ دفن ہو گئی۔

گلابی اردو کے موجد ملّا رموزی بھوپال میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ ملّا صاحب نے ابتدائی تعلیم بھوپال کے مدرسوں میں حاصل کی اس کے بعد مولانا عبدالعلیم صدیقی کے ساتھ کانپور جا کر 'فاضل الٰہیات' کی سند حاصل کی۔ انہیں علم نجوم سے بھی گہری واقفیت تھی۔ فن حکمت میں دخل تھا اور علم الہندسہ میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔

گلابی اردو کے موجد نے ۱۹۲۸ء سے لے کر تقسیم ہند کی شام تک بلاتخصیص ہندوستان کے ہر اخبار میں لکھا ہر رسالے کو اپنی گلابی اردو سے مزین کیا۔ اور اس قدر لکھا کہ اس کا ریکارڈ کرنا آج بھی مشکل ہے۔
وہ بنیادی طور پر سیاسی تھے لیکن ادیب، صحافی، مصنف ہونے کے علاوہ فلسفی بھی تھے۔ انہیں مزاح نگار کہنے والے تھوڑی سی غلطی پر ہیں وہ مزاح نگار سے زیادہ طنز نگار تھے۔ ان کی زندگی کے دوران خواجہ حسن نظامی مرحوم اور مولانا ظفر علیخاں جیسے بلند پایہ ادیب اور صحافی نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ نواب محمد حمیداللہ خاں نے ان کے لیے وظیفہ مقرر کیا تاکہ موصوف معاشی تفکرات سے بے نیاز ہو کر اردو ادب کے ذریعہ قوم و ملک کی خدمت میں مصروف رہیں۔
مولانا ظفر علی خاں کے خیال میں جناب ملّا رموزی مزاح نگاری میں یکتا اور بے مثال تھے۔ انہوں نے ملّا صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تحریر کیا تھا:

"ڈاکٹر سر محمد اقبال نظم میں، مصوّرِ فطرت خواجہ حسن نظامی نثر میں اور ملّا رموزی گلابی اُردو اور مزاح نگاری میں یکتا ہیں۔"

شاعروں پر طنز کرتے ہوئے اپنی گلابی اُردو کے ایک مضمون میں ملا رموزی کا طرز تحریر ملاحظہ ہو:

"خبرداری اور آگاہی ہے واسطے تمہارے اور واسطے کثیر الاولاد اور قلیل معاش والوں کے بھی، واسطے ان کے جو بیچ مشاعرہ کے جاگتے ہیں صبح تک، واسطے پڑھنے غزل واہی تباہی اپنی کے ساتھ غرور استادی کے . . . "

ملّا رموزی صحافی، ادیب، فلسفی اور صاحب طرز انشاپرداز ہی نہیں تھے بلکہ ظریفانہ اور طنزیہ شاعری کے میدان میں بھی مشہور تھے۔ ان کی شاعری سنجیدہ

تبرکات

آغا شاعر قزلباش مرحوم

بدل دی انقلاب دہر نے تاثیر میخانہ
یہ آنکھیں رہ گئیں اتری ہوئی تصویر میخانہ

نشیلی انکھڑیوں کا واسطہ پلکیں جھکا لیجے
ادھر سے یا ادھر سے آ رہے ہیں پیر میخانہ

اثر اتنا تو ہو آنے لگے بوئے شراب اُس سے
کہ جس کاغذ پہ کوئی کھینچ دے تصویر میخانہ

بہت کچھ پارسا بنتا ہوں لیکن تار بارش میں
دکھائی دیتی ہے ہلتی ہوئی زنجیر میخانہ

گیا وہ دور شاعر اب نئے ہیں اور نئے پیتے ہیں
زمانہ مانتا ہے ہم کو پھر بھی پیر میخانہ

اور اصلاحی بھی تھی اور طنزیہ اور مزاحیہ بھی۔ شاعری میں بھی انہوں نے ملک و قوم کی رگ فاسد پر نشتر زنی کی ہے۔ انہوں نے غیر صحت مند عناصر کے خلاف دل کھول کر لکھا ہے۔ سماج کے دشمنوں سے انہیں شدید نفرت تھی۔ بلاشبہ ان کی ساری زندگی ہندوستانی عوام کی اصلاح کرنے میں صرف ہو گئی۔

ملی ترقی گھسیٹا کو بار بار ابھی
دھرے ہوئے ہیں رموزی ہی پیش کار ابھی
دھرے گئے ہیں فقط سیٹھ جی بلیک میں آج
ملیں گے ایسے ہی کچھ انکے رشتہ دار ابھی
جو زیورات خریدے ہیں کالے نفع سے
کرے گا ضبط انہیں کوئی تھانہ دار ابھی

اک میں ہوں کہ طوفان کا منہ پھیر رہا ہوں
اک تو ہے کہ گھر تک سے نکلنے سے ہے بیزار

ہر صاحب فکر کی طرح ملا رموزی کا آخری دور زبوں حالی اور کسمپرسی میں گزرا۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۵۲ء کو وہ سپرد خاک ہونے سے پہلے دو درجن سے زیادہ مطبوعات کا خزانہ ملک اور قوم کی خدمت میں پیش کر گئے۔ کئی غیر مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ان کے شاندار کارناموں میں چند کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

لاٹھی اور بھینس، عورت ذات، نکات رموزی، گلابی اردو، درس عبرت، مشاہیر بھوپال، دیوان ملا رموزی، زندگی، شادی، گلابی شاعری وغیرہ ★

مولانا امداد صابری

از
ڈاکٹر تنویر علوی

مولانا امداد صابری رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی کے ہمراہ

مولانا صابری ایک شریف، علم دوست اور اچھے متمول گھرانے کے فرد ہیں لیکن اس خاندان کو میشانہ وضع سے زیادہ درویشانہ اندازِ زندگی سے دلچسپی رہی ہے۔ مولانا کے والد مولانا شرف الحق مرحوم پر مذہب و تصوف کا گہرا اثر تھا۔ مرحوم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے خاص مریدوں معتقدوں اور خلفاء میں سے تھے، اسی ارادت و عقیدت کا اظہار مولانا امداد صابری کے اصل نام امداد الرشید صابری سے ہوتا ہے۔

مولانا حسرت موہانی کی طرح انہوں نے چکی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن کو بھی جاری رکھا ہے جس کا ثبوت مولانا کی تصانیف کا ایک اچھا خاصا طویل سلسلہ ہے جس میں تاریخ و تحقیق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ــــ مولانا صابری کی دوسری تصانیف سے قطع نظر مولانا نے تاریخ صحافتِ اردو کے سلسلے میں جو کام کیا ہے اس کے لئے اپنے کتب خانہ میں اخبارات اور کتب و رسائل کے علاوہ جو ایک نادر علمی ذخیرہ ہے اور دور دراز مقامات پر پہنچتے ہیں اس لئے اور یکنبل ریکارڈ اور مستند ماخذ کے وسیع مطالعہ کے بعد انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لئے وہ علمی دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں اور شکریہ سے زیادہ اس علمی تعاون کے جس کے بغیر بقول مولانا اُن کا آئندہ کا کام اس حسن و خوبی کے ساتھ پورا نہیں ہو سکتا جو اس کام کا حق اور بحیثیت مصنف ان کی ذمہ داریوں کا تقاضہ ہے۔"

مولانا صابری کی تاریخ صحافتِ اردو کی پہلی جلد یکم جنوری ۱۹۵۲ء کو شائع ہوئی تھی جس میں نو کے عدد سے لیکر غدر کے قبل تک کی خبر رسانی کے طریقے اور اخبارات نیز ان کے ایڈیٹروں کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

حال ہی میں دوسری اور تیسری جلدیں اشاعت پذیر ہوئی ہیں جن میں علی الترتیب ۱۸۷۵ء اور ۱۹۰۰ء تک کے اخبارات و رسائل کی تاریخ، ایڈیٹروں کی سوانح عمری اور اس دور کے سیاسی، سماجی، ادبی، تاریخی اور تعلیمی حالات درج ہیں۔ چنانچہ اختر شہنشاہی کے بعد صابری صاحب کو ہی تاریخ صحافت اردو کو کتابی شکل میں لانے کا اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ ★

پروفیسر محمد مجیب

از- عبداللطیف اعظمی

پروفیسر محمد مجیب، ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو لکھنؤ میں ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ ان کا خاندان اودھ کے بڑے زمینداروں میں سے تھا مگر انکے والد چودھری محمد نسیم صاحب لکھنؤ کے مشہور اور کامیاب وکیلوں میں سے تھے۔ اس لئے آمدنی کا بڑا ذریعہ وکالت تھی نہ کہ زمینداری۔ چنانچہ خود پروفیسر محمد مجیب صاحب اپنی ایک ریڈیائی تقریر میں فرماتے ہیں: "جس گھر میں میرا بچپن گزرا وہ لکھنؤ کے ایک سرے پر تھا میرا خاندان نہ قصباتی تھا نہ شہری، ہم کہلاتے تھے زمیندار، مگر زیادہ آمدنی وکالت سے تھی۔ ہمارے پاس نہ زیادہ دولت تھی کہ لٹا سکیں، لیکن شمار امیروں میں تھا۔"

تعلیم کی ابتدا لوریٹو کانونٹ LORETO CONVENT سے ہوئی۔ ایک سال کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد دہرادون کے ایک پرائیویٹ اسکول میں، جہاں سے ۱۹۱۹ء میں سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۹ء میں انگلستان تشریف لے گئے اور ۱۹۲۲ء میں آکسفورڈ سے تاریخ میں بی اے آنرز کیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک جرمنی میں قیام کیا اور اس دوران قیام میں طباعت میں ٹریننگ لی۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب بھی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں وہاں مقیم تھے۔ ان تینوں ہندوستانیوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی اور آپس میں دوستی ہو گئی اور یہ دوستی اتنی گہری اور پائدار ہو گئی کہ جب تینوں اسکالر فروری ۱۹۲۶ء میں اپنے وطن واپس آئے تو قلیل تنخواہ پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمت میں لگ گئے۔

پروفیسر محمد مجیب صاحب جامعہ میں تاریخ کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۸ء کے اواخر میں جب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو اس وقت مجیب صاحب نائب شیخ الجامعہ تھے ڈاکٹر صاحب کے چلے جانے کے بعد شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔ اور اسی وقت سے اب تک اس عہدے پر فائز ہیں مگر چونکہ تعلیم سے ان کو گہری دلچسپی اور محبت ہے۔ اسلئے اسی کے ساتھ ایم۔ اے کے طالب علموں کو پڑھاتے بھی ہیں۔ جامعہ کی تعلیمی اور انتظامی ذمہ داریوں کی وجہ سے انہیں تصنیف و تالیف کے لئے بہت کم مواقع ملے۔ مگر پھر بھی اردو اور انگریزی میں کوئی ڈیڑھ درجن کتابیں لکھی ہیں۔ چند اہم کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں، اردو میں:-

(۱) روسی ادب کی تاریخ (دو حصوں میں)

(۲) تاریخ تمدن ہند

(۳) تاریخ فلسفۂ ہند

(۴) دنیا کی کہانی

(۵) ہماری آزادی (INDIA WINS FREEDOM) — از مولانا آزاد کا ترجمہ)

اُردو صحافت کا مردِ میدان

مولانا عبدالوحید صدیقی

از: پروانہ ردولوی

مولانا عبدالوحید صدیقی آج سے اکیس سال پہلے روزنامہ نئی دنیا کے دفتر میں

پروانہ ردولوی مولانا عبدالوحید صدیقی کے دیرینہ رفیق ہیں۔ برسوں ان کی رفاقت سے بہرہ اندوز ہوئے اور آج ان کا شمار اردو کے ممتاز اور کہنہ مشق صحافیوں میں ہوتا ہے۔ مولانا کا ایک اجمالی تعارف جو موصوف نے قلمبند کیا ہے، ان کی پرخلوص اور پُر اصرار خواہش پر اردو نمبر میں شریک کیا جارہا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری یہ جرأت مولانا کی افتادِ طبع کے خلاف ہے لیکن ہما کے اردو نمبر کی دستاویزی حیثیت کے پیش نظر اس مضمون کو مولانا سے معذرت کے ساتھ شریک اشاعت کر کے صحافت اردو کے اس خلا کو پُر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں جو مولانا کے تذکرے کے بغیر یقیناً باقی رہ جاتا اور مستقبل کے محققین بھی اس اہم دور کے کامل استفادے سے محروم رہ جاتے۔ (ادارہ)

اگر میں یہ دعویٰ کردوں کہ آزادیٔ وطن کے بعد مولانا عبدالوحید صدیقی نے ہندوستان میں اردو صحافت کو چار چاند لگائے تو غلط نہ ہوگا۔ میں نے اپنی ۲۰ سال کی عمر ہی سے مولانا عبدالوحید صدیقی کو جانچا، پرکھا اور سمجھا ہے اور ان کی نگرانی و سرپرستی میں اپنی صحافتی زندگی کا آغاز بھی کیا ہے اس لیے بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اگر مولانا نے ۱۹۴۷ء کے بعد اردو صحافت کے میدان سے پسپائی اختیار کرلی ہوتی تو آج اردو

صحافت ان نئے نئے تجربات سے خالی ہوتی جو مولانا موصوف نے نہایت ناساعد حالات میں صرف عزم و حوصلہ کو رہنما بنا کر کئے اور جن کی وجہ سے آزاد ہندوستان میں اردو صحافت کو سربلندی و عظمت حاصل ہوئی۔

میں مولانا عبدالوحید صدیقی کی آزادیٔ وطن سے پہلے کی زندگی سے اچھی طرح واقف نہیں ہوں لیکن کتابوں اور اخباروں میں پڑھا ہے اور لوگوں سے سنا ہے کہ ان کی زندگی ہمیشہ طوفانوں سے دوچار رہی اور انہوں نے کبھی بھی خود کو طوفانوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا بلکہ طوفانوں کے رخ بدلے۔ وقت کی کلائیوں کو مروڑا اور جہاد زندگی میں عزم و حوصلہ، لگن، خلوص اور پیہم عمل کو رہنما بنا کر کامیابی حاصل کی۔ بہرحال مولانا کی ۱۹۴۷ء کے بعد کی زندگی کی کتاب میرے سامنے ہے۔ اس کتاب کا ہر ورق سادہ بھی ہے اور رنگین بھی۔ اس کا ہر باب اپنی ابتدا اور انتہا کے اعتبار سے لامحدود ہے، لاکھ کوششوں کے باوجود نہ اس کی ابتدا کا تعین کیا جا سکتا ہے نہ اس کی انتہا کو ناپا جا سکتا ہے۔

ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے دشمن سے بھی دشمنی نہیں کرتے اور اپنے دوستوں کی ہر حال میں مدد کرتے ہیں۔ رحمدلی کا یہ عالم ہے کہ آج آپ ان کی دل آزاری کیجئے، ان کو جان بوجھ کر نقصان پہنچائیے اور ارادی یا غیر ارادی طور پر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھئے کہ ان کے دل و دماغ کا سکون چھن جائے لیکن کل فقیرانہ شان سے ان کے پاس چلے جائیے، اپنی مجبوریاں بیان کیجئے، اپنی پریشانیوں کا تذکرہ کیجئے، یا شرم دامنگیر ہے تو اپنی غلطیوں کے اعتراف میں صرف سر ہی جھکا لیجئے فوراً ان کا دل بھر آئیگا اور وہ ایک مرد مومن اور قلندر کی طرح آپ کو معاف کر دیں گے ——— شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کی معصومیت کے قائل ہیں اور انہیں یہ گوارا نہیں ہے کہ ان کے در پر سوالی بن کر آنے والا خالی ہاتھ واپس جائے خواہ اس سے ان کو ہمیشہ نقصان ہی کیوں نہ پہنچا ہو ———

ان کی اس کمزوری سے (جسے میں سب سے بڑی انسانی صفت سمجھتا ہوں) بہتوں نے فائدہ اٹھایا ہے اور بار بار فائدہ اٹھایا ہے لیکن انہوں نے کبھی اشاروں اور کنایوں میں بھی ایسے لوگوں کی ہجو نہیں کی ———

مولانا کی دوسری قابل ذکر خوبی یہ ہے کہ وہ کسی ادیب شاعر یا صحافی کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوئے بلکہ اسے سہارا دیتے ہیں، آج ہندوستان اور پاکستان میں درجنوں ایسے شاعر، ادیب، اور صحافی موجود ہیں۔ جن کے سروں پر مولانا عبدالوحید صدیقی کے آستانہ سے شہرت کا تاج رکھا گیا۔ یہ حضرات کسی نہ کسی طور پر اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ان کی شہرت مولانا عبدالوحید صدیقی کی مرہون منت ہے لیکن خود مولانا عبدالوحید صدیقی نہ اس کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں نہ کسی کو اس بات کا احساس ہونے دیتے ہیں کہ اس کی ترقی ان کی مرہون منت ہے۔ شاید مرد مومن کی یہی شان ہے

مولانا عبدالوحید صدیقی کی تیسری بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قناعت پسند ہیں اور ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔ وہ صرف اپنی تحریروں اور تقریروں ہی کے ذریعے نہیں بلکہ اپنے عمل کے ذریعے بھی دنیا کو یہ بتاتے ہیں کہ یونیورسٹی کی ڈگریوں، بینک بیلنس اور خاندانی وجاہت سے کوئی بڑا آدمی نہیں بنتا ——— انسان اپنے عمل، افکار کی بلندی اور تخلیقی قوتوں کے ذریعے بڑا بنتا ہے اور اگر عزم، حوصلہ اور دیانت داری سے کام لے تو زندگی کی کوئی بھی ٹھوکر اسے زمین

دو سال قبل مولانا عبدالوحید صدیقی (بشکریہ ہندوستان ٹائمز)

…بوس نہیں کر سکتی

مولانا کی پوری زندگی ان ہی اعلیٰ اور ارفع اصولوں کی آئینہ دار ہے۔

مولانا عبدالوحید صدیقی کا وطن غازی پور (یوپی) ہے۔ ان کے والد عبدالعزیز صدیقی مرحوم انسپکٹر پولیس تھے۔ اس زمانہ کے دستور کے مطابق ان کی ابتدائی تعلیم غازی پور کے ایک مکتب میں فارسی میں ہوئی اس کے بعد اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ ان کے بزرگوں نے ان کے اندر دجانے ایسی کون سی بات دیکھی کہ چودہ پندرہ سال کی عمر ہی میں انہیں حصول علم کے لیے انگلینڈ بھیجنے کا تہیہ کر لیا لیکن قدرت نے کچھ اور ہی سوچ لیا تھا چنانچہ اسی زمانہ میں اچانک والد صاحب کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا اور اعلیٰ تعلیم کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ مجبوراً تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا اور

ذریعہ معاش کی فکر دامنگیر ہوئی۔ بالآخر انہوں نے نہر کے محکمہ میں ملازمت کر لی۔ وہ زمانہ مسلمانوں کے لیے بڑا پُر آشوب تھا۔ مغل راج کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں میں نفسی نفسی اور افراتفری کا عالم تھا ــــــ غدر کے منفی اثرات ابھی تک مسلمانوں کے چہرے سے عیاں تھے، ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہو چکا تھا اور انگریز وائسرائے گورنر اور کلکٹر ایک بار پھر مسلمانوں کے بکھرے ہوئے شیرازے کو یکجا ہونے سے روکنے کے لیے سرگرم عمل ہو گئے تھے۔ ان حالات میں مولانا عبدالوحید صدیقی کو انگریزوں کی نوکری کرنی پڑی تھی ــــــ اس وقت جوانی کا خون رگوں میں دوڑ رہا تھا لیکن حالات ایسے نہیں تھے کہ کھل کر مسلمانوں میں تنظیمی کام کیا جائے۔ اس لیے مولانا نے تعلیم کا سہارا لیا ــــــ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں جہاں بھی جاتے وہاں ایک انجمن قائم کرتے، بظاہر تو یہ انجمن بچوں کی تعلیم اور باہمی میل جول کے لیے ہوتی تھی لیکن اس کا اصل مقصد انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کو منظم کرنا اور انھیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا تھا۔ قارئین کے لیے یہ انکشاف دلچسپ ہو گا کہ اس زمانے میں مولانا عبدالوحید صدیقی اپنی انجمن سازی کی لگن کی وجہ سے "انجمن صاحب" کے نام سے مشہور ہو گئے تھے ــــــ ملازمت مولانا کے ذہن و مزاج سے لگا نہیں کھاتی تھی اس لیے انہوں نے نوکری ترک کر دی اور تحریک خلافت میں جو صحیح معنوں میں ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی پہلی بغاوت تھی ــــــ شامل ہو گئے ــــــ حالات سے مجبور ہو کر ایک بار پھر ملازمت اختیار کر لی لیکن یہ ملازمت انگریزوں کی نہیں تھی۔ انہوں نے اس مرتبہ سپھیڑی (ضلع تھانہ) کی انجمن اسلامیہ کے ایک اسکول میں مدرس کا پیشہ اختیار کیا۔ یہاں رہتے ہوئے دینی تعلیم کا شوق پیدا ہوا اور اس شوق کی تکمیل کے لیے انہوں نے یہ ملازمت بھی چھوڑ دی سپھیڑی سے آکر مظاہر العلوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند میں دینی تعلیم حاصل کی، ساتھ ہی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی انہوں نے "انجمن سازی" کا شغل جاری رکھا اور وہاں انہوں نے "لجنۃ الاتحاد" کے نام سے طلبہ کی ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ غالباً ان کی یہ تنظیم کسی دینی درس گاہ کی پہلی "اسٹوڈنٹس یونین" تھی۔ دیوبند ہی میں مولانا نے "مہاجر" نام کا ایک اخبار نکالا جو طلباء کی تنظیم اور تحریک کا ترجمان تھا۔ اس تحریک کے نتیجہ میں دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ اور طلباء کی ہجرت سے جامعہ اسلامیہ ڈھابیل کی بنیاد پڑی۔ مہاجر نے مولانا کی زندگی کی ایک نئی راہ متعین کی اور یہیں سے صحافتی زندگی کے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ اور جب آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ایک رکن ڈاکٹر شیخ محمد عالم بیرسٹر نے لاہور سے ایک روزانہ اخبار "مساوات" کے نام سے نکالنے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے اس اخبار کی چیف ایڈیٹری کی ذمہ داریاں مولانا عبدالوحید صدیقی کو سونپ دیں۔ کچھ عرصہ بعد مساوات کو انگریز حکومت نے بند کر دیا تو مولانا دیوبند واپس آ گئے لیکن جلد ہی "زمیندار" (لاہور) کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں نے اپنے معاون کی حیثیت سے بلا لیا۔ اسی اثنا میں جمعیۃ العلمائے ہند کے اخبار "الجمعیۃ" کے ایڈیٹر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے استعفیٰ دیدیا۔ اور مولانا احمد سعید مرحوم کی تحریک پر مولانا عبدالوحید صدیقی دہلی آ گئے۔ یہاں آکر انہوں نے پہلے تو الجمعیۃ کے مدیر اور بعد میں جنرل منیجر ــــــ کی حیثیت سے ایک عرصہ تک کام کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک ماہنامہ جاوید جاری کیا جس کا نا

دور کے ماہناموں میں ایک خاص مقام تھا۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کی آواز پر ایک مرتبہ پھر مولانا کو دیوبند واپس جانا پڑا۔ وہاں انہوں نے اس وقت کے صدر مہتمم اپنے استاذ محترم علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، صدر مدرس مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کے ایماء و منشا پر دارالعلوم کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے شعبۂ تنظیم و ترقی اور مجلسِ ابنائے قدیم کی بنیاد رکھی۔ وہ ان شعبوں کے ناظم مقرر ہوئے۔ یہ شعبے آج بھی قائم ہیں اور دارالعلوم کی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اب ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ خیز دور آ گیا۔ ہندوستان تقسیم ہو گیا اور فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے پاؤں اکھڑنے لگے ــــــ تقسیم وطن کے نتیجہ میں مسلمانوں میں عام مایوسی پھیل چکی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے پاس کوئی ایسا پلیٹ فارم یا اخبار نہ تھا جو ان کے حوصلوں کو بلند رکھ سکتا اور ان کے اکھڑے ہوئے پاؤں جما سکتا۔ جمعیۃ العلماء ہند کا اخبار الجمعیۃ بھی انگریز حکومت کی مہربانیوں کا نشانہ بن کر بند ہو چکا تھا۔ آزاد ہندوستان میں اسے پھر جاری کیا گیا تھا لیکن اس کی انتظامی حالت بے حد سقیم تھی۔ اس موقع پر اپنے دیرینہ رفیق مولانا حفظ الرحمٰن کے اصرار پر مولانا عبدالوحید صدیقی دہلی آئے اور الجمعیۃ کی انتظامی حالت کو درست کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے ــــــ لیکن الجمعیۃ ایک تنظیم کا اخبار تھا اور وہ پوری بے باکی کے ساتھ مسلمانوں میں پھیلے ہوئے احساس کمتری کو دور کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اس لیے مولانا عبدالوحید صدیقی نے آزاد ہندوستان میں خود اپنے پہلے اخبار "نئی دنیا" کی بنیاد ڈالی جس نے بے باک اور بے لاگ صحافت کا ایک ایسا معیار قائم کیا جس کی دوسری مثال

صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اور مولانا عبدالوحید صدیقی دس سال قبل کی ایک تصویر

ملنی مشکل ہے۔ نئی دنیا ہندوستان کا پہلا اخبار تھا۔ جس کی اشاعت سے پہلے ہی حکومت نے نقد ضمانت طلب کی تھی۔ اور حکومت کے اس اقدام کے خلاف پورے ملک کے اخبار نویسوں نے صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ نئی دنیا کے اجرا کی اجازت دینے اور اشاعت سے دو یا تین دن قبل ایک ہزار روپے کی نقد ضمانت طلب کرنے کے اس واقعہ نے ہندوستان کی تمام زبانوں کے اخبارات کے ایڈیٹروں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا تھا اور ہندوستان سے شائع ہونے والے تمام زبانوں کے اخبارات اپنی پیشانی پر یہ احتجاجی مطالبہ شائع کرنے لگے تھے کہ "آزادی تحریر و تقریر ہمارا پیدائشی حق ہے اور جب تک ہمیں اس بات کی ضمانت حاصل نہ ہو جائیگی ہم چین سے نہ بیٹھیں گے۔" نئی دنیا کے خلاف اس سرکاری اقدام کو تمام اخبار نویسوں نے اپنے خلاف اقدام سمجھ لیا تھا اور نئی دنیا کا یہ کیس آزادیٔ صحافت کا ٹسٹ کیس بن گیا تھا۔ بالآخر حکومت کو نئی دنیا کی ضمانت واپس کرنی پڑی تھی اور صحافیوں کی ہنگامہ خیز تحریک ختم ہوئی تھی۔ اس کے بعد پھر نئی دنیا سے ۵۔۵ ہزار روپے کی نقد ضمانتیں طلب کی گئی تھیں اور اس کے خلاف بھی پورے ملک میں صدائے احتجاج بلند کی

گئی تھی ——— آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس اخبار کا آغاز
اس قدر ہنگامہ خیز تھا اس کے شباب کا کیا عالم رہا ہوگا۔
نئی دنیا کے ساتھ ہی مولانا نے روزانہ ہمت اور روزانہ
طاقت بھی جاری کیا۔ ہمت کو کچھ عرصہ بعد دہلی کر دیا
گیا۔ طاقت بند ہو گیا اور جب تقریباً ۱۴ سال کی جدّو
جہد کے بعد نئی دنیا بھی بند ہو گیا تو مولانا نے روزانہ
واقعات کو جاری کیا جس نے بہت کم عرصہ میں کتابت
اور طباعت کے نئے تجربوں کے نتیجہ میں نئی دنیا
کی جگہ حاصل کر لی لیکن شاید قدرت کو یہ نہیں منظور
تھا کہ مولانا عبدالوحید صدیقی اخبارات کے تنگ
دائرے میں پھنسے رہیں اس لیے واقعات کو بھی بند
ہو گیا۔

نئی دنیا کئی اعتبار سے ایک قابل ذکر اخبار
تھا لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے
اپنی آغوش شفقت میں صحافیوں کی ایک نئی نسل کی
پرورش کی اور آج دہلی کے بڑے بڑے اردو اخبارات،
ریڈیو، ٹیلی ویژن اور محکمہ اطلاعات میں کام کرنے
والے صحافیوں کی ایک بڑی تعداد نے "نئی دنیا" ہی
سے صحافت کا پہلا سبق پڑھا تھا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ آج میں
نئی دنیا اور مولانا عبدالوحید صدیقی کی شفقت ہی کے
نتیجہ میں خوش حال زندگی سے ہمکنار ہوں۔ اگر مجھے
۲۰ سال پہلے نئی دنیا کی آغوش نہ ملی ہوتی اور مولانا
عبدالوحید کی سرپرستی اور شفقت نے سہارا نہ دیا ہوتا
تو ادب اور صحافت کی دنیا میں میرا کوئی مقام نہ ہوتا۔
مجھ جیسے، بلکہ مجھ سے بھی بہتر بہت سے دوسرے
صحافیوں اور ادیبوں پر بھی یہی بات صادق آتی ہے
لیکن میں ان کے نام نہ لکھوں گا۔ نئی دنیا کے بند ہونے
کا غم مولانا عبدالوحید صدیقی کو اتنا ہی ہوا ہوگا جتنا کسی
ضعیف باپ کو اپنے جوان بیٹے کی اچانک موت کا ہوتا
ہے لیکن انہوں نے اپنے اس غم کو غم جاناں نہیں بنایا۔
نہ انہوں نے سینہ کوبی اور نوحہ خوانی کا شیوہ اختیار کیا۔
ایک بار پھر انہوں نے اپنے عزم محکم کا سہارا لیا، اور
جو آشیانہ اجڑ چکا تھا اسی کے تنکے چن چن کر ایک نئے
آشیانے کی تعمیر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور کچھ دنوں کے
بعد ہی ھما کی شکل میں ان کی نئی کوشش دنیا کے
سامنے آئی ——— ھما ہندوستان کا پہلا
اردو ڈائجسٹ تھا اس لئے اردو داں طبقہ میں اسے
ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو کا یہ
ڈائجسٹ ان لوگوں کے ہاتھوں میں بھی پہنچنے لگا جو
اردو جانتے تو تھے لیکن احساس کمتری کی وجہ سے
پڑھتے نہ تھے۔ ہما کے بعد ھدیٰ، ہزار داستان اور
ہدف جیسے معیاری میگزین اور واقعات جیسا بہترین
پندرہ روزہ رسالہ نکال کر اور کامیابی کے ساتھ
چلا کر مولانا عبدالوحید صدیقی نے اردو کے تن مردہ
میں ایک نئی زندگی پیدا کی۔ اردو والوں کے دلوں
میں نئی امنگ، ولولا اور جوش پیدا کیا۔ مختلف زبانوں
کے بہترین ادب کے ترجموں کے ذریعہ اردو ادب کے
خزانے کو مالا مال کیا اور یوروپین رسالوں سے مرعوب
رہنے والوں کو بھی یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ "واقعی کتابت،
طباعت اور مواد کے اعتبار سے اردو کا دامن خالی
نہیں ہے۔"

آج ہما، ہدیٰ اور واقعات مولانا عبدالوحید
صدیقی کی نگرانی میں ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں
اور ان میگزینوں کا ہر شمارہ مولانا کے اس قول کی
تائید کرتا ہے کہ

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حد پرواز سے ★

ایک جائزہ

اردو صحافت

• ناز انصاری

ناز انصاری اردو کے ممتاز اور نامور صحافی ہیں۔ آپ نے زیر نظر مضمون ہمارے اردو نمبر کے لئے کافی تحقیق و محنت کے بعد مرتب فرمایا ہے۔ ہم اس مضمون کا صرف وہی حصہ شائع کر رہے ہیں جس کا تعلق تاریخ صحافت اردو سے ہے۔ اس مضمون کا ابتدائی حصہ جس میں اردو صحافت سے پہلے دوسری زبانوں کی تاریخ صحافت پر روشنی ڈالی گئی تھی جگہ کی تنگی کی وجہ سے شامل نہ کر سکے جس کے لئے ناز صاحب سے معذرت خواہ ہیں۔ (ادارہ)

اگر صرف اردو صحافت پر ہی کچھ لکھنا ہو تو یہ ایک کوزہ مقالے کا دس پانچ کالم یا سو پچاس صفحے کا موضوع نہیں ہے بلکہ کئی کتابوں کا موضوع ہے ہر چند کہ اس موضوع پر اردو میں بھی کئی کتابیں آچکی ہیں مگر ہنوز ان کو اردو صحافت پر مکمل اور ایسی جامع کتاب نہیں قرار دیا جاسکتا کہ جن کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ ان میں اردو اخبارات اور اردو اخبار نویسی کی پوری تاریخ اور تمام موضوعات اور تمام پہلو آگئے ہیں۔ اس لئے میں اس مضمون کو اردو صحافت کا جائزہ بلکہ سرسری جائزہ کا نام دیتا ہوں — یہ تاریخ نہیں ہے — صحافت، پھر ہندوستانی صحافت اور اردو صحافت کے تذکرے

لکھنؤ کا پہلا سیاسی اخبار

"ہندوستانی" لکھنؤ سے ۱۸۸۳ء میں جاری ہوا یہ پہلا ہفت روزہ تھا جس میں سیاست حاضرہ پہ جرأت مندانہ مضامین ہوتے تھے۔ کچھ دن بعد اسے مسدود کر دیا گیا تھا۔

سے قبل اس موضوع پر شائع ہونے والی کتابوں کا جائزہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اردو صحافت پر اب تک جو کتابیں آئی ہیں اگر انکو سامنے رکھ کر ایک ساتھ پڑھا جائے تو ان ہی کی تحقیقات کی روشنی میں بہت سی غلطیاں درست کی جا سکتی ہیں۔ میں نے کہیں ایک آدھ بہت نمایاں غلطی کو درست کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کتابوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ازسرنو تحقیقات کی جائے۔ ان کتابوں پر ایک مختصر تبصرہ اردو کے اس صدی کے نامور صحافی مولانا عبدالمجید سالک کے صاحبزادے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی کتاب صحافت پاکستان و ہند کے پیش لفظ سے پیش کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر خورشید لکھتے ہیں۔

"امداد صابری نے تاریخ صحافت (۱۹۵۳ء) میں لکھی لیکن صرف ۱۸۵۷ء تک (اب صابری صاحب کی کتاب کی دوسری اور تیسری جلد بھی آ چکی ہے اور یہ ۱۹۰۰ء تک ہے) محمد عتیق صدیقی نے ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں (دسمبر ۱۹۵۷ء میں) پیش کی (ان کی ہی ایک اور کتاب (مئی ۱۹۶۶ء میں) ۱۸۵۷ء کے اخبارات اور دستاویزیں کے نام سے شائع ہوئی ہے، لیکن یہ بھی ۱۸۵۷ء تک کی داستان بیان کرتی ہے۔ بدر شکیب نے اردو صحافت لکھی لیکن زیادہ تر ابواب فن صحافت پر ہیں اور جو تاریخ قلمبند کی ہے وہ انیسویں صدی تک۔ انگریزی زبان میں صحافت کی تاریخ پر دو کتابیں نمایاں ہیں، اول۔ مس مارگریٹا بارنس کی ترتیب کتاب "دی انڈین پریس" جو ۱۹۴۰ء میں چھپی دوم جے نٹ راجن کی کتاب ہسٹری آف جرنلزم ان انڈیا۔ جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی ہے۔ اول الذکر کتاب مس مارگریٹا کی تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے لیکن مؤلف نے اردو اور فارسی صحافت کا ذکر یوں کیا ہے جیسے اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی انہوں نے سارا زور انگریزی صحافت پر صرف کیا ہے۔ یہی حال نٹ راجن کی کتاب کا ہے اس میں اردو صحافت کا ذکر کچھ زیادہ ہے لیکن پھر بھی بہت کم ہے۔"

"اردو صحافت کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی مولانا عبدالمجید سالک۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، ملک امام خاں نوشہروی اور دوسرے بزرگوں نے وقتاً فوقتاً مقالے قلم بند کئے جو اپنی اپنی جگہ پر قابل قدر اور قابل تحسین ہیں لیکن تاریخ صحافت کے فنی پہلوؤں سے دیکھئے تو ان میں تشنگی ہے۔

"میں نے جتنی کتابوں اور مقالوں کا ذکر کیا ہے انمیں کوئی ایسی مثال نہیں جس میں اردو صحافت کی مکمل تاریخ لکھنے کا دعویٰ کیا گیا ہو۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ برصغیر میں اردو صحافت کے نشوونما اور ارتقا کی ایک مسلسل اور مکمل کہانی کتابی صورت میں سامنے آجائے اس ضرورت کو پورا کرنے کی میں نے سعی کی ہے۔" (صفحہ الف۔ب)

مگر میں ان سب کتابوں کی ایک بنیادی خامی یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ اردو صحافت کے میدان کے ہند اور پاکستان کی صورت میں تقسیم ہونے کے بعد لکھی گئی ہیں اور تحقیق کا کام دونوں ملکوں میں تحقیق کرنے کے بعد سامنے نہیں آیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام کے مآخذ اور مواد، امداد صابری اور عتیق صدیقی کو میسر نہیں آسکے اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو ان کے ذرائع و وسائل نہیں ملے جو دوسروں کو حاصل تھے۔

اور ڈاکٹر خورشید نے پنجاب کی صحافت پر زیادہ زور دیا ہے

جام جمشید

نمبر ۹ — اسعد الاخبار — جلد اول

اس اخبار میں

▲ سرورق "جام جمشید" ۳ فروری ۱۸۹۵ء

▲ عکس صفحہ اول "اسعد الاخبار" مورخہ ۷ جولائی ۱۸۴۷ء

اسی لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ آئندہ کوئی کتاب برصغیر ہند و پاکستان میں صحافت بالخصوص اردو صحافت سے متعلق تمام مواد کا مطالعہ کر کے لکھی جائے اور جب تک ایسا نہ ہوگا کوئی بھی کتاب اردو صحافت پر مکمل نہیں کہی جا سکے گی۔

اردو کا پہلا اخبار: محققین جام جہاں نما کے سلسلے میں اختلاف رائے رکھتے ہیں کہ وہ پہلا اردو اخبار تھا یا پہلا فارسی اخبار۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اپنی تحقیق سے جو ثبوت اس کے اردو اخبار ہونے کے متعلق پیش کیا ہے وہ زیادہ صحیح ہے۔ انہوں نے جام جہاں نما کے دو معاصر اخباروں کلکتہ جرنل اور جان بل کے اقتباسات سے یہ ثابت کیا ہے کہ جام جہاں نما اردو کا پہلا اخبار تھا۔ یہ پہلے اردو میں شائع ہونا شروع ہوا۔ چھ شمارے شائع ہوئے تھے کہ کلکتہ جرنل میں اعلان ہوا کہ جو اخبار ہندوستانی میں شائع ہونا شروع ہوا تھا اس کی زبان میں عنقریب اہم تبدیلی ہونے والی ہے۔ چنانچہ یہ تبدیلی فارسی کے حق میں ہوئی مگر ایک سال بعد جام جہاں نما نے پھر اردو کی طرف رجوع کیا مگر فارسی اخبار کو برقرار رکھتے ہوئے اردو ضمیمہ شروع کیا۔ غالباً یہ ہوا ہے کہ لوگوں کی تحقیق میں فارسی سے پہلے اردو ایڈیشن نہیں آیا۔ اور انہوں نے فارسی کے بعد اردو ضمیمہ کی ترتیب ہی نوٹ کی ہے حالانکہ ہوا یہ ہے کہ پہلے اردو پرچہ نکلا پھر فارسی اور اس کے بعد اردو ضمیمہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے کلکتہ جرنل کے ۱۸۲۲ء کے فائل کے حوالے سے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے "اردو جام جہاں نما" کی اولیت ثابت کی ہے۔ ظاہر ہے کہ عتیق صدیقی اور مولانا امداد صابری کو تقسیم ملک کے باعث اس تک رسائی نہیں حاصل ہو سکی یا یہ فائل ان کے علم میں نہیں آ سکا۔ دونوں ہندوستانی مصنفوں کے یہاں محولہ

سرسید کے اخبار تہذیب الاخلاق کے پہلے شمارہ کا عکس

اخبار خیر خواہ ہند یکم اکتوبر ۱۸۳۷ء

کے ثبوت میں نیشنل آرکائیوز کی دستاویزات یا مارگریٹا بارنس کے حوالے میں، پنجاب یونیورسٹی کے فائل کا ذکر نہیں ہے۔

اردو جہاں نما کے ابتدائی دور میں زیادہ تر جگہ خبروں کو دی جاتی تھی اور کبھی کبھی ایک آدھ غزل چھاپ دی جاتی تھی خبروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ خبریں دیسی ریاستوں کے خبرناموں سے نقل کی جاتی تھیں اور زیادہ تر ساحلی انگریزی اخبارات سے ترجمہ اور تلخیص کر لی جاتی تھیں چونکہ دیسی قارئین اس اخبار کو زبان اردو میں مہارت حاصل کرنے کیلئے پڑھتے اور خبروں کے مطالعہ کے لئے انگریزی جرائد کو ترجیح دیتے تھے، اس لئے یکم مارچ ۱۸۲۶ء سے خبروں کی اشاعت تقریباً بالکل بند ہوگئی اور چار مہینے تک بالاقساط تاریخ انگلستان درج کی گئی

پھر تقریباً ایک برس محاربات نپولین کی داستان شائع ہوتی رہی پھر تاریخ عالمگیری کا ترجمہ چھپتا رہا، اس کے بعد اردو کے صفحات اس اعلان کے ساتھ بند کر دیئے گئے کہ "اس لحاظ سے کہ بہتیرے قدر شناس جنہوں کی لطف گستری سے اس کاغذ نے رونق اور شہرت پائی اردو عبارت سے ذوق نہیں رکھتے اور اہل ہند جنہوں کی زبان ہی فارسی ہے وہ فارسی کی تحریر چاہتے ہیں خاکسار نے مناسب سمجھا کہ آئندہ ہفتہ سے ہندی فرمان کے عوض ایک فرمان اور بھی فارسی میں لکھا جائے۔"

اردو کا یہ پہلا اخبار چار سال آٹھ مہینوں تک جاری رہنے کے بعد ۲۲ جنوری ۱۸۲۸ء کو بند ہوگیا۔ اس اخبار کی درخواست دینے والا ہری ہردت جو تھا، ایڈیٹر منشی سدا سکھ اور پرنٹر ولیم پیئرس کلب کنس اینڈ کمپنی تھی۔ خریداری وغیرہ کی خط و کتابت کے لئے تارا چند کا نام درج ہے۔ اخبار ہر بدھ کو ملا سر کلر روڈ کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ فارسی پرچہ کا ماہانہ دو روپے اور اردو پرچہ کا ماہانہ چندہ ایک روپیہ تھا اسکا سائز ۲۰×۳۰ اور دو کالم ہوتے تھے۔ ابتداء میں یہ اخبار کچھ عرصہ انگریزی تجارتی کوٹھی کی ملکیت رہا اور اسی کی پالیسی کے تحت اور اہتمام میں شائع ہوتا رہا لیکن بعد میں راجہ رنجیت سنگھ کے خلاف ایک مضمون لکھنے پر ایسٹ انڈیا کمپنی اس اخبار سے ناراض ہوگئی

نصر من اللہ وفتح قریب

تیرھویں صدی

جلد ۲

شعبان ۱۲۹۷ھ

فہرست

دفتر آگرہ اخبار آگرہ

THE AFZAL-UL-AKHBAR

DELHI

افضل الاخبار

"افضل الاخبار" دہلی کے ایک شمارہ کی لوح

دفتر آگرہ اخبار سے نکلنے والے ماہانہ "تیرھویں صدی" کا ٹائٹل

اور اس سے قطع تعلق کر لیا۔

انگریزوں نے ملک پر گرفت بڑھانے کے بعد مغل سلطنت اور اس کے آثار و اثرات سے الگ کرنے کے لئے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ ۱۸۳۵ء میں فارسی کی جگہ اس نے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ ایک طرف تو اس سے فارسی کے حامیوں پر جذباتی چوٹ نہیں پڑی، دوسری جانب گو اردو کی ترقی میں مدد ملی مگر فارسی اور مغل دور سے رشتہ ٹوٹ گیا، اس کے بعد اردو کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ بہرحال اردو کے کئی اخبار نکلے، ابتداء میں حکومت نے اردو اخبارات کو اسکولوں، کالجوں کے لئے خریدا بھی جس سے ان کی معاشی طور پر امداد ہوئی۔

۱۸۳۶ء میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے ۲۰×۳۰ سائز پر "دہلی اردو اخبار" جاری کیا۔ اس میں صفحہ اول پر "حضور والا" کے عنوان سے مغل تاجدار اور قلعہ معلی کی سرگرمیاں اور "صاحب کلاں" کے عنوان سے کمپنی کی حکومت کی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ اس میں مختلف درباروں ریاستوں اور شہروں سے آنے والے اخبارات کے اقتباس ہوتے تھے۔ وہ سرکاری ذرائع کے علاوہ رضاکارانہ نامہ نگاری کرنے والوں کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھاتا تھا۔ اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ سیاسی کے علاوہ تعلیمی، تمدنی اور مجلسی زندگی سے تعلق رکھنے والی خبریں بھی چھاپتا تھا۔ وہ عموماً خبروں کے ساتھ ساتھ وہیں چار پانچ سطروں میں تبصرہ کر دیتا تھا۔ تبصرہ کا لب و لہجہ نرم ہوتا تھا۔ اس اخبار سے فرقہ وارانہ فسادات کی اطلاع بھی ملتی ہے۔ اس اخبار نے ہندوستان کی پہلی سیاسی جماعت "دھرم سبھا" کے قیام کی خبر شائع کی تھی، یہ کلکتہ میں قائم ہوئی تھی اور اس کی بنیاد رکھنے میں اخبار نویس پیش پیش تھے۔ یہ تعلیم کا زبردست حامی تھا۔ اس میں بہادر شاہ ظفر۔ ملکہ زینت محل۔ ذوق۔ غالب اور مومن کا کلام بھی چھپتا تھا۔ یہ ذوق کا حامی تھا۔ اس نے

THE PAISA AKHBAR

پیسہ اخبار

پیسہ اخبار جنوری ۱۸۹۲ء کا سرورق

غالب کے یہاں جوا پکڑے جانے کی خبر مخالفانہ انداز میں شائع کی تھی۔ اس اخبار کے متعلق سرکاری رپورٹیں واضح ہے کہ یہ اخبار اپنے مخالفوں کے خلاف ہرزہ سرائی میں مصروف رہتا ہے اور معزز دیسی شرفا پر ذاتی حملے کرتا ہے جنہیں اخبار کے مدیر کے مذہبی خیالات سے اتفاق نہیں۔ یہ ۱۸۵۷ء میں بند ہوا اور مولوی محمد باقر گولی سے اڑا دیئے گئے۔

مظہر الحق :- یہ اخبار بھی مولوی محمد باقر کا تھا اور ۱۸۴۳ء میں جاری کیا گیا تھا اس میں شیعہ فرقہ کے خیالات کی ترجمانی ہوتی تھی۔ یہ شاید ۱۸۴۸ء کے بعد نہیں نکلا "غدر" کے بعد اسی اردو اخبار کا نام ۱۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو بدل کر "اخبار الظفر" کر دیا گیا تھا

سید الاخبار :- یہ ہفتہ وار اخبار سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے ۱۸۳۷ء میں جاری کیا تھا۔ سید محمد سرکاری ملازم تھے۔ اس لئے اخبار کی ادارت مولوی عبدالغفور کے سپرد تھی۔ مولوی صاحب قانون سے بخوبی واقف تھے اس لئے اخبار میں ایسے مضامین خاص اہتمام سے شائع کرتے تھے جن میں قانونی مسائل پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ یہ اخبار وکیلوں میں بہت مقبول تھا یہ اخبار مرزا غالب کو بے حد پسند تھا۔ یہ ۱۸۵۰ء میں بند ہو گیا۔

اردو کا سب سے سستا اخبار

۱۸۸۷ء میں مولوی محبوب عالم نے "پیسہ" اخبار لاہور سے جاری کیا جو اپنے اعلیٰ معیار اور سب سے کم قیمت اخبار ہونے کی وجہ سے عوام میں عرصہ دراز تک مقبول رہا۔

صادق الاخبار :- دلی سے اس نام سے چار اخبار نکلے۔ پہلا فارسی میں تھا پھر اردو میں ہو گیا تھا جو ۱۸۵۰ء سے پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔ دوسرا ۱۸۵۳ء میں جاری ہوا اور ایک سال سے بھی کم عرصہ جاری رہا اس کے مہتمم مصطفیٰ خاں تھے۔ تیسرا ۱۸۵۴ء میں سید جمیل الدین خاں نے اور چوتھا ۱۸۵۶ء میں شیخ خدا بخش نے جاری کیا تھا۔ یہ دونوں ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ایک دوسرے کے دوش بدوش نکلتے رہے مگر مقبول سید جمیل الدین والا ہی اخبار تھا اور ۱۸۵۷ء میں تو بہت ہی مقبول تھا۔

کریم الاخبار :- دلی کالج کے پروفیسر اور نامور ادیب مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۵ء میں یہ اخبار جاری کیا تھا جو تین سال بعد بند ہو گیا۔ یہی وہ مولوی کریم الدین ہیں جن کی کریم اللغات بھی مشہور ہے۔

خلاصۃ الاخبار :- یہ اخبار اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس اخبار کے اقتباسات بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں پیش ہوئے تھے

بمبئی سے نکلنے والا روزنامہ "سلطان الاخبار" مورخہ ۵ جنوری ۱۸۹۹ء

لکھنؤ سے نکلنے والے اودھ پنچ کا ایک شمارہ

بہادر شاہ کے مقدمے کی اصل کارروائی انگریزی میں چھپی ہوئی ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے غدر دہلی کے اخبار کے نام جو کتاب چھاپی ہے اس میں انہوں نے کچھ شائع کیا ہے وہ اسی سے ترجمہ ہیں اصل اقتباسات نہیں ہیں۔

ان کے علاوہ خلاصہ اطراف۔ ضیاء الاخبار۔ اخبار دہلی۔ وحید الاخبار۔ نورِ مغربی و نورِ مشرقی شائع ہوتے تھے، دلی سے شائع ہونے والے خالص علمی ادبی رسالوں میں قران السعدین۔ گل رعنا۔ فوائد الناظرین۔ محب ہند۔ اور فوائد الشائقین قابل ذکر ہیں۔ علمی ادبی رسائل کا ذکر آگے آئیگا۔

کوہِ نور: ۱۴ جنوری ۱۸۵۰ء کو لاہور سے جاری ہوا پہلے ہفتہ وار تھا۔ پھر ہفتے میں دو بار اور اس کے بعد ہفتے میں تین بار ہو گیا۔ ۱۸۶۶ء میں اس کے ایڈیٹر ۱۸۵۶ء میں غالباً باغیانہ حیثیت عرفی کے مقدمہ میں تین سال کے لیے جیل گئے مگر اس دوران اخبار برابر جاری رہا۔ اس اخبار سے ۵۵ برس جاری رہا۔ پنجاب کے بہت سے نامور صحافی وابستہ رہے۔ منشی ہرسکھ رائے کے بعد ان کے بیٹے منشی جگت نرائن اور ان کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ اسے چلاتی رہیں۔ اس کے بعد دریائے نور۔ باغِ نور۔ ریاض نور اور نورٌ علیٰ نور نام کے پرچے نکلے۔ اس کا سائز ۱۸×۱۱ انچ تھا پہلے چھ صفحے تھے پھر سولہ ہوگئے تھے۔

دریائے نور: کوہ نور کے چند ماہ بعد سراج الدین صاحب کی سرپرستی اور شہاب الدین صاحب کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا اس کے ایک مدیر منشی مہدی حسن نے اختلاف رائے کی بنا پر مستعفی ہو کر ملتان سے ریاض نور نکالا تھا۔

چشمہ فیض: لاہور کے بعد اخبارات کا دوسرا مرکز صحافت سیالکوٹ تھا وہاں سے چشمہ فیض نکل رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں ۱۰ مئی سے ۱۲ جون تک تو اخبار مقامی طور پر سنسر ہو کر نکلتا رہا۔ مگر پھر بند کر دیا گیا اور اس کے مالک منشی دیوان چند کو مجبع لاہور منتقل کرنے کا حکم ملا جہاں آ کر انہوں نے چشمہ خورشید جاری کیا مگر یہ بھی سنسر ہوتا رہا۔ دسمبر میں منشی دیوان چند کو سیالکوٹ واپس جانے کی اجازت ملی وہاں پہنچ کر انہوں نے چشمہ فیض پھر جاری کیا جو بعد کو وکٹوریہ پیپر میں مدغم ہو گیا

انہوں نے ہفت روزہ خورشید عالم، ہمائے بے بہا، لوح قلی نور اردو کنڈر یہ پیپر بھی نکالا۔ آخر الذکر ۱۹۲۵ء تک جاری رہا۔ چشم فیض اور کوہ نور میں بڑی چشمک رہی جسے سفیر آگرہ کے ایڈیٹر نول کشور نے ختم کر دیا۔

معلم العلماء:۔ سیالکوٹ سے اس نام سے ایک ماہنامہ رسالہ بھی جاری ہوا تھا۔

ریاض نور:۔ یہ اخبار دریائے نور سے مستعفی ہو کر اس کے مدیر منشی مہر حسن نے نکالا تھا۔ اس کے ڈیڑھ سال بعد وہاں سے ایک دوسرا اخبار شعاع الشمس نکلا اس کے مدیر فقیر غلام نصیر الدین تھے دونوں میں کافی عرصہ نوک جھونک رہی۔ بعد کو آخر الذکر اخبار بند ہو گیا۔

پنجاب سے جاری ہونے والے اخبارات میں ۱۸۵۰ء میں گوجرانوالہ سے گلزار پنجاب نکلا۔ اس کے ایڈیٹر منشی کنڈا مل تھے۔ ۱۸۵۱ء میں گجرات سے مطلع الانوار نکلا۔ ۱۸۵۵ء میں پشاور سے خوش بہار اور دو سال بعد راولپنڈی سے سہیل پنجاب اور ۱۸۵۶ء میں عمدۃ روزگار جاری ہوا۔ لدھیانہ سے نور علی نور، بٹالہ سے نیر اعظم، امرتسر سے باغ نور، پشاور سے اخبار طبابت، لاہور سے بحر حکمت اور معلم ہند نکلا۔

صدر الاخبار:۔ ۱۸۶۶ء میں دلی کالج کے زیر اہتمام جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر سے کچھ قابل اعتراض مواد شائع ہوا جس پر اسے الگ کر دیا گیا اور بعد کو اخبار کا نام بھی بدل کر اخبار الحقائق کر دیا گیا۔ یہ اخبار سہ روزہ تھا۔ اس میں بھی ایک قابل اعتراض مضمون شائع ہوا جس پر اس کے ایک معاصر جام جمشید نے کڑی نکتہ چینی کی۔

اسعد الاخبار:۔ قمر الدین صاحب نے آگرہ سے ۱۸۴۷ء میں جاری کیا تھا۔ یہ ہفتہ وار تھا قیمت آٹھ آنے تھی۔ اس میں مسلسل سیرت رسول صلعم چھپتی تھی۔

مطلع الاخبار:۔ یہ آگرہ سے نکلتا تھا۔ شیخ خادم علی اس کے مہتمم تھے۔

قطب الاخبار اور اخبار النواح:۔ یہ دونوں اخبار ۱۸۴۹ء میں جاری ہوئے تھے۔ اول الذکر اسلامی اخبار تھا اور اس میں مذہبی مضامین چھپتے تھے۔ اخبار النواح ہندوؤں کے ذوق کے مضامین چھاپتا تھا۔ پہلا ۲۴ سال جاری رہا دوسرا ۳۴ سال۔

نور الابصار و بدھی پرکاش:۔ یہ دونوں اخبار آگرہ سے سرکار کی سرپرستی میں ایک ساتھ جاری ہوئے تھے۔ پہلا اردو کا تھا اور ۳۴۴ چھپتا تھا دوسرا ہندی کا تھا اور ۲۱۷ چھپتا تھا۔

سفیر آگرہ:۔ یہ اخبار اردو کے نامور محسن منشی نول کشور نے ۱۸۵۶ء میں آگرہ سے جاری کیا تھا۔ اس نے بڑی شہرت پائی۔

متفرق اخبارات:۔ آگرہ سے شائع ہونے والے دوسرے اخبارات میں اخبار حسینی، مطلع العلوم، مشرت الاخبار اور جواہر لال کا نزہت الارواح، پنڈت کیسری پرشاد کا گورنمنٹ گزٹ اور شیو نارائن کا مفید الخلائق بھی تھے۔

لکھنؤ اخبار:۔ یہ اخبار غالباً لکھنؤ کا پہلا اخبار ہے۔ اور ۱۸۴۷ء میں جاری ہوا تھا۔

طلسم سامری:۔ یہ اخبار ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا تھا۔ اس کا ایک پرچہ دلی کے محکمہ آثار قدیمہ میں محفوظ ہے انداز تحریر مقفیٰ تھا۔

سحر سامری:۔ یہ لکھنؤ کا ایک دوسرا اخبار ہے۔ یہ نومبر ۱۸۵۶ء میں جاری ہوا تھا۔ یہ بھی مقفیٰ عبارت لکھتا تھا۔

اعظم الاخبار:۔ یہ مدراس سے شائع ہونے والا اردو کا پہلا اخبار تھا جو ۱۸۴۸ء میں جاری ہوا تھا۔

آفتاب عالمتاب:۔ یہ اخبار ۱۸۴۹ء میں مدراس ہی سے جاری ہوا تھا۔

تیسیر الاخبار:۔ اس کے ایڈیٹر حکیم عبد الباسط تھے۔ یہ بہت سستا اخبار تھا ایک پرچہ کی قیمت ۵ پیسے تھی مگر پھر بھی جلدی بند ہو گیا۔

اخبار نظم لکھنؤ، دکن گزٹ
حیدرآباد اور کوہ نور لاہور کے سرورق (۳)

مظہر الاخبار:۔ یہ اخبار مدراس سے ۱۸۵۶ء میں محمد خواجہ بادشاہ عبرت نے جاری کیا تھا۔ پہلے دس روزہ تھا پھر پندرہ روزہ ہو گیا۔

طلسم حیرت:۔ (مدراس پنچ) یہ اخبار ۱۸۵۵ء میں جاری ہوا تھا۔ اسکے ایڈیٹر غلام محی الدین حنیف تھے۔ یہ بھی دس روزہ تھا۔

جامع الاخبار:۔ یہ اخبار بھی مدراس کا ہے اسکے ایڈیٹر تھے سید رحمت اللہ۔

سدھاکر اخبار:۔ ۱۸۵۰ء میں بنارس سے نکلا تھا۔ پہلے اردو ہندی میں تھا پھر ۱۸۵۳ء میں صرف ہندی میں نکلنے لگا اور ہندی بھی سنسکرت آمیز ہوتی تھی۔

گوالیار اخبار:۔ ۱۸۵۳ء میں یہ اخبار خیراتی لال نے شروع کیا تھا۔ بعد میں اس کے ایڈیٹر لکشمی پرشاد ہوئے۔

بنارس اخبار:۔ یہ اخبار بھی اردو ہندی میں نکلا تھا اور ۱۸۴۵ء میں شروع ہوا تھا۔ مراٹھی جرنلسٹ گرو ندر گھوناتھ اس کے ایڈیٹر تھے۔

عمدۃ الاخبار:۔ یہ اخبار ۱۸۴۶ء میں بریلی سے شائع ہوا تھا اور اسکے ایڈیٹر لچھمن پرشاد تھے۔

مالوہ اخبار:۔ یہ ۱۸۴۹ء میں اندور سے نکلتا تھا۔ اسکے ایڈیٹر مسٹر دھرم نرائن تھے۔ یہ اخبار بھی اردو ہندی میں شائع ہوتا تھا۔

ضیاء الاخبار:۔ جولائی ۱۸۴۹ء میں دلی سے جاری ہوا تھا۔ اس کے مہتمم وایڈیٹر شیخ محمد ضیاء الدین تھے۔

مرزائی:۔ یہ اخبار چھتہ موم گران دلی سے ۱۸۵۰ء میں حافظ منیر خاں صاحب نے جاری کیا تھا۔

گلزار پنجاب:۔ منشی کنڈا مل نے یہ ہفتے وار اخبار ۱۸۵۰ء میں گوجرانوالہ سے جاری کیا تھا۔

فیضی:۔ جنوری ۱۸۵۱ء میں کپتان (مالک) مقبول الدولہ بہادر نے لکھنؤ سے جاری کیا تھا۔

محمدی:۔ یہ ۱۸۵۲ء میں منیر خاں (مالک) نے دلی سے جاری کیا تھا۔

باغ و بہار:۔ یہ اخبار ۱۸۵۱ء میں بنارس سے مہاراجہ بنارس کی سرپرستی میں شروع ہوا تھا۔

خفی:۔ کوراتمان نزد چاندنی چوک دلی۔ بخش (مالک) نے ۱۸۵۷ء میں جاری کیا تھا۔

نزائرین ہند:۔ یہ پندرہ روزہ رسالہ آگرہ سے جاری ہوا تھا۔

ذوالفقار حیدری:۔ حاجی حسن علی (مالک) نے یہ اخبار لکھنؤ سے جاری کیا تھا۔

نفع الاخبار:۔ یہ ہفتہ وار اخبار عثمان خاں (مالک) نے ۲ اکتوبر کو قصبہ کول ضلع علیگڑھ سے جاری کیا تھا۔

نیر اعظم:۔ مفتی محمد بخش کے اہتمام میں ۲۲ دسمبر ۱۸۵۰ء کو سیالکوٹ سے جاری ہوا تھا۔

علمی ادبی جرائد

خیر خواہ ہند:۔ یہ رسالہ ۱۸۳۷ء میں مرزا پور سے پادری آر۔ سی ماتھر نے نکالا تھا۔ فارسی اور رومن خط تھا مگر اردو زبان میں مضامین چھاپے جاتے تھے۔ ۱۸۶۱ء میں اخبار ہوا تو فارسی اور دیوناگری رسم خط میں مضامین چھپنے لگے۔

قران السعدین:۔ ۱۸۴۵ء میں دلی کالج کے پرنسپل مسٹر شپرانگر نے یہ ہفت روزہ جاری کیا۔ اسکے مدیر دلی کالج کے شعبہ انگریزی کے سینیر اسکالر پنڈت دھرم نارائن تھے۔ یہ اپنی قسم کا پہلا اردو رسالہ تھا۔ اس میں سائنس، ادب اور سیاست میں بحثیں ہوتی تھی۔

فوائد الناظرین و محب ہند:۔ دونوں کے مدیر ماسٹر رام چندر تھے۔ پہلا پرچہ ۱۸۴۵ء میں اور دوسرا ۱۸۴۷ء میں جاری ہوا تھا۔ محب ہند کا پہلا نام خیر خواہ ہند تھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ اس نام سے پہلے سے ایک پرچہ نکل رہا ہے۔ تو انہوں نے دوسرے شمارے سے اس کا نام محب ہند کر دیا۔

ہما شے بے بہا:۔ ۱۸۵۳ء میں منشی دیوان چند نے جاری کیا۔ اس میں سائنسی اور تعلیمی مضامین ہوتے تھے۔

معلم ہند:۔ یہ ماہنامہ محمد احسن کاکوروی کی ادارت میں یکم جولائی ۱۸۵۶ء کو لاہور سے جاری ہوا تھا۔ ۳۲ صفحات ہوتے تھے۔ یہ تعلیمی رسالہ تھا۔

خورشید پنجاب:۔ یہ رسالہ جنوری ۱۸۵۶ء میں شروع ہوا تھا اور اس زمانہ میں اپنے تمام ہمعصر رسالوں میں سب سے بلند معیار رسالہ تھا۔ اس میں اخلاقی، علمی تاریخی اور جغرافیائی مضامین شائع ہوتے تھے۔ سائنسی مقالات اس کا طرہ امتیاز تھے۔ اس کا سائز ۲۹×۲۲/۸ اور ضخامت ۴۰ صفحات تھی۔

گلدستہ:۔ یہ کسی رسالے کا نام نہیں بلکہ ان اردو رسائل کو گلدستہ پکارتے تھے جو شعر و شاعری سے متعلق خاص طور پر مشاعروں کی روداد چھپتے تھے۔ پہلا گلدستہ گل رعنا ۱۸۴۵ء میں مولوی کریم الدین نے دلی سے نکالا تھا۔

معیار الشعراء:۔ ۱۸۴۸ء میں شیونارائن آرام (مالک و مدیر) نے آگرہ سے شروع کیا تھا۔ بعض شواہد سے اندازہ ہوتا ہے بعد میں منشی قمرالدین قمر اور گلاب خاں کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا۔ ۱۸۴۹ء میں ایک گلدستہ بنارس سے "گل نار ہمیشہ بہار" کے نام سے جاری ہوا۔

فوائد الشائقین:۔ یہ اخبار قانونی مضامین، عدالتوں کے فیصلے، دیوانی و فوجداری کے قواعد و ضوابط، فیصلے اور خبریں چھاپتا تھا۔ قوانین سے متعلق سوالات کے جواب دیتا تھا یہ ہفت روزہ تھا اور نومبر ۱۸۴۶ء میں جاری ہوا تھا۔

معدن القوانین:۔ ۱۸۵۱ء میں یہ ماہنامہ آگرہ سے جاری ہوا تھا۔ اس میں بھی مقدمات کے فیصلے اور قانونی مشورے دیئے جاتے تھے۔

طبی رسائل:۔ دو طبی رسالوں، اخبار طبابت (پشاور) اور بحر حکمت (لاہور) کا ذکر گارساں دتاسی کی کتاب میں ملتا ہے۔ ان میں طب اور جراحی وغیرہ پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اول الذکر میں ہندو ویدوں اور مسلمان طبیبوں کے مضامین ہوتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کی صحافت

اردو اخبار:۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد صحافت کا ایک

نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۵۸ء میں اردو کا نامور اخبار "اودھ پنچ" جاری ہوا۔ اسے اردو کے نامور محسن منشی نول کشور نے شروع کیا تھا۔ سرسید نے اپنے اخبار "تہذیب الاخلاق" میں اودھ اخبار کے ہفتے میں دو بار شائع ہونے پر تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا، "منشی نول کشور رحمہ اللہ تعالیٰ کی عالی ہمتی سے یہ امید ہے کہ ان کا اخبار مثل بڑے بڑے باوقعت انگریزی اخبارات کے روزانہ جاری ہوا کرے گا اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔" چنانچہ ۱۸۷۷ء میں وہ روزانہ ہوگیا۔ بظاہر ایسا نظر آتا تھا کہ یہ مسلمانوں کا اخبار ہے اس کا کوئی خاص سیاسی مسلک نہیں تھا مگر غیر فرقہ وارانہ ضرور تھا۔ اس اخبار کے ادارۂ تحریر سے مولوی غلام محمد خاں تپش، تلمیذ غالب پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی احمد حسین شوکت، مولانا عبدالحلیم شرر، سید امجد علی اشہری، مرزا حیرت دہلوی اور مولانا جالب دہلوی وابستہ رہے۔ اودھ اخبار ہر اعتبار سے ایک اعلیٰ پایہ کا اخبار تھا۔ اس اخبار نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس نے یہ کوشش بھی کی کہ مسلمانوں کی طرف سے برطانوی حکومت کی بدگمانیاں دور کی جائیں۔ اس نے مقالات لکھ کر مسلمانوں کی وفاداری ثابت کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ یہ غلط ہے کہ مسلمانانِ ہند فساد کریں گے۔ اودھ اخبار کو اس دور کا سب سے معیاری اخبار شمار کیا جاتا ہے اور اس سے بہت سے اخباروں اور اخبار نویسوں اور مدیران جرائد نے فیضان حاصل کیا ہے۔ اودھ اخبار عملاً ہندوستانیوں اور انگریزوں کے تعلقات بہتر بنانے کا حامی اور برطانیہ نواز تھا۔ اس کا کوئی خاص سیاسی عقیدہ نہ تھا۔ اصلاح معاشرہ کا علمبردار تھا۔ مغربی علوم اور مغرب کی اچھی باتیں اختیار کرنے کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ مشرقیت کا بھی حامی و دلدادہ تھا۔ یہ اخبار اس صدی کے نصف تک زندہ رہا۔

اخبار سائنٹفک سوسائٹی: ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو سرسید نے یہ اخبار یا علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا جو سرسید کی وفات کے بعد بھی باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ شروع میں ہفت روزہ تھا پھر سہ روزہ ہوگیا۔ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا۔ بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے۔ اس لئے اس سے انگریز اور ہندوستانی دونوں فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ سرسید اس میں سیاسی مسائل پر ایسے شذرات لکھتے جن سے انگریز ہندوستانیوں کے مسائل اور خواہشات و نظریات سے آگاہ ہوں۔ دوسرے ہندوستانیوں میں سیاسی ذوق پیدا ہو اور وہ انگریزی طرز حکومت سے آگاہ ہوں۔ مولانا حالی لکھتے ہیں اس میں سوشل اخلاقی علمی اور پولیٹیکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے۔ جو ماٹو اس اخبار نے اپنے لئے اختیار کیا تھا اس کو ہمیشہ اپنا نصب العین رکھا۔ وہ ہمیشہ رعیت کو آزادی اور اطاعت سکھاتا تھا اور ان کی خیرخواہی اور وفاداری کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر کرتا تھا۔ (حالی کے ان الفاظ کا ہوبہو اطلاق اودھ اخبار پر بھی ہوتا تھا اس نے مسلمانوں کی، جن سے انگریزی حکومت بہت برہم تھی اور اپنے لئے خطرہ سمجھتی تھی، کئی بار اپنے مقالات سے صفائی پیش کی ہے)

تہذیب الاخلاق: سرسید ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے تھے اور ۱۸۷۰ء میں واپس آئے۔ انہوں نے اس کے اجرا کا ارادہ بقول مولانا حالی وہیں کر لیا تھا کیونکہ تہذیب الاخلاق کی پیشانی وہ وہیں سے بنوا کر لائے تھے۔ بلکہ بقول حالی وہ اس کا تصور بھی رچرڈ سٹیل اور جوزف ایڈیسن کے ادبی اور علمی اخبارات دی ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر سے لائے تھے جنہوں نے انگریزوں کے عادات و رسوم و معاشرت اور قومی خیالات بدلنے میں اہم پارٹ ادا کیا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا تھا۔ اس کے دو نام تھے اردو میں "تہذیب الاخلاق" اور انگریزی میں "دی محمڈن سوشل ریفارمر" پورا اردو میں ہوتا تھا۔ سائز ۲۰×۲۶ ۸ تھا۔ آٹھ یا بارہ صفحات ہوتے تھے۔ اس میں اور سائنٹفک سوسائٹی میں فرق یہ تھا کہ جہاں تہذیب الاخلاق میں خبریں نہیں چھپتی تھیں بلکہ ایسے مضامین

چھپتے تھے جن کا منشا مسلمانوں کا انداز فکر بدلنا تھا۔ وہاں اخبار سائینٹفک سوسائٹی ایک اخبار تھا رسالہ نہیں تھا۔

اودھ پنچ:۔ اودھ پنچ اگرچہ پہلا مزاحیہ اخبار تو نہ تھا مگر وہ اپنے معیار سے ہندوستان میں پنچ اخبارات کا نقیب بن گیا جس طرح دوسرے اخبارات و رسائل نے ابتدا میں انگریزی صحافت سے اثر لیا اور ان کو مثال بنایا اسی طرح سے پنچ لندن کو دیکھ کر ہندوستانی صحافت میں اودھ پنچ نے مزاح نگاری کی راہ اختیار کی اور اسکے بعد تو پنچ اخبارات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور انیسویں صدی کے ربع آخر میں پنچ اخبارات کا وہ غلغلہ ہوا کہ ہر طرف انہی کا طوطی بولنے لگا۔ سنجیدہ صحافت نے پنچ اخباروں کو جعفر زٹلی قرار دیا۔ انکے خلاف بہت لے دے کی لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا اس لئے تیس پینتیس سال تک میدان مزاحیہ صحافت کے ہاتھ رہا۔ اودھ پنچ کو نہ صرف لندن پنچ کی ہمسری بلکہ اس پر برتری کا بھی دعویٰ تھا۔

اودھ پنچ سے پہلے جنوری ۱۸۷۷ء میں رام پور سے مذاق اور ۱۸۷۷ء میں مدراس سے مدراس پنچ جاری ہوا۔ جنوری ۱۸۷۷ء میں بمبئی سے فرحت الاحباب، مراد آباد سے روہیلکھنڈ پنچ نیز سے پہلو پنچ نکلا۔ اسکے بعد جنوری ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ منظر عام پر آیا۔ اور ۱۹۱۲ء تک جاری رہا۔ منشی سجاد حسین اسکے مدیر تھے وہ کانگریس کے ممبر تھے اور آخری دم تک رہے۔ ہندو مسلم اتحاد اور انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت ان کی پالیسی کا بنیادی نکتہ تھا۔ کانگریس کی حمایت میں اس اخبار نے سرسید کی بھی زبردست مخالفت کی۔ اس کا سائز ۱۲x۹½ تھا اور ضخامت آٹھ صفحات تھی۔ اودھ پنچ کا نام اس طرح سے لکھا جاتا تھا کہ اس کا ہر لفظ ایک کارٹون تھا۔ انگریزی موٹو (LIFE IS PLEASURE) یعنی "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" درج ہوتا تھا۔ اسکے ادارہ تحریر سے بھی اور قلمی تعاون کرنے والوں میں بھی پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد اکبر الہ آبادی، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی جوالا پرشاد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اخبار انجمن پنجاب:۔ ۱۸۶۵ء میں پنجاب کے ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں نے ملکر انجمن اشاعت مطالب مفید پنجاب" کی بنیاد رکھی۔ اسی انجمن کے تحت پنجاب یونیورسٹی کالج اور پھر یونیورسٹی بنی اس میں پنجاب کی نامور شخصیتیں شامل تھیں۔ ۱۸۶۵ء میں اسکے مقاصد کے فروغ دینے کو انجمن اشاعت مطالب مفید پنجاب نکلا۔ یہ انجمن علوم شرقیہ کی یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی تھی مگر جب یونیورسٹی بنی تو وہ دوسری طرح کی تھی۔ انجمن عام طور سے لوگوں میں "انجمن پنجاب" کے نام سے مشہور تھی۔ ۱۸۶۷ء میں رسالہ بند ہو گیا اور افسر شہنشاہی کے بموجب "اخبار انجمن پنجاب" نکلا۔ اسے نہ صرف بڑے بڑے انگریز افسروں بلکہ حکومت کی بھی تائید و حمایت حاصل تھی۔ اس وقت منشی پیارے لال آشوب اور انکے نائب مولانا محمد حسین آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والا "سرکاری اخبار" بند ہو گیا تھا۔ اس کے بند ہونے پر حکومت نے "اتالیق پنجاب" نکالا۔ یکم اپریل ۱۸۷۷ء کو انجمن نے پنڈت مکند رام کی ادارت میں "ہمارے پنجاب" جاری کیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام گارساں دتاسی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ ہمارے پنجاب پہلا تھا۔ اس کی جگہ اخبار انجمن پنجاب نے لی تھی۔ اسکے اجرار کا بنیادی مقصد یہ بتایا گیا ہے "ہمارے ہم وطن خیالات انگریزی اور منشائے سرکار اور سرگزشت زمانہ سے واقف ہوں"۔ یہ اخبار سولہ صفحات اور ۲۲x۱۸ سائز پر نکلا تھا۔

اخبار انجمن پنجاب کے ہمعصر:۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے اس وقت کوہ نور، رہبر ہند، آفتاب پنجاب، پنجاب پنچ، وکیل ہندوستان امرتسر، نصرت الاخبار دہلی، لارنس گزٹ میرٹھ، پرنس آف ویلز گزٹ، اخبار عالم، سہیل ہند، اودھ پنچ، شیر قیصر، اردو گائیڈ کلکتہ، علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، کشف الاخبار بمبئی، سفیر مدراس، افضل الاخبار، ہوشیار پور سے نرائن داس کا اتالیق زمینداران ماہانہ رسالہ اور

لاہور سے رسالہ "آریہ سماچار گپنت رائے میگزین" نکلتا تھا۔ پنڈت شیونرائن اگنی ہوتری نے لاہور سے ہندو باندھو یعنی برادر ہندو ماہانہ رسالہ نکالا تھا۔ حافظ محمد اکبر نے مظفر نگر سے افضل الاخبار، اصغر حسین نے پہلے بھوپال سے پھر فرخ آباد سے عمدۃ الاخبار نکالا۔ مولوی غلام محمد تپش ۔ سابق مدیر اودھ اخبار نے بنارس سے مشیر قیصر نکالا۔ ستمبر ۱۸۸۸ء میں رامپور سے تاج الاخبار اور امرتسر سے رسالہ۔ مرآۃ المطابت نکلا اور خواجہ بدرالدین خان عرف خواجہ امان نے اپنا اردو اخبار بند کردیا۔ اسی دوران رومن رسم خط کا بھی چرچا ہوا۔ چنانچہ پنجابی اخبار کا ایک ضمیمہ رومن میں نکلا اور مولوی فتح الدین بسمل مالک اخبار پنجاب تیغ نے ایک ہفت روزہ "رومن اخبار" کے نام سے نکالا۔ یہ آٹھ صفحات کا تھا، ہر صفحے پر دو کالم تھے۔ ایک میں اردو اور دوسرے میں رومن خط میں وہی عبارت ہوتی تھی۔

۱۹ ویں صدی کے نامور اخبارات

ذیل میں چند ایسے اخبارات کا تذکرہ ہے جن کا ان کے دور میں بڑا شہرہ تھا اور جن کو اردو صحافت میں ایک خاص مقام دیا جاتا ہے:۔

مہذب لکھنؤ:۔ یہ ہفت روزہ مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھنؤ سے یکم اگست ۱۸۹۰ء کو جاری کیا تھا جو مواد، خیالات، طباعت اور کتابت کے لحاظ سے ایک اعلیٰ پائے کا اخبار تھا۔ اس کا غالب حصہ اداریوں اور مضامین پر مشتمل ہوتا تھا۔ مولانا شرر سرسید کی تحریک کے حامی تو نہیں مگر مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھنے اور حکومت کے دم بھرنے کے حامی ضرور تھے علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی، دینی ہر قسم کے مضامین ہوتے تھے۔ ۱۸×۲۲/۴ پر سولہ صفحات کا پرچہ تھا۔

ہندوستانی لکھنؤ:۔ ۱۸۸۵ء میں ہفت روزہ کے طور پر لکھنؤ سے جاری ہوا تھا پھر ہفتہ میں دوبار اور اس کے بعد

مرحوم مولوی سیف الحق ادیب دہلوی

تین بار شائع ہونے لگا۔ ہندوستانی کو یو۔پی میں کانگریس کا چراغ سمجھا جاتا تھا۔ جب ۱۸۸۸ء میں سر آکلینڈ کالون سرسید احمد خاں اور راجہ شیو پرشاد نے کانگریس کے خلاف مہم کا آغاز کیا تو لکھنؤ میں کانگریس کی تائید میں اودھ پنچ اور ہندوستانی نے کانگریس کی پرزور تائید کی۔

قیصر الاخبار:۔ جنوری ۱۸۸۰ء میں منشی سراج الدین احمد خاں نے یہ ہفت روزہ الہ آباد سے جاری کیا تھا۔ ۱۱ر نومبر ۱۸۸۰ء کو اس کو روزنامہ کردیا گیا مگر یہ صرف چند ماہ ہی جاری رہا۔ جب اینگلو انڈین اخبارات نے ۱۸۸۱ء میں اردو صحافت کے خلاف ایک اسکیم شروع کی اور الزام لگایا کہ یہ فساد اور بغاوت کی ترغیب دیتے ہیں تو اس اخبار نے اس کے ڈیفنس میں پرزور اداریئے لکھے۔ اس میں انگریزی اخبارات کے علاوہ عربی، فارسی اور ترکی زبان کے اخباروں سے ترجمے بھی ہوتے تھے۔

احسن الاخبار:۔ یہ اخبار ۶ر جنوری ۱۸۸۱ء کو حاجی محمد کبیر الحق نے الہ آباد سے جاری کیا تھا۔ ہفت روزہ تھا۔ تبصرے سے حتی الوسع پرہیز کرتا تھا۔ خبریں خصوصاً عالم اسلام کی زیادہ چھاپتا تھا۔ کتابت اور طباعت بہتر تھی۔

اکمل الاخبار:۔ زبان کے اعتبار سے اودھ اخبار اور اکمل الاخبار اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے اس کے مالک

حکیم محمود خاں اور ایڈیٹر منشی بہاری لال مشتاق تھے۔ یہ اخبار اپنے وقت کے بہت ثقہ اخباروں میں تھا۔

پنجابی اخبار:- منشی محمد عظیم نے ۱۸۴۹ء میں لاہور کو نیکل اور ۱۸۶۰ء میں پنجابی اخبار جاری کیا۔ ۱۸۶۵ء میں یہ دوبارہ جاری ہوا اور ۱۸۸۰ء تک جاری رہا۔ ۱۲×۱۰ کے دس صفحات ہوتے تھے اس کی پالیسی مذہب اور ذاتیات سے بالا تھی۔

رفیق ہند لاہور:- ۵ جنوری ۱۸۸۴ء کو جاری ہوا۔ مولوی محرم علی چشتی مالک و مدیر تھے۔ ۱۸۸۸ء تک سرسید کا حامی رہا لیکن جب ان سے مذہبی اختلاف ہوا تو پنجاب میں وہ سرسید کے مخالفوں کا سب سے بڑا اڈہ بن گیا۔ ۱۹۰۸ء میں بند ہو گیا۔

آفتاب پنجاب:- دیوان بوٹا سنگھ نے یکم جولائی ۱۸۷۲ء کو لاہور سے جاری کیا تھا۔ اسکے مدیر ابتداء میں مولوی حسن بخش تھے۔ اور اس کی پالیسی روادارانہ تھی لیکن پھر یہ فرقہ پرست بن گیا۔

کشف الاخبار بمبئی:- یہ پرچہ غالباً ۱۸۵۸ء میں نکلا منشی امان علی لکھنوی اس کے مدیر تھے۔ اس کی دلچسپ بات یہ ہے کہ صفحہ اول پر اخبار کی شان میں ایک ۲۴ اشعار کا قصیدہ چھاپا جاتا تھا۔

شمس الاخبار:- یہ اخبار ۱۸۵۹ء میں مدراس سے جاری ہوا تھا اس کے بعد نصف صدی جاری رہا۔ پہلے ایڈیٹر سید عبدالستار سین تھے۔ اس نے جنگ روم روس میں ترکی کی بڑی حمایت کی۔ اور اسکی اپیل پر ترکی کو ہزاروں روپیہ چندہ گیا جس پر سلطان عبدالحمید ثانی نے اسے تمغہ مجیدیہ مرحمت کیا تھا اور یہ اسے فخر سے اپنی پیشانی پر چھاپا تھا۔

جریدہ روزگار:- مدراس سے ۱۸۷۳ء میں جاری ہوا۔ یہ بھی ترکوں کا زبردست حامی تھا اسکی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اس سے اقتباسات ہندوستان بھر کے اردو اخباروں میں چھپتے تھے۔

قاسم الاخبار بنگلور:- بنگلور کے مشہور شاعر منشی محمد قاسم نجم نے ۱۸۶۵ء میں جاری کیا تھا۔ طباعت و مضامین کے لحاظ سے بے نظیر تھا۔

میسور اخبار:- ۱۸۶۶ء میں بنگلور سے جاری ہوا، اور قاسم الاخبار سے قیمت کم ہونے کی وجہ سے یہ بہت مقبول تھا۔ بنگلور کے یہ دونوں اخبار اشتہار نہیں چھاپتے تھے۔

منشور محمدی بنگلور:- یہ اخبار ۱۸۷۲ء میں محمد شریف نے جاری کیا اور اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ شمالی ہند کے عیسائیوں کے اخبار نور افشان اور کوکب ہند میں اسلام کے خلاف جو مضامین ہوتے تھے ان کا جواب دیا جائے۔

شوکت اسلام:- پہلے یہ اخبار بمبئی سے نکلتا تھا پھر حیدرآباد منتقل ہو گیا تھا۔

اردو روزنامے

اردو کا پہلا روزنامہ مولوی کبیر الدین احمد خاں بہادر نے کلکتہ سے "اردو گائیڈ" کے نام سے جاری کیا تھا۔ ۱۸۷۵ء میں اودھ اخبار روزنامہ بن گیا اور اس طرح یہ اردو کا دوسرا روزنامہ ہوا، تیسرا روزنامہ یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو لاہور سے "روزنامہ پنجاب" جاری ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں اس دور کے اردو کے نامور شاعر، انشا پرداز اور ادیب مولوی سیف الحق کی ادارت میں یکے بعد دیگرے منشی مہر بخش نے تین اردو اخبار ہفت روزہ شفیق ہند اور دو روزنامے 'شام وصال' اور 'نسیم صبح' جاری کئے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک شام کا اخبار تھا دوسرا صبح کا۔

آئینہ نمائش:- مولوی غلام ہمدانی نے ۵ دسمبر ۱۸۸۲ء کو کلکتہ سے جاری کیا تھا۔

پیک صبا:- ۱۱ اپریل ۱۸۸۳ء کو عمر محمد ناخدا نے سید عبدالرحیم کی ادارت میں کلکتہ سے ہی شروع کیا تھا۔

روزنامچہ ملک:- کلکتہ سے علی اصغر ایم۔اے نے یکم مئی ۱۸۸۰ء کو یہ روزنامہ جاری کیا۔

روزنامچہ لکھنؤ:- خدا بخش خاں بنارسی نے لکھنؤ سے یکم جنوری ۱۸۸۱ء کو جاری کیا۔ منشی سید عبدالبصیر بلگرامی مدیر تھے۔

روزانہ:- منشی حاجی تیغ بہادر نے ۱۱ رجون ۱۸۸۱ء کو ہفتہ روزہ کو روزنامہ کیا۔ منشی محمد علی خاں فرتحتی مدیر تھے۔ ہفت روزہ کی صورت میں اس کا نام انوار الاخبار تھا۔

قیصر الاخبار ہند:- سراج الدین احمد خاں نے الٰہ آباد کے قیصر الاخبار ہند کا یکم نومبر ۱۸۸۱ء سے روزانہ ایڈیشن جاری کیا۔

روزنامچہ عالم:- مولوی شیخ ریاض الدین احمد نے یکم اکتوبر ۱۸۸۱ء کو یہ روزانہ اخبار نکالا، ایک پرچہ کی قیمت ایک پیسہ تھی۔

پیک آصفی:- حیدرآباد دکن سے مولوی سعید احمد بلگرامی نے پہلا روزنامہ جنوری ۱۸۸۲ء میں اس نام سے شروع کیا ان کا ایک ہفت روزہ 'ہزار داستان' تھا۔

سفیر دکن:- ۱۸۸۲ء میں سید احمد علی اشہرتی کی ادارت میں شروع ہوا۔

مشیر دکن:- ۱۸۸۲ء میں پنڈت کشن راؤ نے 'دکن پنچ' شروع کیا تھا۔ پانچ سال بعد اسے مشیر دکن کا نام دے کر روزنامہ کر دیا۔

اتحاد مدراس:- ۱۸۸۶ء میں سہ روزہ تھا۔ ۱۸۸۸ء میں یہ روزنامہ کر دیا گیا۔ اس کے بانی انجمن اسلامیہ کے صدر میر ہمایوں جاہ بہادر تھے۔ ان کے لڑکے بعد میں نواب سید محمد بہادر کانگریس کے صدر بھی بنے تھے۔

حدیقہ روزگار رنگون:- ۹ر جنوری ۱۸۸۹ء کو رنگون سے جاری ہوا تھا۔ یہ دو ورق کا ہوتا تھا۔

خادم ہند بمبئی:- منشی کشن سروپ نے ۱۷ر مارچ ۱۸۸۹ء کو لکھنؤ سے جاری کیا تھا۔

انیس بہار پٹنہ:- اردو کا چوتھا روزنامہ تھا۔ جو ۱۸۷۶ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے مالک سید اصغر علی تھے۔

اخبار عام:- یکم جنوری ۱۸۷۱ء کو پنڈت مکند رام نے جاری کیا۔ وہ پہلے کوہ نور میں کتابت کرتے تھے اور غالباً کسی کاتب سے ایڈیٹر بننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ پہلے یہ ہفتہ وار تھا اس کے بعد تین بار نکلنے لگا تھا اور آخر میں روزنامہ ہو گیا تھا۔ سالانہ چندہ ڈھائی روپے تھا۔ اس کے مدیر پنڈت گوپی ناتھ تھے۔ اس میں صفحہ اول پر 'اخبار کی بہار' کے عنوان سے ایک سطر میں خبر اور ایک سطر میں طنزیہ تبصرہ ہوتا تھا اور اشتہار کی شرائط میں یہ لکھا تھا کہ اچھا مال ہو تو بجائے اشتہار کی اجرت کے بدلے مال لے لیا جائے گا۔

پیسہ اخبار:- منشی محبوب عالم نے اخبار عام کے سترہ سال بعد ۱۸۸۸ء میں فیروز والہ سے یہ اخبار جاری کیا۔ اس سے پہلے جنوری ۱۸۸۷ء میں ایک ماہانہ رسالہ زمیندار پھر جنوری ۱۸۸۸ء میں فیروز والہ سے ہفت روزہ بہت جاری کر چکے تھے۔ سرسید کے بعد وہ اردو کے دوسرے اخبار نویس تھے جنہوں نے انگلستان کا سفر کیا۔ واپس آکر "ٹٹس بٹس" کی طرح کا ایک پرچہ 'انتخاب لاجواب' کے نام سے شائع کیا۔ اردو صحافت کی ترقی میں پیسہ اخبار سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مدیروں میں لالہ دینا ناتھ، منشی محمد دین فوق خصوصاً میر جالب دہلوی سب سے قابلِ ذکر شخصیت تھے۔ متانت اور سنجیدگی اور صحافت کو تجارت کے اصول پر چلانا اس کی نمایاں خصوصیت تھی۔

وکیل امرتسر:- ہفت روزہ تھا۔ شیخ غلام محمد مالک تھے اس کے ادارہ تحریر سے مولانا عبداللہ العمادی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبداللہ منہاس جیسے نامور لوگ وابستہ رہے۔

بیسویں صدی کی صحافت

بیسویں صدی کی گود میں بہت سے ہنگاموں اور

انقلابات نے جنم لیا، پروان چڑھے اور تکمیل کو پہنچے، دنیا کے سیاسی نقشے میں کئی بار رد و بدل ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو صحافت میں بھی انقلاب آیا۔ بیسویں صدی کی صبح ہوئی تو اس وقت تین روزنامہ اخبار چل رہے تھے۔ پیسہ اخبار، اودھ اخبار، اور صلح کل۔ اسکے بعد جوں جوں یہ صدی آگے بڑھی صحافت میں بھی نئے نئے موڑ آتے گئے اور ترقی کی رفتار تیز اور انقلابی ہوتی گئی۔

پنجہ فولاد لاہور:۔ منشی محمد دین نے ۱۹۰۱ء میں جاری کیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں بند ہو گیا۔

وطن لاہور:۔ ۱۹۰۲ء میں یہ ہفت روزہ مولوی انشاءاللہ خاں نے جاری کیا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں یہ روزانہ ہوا مگر کچھ عرصہ بعد پھر ہفت روزہ ہو گیا۔ ۳۳ سال جاری رہا۔

ہندوستان لاہور:۔ ۱۹۰۴ء میں لالہ دینا ناتھ اور رام بھجدت نے مل کر یہ اخبار جاری کیا تھا دونوں بیرسٹر اور قومی کارکن تھے۔

دیپک لاہور:۔ یہ ہندوستان کا روزانہ ایڈیشن تھا مگر ۱۹۱۵ء میں ہندوستان کی ملکیت بدلنے پر بند ہو گیا تھا اس کے ایڈیٹر بھی لالہ دینا ناتھ ہی تھے۔

دیش:۔ ہندوستان سے الگ ہو کر لالہ دینا ناتھ نے یہ روزانہ اخبار جاری کیا تھا اور ۱۹۲۳ء میں یہ بند ہو گیا۔

ہمالہ:۔ یہ اخبار لالہ دینا ناتھ نے اخبار دیش کے ساتھ ساتھ آریہ سماج کی تحریک کو فروغ دینے کے لیے جاری کیا تھا۔

زمیندار:۔ مرحوم مولانا ظفر علی خاں کے والد مولوی سراج الدین احمد نے اسے کرم آباد سے ہفتے وار جاری کیا تھا اور زمینداروں، کسانوں کی بہبودی کے لیے تھا نومبر ۱۹۰۹ء میں ان کا انتقال ہونے پر اس کی ادارت مولانا ظفر علی خاں نے سنبھالی۔ چودھری شہاب الدین کی تجویز پر انہوں نے اس کو لاہور منتقل کر لیا اور جنگ طرابلس میں یہ روزنامہ ہو گیا۔ اس کے بعد اسنے بڑے بڑے انقلاب دیکھے متعدد مرتبہ ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ تحریک خلافت اور تحریک حریت میں سرگرم حصہ لیا۔ خود مولانا ظفر علی خاں کی زندگی نے بڑے انقلابات دیکھے، مولانا کے بعد ان کے لڑکے اختر علی خاں اور پھر پوتے منصور علی خاں اسے چلاتے رہے تقسیم ہند کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔ اسنے ہندوستان اور اردو کو بڑے بڑے صحافی دئے ان میں سے ایک ھمدم کے ایڈیٹر مولانا عبدالوحید صدیقی بھی ہیں۔ پنجاب سے بعد میں بہت سے اخبارات نکلے، زمیندار کا ہمسر کوئی نہ ہو سکا۔

کشمیری میگزین:۔ یہ ماہنامہ ۱۹۰۶ء میں منشی محمد دین نے جاری کیا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں یہ ہفتے وار ہو گیا تھا۔

اردوئے معلیٰ:۔ مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۰۸ء میں یہ ماہنامہ جاری کیا اور اس وقت آزادی کا نعرہ بلند کیا جب بعد کو قافلہ سالار آزادی بننے والوں میں کوئی میدان میں نہ تھا وہ آخر تک گرم سیاست کے علمبردار رہے وہ آروبندو گھوش، تلک اور بپن چندر پال کی سیاست کے حامی تھے۔ اس کی بے باکی برطانوی حکومت کو برداشت نہ ہوئی اور اردوئے معلیٰ کو بار بار ضبطی ضمانت اور بند ہونے اور مولانا کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

مسلم گزٹ لکھنؤ:۔ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کے زیر ادارت شروع ہوا تھا اس کے مقام کا اندازہ اس سے کیجئے کہ مولانا آزاد نے الہلال میں لکھا تھا اس نے موجودہ سیاسی تغیرات خیالات کی تولید میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

علم و عمل:۔ حیدرآباد دکن سے ۱۹۰۴ء میں مولوی محب حسین کی ادارت میں شروع ہوا تھا۔

صحیفہ:۔ ۱۹۱۱ء میں اکبر علی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ پہلے یہ حضرت کیفی کی ادارت میں ۱۹۰۴ء میں رسالہ کی صورت میں نکلتا تھا، چالیس سال جاری رہا۔

معارف:۔ یہ روزنامہ بھی ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا تھا۔

عثمان گزٹ لکھنؤ:۔ روزنامہ شروع ہوا تھا لیکن یہ اور معارف دونوں جلد بند ہو گئے۔

ہمدم لکھنؤ:۔ مولانا عبدالباری نے ۱۹۱۲ء میں شروع کیا تھا پالیسی نیشنلسٹ تھی تقسیم ہند کے وقت تک زندہ تھا۔

مدینہ بجنور:۔ ۱۹۱۲ء میں مولوی عبدالمجید صاحب نے شروع کیا تھا آج تک جاری ہے اور ان کے صاحبزادے سید اختر ایم اے چلا رہے ہیں، یہ اخبار ہمیشہ نیشنلسٹ اور کانگریس اور جمعیۃ العلماء کا حامی رہا خلافت سے لے کر آخر تک آزادی کی تمام تحریکات میں حصہ لیا مدینہ نے کئی ایسی سنجیدگی، متانت، اصابت رائے اور رہنمایانہ کردار کیلئے اردو صحافت میں بڑا نام اور مقام پیدا کیا۔ آج تک پابندی سے جاری ہے۔

کامریڈ اور ہمدرد:۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے پہلے کلکتہ سے کامریڈ انگریزی ہفتہ وار شروع کیا یہ دارالحکومت دلی منتقل ہونے پر اسے دلی لے آئے اور یہاں سے ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو اردو روزنامہ ہمدرد جاری کیا۔ کامریڈ کا مقصد اجرا مولانا نے یہ بتایا تھا کہ وہ حکومت کی خدمت میں عرض اور ہندوستان کی دوسری ملتوں کو ملت اسلامیہ کے افکار و مطالب سے ماہر کریگا۔ اور مسلمانان ہند کی خدمت کے لیے اردو روزنامہ جو بعد کو ہمدرد کے نام سے نکلا، شایع کیا جائیگا ان اخبارات پر مولانا کے سیاسی نظریات کی پوری پوری چھاپ تھی خلافت اور کانگریس کی حمایت وغیرہ وغیرہ مولانا کی اردو صحافت کو سب سے بڑی دین روزنامہ اخبار میں ٹائپ سے کام لینا تھا۔ انہوں نے خبروں، اداریوں اور مضامین کے اعتبار سے بھی معیار قائم کیا۔

الہلال والبلاغ:۔ یہ دونوں ہفت روزہ اخبارات امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے جاری کیے تھے مگر ان سے مولانا کی صحافت کی ابتدا نہیں ہوتی بلکہ یہ معراج تھی سب سے پہلے انہوں نے ایک گلدستہ نیرنگ عالم جاری کیا تھا اس کے بعد کلکتہ کے احسن الاخبار کی ترتیب میں شریک رہے۔ پھر انہوں نے تحفہ محمدیہ اور خدنگ نظر جاری کئے اور ان کی ترتیب مولانا کے سپرد ہوئی، اس کے بعد وہ لسان الصدق، الندوہ اور وکیل سے وابستہ رہے۔ تقسیم بنگال کے وقت دارالسلطنت کا اخبار مولانا آزاد کی ادارت میں رہا۔ اس کے بعد ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو اردو صحافت کا عظیم اخبار الہلال منظر عام پر آیا جسے ایک طرف قوم کو جھنجھوڑ کر غلامی کی نیند سے بیدار کیا دوسری طرف برطانوی حکومت کی چولیں ہلا ڈالیں یہ اردو ٹائپ میں باتصویر چھپتا تھا اس کا ثانی آج تک پیدا نہیں ہوا۔ ۳۰×۲۰ کے ۱۶ صفحے ہوتے تھے اس کی بے باکی اور آتش نوائی حکومت سے برداشت نہ ہوئی پہلے دو ہزار کی ضمانت مانگی پھر اس کو ضبط کیا پھر دوسری ضمانت ضبط کر کے نئی ضمانت دس ہزار کی طلب کی تو چھپنا بند کر دیا گیا۔ اگلے سال البلاغ جاری کیا گیا جو مولانا کی نظربندی کے ساتھ بند ہو گیا ۱۹۲۱ء میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی معاونت سے پیغام بھی جاری کیا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں الہلال دوبارہ جاری ہوا مگر ۶ ماہ ہی جاری رہ سکا۔

سیاست:۔ ۱۹۱۹ء میں مولانا سید حبیب نے یہ روزنامہ لاہور سے جاری کیا تھا اس اخبار کی شہرت ہمیشہ قومی تحریکات میں حصہ لینے کی وجہ سے ہوئی۔

پرتاپ:۔ یہ روزنامہ مہاشہ کرشن نے لاہور سے شروع کیا تھا تقسیم ہند کے بعد سے دلی اور جالندھر سے شایع ہو رہا ہے اور جالندھر میں اس کے ایڈیٹر ان کے لڑکے ویریندر اور دلی میں دوسرے فرزند نریندر ایڈیٹر ہیں اس اخبار کا بھی جنگ آزادی کی صعوبتوں اور قید و بند میں بڑا حصہ ہے لاہور سے مہاشہ کرشن نے پرکاش ہفتہ وار بھی نکالا تھا۔ ہندی ویر ارجن دلی بھی انہی کی یادگار ہے۔ مہاشہ جی آریہ سماجی لیڈر بھی تھے اس لیے ان کے اخبار آریہ سماج کے ترجمان بھی رہے اب یہ اخبار جن سنگھ کا دم بھرتا ہے اور مسلمانوں کی ہر قدم پر مخالفت کرتا ہے

بندے ماترم:۔ یہ روزنامہ ۱۹۲۰ء میں لاہور سے جاری ہوا تھا اس کے بانی لالہ لاجپت رائے اور ایڈیٹر سردار موہن سنگھ ساحر تھے تقسیم کے بعد دلی میں بھی نکلتا رہا۔

کیسری اور گورو گھنٹال:۔ لالہ رام لال کپور لاہور سے ہفتہ وار گورو گھنٹال نکالتے تھے ۱۹۲۱ء میں انہوں نے روزنامہ کیسری شروع کیا بعد میں یہ سہ روزہ ہوا پھر بند ہو گیا

ملاپ:۔ ۱۳ اپریل ۱۹۲۳ء کو مہاشہ خوشحال چند خورسند نے یہ روزنامہ لاہور سے شروع کیا تھا تقسیم ہند کے بعد سے یہ جالندھر میں فری کشن کی ادارت میں دلی سے شری رنبیر اور حیدرآباد سے شری یدھویر کی ادارت میں نکل رہا ہے پچھلے دنوں لندن سے بھی اس کا اجرا عمل میں آ چکا ہے مہاشہ خورسند نے پہلے آریہ گزٹ بھی نکالا تھا وہ اپنی حیات میں سنگھ دیا کو تیاگ کر چکے کے بعد مہاتما آنند سوامی کے نام سے مشہور ہیں یہ اخبار نیشنلسٹ تھا اور آج بھی اسی راہ پر گامزن ہے جارحانہ فرقہ پرستی کا مقابلہ جارحانہ انداز تحریر سے کرتا ہے۔

تیج:۔ یہ روزنامہ مارچ ۱۹۲۳ء میں دلی سے جاری ہوا تھا اور آج تک جاری ہے سوامی شردھانند اس کے بانی تھے اس کے بعد اس کی زمام ادارت سورگیہ لالہ دیش بندھو گپتا نے سنبھالی اب ان کے فرزندوں کے ہاتھ میں ہے چیف ایڈیٹر وشو بندھو گپتا مینیجنگ ایڈیٹر ہیں ہندی ایڈیشن کے ایڈیٹر لالہ دھرم پال گپتا وکار ہیں اور چوہدری لال دیش بندھو گپتا ایڈیٹر ہیں ـــــ راقم الحروف بھی آج کل اس کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہے، یہ اخبار کانگریسی نظریات کا علمبردار ہے شام نامہ بھی ہر شام کو شائع ہوتا ہے۔ اب اس ادارے سے ہفتہ وار (ہندی)، دیوانہ روزنامہ شام کا اخبار، تیج ہندی اور انگریزی ماہنامہ دیوانہ بھی شایع ہوتے ہیں ایک زمانہ میں فلم آرٹ بھی شروع کیا تھا جو اپنی نوعیت کا بے نظیر فلمی اخبار تھا تیج نے بھی آزادی کی جنگ میں بھرپور حصہ لیا ہے۔

الجمعیۃ:۔ یہ روزنامہ جمعیۃ علماء ہند کا ترجمان ہے۔ ۱۹۲۵ء میں شروع ہوا تھا اس سے پہلے جمعیۃ علماء کا ترجمان اخبار مسلم تھا اس کے پہلے ایڈیٹر مولانا محمد عرفان تھے اس کے بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ہلال احمد زبیری، مولانا عبدالوحید صدیقی، مولانا محمد عثمان فارقلیط، خلیق صدیقی رہے جمعیۃ علماء ہند چونکہ تحریک آزادی کی نقیب اور اس راہ میں کانگریس کی حلیف تھی اس لیے یہ اخبار بھی جنگ آزادی کی صعوبتوں میں شریک رہا۔ آزادی کے بعد اس کا موجودہ دور شروع ہوا تو پھر مولانا عثمان فارقلیط ـــــ ہی نے اس کی ادارت سنبھالی۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک راقم الحروف اس کے ادارۂ تحریر سے وابستہ رہا ہے الجمعیۃ کا مسلک جمعیۃ علماء ہند کا مسلک رہا ہے پہلے سہ روزہ تھا بعد کو روزنامہ ہوا موجودہ دور میں روزنامہ کی حیثیت سے ہی جاری ہوا تھا آزادی کے بعد ان آفات و مصائب میں جن سے ہندوستانی مسلمان دوچار ہوئے الجمعیۃ ان کی ڈھارس بنا۔ گو اسے اس کی قیمت متعدد مقدمات کی صورت میں ادا کرنی پڑی ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد سردار پٹیل کی ہوم منسٹری کے دور میں حکومت نے کچھ اس پر پابندیاں لگا دی تھیں لیکن جلد ہی اس سے پابندیاں ہٹالی گئیں مولانا عبدالوحید صدیقی جنہوں نے بعد میں روزنامہ نئی دنیا نکالا اس کے مستقل علمی معاون رہے راقم الحروف بھی جولائی ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۴ء تک روزنامہ نئی دنیا کے ادارۂ تحریر کا ایک رکن رہا ہے) الجمعیۃ آج بھی جاری ہے اور ملک و ملت کی بڑی خدمت انجام دے رہا ہے۔

انقلاب لاہور:۔ ۱۹۲۷ء میں زمیندار کے عملے نے ہڑتال کر کے یہ اخبار لاہور سے جاری کیا تھا مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک ایک جان دو قالب اس کے بانی اور ایڈیٹر تھے یہ اخبار تقسیم ہند کے بعد بند ہوا۔ انقلاب نے بھی اسلامی و ملکی سیاست اور اردو صحافت میں اہم حصہ لیا ہے اور صحافت میں ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔

احسان لاہور:۔ یہ روزنامہ ملک نور الٰہی نے ۱۹۳۴ء میں جاری کیا تھا مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش اس کے ایڈیٹر تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا انعام اللہ خان ناصر اور نامور اشتراکی ادیب باری علیگ جیسے صحافی اس سے وابستہ

رہے ہیں۔ یہ بھی تقسیم کے بعد بند ہوا۔

احرار اور آزاد لاہور:۔ یہ دونوں اخبار مجلس احرار اسلام کے ترجمان رہے ہیں۔ لاہور سے نکلتے تھے پہلا مولانا چراغ حسن حسرت کی ادارت میں اور دوسرا آغا شورش کاشمیری کی ادارت میں شائع ہوا تھا جس نے ایک رسالہ شہاب بھی جاری کیا تھا اور اخبار احرار کافی عرصہ تک اسرار محمد آزاد کی ادارت میں سہارنپور سے بھی نکلتا رہا ہے۔

نیشنل کانگریس:۔ یہ ہفت روزہ پنجاب کانگریس کے صدر ڈاکٹر ستیہ پال نے جاری کیا تھا تقسیم کے بعد دلی سے بھی کچھ عرصہ نکلا پھر بند ہو گیا۔

زمزم لاہور:۔ یہ سہ روزہ اخبار کانگریس اور مسلم نیشنلسٹ نظریے کا ترجمان تھا پہلے اس کے ایڈیٹر سراج الحسن عتیق اور پھر مولانا محمد عثمان فارقلیط رہے۔ یہ بھی تقسیم کے بعد بند ہوا۔

منادی:۔ خواجہ حسن نظامی اردو کے صاحب طرز انشا پرداز تھے انہوں نے کئی اخبار جاری کیے جن میں سے ایک منادی تھا جو اخبار کی صورت میں آج بھی جاری ہے۔

انصاری دلی:۔ یہ روزنامہ ہلال احمد زبیری ایم اے سابق ایڈیٹر الجمعیۃ نے جاری کیا تھا اور ۱۹۵۱ء تک جاری رہا اس وقت اس کا ایک ہفتہ وار ایڈیشن انصاری دہلی اور ایک مستقل ایڈیشن بھی الگ الگ نکلتے تھے راقم الحروف نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز اسی اخبار سے کیا تھا۔ یہ کانگریس اور جمعیۃ علماء کے نظریات کا ترجمان و علمبردار تھا۔

قومی آواز:۔ یہ اخبار پنڈت جواہر لال نہرو کے ایما و سرپرستی سے نوجیون ٹرسٹ کے تحت حیات اللہ انصاری کی ادارت میں جاری ہوا تھا اور آج تک جاری ہے اسے شروع سے ڈیپلے ترتیب و تزئین میں خصوصیت سے نمایاں رہا۔ ابتداً شروع کیا اخبار ابھی تک نکل رہا ہے۔ اس ٹرسٹ کے تحت انگریزی روزنامہ نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ اور ہندی کا نوجیون بھی نکلتے ہیں نیشنل ہیرالڈ دلی سے بھی شروع ہو گیا ہے۔ کانگریس کی ہمنوائی کی بدولت ان اخبار کو بھی برطانوی تشدد و ظلم کا شکار ہونا پڑا اس سے پہلے حیات اللہ انصاری ہی کی ادارت میں لکھنؤ سے اک ہفت روزہ ہندوستان بھی نکلا تھا۔

الامان اور وحدت:۔ یہ دونوں اخبار مولانا مظہر الدین نے دلی سے جاری کیے تھے اول الذکر سہ روزہ تھا اور آخر الذکر روزنامہ مولانا مظہر الدین کو ۱۹۳۸ء میں قتل کر دیا گیا تھا مگر یہ اخبار انکے بعد تک جاری رہے۔ وحدت تو تقسیم کے بعد بھی نکلتا رہا مگر پھر بند ہو گیا۔

ملت:۔ مولانا محمد علی کا اخبار ہمدرد بند ہونے کے بعد ان کے ادارہ تحریر کے رکن سید محمد جعفری نے یہ روزنامہ دلی سے جاری کیا تھا۔

تریاق:۔ یہ روزنامہ کانگریس کے ایک سرکردہ لیڈر ڈاکٹر شیخ محمد عالم نے لاہور سے جاری کیا تھا اس کے پہلے ایڈیٹر پنڈت میلا رام وفا اور بعد کے احمد علیق صدیقی سہارنپوری رہے۔

ہند کلکتہ:۔ یہ روزنامہ اخبار مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی نے شروع کیا تھا جس کا نام بعد میں ہند جدید پھر روزانہ ہند ہوا یہ اخبار اب بھی نکلتا ہے مگر ملیح آبادی صاحب نے بعد میں کلکتہ میں آزاد ہند شروع کر دیا تھا یہ روزنامہ ہے اور ابھی تک جاری ہے ان کے لڑکے احمد سعید اس کے ایڈیٹر ہیں۔ اس اخبار کا ہفتہ وار ایڈیشن اجالا کے نام سے نکلتا ہے۔

خلافت بمبئی:۔ مولانا محمد علی کے بھائی مولانا شوکت علی نے بمبئی سے جاری کیا تھا بعد میں ان کے لڑکے زاہد شوکت علی اسے نکالتے رہے ان کا بھی انتقال ہو گیا ہے مگر خلافت کمیٹی کے تحت جاری ہے پہلے ایڈیٹر محمد [illegible] چودھری تھے پھر حافظ علی بہادر خاں بھی رہے۔

پیام حیدرآباد:۔ یہ روزنامہ اخبار اردو کے مشہور انشا پرداز قاضی عبد الغفار نے حیدرآباد سے جاری کیا تھا اور آزادی کے بعد تک جاری رہا اس سے پہلے قاضی صاحب نے کلکتہ سے جمہور شروع کیا تھا انہوں نے صحافت کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا یہ اپنی متانت ثقاہت اور ادبیت کے اعتبار سے بالکل منفرد تھا اور کانگریس کے نظریات کا حامی تھا۔

جنگ آزادی کے دور کے متفرق اخبارات

روزنامے:۔ کلکتہ سے مولانا شائق احمد عثمانی نے روزنامہ عصر جدید جاری کیا تھا اور آج تک جاری ہے روزنامہ حق لکھنؤ سے جاری ہوا۔ روزنامہ تنویر چودھری خلیق الزماں نے لکھنؤ سے اور منشور روزنامہ دلی سے حسن ریاض کی ادارت میں مسلم لیگ نے جاری کیا۔ روزنامہ حقیقت ۱۹۱۸ء میں ایس احمد عباسی نے کلکتہ سے جاری کیا تھا اور آج تک جاری ہے ۱۹۲۵ء میں شیعہ کانفرنس نے سرفراز نکالا جو ابھی تک چل رہا ہے مولانا محمد اکرم نے روزنامہ آزاد کلکتہ سے جاری کیا تقسیم کے بعد ڈھاکہ سے آزاد نکالتے تھے۔ حافظ علی بہادر نے بمبئی سے ہلال نو۔ معین الدین حارث نے اجمل اور عبد المجید انصاری نے انقلاب شروع کیا۔ دلی سے میر خلیل الرحمن نے دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جنگ شروع کیا جو تقسیم کے بعد کراچی سے نکلنا شروع ہوا اور اس وقت پاکستان کا سب سے بڑا اخبار ہے۔ محمد عثمان آزاد نے روزنامہ انجام دلی سے جاری کیا تھا مگر یہ بھی اب کراچی سے نکلتا ہے۔ میاں افتخار الدین نے لاہور سے فیض احمد فیض کی ادارت میں روزنامہ امروز اور نواب ممدوٹ نے حمید نظامی کی ادارت میں نوائے وقت شروع کیا۔ دلی سے شیو نرائن بھٹناگر نے روزنامہ وطن اور پٹنہ سے مدیر احمد کا صدائے عام۔ حیدرآباد سے رہبر دکن اور سیاست، دلی سے عبد الحمید شملوی کا پیام نکلا۔ مرتضیٰ احمد خاں میکش نے احسان لاہور سے نکالا جو بعد کو یونینسٹ پارٹی نے خرید لیا تھا ۱۹۴۲ء میں تاج چند تاجر نے پرتاپ اور اکالی دل نے سادھو سنگھ ہمدرد کی ادارت میں اجیت، آل انڈیا جاٹ مہاسبھا نے رہبر ہند نکالا۔ پشاور سے سردار اورنگ زیب نے روزنامہ ملت، رحیم بخش غزنوی نے روزنامہ سرحد۔ دوست محمد اثر نے روزنامہ آزاد جاری کیا۔ پشاور سے شہباز بھی نکلا۔ سرینگر سے شیخ محمد عبد اللہ کا خدمت اور روزنامہ شیر رنگون (ایڈیٹر علیق صدیقی) قابل ذکر ہیں۔

ہفت روزہ:۔ دلی میں چار قابل ذکر ہفت روزہ تھے سردار دیوان سنگھ کا ریاست روزانہ تیج کا تیج ویکلی مفتی شوکت علی فہمی کا دین دنیا۔ عزیز حسن بقائی کا حریت لکھنؤ سے پیام نکلا پشاور سے رضا ہمدانی فارغ بخاری کا شباب، قاضی عبد الحکیم کا انصاف۔ میر عبد الصمد کا دوسرا سرحد ضیا جعفری اور جمیل رار ملنگ کا تعمیر نو۔ پیغام جنگ۔ حریت۔ شمشیر سرحد۔ شیر سرحد۔ اخوت۔ کوئٹہ سے خان عبد الصمد اچکزئی (سرحدی گاندھی) کا استقلال اور قاضی عیسیٰ کا الاسلام اور ہفت روزہ تنظیم نکلے۔ کمیونسٹ پارٹی نے بمبئی سے قومی جنگ شروع کیا بعد کو نیا زمانہ ہو گیا لاہور سے منشی محبوب عالم کا پیسہ۔ چراغ حسن حسرت کا شیرازہ لکھنؤ سے مولانا عبد الماجد دریابادی کا پہلے ہفت روزہ سچ نکلتا تھا بعد کو صدق نکلا اور اب صدق جدید کے نام سے ہفتے وار نکلتا ہے کلکتہ سے عنایت دہلوی کا ایک بہت مشہور مزاحیہ پرچہ ہفت روزہ چونچ نکلتا تھا۔ قادیانیوں کا اخبار الفضل قادیان سے لالہ کرم چند کا پارس لاہور سے عطاء اللہ ہاشمی کا اداکار لاہور اور سردار امر سنگھ کا شیر پنجاب، مولانا زکریا اسعدی کا ہفت روزہ مینار سہارنپور قابل ذکر ہیں۔

ماہنامے:۔ علمی ادبی اور تحقیقی جرائد میں شیخ عبد القادر کا مخزن لاہور۔ سید سلیمان ندوی کا معارف اعظم گڑھ۔ مولانا ظفر الملک کا الناظر لکھنؤ۔ مولانا عبد الوحید صدیقی کا ماہنامہ جاوید دہلی۔ منشی دیا نرائن نگم کا زمانہ کانپور۔ جامعہ ملیہ کا رسالہ جامعہ۔ ندوۃ المصنفین کا برہان دلی، میاں بشیر الدین کا ہمایوں لاہور۔ حکیم یوسف حسن کا نیرنگ خیال لاہور۔ حافظ محمد عالم کا عالمگیر لاہور۔ صلاح الدین احمد کا ادبی دنیا لاہور، تاجور نجیب آبادی کا شاہکار،

ادب لطیف، علامہ سیماب اکبرآبادی کا شاعر آگرہ، انجمن ترقی اردو کا رسالہ اردو، علامہ راشد الخیری کا عصمت اور رسالہ بچوں کا پھول لاہور اور پیام لاہور، لکھنؤ کا مولوی سید محمد کا اخبار النساء، مولوی سید ممتاز علی کا تہذیب نسواں، حکیم احمد شجاع کا ہزار داستان، امتیاز علی تاج کا کہکشاں لاہور، نیاز فتح پوری کا نگار لکھنؤ، شاہد احمد دہلوی کا ساقی دلی، اختر شیرانی کا خیالستان اور رومان لاہور، پشاور سے سردار علی احسن کا فانوس، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کا ہندوستانی، انجمن ترقی اردو کا ماہنامہ سائنس، جوش ملیح آبادی کا کلیم دلی اور حکومت ہند کے دلی سے نکلنے والے ماہنامے آجکل (ادبی) نونہال (بچوں کا)، ساطع عالم (بین الاقوامی امور پر)، مدرسہ دارالعلوم دیوبند کا ماہنامہ دارالعلوم جس کے مدیر اعلیٰ مولانا عبدالوحید صدیقی تھے۔ مرکزی اطلاعات (وزارت اطلاعات و نشریات کا) اور آواز (آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام کا پرچہ) تھا۔ لاہور سے خوشتر گرامی کا ماہنامہ بیسویں صدی بھی نکل رہا تھا جو اب دلی میں جاری ہے۔ راقم الحروف نے بھی ایک رسالہ میں۔ سہارنپور سے ماہنامہ چاند نکالا تھا جو دو ڈھائی سال جاری رہا۔

آزادی کے بعد کی اردو صحافت

۱۵ اگست کو برصغیر ہندوستان، ہند اور پاکستان میں تقسیم ہو گیا۔ تقسیم کے نتیجہ میں دونوں حصوں کے بہت سے لوگوں کو ترک وطن کر کے ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانا پڑا۔ ان کے ساتھ ساتھ اخبارات کا بھی تبادلہ ہوا۔ پرتاپ، ملاپ، مدینہ، ماتم، ویر بھارت، پربھات، امیت لاہور سے جالندھر اور دلی منتقل ہو گئے۔ کچھ دونوں جگہ سے نکلنے لگے۔ کچھ جالندھر سے یا دلی سے نکلنے لگے۔ انجام کراچی چلے گئے۔ کچھ دن تک یہ دونوں جگہ سے نکلتے رہے مگر پھر دلی میں بند ہو گئے۔ پیام اور وحدت یہیں بند ہو گئے۔ پاکستان میں جنہیں لکل سکے۔ تیج ویکلی اب بھی نکلتا ہے مگر وہ روزنامہ کی صورت میں نکلتا ہے۔ ویر بھارت اور ملاپ ماتم یہاں آکر بند ہو گئے۔ پارس ویکلی لاہور سے آیا تھا وہ لالہ کرم چند کے انتقال کے بعد بند ہو گیا۔ تریت ویکلی اور ماہنامہ پنچھی خواجہ حسن نظامی دلی سے نکالتے تھے وہ بند ہو گئے۔ الجمعیۃ کا اجرا مولانا محمد عثمان فارقلیط کی ادارت میں دوبارہ عمل میں آیا۔ تیج کے سابق ایڈیٹر رام لال ورما نے روزنامہ ہند نکالا اور وہ بند ہوا۔ زمیندار اور مساوات کے سابق ایڈیٹر مولانا عبدالوحید صدیقی نے نئی دنیا، بحث اور طاقت (روزنامے) نکالے جو بعد کو بند ہو گئے۔ تیج سے علیحدہ ہو کر جناب جمنا داس اختر نے ہفت روزہ شروع کیا تھا جو اب روزنامہ ہے۔ تیج کے ایک دوسرے سابق ایڈیٹر خوشتر گرامی نے تاج الدین لکھنوی کی ادارت میں روزنامہ سفینہ نکالا اور بند ہو گیا۔ شہباز لاہور کے سابق ایڈیٹر مولانا عبدالباقی نے پہلے روزنامہ پیام وطن دلی سے نکالا جو جلد ہی بند ہو گیا پھر ہفت روزہ کاروان وطن نکالا جو ان کے انتقال کے بعد بند ہو گیا۔ ہفت روزہ دین دنیا جو پہلے علمی ادبی تھا کئی سال ہونے کے بعد مذہبی اور تاریخی ماہنامے کی صورت میں نکل رہا ہے۔ تقسیم سے ایک دو ماہ پہلے صاحبزادہ محمد حسن فاروقی نے ایک مذہبی ماہنامہ آستانہ اور ۱۹۵۸ء میں ہفت روزہ پیام مشرق شروع کیا تھا۔ ۱۹۶۲ء سے ملازمت کے سلسلے میں راقم الحروف بھی اس سے وابستہ رہا ہے۔ یہ فروری ۱۹۶۸ء میں بند ہو گیا۔ ایک اور مشہور مذہبی ماہنامہ مولوی بھی تین سال ہوئے بند ہو گیا۔ لاہور سے آنے والے ماہناموں میں بیسویں صدی جس کے مالک و مدیر جناب خوشتر گرامی ہیں اسی آن بان سے نکل رہا ہے لیکن لاہور کے پرچے سے بہتر ہے۔ دوسرا پرچہ صوبہ بھکن پرشاد کا ماہنامہ استاد ہو گئی ہے جو بدستور نکل رہا ہے۔ اتالیق اور رہنمائے تعلیم بند ہو گئے ہیں۔ دلی سے بچوں کے لئے دو ماہنامے پھلواری اور پھول بھی نکلتے تھے مگر اب بند ہو گئے ہیں۔ دلی کا جوا ماہنامہ مانی کراچی منتقل ہو گیا تھا۔ سرکاری ماہنامہ آجکل جاری ہے۔ ساطع عالم اور نونہال بند ہو گئے۔ ہمدرد دواخانہ کا ماہنامہ ہمدرد صحت بند ہو گیا مگر ہفت روزہ ہمدرد اور ہمدرد طبیب نکلنے شروع ہو گئے تھے اور جاری ہیں۔ یہ دونوں طبی ہیں۔

مولانا عبدالوحید صدیقی نے نئی دنیا بند ہونے کے بعد ایک نئے میدان میں قدم رکھا اور ہندوستان کو ایک اعلیٰ درجہ کا اردو ڈائجسٹ "ہما" دیا جو ہندوستان کا سب سے پہلا ڈائجسٹ کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک مذہبی اور تاریخی ڈائجسٹ "ہدیٰ" جاری کیا اور پھر ہفت اور ہزار داستان جاری کئے۔ اول الذکر دونوں ابھی تک نکل رہے ہیں۔ اس کے بعد پندرہ روزہ (نیوز اور ویوز میگزین) واقعات جاری کیا جو ابھی تک ماہنامے کی صورت میں جاری ہے۔ مولانا کے بعد کئی حضرات نے ڈائجسٹ شروع اور بند کئے۔ حاجی محمد یوسف نے آزادی سے پہلے ماہنامہ شمع شروع کیا تھا۔ یہ فلمی پرچہ ہے اب اس کا ہندی ایڈیشن سشما بھی نکل رہا ہے۔ شمع کے بعد حافظ صاحب نے پہلے بچوں کے لئے کھلونا، پھر عورتوں کے لئے 'بانو' اور ایک جاسوسی ماہنامہ مجرم اور اردو ڈائجسٹ شبستاں شروع کیا۔ یہ سب پرچے جاری ہیں۔ دلی سے ایک اور قابل ذکر ہفتہ وار 'روشنی' دلی سے جاری ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ میر مشتاق صاحب نے ہفت روزہ ایشیا جاری کیا تھا جو اب مشری ہر دے کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ سیماب سلطان نے جو آزادی سے پہلے الہ آباد سے ماہنامہ 'نئی زندگی' اور 'جہاں نما' نکالتے تھے نو ہی حیدرآباد کے ہندوستان کے مشہور صحافی شعیب اللہ خاں کی یاد میں روزنامہ شعیب جاری کیا تھا مگر وہ بند ہو گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء سے دلی سے ہفت روزہ پرچم ہند اور ۱۹۶۲ء سے روزنامہ ملک و ملت نکال رہے ہیں۔ حال ہی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے قومی آواز لکھنؤ کے سابق ایڈیٹر حیات اللہ انصاری کی ادارت میں ایک اردو ہفت روزہ سب ساتھ جاری کیا ہے۔ یہ کانگریس کا سرکاری ترجمان ہے۔ جناب عباسی صاحب عباسی ہما ہفت رنگ نکالتے ہیں یہ بھی ڈائجسٹ ہے۔ الہ آباد سے جاسوسی دنیا اور روحانی دنیا نکلتے ہیں۔ جاسوسی دنیا نے جاسوسی پرچوں کے لئے میدان صاف کیا تھا۔ کثیر تعداد میں ہر گھر سے دعا آئی۔ مرت پہلا، سیارہ، سیدہ اور ہفت روزہ آئینہ اور تحریر سے ہفت روزہ چار قابل ذکر ہیں۔

لکھنؤ۔ اردو اخبار آزادی کے بعد بند ہو گیا۔ قومی آواز اور سرفراز برابر نکل رہے ہیں۔ ہفت روزہ ساتھ شروع ہوا تھا پہلا سال ہے ہفت

نظم ساکی

بے زبانوں کی زبان اردو

ہمیشہ سے رہی ہے زیب گلزار وطن اردو
اگر ہے انجمن بھارت تو شمع انجمن اردو
اٹھا کر دیکھ لو تاریخ اردو اس زمانے میں
یہی اردو رہی ہے ہند کا گلشن سجانے میں
اسی اردو نے ڈالی تھی بنائے فکر آزادی
خزاں دیدہ گلوں نے پائی تھی اردو سے شادابی
اسی اردو میں تہذیب و تمدن کے خزانے ہیں
اسی میں پاس و رواداری محبت کے فسانے ہیں
وطن گلزار ہے اور رونق گلزار ہے اردو
ہے جس کی روشنی ہر سو وہ مینار ہے اردو
اسی اردو نے کی ہے حکمرانی کامراں ہو کر
مگر اب رہ گئی ہے بے زبانوں کی زباں ہو کر
اسی اردو سے بھارت میں صدائے اتحاد آئی
یہی اردو وطن میں ایک تازہ زندگی لائی
یہی اردو ہے ہندوستانیوں کا قومی سرمایہ
اسی اردو سے قوموں نے ملاپ باہمی پایا
اسی اردو نے خوابیدہ قبیلوں کو جھنجھوڑا ہے
مئے حب وطن کا کیف اک اک دل پہ چھوڑا ہے
ہمارے دیش میں ہر گھر کی آبادی رہی اردو
وطن والو! تحریک جنگ آزادی رہی اردو
کرو اردو کی خدمت مل کے سب کی ہے زباں اردو
پھلے پھولے بہار دل میں ہر ہندوستاں اردو

ان سب کے تاریخی پس منظر میں مولانا نے ہمارا ہرلا ہدف، بر اہداستان اور واقعات کا سلسلہ شروع کیا جو ملی کی تاریخ ہے اور سب کے سامنے ہے۔

نئی دنیا نے اردو صحافت میں کئی نئی باتوں کا اضافہ کیا اس کا سب سے بڑا کارنامہ جارحیت پسند، فرقہ پرست جماعتوں کا پردہ چاک کرنا اور ان کی ان سرگرمیوں کو جو مسلم دشمنی سیکولرزم اور جمہوریت کی مخالفت پر مبنی ہوتی تھیں بے نقاب کرنا تھا۔ جس پر سی آئی ڈی والے پردہ ڈالتے اور اوپر تک نہیں پہنچاتے تھے۔ دوسری طرف اس نے مسلمانوں میں حوصلہ پیدا کیا اور ان کے لئے آبرومندانہ زندگی کی جدوجہد کی جس کے نتیجہ میں مولانا کو کئی بار دارو گیر کا سامنا کرنا اور عدالت کے کٹہرے میں پیش ہونا پڑا۔ مولانا سیاسی فکر و خیال کے اعتبار سے صحت مند ذہنیت رکھتے ہیں اور حیرت انگیز قوت ارادی کے مالک ہیں جس کا مظہرہ ہرے مرد سامانی کے عالم میں نئی دنیا کا اجرا اور تیرہ برس تک اس کو چلانے اور پھر سب کچھ کھو کر ملبہ پر نیا کا شاندار محل تعمیر کرنے کی صورت میں میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ ایک اچھا اخبار نویس اور صاحب قلم اچھا منتظم ہیں بے مولانا عبدالوحید صدیقی کے علاوہ آج تک دوسرا نہیں دیکھا۔ سنہ میں نئی دنیا کے اجرا کے وقت انشاء میں گھنٹے کام کرنا تو کچھ اور بات تھی لیکن ۷۵ سال کی عمر میں اور ۲۲ برس لگاتار اٹھارہ میں گھنٹے کام کرنے کے بعد آج بھی وہ اسی مستعدی اسی رفتار سے کام کرتے اور چاق و چوبند نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی قوت ارادی کا دوسرا ثبوت ہے اگر مذہب آڑے نہ آتا تو میں اسے معجزہ کہتا بہرحال اس کے کرامت ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے نئی دنیا نے اپنے کئی نمبروں کے لئے جس میں ایک اردو نمبر بھی شامل ہے، اور مختلف موضوعات پر اپنے ہفتہ وار ایڈیشنوں کی بدولت بڑی شہرت حاصل کی۔ نئی دنیا کئی نئے لکھنے والوں کے لئے تربیت گاہ بھی رہا اور مولانا نے ان کی تربیت اور ہمت افزائی کی۔

مولانا عبدالباقی ایم۔ اے۔ میراان کا ساتھ پہلے نئی دنیا میں پھر بہت دورہ، پیام مشرق میں رہا لیکن میں ان کے نام اور قلمی جوہر سے شروع ہی میں اس وقت آشنا ہوا جب مولانا دار تعلیم کی جگہ انہوں نے زمزم میں چیف ایڈیٹری سنبھالی انہوں نے ایک بہت شاندار اخبار روزنامہ آزاد نکالا تھا۔ یہ باتصویر تھا اس کی جھلک آج بھی میرے ذہن میں گھومتا ہے۔ وہ دینی اداروں سے بھی وابستہ رہے اور جہانی سے بھی۔ جغرافیات کی یونینسٹ وزارت کے زمانہ میں پنجاب گورنمنٹ کے ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز بھی رہے۔ نئی دنیا میں وہ چیف ایڈیٹر اور میں سب ایڈیٹر تھا۔ ہر موضوع پر لکھتے، تاریخی اور مذہبی مقالات کے علاوہ

اردوئے اعظم

تمکین دکنی سیمابی

زبانِ اردو! ہے جس کی اساس مستحکم — محیط ہے جو فضائے ادب پہ بیش و کم
عیاں ہے اس سے ہم آہنگیٔ مذاہب بھی — ضیائے مہر درخشاں ہے رونقِ شبنم
نشاط خیز ہے لفظ و بیاں کی شوکت بھی — ملے ہے جس کے مرکب سے کیفِ جامِ جم
وہ رفعتیں وہ خوشی اسلوبِ مزاجِ سخن — کہ جس نے گاڑے ہیں ہر سمت ملک میں پرچم
لہو سے ہندو و مسلم نے جس کو سینچا ہے — یہ کشت ہے سببِ آبیاریٔ باہم

عرب اور ترکی و ایران سے جو لوگ آئے — ہوئی جب ان کی سکونت بھی ہند میں دائم
جو کاروبار ضروری یہ بات کی ٹھہری — مقامی لوگوں سے گفت و شنید کی ہر دم
ان انتظامی سماجی امور نے آخر — عطا در ذہن دیا اک نئی زباں کو جنم
تیرا زبان تقدس مآب اکیا کہنا — تو حسن شامِ کلیسا ہے، نورِ صبحِ حرم
زباں وہ جس میں حلاوت ہے انگبیں کی سی — کہیں نہ ندرت اظہار میں ہے تلخیٔ ستم
وہ حسن پیکر الفاظ، اے سبحان اللہ — کہ وجد وقتِ نگارش کرے ہے نوکِ قلم
نچوڑ کاوشِ اقوامِ ہند کا وہ زباں — عوام کی وہ زباں یعنی اردوئے اعظم
وہ ارضِ پاک ہوئی جس میں اس کی نشو و نما — وہ سرزمین، توانائی جس نے دی پیہم
وہ ہے دکن، ولی دکنی نے شاعری کی طرح — جہاں پہ ڈالی تھی پہلے پہل بہ زورِ قلم
شمالی ہند میں بعد دکن ہوئی مقبول، — ملا وطن کا تعاون اسے ہر ایک قدم
زباں کی بو سے معطر ہوا مشام او — مشاعرے بھی ہوئے منعقد بہ جاہ و حشم
نظیر غالب و اقبال داغ اور سیماب — فراق ملا و چکبست جوش اور عدم
حسن نیاز و حمید، احتشام و مالک رام — سہیل سیدی کرشن چندر جیسے اہل قلم
زرینہ، آمنہ، جیلانی نازلی عصمت — ملایا سرلا و عفت نے بھی قدم سے قدم
ہوئی ہے ہند میں پیدا نہیں پہلے گی بھی — یہ کشتِ زار ہے رونق رہینِ ابرِ کرم

ہے صلح جوئی جو حسنِ خلوص کی حامل
زبانِ اردو درخشاں ہے تیرا مستقبل

افسانے بھی لکھتے تھے۔ خالص صحافتی نقطہ نگاہ سے بہترین اداریہ نگار تھے۔ انگریزی اخبارات میں بھی لکھتے تھے نئی دنیا سے الگ ہو کر انہوں نے پیام وطن شروع کیا۔ وہ بند ہو گیا اور صاحبزادہ محمد شمس جالندھری نے بہت روزہ پیام مشرق شروع کیا تو اس میں آگئے اور کئی بار اس میں آئے گئے تین بار پیام وطن اور وہ بار بہت روزہ کا روان وطن جاری کیا۔ پرچم ہند میں بھی میرا ان کا ساتھ رہا۔ وہ روزنامہ ملک و ملت میں بھی رہے۔ انتقال کے وقت اپنا پرچہ کاروان وطن نکال رہے تھے کئی کئی گھنٹے ایک نشست میں اور جم کر لکھتے تھے اور بہت دل لگا کر لکھتے تھے مختصر سے مختصر اور طویل سے طویل مضامین لکھتے ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے مضمون کا جواب اور پھر جواب الجواب لکھتے اور مختلف پرچوں میں فرضی ناموں سے ان میں لڑائی جاری رکھے ہوئے قارئین رکھتے تھے انہوں نے پیام وطن کا ایک آزاد نمبر اور کاروان وطن کا ایک بے نظیر سالنامہ شائع کیا تھا۔ آزاد ہند میں استقلال ہوتا تو پنڈت نہرو، مولانا آزاد، لال بہادر شاستری اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے تعلقات ہونے کے باعث سیاسی طور پر بھی بہت اچھے جانے جاتے مگر ایسا نہ ہوا۔ ●●

اردو نمبر

تخلص بھوپالی۔ ہندوستان کے موجودہ مزاح نگاروں میں عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی کا نام سرفہرست ہے۔ وہ بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالرشید خاں صاحب بھوپال پولیس میں کوتوال تھے۔ تخلص صاحب بچپن کا زمانہ رعب دار سے تھے۔ پھر جنگ عظیم ثانی میں ہندوستانی فوج کے کلرک میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے تجارت شروع کی اور مل مالک بن گئے۔ تجارت کو اپنی منزل تک پہنچانے کے بعد انھوں نے بھوپال پنچ ۱۹۶۵ء اور پھر حیات رضا دی سے کتابیں لکھنا شروع کیں: "دست مادرم"، "شیطان حاکم الف"، "غبور میاں"، "در پاندان والی خالہ" (تین جلدوں میں)، لکھ کر اردو کے صف اول کے مزاح نگاروں سے اپنی ترکیہ کا لوہا منوالیا۔

مجتبیٰ حسین۔ ہندوستان کے صاحب طرز طنز نگار ہیں، ایک وسعنگ سیاست حیدرآباد کا مزاحیہ کالم لکھتے ہے۔ اب آندھرا پردیش کے محکمۂ تعلیمات میں ملازم ہیں اور ڈیپوٹیشن پر مرکزی حکومت کی ترقی اردو کمیٹی میں کام کر رہے ہیں۔ آپ نے غالباً ۱۹۶۳ء میں پہلی بار حیدرآباد میں ہندوستان کے مشہور طنز نگار شاعروں اور ادیبوں کی ایک محفل منعقد کی جو اب بھی ہر سال ہوتی رہتی ہے۔

نیاآلی۔ جی لال نیاآلی روزنامہ "پرتاپ" نئی دہلی سے تقریباً ۴۰ سال سے وابستہ ہیں۔ اردو کے بے نیاز طنز نگار ہیں۔ مسلمانوں اور ان کے مسائل کے بارے میں نیاآلی کا کمرشل ترجمان کر چلتے ہے۔ لیکن بی صحتوں میں وہ مسلمانوں سے بہت قریب ہیں۔ اکثر وہ کہتے ہیں: "صحافی میں مسلمانوں کا دشمن نہیں ہوں لیکن پیشہ ورانہ مجبوریاں ہیں کیا کروں؟" اس وقت ان کی عمر ۷۵ سال کے لگ بھگ ہے لیکن ان کا ذہن ابھی بوڑھا نہیں ہوا ہے۔

احمد جمال پاشا۔ لکھنؤ کے اخبار "قومی آواز" سے وابستہ ہیں۔ ہلکے پھلکے طنز اور مزاح کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ اپنے ابتدائی دور میں بے تحاشہ لکھتے تھے لیکن اب غم دوراں اور غم جاناں کے نتیجے میں ان کی طنز نگاری کو گھن لگنے لگا ہے۔ ان کی طنز نگاری کا آغاز "قومی آواز" کے مزاحیہ کالم "گھوریاں" سے ہوا اور اسی کے ذریعہ انھیں شہرت حاصل ہوئی۔

مضطر ہاشمی۔ گزشتہ سال نہایت کسمپرسی کے عالم میں مضطر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ یہ ان مسلمان صحافیوں میں سے تھے جو تقسیم وطن کے بعد پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔ ابتدا میں ریڈیو کشمیر سے ان کے مزاحیہ اور طنزیہ خاکے نشر ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ روزنامہ "نئی دنیا" اور روزنامہ "پرتاپ" نئی دہلی میں کام کیا اور "انقلاب" بمبئی کا طنزیہ کالم بھی لکھا۔ آخری عمر میں ایک غیر ملکی خبر رساں ایجنسی "تاس" سے وابستہ ہو گئے اور جب دہلی میں تاس کا دفتر بند ہوا تو مضطر ہاشمی بے کار ہو گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مضطر صاحب کو شراب نے پی لیا۔ معلوم نہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے۔ مضطر صاحب بڑے کرو فر کے انسان تھے اور ہر حال میں خودداری کا دامن تھامے رہتے تھے۔

فکر تونسوی۔ روزنامہ "ملاپ" نئی دہلی سے وابستہ ہیں اور "ملاپ" کا مزاحیہ کالم "پیاز کے چھلکے" لکھتے ہیں۔ فکر صاحب کی تحریروں میں بے پناہ شوخی ہے، ہر روز نئے موضوع پر لکھنا اور قارئین ملاپ کو ہنسانا واقعی ان ہی کا حصہ ہے۔

علامہ روحانی۔ روزنامہ "نئی دنیا" دہلی کے مزاحیہ کالم "نجام بکف" علامہ روحانی ہی کے نام سے لکھا جاتا تھا۔ یہ ایک قلمی نام تھا اور اسی نام سے مولانا عبدالوحید صدیقی، مولانا عبدالباقی مرحوم، اشرف بھوپالی مرحوم، اختر صدیقی، مہدی نظمی، احمد مصطفیٰ راہی صدیقی اور پیمانہ صدیقی نے برسوں لکھا۔ "نئی دنیا" کے ساتھ علامہ روحانی بھی انتقال فرما گئے۔ ●●

قطعات بنام اردو مرحوم

بس اتنا ہی سمجھ پایا ہوں اب تک
یوں ہی ہے آپ کی اردو نوازی
مسیحا فاں جس طرح ہو مقبرے پر
کسی مردہ کی جیسے چارہ سازی

نیتاؤں کی نظروں میں تو مردود ہے اردو
دفتر میں کہیں جائیے مفقود ہے اردو
لیکن یہ سیاست کی نمائش معاذاللہ
دستور کے صفحات پہ موجود ہے اردو

اردو کو بنا رکھا ہے کیا خوب تماشا
یوپی کی زباں ہے نہ یہ پنجاب کی بھاشا
ہم زندہ کریں گے اسے پھر زندہ کریں گے
بے گور و کفن رہنے بھی دو اردو کا لاشا

ہیں ہند میں کتنی ہی زبانیں رائج
کوئی بھی نہیں اس کی مگر ہم پایہ
کہتے ہیں جسے آپ زبانِ اردو
تہذیب کا ہے بیش بہا سرمایہ

لیں الکشن میں جس زباں سے کام
عشق اس سے ہے کس قدر فرضی
ہم کو غدار کا خطاب ملے
اس زباں میں اگر لکھیں عرضی

اردو و ہندی کی کیسی کشمکش
ان میں رشتہ ہے پرانا میل ہے
یہ زبانوں کا تصادم کچھ نہیں
درحقیقت اک سیاسی کھیل ہے

(حمی سیتاپوری)

سر تیج بہادر سپرو کا بسترِ مرگ سے اُردو کے بارے میں آخری خط

خالد صدیقی

سر تیج بہادر سپرو ہندوستان کی سیاست میں ممتاز ترین فرد اور بلند پایہ راہنما اور رہبر کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برطانیکا میں انہیں دنیا کے ان چند لوگوں کی صف میں جگہ دی گئی ہے جنہوں نے قوموں کے مزاج کو سمجھا اور ان کی رگوں میں اپنا خون دوڑایا۔ سر سپرو ۸ دسمبر ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے اور ۲۰ جنوری ۱۹۴۹ء میں رحلت فرما گئے۔ ۷۵ سال کے اس عرصہ میں انہوں نے کم و بیش ۵۰ سال اردو کے لیے صرف کر دیے۔

ان کے لیے حلیف اور حریف دونوں ہی اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ایسے دانشور تھے جنہیں ذہانت دار ہونے کا فخر بھی حاصل تھا۔ سر سپرو نے عدالت کے میدان میں سیاست سے زیادہ نام اور شہرت حاصل کی لیکن ذہانت داری یہاں بھی قائم رہی۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ میں ابتدائی دنوں میں سات سال تک کوئی مقدمہ اس لیے نہ مل سکا کہ انہوں نے جھوٹے مقدمات کے لیے دلالوں کا سہارا نہیں لیا۔ پھر اس میدان میں وہ نام کمایا کہ ۱۹۱۹ء میں وائسرائے کونسل میں مشیر قانون کے عہدہ پر فائز کیے گئے۔ اس دور میں یہ اقتدار کسی ہندوستانی کے لیے معراج جیسا ہی تھا۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۶ء تک وہ یوپی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر رہے۔ ۱۹۳۱ء میں گاندھی اروِن معاہدہ بھی انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے جس نے گول میز کانفرنس میں مہاتما کی شرکت کے لیے راہیں ہموار کیں۔ ان تینوں کانفرنسوں میں خود سر سپرو نے بھی شرکت کی۔

سیاسیات سے قطع نظر انہیں اردو سے شاید جتنا قلبی تعلق تھا وہ کسی اور شخص کے حصہ میں نہیں آیا۔ جنوری ۱۹۴۹ء میں علالت کے دوران ایک ہندی شدہ ہندی بولنے پر اس قدر ناراض ہوئے کہ علاج تو کیا اسے حال بتانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے جو کچھ کمایا خرچ کر دیا۔ ان کے مکان پر شام کو ایک شام اردو کا ہوتا تھا جس میں اردو شاعری، الفاظ، محاورات پہ گفتگو ہوتی تھی۔ انہیں اقبال سے عشق تھا، دونوں ہی ہم نسل یعنی کشمیر کے سپرو خاندان کے فرد تھے۔

سر تیج بہادر نے بسترِ مرگ سے ایک خط آنجہانی جواہر لال نہرو کو لکھا جس میں سوائے اردو کے مستقبل کے اور کوئی خاص بات نہیں کی گئی۔ یہ خط مرحوم نے ۲ دسمبر ۱۹۴۸ء کو لکھا اور ۲۰ جنوری ۱۹۴۹ء کو وہ رحلت فرما گئے۔ اس انگریزی خط کا ترجمہ پنڈت نہرو کی کتاب اے بنچ آف اولڈ لیٹرز کے صفحہ ۴۲۷ سے کیا گیا ہے جس میں غالب کا شعر مرحوم نے اردو میں ہی لکھا تھا۔

الٰہ آباد

۲ دسمبر ۱۹۴۸ء

میرے پیارے جواہر لال جی

اخبارات میں آپ کے تمام بیانات پڑھ کر میرے دل میں آپ کی عزت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ آپ کی سالگرہ پر آپ کو تحریر کرنا چاہتا تھا لیکن ان دنوں میری حالت بہت خراب تھی۔ اب میں آپ کو اپنی نیک خواہشات غالب کے ایک لافانی شعر کے روپ میں ارسال کر رہا ہوں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

زبان کے مسئلہ پر میں یوپی کے چند کانگریس رہنماؤں کے رویّہ سے قطعی خوش نہیں ہوں، ہر ممکن طریقہ سے ہندی سیکھی جائے لیکن یہ بات فراموش نہ کی جائے کہ اردو مسلمانوں ہی کی زبان نہیں ہے۔ ہندوؤں نے بھی اس زبان کے لیے بڑا سرمایہ فراہم کیا ہے۔ روہیلکھنڈ اور مغربی یوپی کے باشندے اس ہندی کو سمجھنے سے قطعی معذور ہیں جو مشرقی یوپی میں بولی جاتی ہے۔ میں اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہوں کہ ملک کے دوسرے علاقوں کے لوگ بھی اس شدھ ہندی کے استعمال سے بیزار ہیں چونکہ وہ اسے اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے۔ مجھے اس بات کا بھی یقین کامل ہے کہ بعض انگریزی الفاظ کے ہندی ترجمے آپ کی سمجھ سے بھی بالاتر ہوں گے۔ چونکہ میں اس مسئلہ پر جذبات سے بے نیاز ہو کر معروضی رنگ میں سوچنے کا عادی ہوں اسلیے مجھے احساس ہے کہ یہ روش ایک روز تشکیک کا باعث بنے گی۔ بیماری اور کمزوری کی وجہ سے مجھ میں اس سے زیادہ کچھ اور لکھوانے کی طاقت نہیں ہے۔

میری بیماری میں ابھی تک کوئی اصلاح نہیں ہوئی ہے۔ مثانہ اور فالج کے امراض کے علاوہ مجھے سوءِ ہضم کی بھی شکایت پیدا ہو گئی ہے۔ اکثر و بیشتر اس بیماری کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ دن میں پانچ چھ بار (CATHETER) کیتھیٹر کے ذریعہ پیشاب نکالا جاتا ہے۔ بہرحال مجھے ان تمام باتوں کا نتیجہ معلوم ہے جسے سامنے رکھ کر مجھے زندگی کے آخری سفر کی تمام تیاریاں مکمل کر لینا چاہئیں۔ تاہم مجھے اپنے ستاروں پر فخر ہے کہ میں نے ہندوستان کو اپنی زندگی میں آزاد ہوتے ہوئے دیکھ لیا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ ملک کی سربراہی آپ کو تفویض کی جا چکی ہے۔ نیک خواہشات کے ساتھ

مخلص   تیج بہادر سپرو۔

اُردو، ہندی مقدمہ!

[illegible] قصہ پارینہ را

• شاہد صدیقی

اُردو، ہندی تنازعہ آج کے دور کی بات نہیں ہے۔ آج سے تقریباً ایک صدی قبل بھی اُردو کے قلب و جگر پر بھرپور وار کیے گئے تھے لیکن یہ اُردو کی سخت جانی تھی یا اس کی ہمہ گیر افادیت کہ وہ ان حملوں سے مجروح ہو کر بھی اس زبان کو [illegible] سے منسلک کیا جہاں وہ پیدا ہوئی، پنپی اور برسوں سے جو دریا تک سیلاب کی طرح پھیل گئی۔ ہر ممکن کوشش کی گئی۔ جاہلانہ حکومت کے ایوانوں میں ہزاروں دستخطوں سے عرضداشتیں پیش کی گئیں [illegible] کے دعووں پر دستک دی گئی تاکہ اُردو زبان کو ان سے نکال دیا جائے اور اس کی جگہ ہندی کو فروغ دیا جائے۔ اگرچہ انگریزوں کی حکومت تھی لیکن انگریزی زبان کو عوام پر لادنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ [illegible] فارسی کی جگہ تقریباً سارے ہندوستان میں اُردو سرکاری زبان کی جگہ لے چکی تھی دیگر ریاستوں میں بھی۔

ٹھکانہ۔

"ہندی اس رسم الخط (دیوناگری) کے علاوہ کسی زبان کے لیے کی اہلیت کے خلاف بین ثبوت ہے"

ڈاکٹر موصوف کے اس فیصلہ کو سامنے رکھتے ہوئے صاف واضح ہو جاتی ہے کہ اُردو کا رسم الخط شارٹ ہینڈ کی بہت سی صلاحیتوں کا حامل ہے۔ ان دنوں شارٹ ہینڈ اور اسٹینو گرافی کا چلن نہیں تھا اور اُس کی عدم موجودگی میں اُردو تیز رفتاری کے ساتھ لکھی جانے کی وجہ سے علی الخصوص عدالتی کارروائی کیلئے بڑا سہارا تھی۔

خود ہنٹر کمیشن نے اس تنازعہ سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا اُن کے بین السطور آج بہت کچھ سوچا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے مراسلے مورخہ ۲۹ اکتوبر ۱۸۸۲ء میں تحریر کیا تھا بہار کے ہندوؤں کے بارے میں مندرجہ ذیل الفاظ بھی لکھے ہیں۔

"اہل ہنود میں کائستھوں جیسا مسلم الثبوت طبقہ جو سرکاری اور عدالتی زبان میں تقریباً اجارہ داری کی حیثیت کا مالک ہے۔ اس بات کے خلاف ہے کہ ہندی زبان کو اُردو زبان پر فوقیت دی جائے۔"

اس مراسلے ماری میں ایک انسر اعلیٰ نے تو یہاں تک تحریر کیا تھا کہ ہندی زبان کو ہندوستان میں رائج کرنے کے متعلق سوچنا کچھ ایسا ہے جیسا کہ ہندوستان کی سرکاری زبان بنانے کیلئے چینی زبان کی بات کیا جائے۔

ان دونوں زبانوں کے جھگڑے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزی حکومت نے اس بات پر زور دیا کہ دونوں زبانوں سے الگ انگریزی کو عدالتی زبان قرار دیدیا جائے۔

اس مقدمہ کے دوران ضمنی بھی رائیں موصول ہوئیں ان میں زیادہ تر اُردو کے حق میں تھیں لیکن رائے دینے والے تمام انسان ایک بات پر متفق تھے اور وہ یہ تھی کہ اُردو زبان میں جو فارسی اور عربی کے مشکل اور دقیق الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں انہیں ترک کر دیا جائے اور اُردو لکھتے وقت خصوصاً اس بات کا دھیان رکھا جائے کہ اس کی لکھاوٹ عام لوگوں کے لئے قابل فہم ہو۔

اُردو ادب اور ہندوستانی تہذیب

• سراج انور مصطفیٰ آبادی

۱۹۴۷ء میں ہندوستان نے آزادی حاصل کر لی لیکن آزادی ملنے کے ساتھ ہی ملک بھی تقسیم ہو گیا۔ ان واقعات کا خاص اثر ہندوستانی سماج اور معاشرت پر پڑا۔ آزادی سے قبل ہی اردو ادب میں انقلاب پسند اور ترقی پسند تحریک چل رہی تھی۔ اس تحریک کے زیر اثر مصنفین نے نظم اور نثر کے میدان میں انسانی حقوق، مساوات، جمہوری اقدار اور قومی روایات پر مشتمل تخلیقات پیش کیں۔ اردو کے روایت پسند شعراء کا کلام بھی مشترکہ تہذیب کی اعلیٰ قدروں اور گنگا جمنی تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ جگر مراد آبادی نے فرمایا تھا۔

ان کا جو کام ہے اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جگر مرحوم کی نظموں میں قحط بنگال، گاندھی جی کی یاد میں، اعلان جمہوریت اور ساقی سے خطاب ایسی نظمیں ہیں جو انسانی ہمدردی، مساوات، خلوص، حب الوطنی اور قومی یکجہتی کی آئینہ دار ہیں۔ "ساقی سے خطاب" اس نظم کا ہر شعر درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی
سلامت تو، ترا میخانہ، تری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

انسان کی علمی اور سائنسی ترقی بھی دنیا کو امن و سکون کا پیغام نہ دے سکی جگر اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کہاں سے بڑھ کے پہنچے ہیں کہاں تک علم و فن ساقی
مگر آسودہ انسان کا نہ تن ساقی نہ من ساقی
وہی انسان جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا

وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

روایت سے ہٹ کر نئے انداز میں غزل کہنے والے شعراء جدیدیت کے پرستار کہلاتے ہیں۔ ان شعراء نے اپنی غزل میں نئے علائم، ملکی تلمیحات ملکی ماحول۔ اور داستانوں کے علاوہ دیومالاؤں کے کردار تک کو جگہ دی ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

چل اے دل چل کچھ وقت گزاریں رشیوں کی امرائی میں
شاید منشی مید آجائے اُس آنچل کی پروائی میں

اس موسم کی کیا بات ہے جب پوری ہوں من کی آشائیں
اک چاند گگن کے اوپر ہے اک چاند مری انگنائی میں
(عمیق حنفی)

رشیوں کے ماوں گھبرائے جائے تم کس دیس سے
غم کی دھوپ اتر آئی ہے جیون کی انگنائی میں
یادیں تو اکسا دیتی ہیں کھولی سری جوگن کو
آنسو آگ لگا دیتے ہیں ساون کی پروائی میں
(شکیل اعظمی)

اسی طرح اردو کے ہر دور اور ہر مکتب فکر کے شعراء دراصل ہندوستانی تہذیب کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ وہ ہندوستانی فکر و ذہن رکھتے ہیں۔ انہی حقائق کے پیش نظر اردو ادب ہندوستانی تہذیب کا آئینہ دار بن گیا ہے جس پر کوئی بھی غیر ملکی ہونے کا الزام نہیں لگا سکتا۔ ضرورت ہے کہ حکومت اس زبان کو اس کا جائز حق دے۔

ماحول کے سانچے میں ڈھلی ہے اردو
ہند کی گود میں ماؤں سے پلی ہے اردو
دل کی آواز بھی کہتی ہے اے اہلِ وطن
اپنی تہذیب کا عنوان جلی ہے اردو۔

ملکہ جان

ملکہ تخلص، نام ملکہ جان، عرف بی بی ملکہ، توم آرمینی۔ انیسویں صدی کی مقبول شاعرہ گزری ہے۔ پہلے بنارس میں رہتی تھی لیکن قدر دانوں کی تعداد کلکتہ میں زیادہ ہونے کی وجہ سے کلکتہ چلی آئی اور یہیں بس گئی۔ چونکہ رقص و سرود کے سلسلے میں تمام ہندوستان میں مشہور تھی۔ اس کی عشق و فریاد کی ایک داستان نام "مخزن الفت ملکہ" جولائی ۱۸۶۹ء میں کلکتہ سے شائع ہوا جس کے پبلشر محمود زیر علی فدا ہر میر مکرد شہرت تھی۔ اس دیوان کے ۸۰ صفحات ہیں۔ ابتدا میں ملکہ جان کی غزلیں، گیت، ٹھمریاں اور ہولیاں ہیں دیوان کے آخر میں چند قدر دانوں کے قطعے اور تقریظی نظمیں ہیں۔ ملکہ کلکتہ کو صاحب طال تھے ملکہ جان محفل سخن میں شریک ہوا کرتی تھی، اور غزلیں پڑھتی اور گایا کرتی تھی۔ کبھی کبھی اپنے گھر پر بھی مشاعرے منعقد کرتی تھی۔ ملکہ کے کلام میں شیریں الفاظ ہے اور اس کی غزلیں گائی جا سکتی ہیں۔ فن موسیقی سے بھی وہ بخوبی واقف تھی۔ کلکتہ سے شائع شدہ ملکہ کا یہ دیوان برٹش میوزیم لائبریری لندن میں محفوظ ہیں۔ حضرت داغ دہلوی جب حجاب کی محبت میں گرفتار ہو کر کلکتہ آئے اور حجاب کے مکان پر مقیم تھے ان دنوں ان کی ملاقات ملکہ جان سے ہوئی تھی اور یہ ملاقاتیں دوستی میں بدل گئی تھیں چنانچہ اس کا پتہ چلتا ہے کہ بعد میں بھی ملکہ جان سے داغ کی خط و کتابت جاری رہی۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو

تر دامنی سے اپنی نہیں غم مجھے ذرا
بحرِ کرم ہے جوش پہ آمرزگار کا

ملکہ ہے جس سے صد ساں ناگہاں
صدمہ نہ ہوگا اس کو ہی کے خمار کا

اپنی حیرت کی کوئی شکل بتاؤں تو کہوں
سامنے آئینہ سا ان کو بٹھاؤں تو کہوں

★★

بقیہ: اردو مفکرین کی نظر میں

کیپٹن ڈی۔ آر۔ موہن:۔ اردو ہماری تاریخ کے سینے میں دل کی طرح دھڑک رہی ہے یہاں مجھے یہ وضاحت کرنے کی اجازت دیجیے کہ اسلامیان ہند کو ہندی سے بھی کچھ کم عشق نہیں رہا۔ آخر ہم امیر خسرو، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خان خاناں، رسخان اور تاج کے کارناموں کو کس طرح فراموش کر سکتے ہیں۔ ہندی اگر سنسکرت سے خون کے رشتے کی دعویدار ہے تو اردو کو بھی سنسکرت کی بیٹی ہونے کا اعزاز ہے کوئی محروم نہیں کر سکتی۔ اردو ہندوستان کی دولت ہے اور چونکہ ہم اہل کرم ہیں اس لیے اس دولت کا کچھ حصہ پاکستان کو بھی مرحمت فرماتے ہیں۔ (سرلسانی اردو کونسل ۲۱، اکتوبر ۲۳ء منعقدہ لکھنؤ کا خطبہ صدارت)

پی یم سعید (ایم۔ پی):۔ کوئی بھی زبان کسی ایک قوم کی میراث نہیں ہوتی یہ غلط ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے یہ ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں سب کی مشترکہ وراثتی ادب ہے۔ (ہما اپریل ۷۲ء)

راجہ چرن سنگھ مہاراجہ آف سمترا دیا: اردو ادب اور زبان کو ہر فرد کے لیے ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ اس سلسلے میں میرا نظریہ یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص اردو نہیں پڑھتا اس وقت تک اس کی زبان، تہذیب اور طرز گفتگو میں جاذبیت اور اثر اندازی کی کیفیت نہیں پیدا ہوتی میرے آباؤ اجداد سب اردو کے پرستار رہے ہیں اور سب کا یہ نظریہ رہا کہ انہوں نے ہم لوگوں کو بھی اردو پڑھا دیا چنانچہ یہی چیز میرے ورثے میں بھی آئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو اور ہندی زبان اس ملک کی دو خوبصورت آنکھیں ہیں۔

پنڈت آنند نرائن ملا:۔ اگر آج اردو کے ساتھ ایسی زبردست ناانصافی روا رکھی گئی تو کیا اندیشہ نہیں کہ کل کوئی گروہ کسی اور زبان کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے جو آج اردو کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ جمہوری نظام میں روایات قائم کی جاتی ہیں اور ناانصافی کی روایات قائم کر کے جمہوریت کی بیخ کنی کرنا ہے۔ زندگی کا ایک اٹل قانون ہے کہ جب کسی دوسرے کا حق چھینتے ہیں اس وقت ہم خود اس روز کو دعوت دیتے ہیں جب ہمارا حق بھی لازمی طور پر ہم سے کوئی اور چھین لے گا۔

(خطبہ صدارت سرلسانی کونسل)

مسز سبھدرا جوشی:۔ اردو کو ایک اچھا مقام ملنا چاہیے بہت سے نیک اور بھلے کام جو کانگریس نہیں کر سکی ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا حکومت کو عملی اقدام سے اس زبان کے تحفظ و ترقی کے لیے ضرور کچھ کرنا پڑے گا۔ اردو کسی ایک قوم کی زبان نہیں وہ ہندوستان کی زبان ہے وہ اسی سرزمین سے نکلی ہے۔

(حالہ ہندی کی ملاقات ہما ستمبر ۶۹ء)

بابائے اردو عبدالحق:۔ اردو زبان کے ترک کرنے والوں کو "وفاداری" کی شرط اول قرار دیا جاتا ہے اردو کو غیر ملکی اور اردو والوں کو غدار کہا جاتا ہے۔ اور مطالبہ کیا جاتا ہے کہ یہ سب غدار پھانسی کے حقدار ہیں۔

اردو والے غدار ہیں پھانسی کے حق دار ہیں

ستم ظریفی یہ ہے کہ مطالبہ بھی اردو زبان ہی میں کیا جاتا ہے۔ اردو کے سخت سے سخت مخالف اور دشمن اردو زبان ہی میں مخالفت کرتے ہیں۔

(اردو تحریک اور خطبات)

عالیہ عسکری:۔ زبان کا کوئی مذہب نہیں وہ جغرافیائی حدود کی پابند بھی نہیں۔ اگر کوئی ناداں اردو کو کسی نام پر ختم کرنے کی بات سوچتا ہے تو وہ ایسی ہی کوشش ہے جیسے کوئی عقل و ہوش سے بیگانہ تاج محل کو ڈھا دینا چاہے۔ گنگا جمنا کی بہتی لہروں کو روک ڈالنے کی سعی کرے۔ قطب کی برجی کو توڑ دے میں کہتی ہوں گنگا جمنا کی لہروں کو روک دو، تاج محل کو ڈھا دو، قطب کی برجی کو توڑ دو لیکن پھر دیکھو ہندوستان میں کیا بچتا ہے۔ اردو ہندو مسلم اتحاد کی یادگار اور پیار و محبت کی نشانی ہے۔ پیار اس کی رگوں میں ایسے ہی جذب ہے جیسے چنبیلی کے پھول میں خوشبو۔ اور بغیر خوشبو کے چنبیلی کے پھول کا تصور ممکن نہیں۔ (اسٹوڈنٹس اردو کونسل ۵۵ء کا خطبہ استقبالیہ)

تیج بہادر سپرو:۔ وقت اس کا فیصلہ کرے گا کہ اردو وہ زبان نہیں ہے جسے نظر انداز کیا جا سکے۔ یہ جیسے مسلمانوں کی زبان ہے ویسی ہی ہندوؤں کی بھی۔

سر شنکر لال:۔ اردو زبان مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول سے پیدا ہوئی اور صدیوں سنورنے کے بعد اس صورت میں جلوہ گر ہوئی۔

کرشن چندر:۔ ہندو مسلمان سکھ عیسائی ہر قوم کے ہر راج کے ہر گوشے کے لوگ اس سے ملتے ہیں، یہ اردو زبان نہیں ہے۔ یہ سارا ہندوستان ہے۔ یہ ہماری زبان ہماری مشترکہ تمدن کی روح ہے۔ ہمارے مشترکہ تہذیب کی وارث ہے۔

مالک رام۔ ایم۔ اے:۔ یہ تنہا بولی ہے جو اس وقت بھی ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بول چال و تبادلۂ خیال میں کام آتی ہے اور آئندہ بھی سارے ملک کی مشترکہ زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ایڈیٹر بیسویں صدی خوشتر گرامی:۔ اردو میری زبان ہے میرا اوڑھنا بچھونا ہے ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک اردو بولی بھی جاتی ہے میرے نزدیک ہر لحاظ سے شیریں زبان ہے۔

پروفیسر راجندر شیدا۔ ایم۔ اے:۔ اردو بے تعلق مذہب و ملت کئی کروڑ ہندوستانیوں کی مادری زبان ہے۔

راماننذ ساگر (بمبئی):۔ اردو کا حسن کے تانے میں ہندو سکھ اور مسلمان ادیبوں کا برابر حصہ ہے۔ بالکل گلا گھونٹ دینا انسان اور انسان کے درمیان انسانی تعلقات کا گلا گھونٹنا ہے۔

جگن ناتھ آزاد ایم۔ اے:۔ اردو زبان کو ختم کرنے کی کوشش کو میں ناپاک اور قومیت کے اصول کے منافی سمجھتا ہوں۔ اردو ہندوستان میں ایک مہذب متمدن اور ترقی پسند زبان ہے۔ اردو کا دشمن ہندوستان کا دشمن ہے۔

مسٹر نیرد چودھری نامور انگریز مصنف:۔ میں اردو نہیں جانتا لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ اردو زبان اب زیادہ سے زیادہ صرف مسلمانوں تک محدود ہو جائیگی۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک ایسی ہی تمدنی زبان بن جائیگی جیسے عیسائیوں کے لیے انگریزی۔

(انٹرویو ہما اردو ڈائجسٹ فروری ۷۰ء)

مسٹر کلدیپ نائر ایڈیٹر انگریزی اخبار اسٹیٹس مین:۔ اس وقت مرکز نے بیدار مغز روشن خیال ترقی پسند وزیر مسٹر آئی۔ کے۔ گجرال کی سرپرستی میں ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے جو اردو کی بقا و تحفظ کے لیے تجاویز پیش کرے گی۔ یہ کمیٹی ابھی اعداد و شمار فراہم کر رہی ہے لیکن سچی صاف سیدھی اور سادی بات یہ ہے کہ ان کمیٹیوں اور اعداد و شمار اور انعام و اکرام سے کچھ نہیں ہوگا اردو کے تحفظ اور بقا کے لیے واحد اقدام یہ ہے کہ اسے ملک کی قومی زندگی میں اس کا جائز مقام بحال کیا جائے۔

(اردو کانفرنس پٹنہ کا خطبہ صدارت)

★★

محترمی تسلیم!

ہم نے مارچ کے آخری ہفتہ میں اردو ڈائجسٹ ھما کا 'اردو نمبر' شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ ھما کے 'اردو نمبر' کے سلسلے میں مندرجہ ذیل سوالنامہ آپ کی خدمت میں ارسال کیا جا رہا ہے، امید ہے کہ آپ اس کا جواب فروری کے آخری ہفتہ تک ارسال فرما دیں گے تاکہ اس دستاویزی نمبر میں آپ کے خیالات کو جگہ دینے کا شرف حاصل کیا جا سکے (اگر جواب کے ہمراہ پاسپورٹ سائز کا اپنا فوٹو بھی عنایت فرمائیں تو شکر گزار ہوں گے)

مخلص
عبدالوحید صدیقی
ایڈیٹر، اردو ڈائجسٹ ھما ۱۷-ج، جھنڈے والان ایکسٹینشن نئی دہلی ۱۴

سوالنامہ

۱۔ کیا آپ کے خیال میں اردو کے ساتھ نا انصافی ہو رہی ہے؟

۲۔ اردو کو اس کا جائز حق دینے کے لیے حکومت اور اردو پسند حلقوں کو کیا کرنا چاہیے؟

۳۔ کیا اردو کی ترقی کے لیے صرف اردو شاعروں اور ادیبوں کو انعامات سے نوازنا یا دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے حکومت کا کوئی مالی امداد دینا کافی ہے؟

۴۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو سب سے زیادہ نقصان کس نے پہنچایا؟

۵۔ کیا آپ کے خیال میں اردو یونیورسٹی کے فوری قیام کی ضرورت ہے؟ اور کیا صرف اردو یونیورسٹی کے قیام سے اردو کا مسئلہ حل ہو جائیگا؟

۶۔ آپ بذاتِ خود اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

اردو ڈائجسٹ ھما کے ایڈیٹر مولانا عبدالوحید صدیقی نے ممتاز مکتبۂ سیاست کے رہنماؤں، اردو کی خدمت کرنے والی تمام تنظیموں، مختلف یونیورسٹیوں، کالجوں اور درس گاہوں میں شعبۂ اردو کے سربراہوں، ممتاز اخبار نویسوں اور اردو کے نامور ادیبوں کو مندرجہ بالا سوالنامہ جنوری کے آخری ہفتہ میں ارسال کیا تھا۔ جس کا جواب فروری کے آخری ہفتہ تک مانگا گیا تھا۔ چنانچہ جن حضرات کے جوابات مارچ کے پہلے ہفتہ تک بھی ملے ان کو اسی ترتیب کے ساتھ جس ترتیب سے وہ وصول ہوئے ہیں شامل کر دیا گیا ہے۔ جن حضرات کے جواب طویل تھے ان کے جوابات کی اس حد تک تلخیص کر دی گئی ہے کہ ان کی روح مجروح نہ ہونے پائے باقی حضرات کے جوابات من وعن شائع

کئے جا رہے ہیں۔ اسی طرح جن حضرات کے جواب تاخیر سے وصول ہوئے یا جواب اتنے زیادہ طویل تھے کہ جگہ کی تنگی اس کی متحمل نہ ہو سکی تو ہم ان سب حضرات کی خدمت میں معذرت پیش کرتے ہیں۔ (ہماری آئندہ اشاعتوں میں ان کے لئے کچھ صفحات نکالنے کی کوشش کی جائے گی) ہم خصوصاً قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ جگہ کی تنگی نے ہمیں زیر نظر صفحات کے حروف کچھ خفی کر دینے پر مجبور کر دیا تاکہ زیادہ سے زیادہ مواد قارئین تک پہنچ سکے۔ (احمد مصطفیٰ صدیقی)

ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی۔ ایم اے، ڈی فل

شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد

(۱) ہندوستان میں زبان کا مسئلہ دوسرے ملکوں سے کسی قدر مختلف ہے۔ دوسرے ملکوں میں قوموں کی عموماً ایک ہی زبان ہوتی تھی اس لئے لسانی مسئلہ پیچیدہ نہیں ہوا کرتا یا کم از کم اس قدر پیچیدہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہاں اقلیت اور ناانصافی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں مختلف رنگ و نسل کے لوگوں کے ساتھ متعدد اور مختلف زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ کسی تاریخی اور سماجی تبدیلی کے سبب جب انیسویں صدی میں ہندوستان کی سربرآوردہ زبان انگریزی ہوئی تو بھی اردو کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ انگریزوں نے اردو کو عوامی بولی اور زبان دیکھ کر اسے عدالت کی زبان بھی قرار دے دیا۔ پھر کچھ تنگ نظر لوگوں نے اسے صرف مسلمانوں کی زبان اپنے ذہن میں قرار دے لیا۔ بس یہی ذہن میں چھپا ہوا خیال اردو کے حق میں سم قاتل بن گیا۔ جب ملک تقسیم ہوا تو اسی خیال کے لوگوں نے یہ پھیلانا شروع کیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور چونکہ پاکستان مسلمانوں کا ہے اس لئے مسلمانوں کو بھی پاکستان چلا جانا چاہئے اور اردو زبان کو بھی ہندوستان میں رہنے کا حق نہیں۔ وہ لوگ تھے جو زبان کو مذہب اور سیاست کی عینک سے دیکھتے تھے۔ ان میں کچھ اردو زبان کی لسانی تاریخ جانتے ہوئے بھی تعصب کی بنیاد پر ایسا کر رہے تھے اور کچھ لوگ محض نادانستہ طور پر اس نقطۂ نظر کو اپنائے ہوئے تھے۔ ایسی صورت میں کسی زبان کے ساتھ انصاف ممکن نہیں ہوتا پھر اردو کے ساتھ کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔

ہندوستان کے آئین نے جب ملک کی زبان ہندی کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ طے کیا تو لوگ یہ سمجھنے لگے کہ حکومت کی زبان کے بعد مادری زبان کا کوئی حق نہیں رہ جاتا۔ اس لئے اب صرف ہندی ہی کو حق حاصل ہے کہ وہ ملک میں بڑھے پھیلے۔ ابتدا میں حکومت نے اس مسئلے کی طرف زیادہ توجہ بھی نہیں دی اس لئے یہ خیال اور زیادہ مضبوط ہوتا گیا۔ اسکولوں اور کالجوں میں جہاں اردو پہلے سے موجود تھی وہاں کہیں تو باقی رہی اور کہیں سے ختم کر دی گئی۔ اس کے بعد ملک میں تعلیم کا جو چرچا ہوا، نئے اسکول اور کالج کھلے تو ان میں اردو کو نصاب میں شامل نہیں کیا گیا۔ جہاں شامل کیا گیا وہاں یہ شرط لگا دی گئی کہ جب تک چالیس طالب علم نہ ہوں اردو کلاس نہیں کھل سکتے، یعنی جہاں چالیس طالب علم ہوتے وہاں اساتذہ کا تقرر نہ ہوتا۔ غرض کہ ہر طرح سے اردو سے بغض و عناد رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ حکومت اردو کے ساتھ کچھ کرنا بھی چاہتی تو حکومت کے کارندے اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچنے دیتے اور یہ سلسلہ آج تک کسی نہ کسی شکل میں چلا آ رہا ہے۔ پہلے تو اسکولوں میں اردو کا نصاب ہی نہیں ہوتا، پھر اگر ایسا ہوا بھی تو کوئی استاد نہیں اور کوئی استاد پڑھانے کے لئے مقرر ہو گیا تو کورس کی کتابیں ندارد۔ بے چارے طالب علم امتحان کی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ شعور بہت بعد میں آتا ہے کہ وہ کسی نصاب کو کیوں پڑھتا ہے۔ اس لئے وہ گھبرا کر اردو ہی کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح اردو کی تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد منتشر ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج وہ حضرات بھی جو اردو کی درس و تدریس میں یونیورسٹیوں اور دوسرے علمی اداروں میں مشغول ہیں خود ان کے بچے بھی اردو سے تقریباً ناواقف ہیں۔ اس طرح اردو کے ساتھ ناانصافی کے مختلف رخ ہیں جب تک ان کمیوں اور خامیوں کو دور نہیں کیا جاتا اردو کے ساتھ ناانصافی برقرار رہے گی۔

(۲) آپ کے دوسرے سوال کا جواب میری نظر میں بہت مختصر ہے۔ حکومت سے صرف ایک معمولی سی درخواست کی جائے کہ ان تمام صوبوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی اچھی تعداد ہے وہاں حکومت، میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ اور سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے تمام اسکولوں میں ایک اردو کے استاد کا تقرر لازمی کر دے اور اسکی بحث نہ اٹھائے کہ لڑکوں کی تعداد کیا ہے۔ اسی تعداد کا سہارا لے کر اسکولوں سے اردو کو ہٹایا جاتا ہے۔ اگر اردو کے طالب علم کسی سال نہ ہوں گے تب بھی کچھ فرق نہ پڑے گا۔ اس لئے کہ وہ استاد دوسرے موضوع پڑھائے گا۔ یوں بھی چھوٹے اسکولوں میں اساتذہ صرف ایک ہی موضوع نہیں پڑھاتے بلکہ انہیں کئی مضامین پڑھانے پڑتے ہیں۔ اس لئے کوئی مالی نقصان اداروں کو نہ ہوگا۔ پرائیوٹ اسکولوں کو اس وقت تک منظوری نہ دی جائے جب تک اردو کا مضمون ان کے یہاں نصاب میں شامل نہ ہو۔ اس طرح اردو لازمی مضمون نہ ہوگی بلکہ اردو پڑھنے والوں کے لئے یقینی مواقع فراہم ہوں گے۔ اگر اردو دوست حکومت سے صرف یہ بات منوا لیں اور حکومت سچے دل سے اس پر عمل کرے تو اردو کا مسئلہ بہت بڑی حد تک حل ہو جائے گا۔

اردو دوستوں اور اردو پسند حلقوں کو اس بات کی طرف توجہ دینی چاہئے کہ ان کے بچے اردو کی تعلیم حاصل کریں۔ ہر اردو دوست اس بات کا تہیہ کرے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو ضرور پڑھائے گا چاہے پرائیوٹ طریقے پر یا اسکول میں اگر انتظام ہے تو اسکول میں لیکن اگر کہیں اسکول میں انتظام نہیں ہے تو اپنے طور پر تو یہ کام کیا ہی جا سکتا ہے۔

وہ لوگ جو یونیورسٹیوں اور دوسرے اداروں سے وابستہ ہیں اور مختلف کمیٹیوں کے سربراہ ہوتے ہیں وہ اردو کے اساتذہ کے انتخاب کے وقت سفارشوں اور دوستیوں سے زیادہ اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کے منتخب کئے ہوئے اساتذہ میں اردو کی لیاقت کیا ہے۔ اگر سرچشمے ہی ضعیف ہیں تو شاگردوں کی کیا مدد کریں گے۔ اچھے استاد، اچھے طلبا پیدا کریں گے۔

اردو دوست حلقے کم از کم ایک اردو کا اخبار یا رسالہ ضرور خریدیں تاکہ اردو کی صحافت بھی اردو کے ساتھ ترقی کر سکے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اردو کے اخبار اور رسالے اردو کے ادیبوں کو انکی نگارشات کا معاوضہ بھی ضرور دیں چاہے کتنا ہی مختصر معاوضہ کیوں نہ ہو اس سے اردو کے ادیبوں کو ایک طرح کی مالی امداد بھی ہوگی اور ان کا حوصلہ بھی بڑھے گا۔

(۳) اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو انعام دینا ایک اچھا قدم ضرور ہے لیکن صرف یہ بات کافی نہیں کیونکہ اس طرح پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ کلام یا تحریریں پہلے کتابی شکل میں شائع ہو جائیں تب انعام کی منزل آتی ہے۔ بہت سے ایسے شاعر اور ادیب ہیں جو خود بھی اچھا ذوق اور اچھی فکر رکھتے ہیں مگر اس کی استطاعت نہیں رکھتے کہ کتابی شکل میں اپنی نگارشات شائع کر سکیں۔ ایسے حضرات ان انعاموں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اسلئے انعام و اکرام کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں اردو کی اچھی نگارشات کو شائع کرنے کا انتظام بھی کیا جائے۔ اردو اکیڈمی اس کام کو اگر علاحدہ سے شروع کر دے تو اچھا ہوگا۔ نگارندوں کو صرف جزوی مدد دینا درست نہیں۔ یا تو یہ کام اکیڈمی خود اپنے ہاتھ میں لے یا پھر نگارندوں کو جزو کے بجائے کل رقم طباعت اور اشاعت کے لئے عنایت کرے۔ بہتر طریقہ یہی ہوگا کہ اردو اکیڈمی طباعت اور اشاعت کا کام خود سنبھالے کیونکہ اردو کے کچھ ادارے جو نیم سرکاری ہیں اس پر زور دیتے ہیں کہ وہ صرف علمی اور ادبی کتابیں شائع کریں گے۔ ناول، افسانے یا شعری مجموعے انکی اشاعت میں شامل نہ ہوں گے۔ یہ مناسب قدم نہیں۔ ہر وہ چیز اچھی ہو اسے شائع کرنا چاہئے۔ اشاعت کے پروگرام میں کبھی کبھی یہ نقطۂ نظر بھی کام کرتا ہے کہ کسی ایک علاقے کے ادیبوں کی کتابیں شائع کی جائیں کچھ مقامی شاعر بہت زیادہ ایسے کاموں میں دخیل ہو جاتے

ہیں۔ یہ درست نہیں کہ دنیا میں ایسی باتوں سے چھٹکارا کبھی
ممکن نہیں۔ تاہم جہاں تک ہو سکے انتخاب کرنے والوں کو اپنی
آراء دینے کا استعمال کرنا چاہئے کچھ منتخب کرنے والے حضرات
چند مکتبہ خیال سے وابستہ ہوتے ہیں۔ انکی کوشش ہوتی ہے
کہ صرف انہیں کے نقطۂ نظر سے اشاعتی پروگرام مرتب کیا
جائے۔ یہ بھی مناسب بات نہیں۔ اردو کے بہت سے نیم سرکاری
ادارے اس تنگ نظری کا شکار ہو کر اردو کو نقصان
پہنچا رہے ہیں یہ بات ختم ہونی چاہئے۔ اردو کی ہر اچھی چیز
کی اشاعت ایسے اداروں سے ہونا چاہئے"

ترجمہ کی حالت اردو میں بہت خراب ہے۔ اردو کے
حلقوں میں مترجم کی تقریباً کوئی حیثیت نہیں سمجھی جاتی۔
اسے ادیب کی حیثیت بھی کوئی مشکل ہی سے دینے کو تیار ہوتا
ہے یہ نقطۂ نظر بہت غلط ہے۔ اگر لاطینی اور یونانی رسالوں
سے ترجمے نہ ہو سکتے تو آج انگریزی ادب میں بہت سے شاہکاروں
سے کوئی متعارف نہ ہوتا۔ اسلئے ترجمہ کی اہمیت واضح کرنے
کے لئے پہلے اردو کے ادیبوں کو اپنا نقطۂ نظر بدلنا چاہئے پھر
حکومت سے ایک دار الترجمہ اردو کے لئے قائم کرنے کی
درخواست کی جائے جس میں ہندوستان کی دوسری زبانوں
کی اچھی کتابوں کا عام فہم سلیس اردو میں ترجمہ کیا جائے
ساتھ ہی ساتھ مغرب کی اچھی کتابوں کے بھی ترجمے کئے جائیں
اردو اکیڈمی کے ساتھ ہی یہ دار الترجمہ بھی وابستہ کر دیا جائے
ترجموں کے لئے بھی حکومت کا صرف مالی امداد دینا ہرگز کافی
نہیں ہے۔ ترجمہ کا کام ایسے لوگوں کے سپرد کیا جائے جنہیں واقعی
اس کام میں انہماک ہو محض نام سے متاثر ہو کر کام سپرد
کرنا کبھی کبھی بڑے افسوس ناک نتائج برآمد کرتا ہے میں
اردو کے ایک بہت بڑے شاعر کے متعلق جانتا ہوں جس
کے نام سے شائع ہونے والے ترجمے بی اے اور ایم اے
کے طالب علموں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں جن پر شاعر موصوف
نے نظر ثانی کرنے تک کی بھی زحمت نہیں کی۔ چنانچہ ایسے ترجموں
کی کیا درگت ہی ہے ترجمے خود بتاتے ہیں۔ محض ناموں سے
اثر لے کر کام سپرد کرنے کا نتیجہ اردو والے آزادی کے بعد
سے کئی موثر کتابوں کے سلسلے میں دیکھ چکے ہیں۔ اس لئے
اردو کی ترقی کے لئے شاعروں اور ادیبوں کو انعام دینے
کے ساتھ ساتھ دار الترجمہ کی اسکیم پر بھی حکومت کو توجہ دینی چاہئے۔

(۴) [illegible] کے بعد اردو کو سب سے زیادہ نقصان
اردو دوستوں کی پست ہمتی، بے عملی، احساس کمتری ــــ
ہندوستان میں لسانی تعصب کی فضا اور حکومت کی بے توجہی
نے پہنچایا۔

(۵) جہاں تک میری ذاتی رائے کا سوال ہے میں اردو
یونیورسٹی کے قیام کے خیال سے متفق نہیں ہوں لیکن ہندوستان
کے بہت سے اردو دوست اردو یونیورسٹی کے قیام میں
اردو کی فلاح و بہبود سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہی ہوگا۔

(۶) میں اردو کا ایک معلم ہوں میرا خیال ہے کہ اگر میں
خاموشی سے، تندہی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی جو اردو کے
سلسلے میں میرے سپرد کئے گئے ہیں انجام دیتا رہوں تو اردو
کی کچھ خدمت ہو سکتی ہے جائز مقام دلانے یا نہ دلانے کا معیار
تو وہ لوگ ہیں جو حکومتوں میں دخیل ہیں۔ ایک معلم تو صرف فضا
تیار کر سکتا ہے کچھ تحریری اور تقریری کوششیں کر سکتا ہے۔
یہی کام میں بھی کر سکتا ہوں اور جہاں تک ہو سکتا ہے کرتا بھی ہوں
معلوم نہیں دوسرے حضرات اسے کس رنگ میں تعبیر کرتے ہیں۔

سید محمد عقیل

ڈاکٹر قیصر جہاں۔ ویمنس کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

۱۔ آجکل اردو اخباروں میں یہ خبریں جوش و خروش سے
شائع ہو رہی ہیں کہ اردو کا مستقبل روشن ہے شاید اس لئے
کہ پرائمری اسکولوں میں اردو کی تعلیم دینے کا ابھی حال میں انتظام
کیا گیا ہے۔ اردو کی ترقی کے لئے کثیر رقم دی جا رہی ہے علاوہ
ازیں ہماری سرکار اردو کے ادیبوں کو انعامات بھی تقسیم کر رہی ہے
یہ تمام باتیں بظاہر بڑی دل خوش کن معلوم ہوتی ہیں لیکن
واقعہ اصل اس کے بالکل برعکس ہے۔ اہل علم بخوبی جانتے
ہیں کہ تاوقتیکہ اردو زبان کی درس و تدریس کا انتظام ثانوی
زبان کی حیثیت سے لازمی قرار نہیں دیا جاتا ہے اسوقت تک یہ
تمام کوششیں بے معنی ہیں۔

۲۔ حکومت کو چاہئے کہ تمام پرائمری اسکولوں میں اردو
کو لازمی مضمون کی حیثیت دلائے محض اختیاری مضمون ہونے
سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ عدالتوں میں دفتروں میں
تمام اسٹیشنوں کے نام، اور پوسٹر ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں
بھی ہونے چاہئیں

حکومت کے فرائض کے ساتھ ہی ساتھ کچھ اردو والوں
کے فرائض بھی ہیں ان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے بچوں
کو گھر میں اردو سکھائیں، انگریزی اسکولوں میں داخل ہونا کوئی
(جواب STATUSE SYMBOL بن گیا ہے) لیکن گھر پر اردو
کی تعلیم و تدریس کا بھی معقول انتظام ہونا ضروری ہے۔

اردو دوستوں کا فرض ہے کہ اپنے اپنے حلقے میں چھوٹے
چھوٹے مکتب کھولیں جس میں اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام ہو
اور شبینہ مدارس قائم کریں تاکہ تعلیم بالغان کا درس و تدریس ممکن
ہو سکے آل انڈیا ریڈیو سے اردو زبان کی تعلیم کا پروگرام نشر کئے
جانے کا مطالبہ کریں۔ اردو زبان کے ایسے شیدائی جن کے سپرد
اسکولوں اور کالجوں کے انتظامات بھی ہیں وہ اپنے اسکولوں
کے انتظامات پر خاص طور پر توجہ کریں۔ اردو میں اچھے نمبروں
سے پاس ہونے والے بچوں کو وظیفہ دیں۔ کلاس پرائز کی کورس
کو عام بنائیں۔ یہ تمام امور اردو کے پرستاروں کی خاص توجہ
کے محتاج ہیں۔

(۳) انعامات اور ترجموں کے لئے دی گئی رقمیں اردو

کی ترقی کے لئے مفید ضرور ہو سکتی ہیں لیکن صرف انعامات
حاصل کر کے خوش ہو لینا کافی نہیں۔ جہاں تک ترجموں کا سوال
ہے اس سے اب تک خاطر خواہ نتائج نہیں نکلے اور نہ
ہی آئندہ کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان ہے تاوقتیکہ نئی
نسل کے لئے [illegible] اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں ہو جاتا۔
حکومت نے جن ذمہ دار حضرات کے سپرد ترجمہ نگاری کا کام کیا
ہے ان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ علاوہ اساتذہ کے ایسے لوگوں
کو بھی تلاش کریں جو ترجمہ نگاری کے فن سے واقف ہیں اگر وہ
استاد نہ ہونے کی وجہ سے گمنامی کی حالت میں زندگی بسر
کر رہے ہیں یہ لوگ اپنا پورا وقت ترجمے پر صرف کر سکتے ہیں
جس کی توقع نہیں اساتذہ سے انکی دوسری ذمہ داریوں کے
پیش نظر کم ہی ہے

(۴) بعض حلقوں سے اردو یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ

کی اردو دشمنی سے کیا جا رہا ہے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ
یونیورسٹی کا قیام اردو کی ترقی اور بقا میں کہاں تک مددگار ہو سکتا
ہے۔ اس یونیورسٹی سے تعلیم پائے ہوئے لوگ کہاں تک کھپ
سکتے ہیں، اور جو اس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کریں گے کیا
بھاگ نہیں گے؟ اس وقت اہم مسئلہ یونیورسٹی کا نہیں بلکہ اردو
کی بنیادی تعلیم کا ہے اور جب تک ابتدائی اردو دانوں کی میعاد
پختہ نہیں ہوگی اس وقت تک ہمیں اردو یونیورسٹی کا خواب دیکھنا
ایک بے معنی سی بات ہے۔

(۵) اردو کے شیدائیوں کو چاہئے کہ وہ کم از کم ہر سال
دو لوگوں کو اردو سکھائیں، میری کوشش یہی رہی ہے۔

منیر حسان

کامریڈ ایس اے ڈانگے (چیئرمین)
کامریڈ راجیشور راؤ (جنرل سکریٹری) اور
معیم الدین فاروقی، ممبر سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی
ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی

(۱) لاشبہ اردو کے ساتھ پچھلے پچیس برس سے برابر ناانصافی
ہو رہی ہے۔ اردو کو ہمارے آئین کے آٹھویں شیڈول میں
ہندوستان کی ایک قومی زبان تسلیم کیا گیا ہے لیکن عملاً آئین
کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے اس لئے یہ صرف ناانصافی
ہی نہیں بلکہ سراسر دستور ہند کی مخالفت کے مترادف ہے۔
ہم کمیونسٹ پارٹی والے پارلیمنٹ، اسمبلیوں
اور ان کے باہر کہتے رہے ہیں۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی
نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اردو کے ساتھ انصاف
نہیں ہوا۔

(۲) مرکزی حکومت کو چاہئے کہ وہ ہندوستان کے دستور
کا احترام کرے اور سختی کے ساتھ صوبائی سرکاروں کو لکھے
کہ اردو زبان کی مکمل حفاظت کی جائے۔ اردو بولنے والوں
کے بچوں اور بچیوں کے لئے ہر جگہ (جہاں اردو بولنے والوں
کی مناسب تعداد میں آبادی ہو) اسکول کھولے جائیں جہاں
کی [illegible] کی جائیں۔ عدالتوں اور سرکاری دفتروں
میں اردو کی درخواستوں اور خطوط کو پڑھنے اور جواب دینے
کا مناسب انتظام کیا جائے۔ مرکزی سرکار کو اس کے لئے
ایک باقاعدہ مشینری مقرر کرنی چاہئے اور صوبائی سرکاروں
کو بھی ایسی ہی مشینری قائم کرنے کے لئے کہا جانا چاہئے۔ اس
مشینری کا مقصد یہ ہو کہ وہ حکومت ہند کے احکامات اور
فیصلوں پر عمل درآمد کرائے۔

اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کو چاہئے کہ وہ اس قسم کی مشینری قائم
کرانے کے لئے جدوجہد کریں اور سرکار کو مجبور کریں کہ ایسا
قدم اٹھایا جائے۔

(۳) اردو اخباروں اور رسالوں کو اعانت ضرور ملنی چاہئیں
اور اردو میں دوسری زبانوں سے ترجمہ بھی کرایا جانا چاہئے۔
حکومت کو یہ قدم تو اٹھانے ہی چاہئیں لیکن اتنا کافی نہیں
ہے۔ اردو بولنے والوں کی تعداد تین اور چار کروڑ کے درمیان
ہے اس لحاظ سے ہندوستان کی بڑی زبانوں میں سے
ہے۔ اس لئے اہم بات یہ ہے کہ ان کروڑوں ہندوستانیوں
کو بھی دوسری زبان والوں کی طرح ترقی اور اظہار رائے کا موقع ملنا چاہئے

(۴) ۱۹۴۷ء کے بعد اردو ایک سیاسی تعصب کا شکار
ہو گئی۔ فرقہ پرست لوگ جو کانگریس کے اندر بھی تھے اور
کانگریس کے باہر جن سنگھ اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر۔
ایس۔ ایس) کی شکل میں، عام طور پر فرقہ پرستی کی آگ بھڑکاتے
رہے، مسلم اقلیت کے خلاف اور اردو زبان کے خلاف [illegible]
لیکن اس عرصہ میں کانگریس کی حکومت رہی ہے۔ اس
کے اکثر رہنما جمہوری اور سیکولر رجحان رکھتے ہیں لیکن جس
مستقل مزاجی کے ساتھ انہیں اور ان کی حکومت کو فرقہ پرستی
اور ایڈمنسٹریشن میں بیٹھے ہوئے فرقہ پرست افسروں کے خلاف
حرکت میں آنا چاہئے تھا۔ اس کا ثبوت انہوں نے نہیں دیا۔
ان کی کمزوری سے فرقہ پرست جن سنگھ، فرقہ پرست افسروں
اور کانگریس کے بعض فرقہ پرست وزیروں نے فائدہ اٹھایا
اور اس ماحول میں اردو کے ساتھ ناانصافی ہوتی رہی۔

(۵) اگر اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے تو اس سے اردو کو
فائدہ ہوگا۔ اس سے اردو کی حیثیت بحال کرنے میں مدد ملے گی۔
لیکن یہ تو ایک قدم ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت کو چاہئے
کہ ہندوستان کی اکثر یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم کرنے
کی ہدایت دے اور اس کے لئے مناسب فنڈ مہیا کرے۔
تمام ہندوستان میں اور خاص طور پر ان صوبوں میں جہاں
اردو بولنے والوں کی خاصی آبادی ہے۔ اردو کی تعلیم کے لئے
اسکول کھولے جائیں۔ عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں (اور
خاص کر ان صوبوں میں جہاں اردو بولنے والے رہتے ہیں)
اردو کی درخواستیں اور چٹھیاں وصول کرنے اور ان کا جواب
اردو میں دینے کے لئے انتظام کیا جائے۔

ان پر عمل کرنے کے لئے مشینری ہونی چاہئے (اس کا
ذکر میں اوپر کر چکا ہوں)

(۶) میں اور میری پارٹی اس معاملہ میں متفق ہیں کہ اردو
کو اس کا جائز حق ملنا چاہئے۔ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں
میں ہمارے ممبر اس سوال پر بارہا آواز اٹھاتے رہے ہیں۔ ابھی
کچھ عرصہ پہلے پارلیمنٹ میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ
پر بولتے ہوئے ہماری پارٹی کے لوک سبھا میں لیڈر کامریڈ
اندرجیت گپتا نے زور دار الفاظ میں اردو کے لئے آواز بلند
کی یہ بات اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔
ہماری پارٹی کے بنیادی پروگرام میں اردو کی حفاظت
کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ہمارے اخبار اکثر اس کے بارے میں لکھتے
رہتے ہیں۔ دسمبر کے مہینہ میں ایک [illegible] پارٹی کے سکریٹری آرگنائزیشن
میں جو مضمون لکھا تھا وہ اس کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں آپ
چاہیں تو اس کو استعمال کر سکتے ہیں۔

ہم یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی
ہی ایک ایسی سیاسی پارٹی ہے جو اس سوال پر متفق ہے۔ ہم
اس سوال کے [illegible] اور جمہوری پہلو پر بہت زور دیتے آئے
ہیں۔ آئندہ بھی اس کی حفاظت کے لئے جدوجہد جاری رکھیں گے۔

(نوٹ: ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے صدر جناب
ایس اے ڈانگے صاحب اور جنرل سکریٹری جناب راجیشور راؤ
صاحب کے پاس بھی آپ کا سوالنامہ آیا ہے۔ ان کی جانب سے
بھی یہی جواب ہے۔)
معیم الدین فاروقی

پروفیسر اختر قادری، صدر شعبہ اردو فارسی
ایل، ایس، کالج۔ مظفر پور

(۱) [illegible] اردو کے ساتھ بے انصافی ہوئی
ہے اور اس سے بے انصافی کرنے والے بھی کبھی انکار نہیں کرتے۔
یہ اور بات ہے کہ وہ اردو کو [illegible] کی محض ایک شیٹی سمجھ کر نظرانداز
کر دیتے ہیں۔

(۲) یہ سوال دو شقوں پر مشتمل ہے۔ (الف) حکومت کو
کیا کرنا چاہئے؟ حکومت کو دستور ہند کی متعلقہ دفعات کو عمل میں
لانا چاہئے اور اردو کو مرکزی اور ریاستی حکومت میں سرکاری زبان
تسلیم کر کے ضروری کارروائیاں کرنی چاہئیں۔ (ب) اردو پسند
حلقوں کو کیا کرنا چاہئے؟ اردو پسندی کا عملی ثبوت دینا چاہئے
اپنے معاشی اور دوسرے سیاسی اغراض کے لئے اردو دوستی کا ڈھونگ
رچانا ترک کر دینا چاہئے۔ اردو کے ابتدائی، فوقانی اور ثانوی
مدارس کا قیام کرنا چاہئے اور ان مدارس کو سرکاری منظوری دلانے
کی جدوجہد کرنی چاہئے، اغراض پہلے خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے
کی کوشش کرنی چاہئے محض شکوہ بےجا سے بات نہیں بنتی، پچیس
برس کا تجربہ سامنے ہے

(۳) یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک خشک ہوتے ہوئے درخت
کی شاخوں اور پتوں پر پانی کا چھڑکاؤ کیا اور اس کی جڑ کو مناسب
کھاد پانی سے محروم رکھا۔

(۴) ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو سب سے زیادہ نقصان
اردو کے بہی خواہوں سے پہنچا۔ وہ ایک بیرونی استعماری حکومت
سے کام نکالنے کے طریقے جمہوری دور حکومت میں آزماتے رہے
حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ اردو کی تعلیم کا ایک منظم اور مربوط
سلسلہ شروع کرنے کے بعد مدارس کی سرکاری منظوری کی تحریک
شدومد سے چلائی جاتی۔ مخلصین نے ایسا نہ کیا اور تمام جہاد اردو
دوستوں کی [illegible] انجمن میں [illegible] نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کے یہ
فرضی ادارے محض نوکری اور [illegible] اور مجالس منتخبہ میں پہنچ گئے

گمشدگیاں ذرا سے خاموش ہیٹھی رہی لیکن جب الیکشن کا سامنا آیا تو کانگریس الیکشن کے موقعوں پر اپنے منشور میں اردو کی حمایت کا نعرہ زور و شور سے کرا اعلان کرتی رہی۔ بالآخر اردو کے شیدائیوں کے ووٹ حاصل کرنے کے بعد ہمیشہ کی طرح اپنے وعدے سے پھر گئی اور یہ وعدہ خلافیاں۔ معلوم کب تک جاری رہیں گی

(۵) اردو یونیورسٹیوں کے قیام کی فوری ضرورت تو ہے مگر صرف اس سے اردو کا مسئلہ حل ہونے والا نہیں جب تک اردو زبان کا چلن عام نہیں ہوگا اور اس کو سرکاری طور پر دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا جائے گا اردو کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔

(۶) اپنی ذاتی زندگی میں اردو کا ہر ممکن استعمال اردو اخبارات اور رسائل کا مطالعہ اور ان سے تعاون، اردو میڈیم اسکولوں کا قیام اور اس سے اردو کے سائن بورڈ زیادہ سے زیادہ تعداد میں استعمال کرنے کی درخواست کرنا، اردو کی ادبی نشستوں کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا اردو کتب کی لائبریریاں قائم کرنا، اردو میں تحریری و تقریری کے مقابلے۔ اچھی اور مفید کتابوں کے دوسری زبانوں سے اردو میں تراجم اور اردو کو اس کا مقام دینے کے لئے حکومت سے مطالبہ کرنا شامل ہیں

ڈاکٹر سلامت اللہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

(۱) جی ہاں

(۲) حکومت کو چاہیے کہ ابتدائی اور ثانوی مدارس میں اردو کی تعلیم کا انتظام کرے۔ اردو میں کتابیں تیار کرنے اور اردو کے اداروں کو تحفظ دینے کے لئے سرکاری طور پر امداد کرے۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ اتر پردیش، دہلی، ہریانہ، پنجاب اور دوسرے علاقوں میں اس کی ضرورت ہے۔ جو سہولتیں فی الحال دی جا چکی ہیں ان پر پابندی کے ساتھ عملدرآمد ہو۔

اردو پسند طبقہ۔

اردو کی تعلیم اور اس کے استعمال کے لئے جو سہولتیں اس وقت فراہم ہیں ان سے فائدہ اٹھائیں اور ان کے عملدرآمد کی کوشش کریں۔ اردو کی ترویج و اشاعت میں عملی تعاون کریں اور اپنے متعلقین کو اردو پڑھائیں۔

(۳) اکادمی تو نہیں پھر بھی ایک اچھا قدم ہے۔

(۴) حکومت کے غیر ذمہ دارانہ رویے اور تنگ نظری سے ایسا نہ ہوتا ہے اس کی سرپرستی سے اور اردو داں طبقہ کی پست ہمتی سے۔

(۵) اردو یونیورسٹی کا قیام اس وقت تک مفید ہوگا جب تک ابتدائی اور ثانوی سطح پر اردو کی تعلیم کا انتظام نہ ہو۔

(۶) اردو کو اس کا مقام دلانے کے لئے ناگزیر ہیں

طور پر کچھ نہیں کیا جا سکتا لیکن احتجاجی طور پر اور سیاسی سطح پر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ایک ادارے کی حیثیت سے ہم حسب ذیل پروگرام پر عمل کر رہے ہیں

۱ اردو مدارس کے لئے اساتذہ کی تربیت کا انتظام۔

۲ اردو میں علمی ادب کے اضافے کی کوشش۔

۳ اردو خطاطی کا کورس

عزیز اندوری۔ صدر شعبہ اردو، اسلامیہ کریمیہ ڈگری کالج، اندور

(۱) جی ہاں اس حد تک تو یقینی طور پر اردو کو سرکاری ناانصافی کا شکار ہونا پڑ رہا ہے کہ بار بار کی یاد دہانی کے باوجود اس کی جائز ترویج کی طرف فوری توجہ نہیں دی گئی ہمارا صوبہ ہندی بھاشائی ہے مگر اس میں اردو

بولنے والوں کی کمی خاصی تعداد ہے۔ اس کے باوجود اردو بیاں طور پر حکام کی عدم توجہی کا شکار ہو رہی ہے۔ کئی تعلیمی اداروں میں دانستہ طور پر اسے اس کے حق سے محروم رکھا گیا ہے یہی حالت دیگر ملک اداروں کی ہے

(۲) کسی زبان کی ترقی و ترویج کسی بھی دور میں نہ تو حکومت کے بھرپور اور ایماندارانہ تعاون کے بغیر ہو سکی ہے اور اس زبان کے بولنے والوں کی انتہائی دلچسپی اور سرفروشانہ جدوجہد کے بغیر ہی اسے اس کا جائز حق مل سکتا ہے

اسی کے ساتھ اردو داں طبقہ بھی ناقابل تردید تساہل کا شکار ہو کر سرفروشانہ جدوجہد کو فراموش کر چکا ہے جس نے اس سے عمل کی تیزی اور شعور کی قوت کو چھین لیا ہے ان دونوں وجوں سے اردو کو مجموعی طور پر سخت نقصان پہنچایا ہے اگر ان

ہے۔ وہ کسی کے فنا کرنے سے فنا ہونے والا نہیں ہے۔ لہٰذا اسے محفوظ رکھنے یا آگے بڑھانے کا کوئی ایک موثر و بہتر طریقہ یہ ہے کہ اردو پسند حلقے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ اپنی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اسے درس گاہوں میں داخل کریں یہی ذریعہ زود اثر اور مناسب ہے۔

(۳) بچے بڑے شریر ہوتے ہیں نعمتوں کا کوئی سلسلہ سرپرست پورا کر دیتے ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جو محض طفل تسلیوں سے نہیں بہلتے، متواتر پریشان کیے جاتے ہیں، لہٰذا وہ کھلونے دے کے بہلائے جاتے ہیں۔

یہی حال اردو کے سلسلے میں شور و غوغا مچانے والوں کا اور حکومت کا ہے اردو والوں کا ساتھ اگر یہ باہمی مفاہمت کی بھی کوئی صورت نہیں۔ لہٰذا حکومت تو یہی سوچتی ہے کہ جو گڑ سے مرے اسے زہر کیوں دے۔ کہیں کسی مصنف کو انعام سے بہلا رہا۔ کسی شاعر کو خواہ مخواہ بڑا تسلیم کر لیا جا رہا ہے اسکا شعر بھی داد کے قابل نہ ہو لیجیے سطحی طور پر اردو کا حق اور اس کا نام بہادر مقام تسلیم۔ سامعین و ناظرین اور قارئین تو اپنی اپنی جگہ بے حد مطمئن و مسرور ہوتے ہیں کہ جس زبان کی اتنی پذیرائی کی جا رہی ہے بھلا وہ کیسے ایک مستعد اور مستحکم زبان نہیں بن جائے گی۔ کاش انہیں یہ بھی معلوم ہوتا کہ جو چیز جتنی خالی ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ زور سے بجتی ہے۔ ٹھوس چیزیں آواز نہیں پیدا کرتیں ان میں وزن ہی وزن ہوتا ہے۔ یہ چہل پہل اردو کے سلسلے میں یہ انعام و اکرام سب محض دکھاوا ہے اندر ہی اندر یہ کار فرما ہے کہ جس طرح بن پڑے اردو کا خاتمہ کیا جائے۔

(۴) میرا تو یہی خیال ہے کہ آزادی کے بعد علاقائی رجحان ہی نے سب سے زیادہ اردو زبان کو نقصان پہنچایا اور لوگ یہ سوچنے لگے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ جیسے مسلم ہی ملک کی ملکیت ہونی چاہیے ہم یہ بھول گئے کہ ملک کا بٹوارہ ہوا ہے۔ زبان کا نہیں ہوا۔ اگر اردو صرف مسلمانوں ہی کی زبان قرار دی جاتی ہے تو اسے دراصل ملک عرب کی ملکیت ہونا چاہیے کیونکہ ہر مسلمان خواہ وہ کسی وضع و ہیئت کا ہو اس کا قبلۂ اول عرب ہی ہے کیا مضحکہ خیز اصول ہے کہ بٹوارے نے ادب کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

(۵) عثمانیہ یونیورسٹی اس کی اچھی مثال ہے اس کا ذریعہ تعلیم اردو ہی تھا اور اس یونیورسٹی کے ذریعہ جتنی خدمت اردو زبان و ادب کی ہوئی ہے اتنی دکن میں کسی اور طریقے سے نہیں ہو سکی۔ اگر اسی طرح کی ایک اردو یونیورسٹی مرکزی جگہ قائم کی جائے جس کا بنیادی مقصد ہی اردو کی ترویج و اشاعت ہو تو یقین کامل ہے کہ اردو کی بکھری ہوئی کشتی کو ساحل کا سہارا مل جائے گا۔

ہو سکتا ہے کہ یہ سہارا گمنام مگر عالم حضرات کو میدان عمل میں لے آئے۔ اور جن کی قوتیں کسی مدد کے بغیر بیکار پڑی ہیں وہ صیقل ہو کر کسی کام میں آ سکیں۔

(۶) یہ ضرور ہے کہ ہر تعمیر مشکل اور ہر تخریب آسان ہے۔ ایک چھوٹا سا مکان کافی مدت میں بنتا ہے لیکن ایک بڑی عمارت دیکھتے ہی دیکھتے زمین کے برابر کی جا سکتی ہے۔ یہ سوچنے کا مقام ہے کہ جب اردو دشمنوں نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی ہے یعنی اردو سے اس کا اپنا حق چھینا ہے تو کیا ہم اردو دوست اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے؟ کیا ہم میں اتنی سکت نہیں ہے کہ بجائے زبان — ہلانے کے بازو ہلائیں؟ اپنی چیز واپس چھین لیں جو صرف ہماری ہی نہیں ہمارے ماں باپ کی بھی ہے۔ مادری زبان اور کون نہیں جانتا کہ دنیا کے تمام حقوق سے صرف ماں کا حق افضل و برتر ہے۔

عفت موہانی

اے۔ آر۔ رُشدی
ایڈیٹر افکار
بھوپال

(۱) اردو کے ساتھ واقعی ناانصافی ہو رہی ہے۔ جسے کوئی بھی حقیقت پسند نظر انداز نہیں کر سکتا۔

(۲) اردو کو اس کا جائز مقام دینے کے لیے حکومت کو پس و پیش اور غلط اندیشوں سے نکل کر قانونی تدابیر اختیار کرنا چاہیے۔ جب تک حکومت اردو کو قانونی طور پر اس کا موزوں مقام نہیں دیتی اور اپنی یقین دہانیوں پر عمل نہیں کرتی اردو کو آسانی سے اس کا صحیح اور جائز مقام نہیں مل سکتا۔ اردو پسند طبقوں کو جائز مقام دلانے کے لیے ٹھوس اور مسلسل جد و جہد کرنا چاہیے۔ جس سے اردو کی تعلیم کو فروغ حاصل ہو سکے۔ اردو پسند طبقوں کو حکومت پر یہ زور دینا چاہیے کہ اردو کو جائز مقام دینے میں کسی بھی دوسری زبان کی حق تلفی نہیں ہو گی۔

(۳) شاعروں اور ادیبوں کو محض انعامات سے نوازنا یا دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمے کے لیے مالی امداد دینا کافی نہیں ہے۔ یہ چیزیں محض ہمانتی ہیں۔

(۴) ۱۹۴۷ء کے بعد سیاسی حالات نے اردو کو زبردست نقصان پہنچایا۔ تقسیم کے بعد یہ سمجھ لیا گیا کہ اردو زبان ختم ہو گئی جس کی وجہ سے حکومت اور اہل وطن نے اس کی مسلمہ حیثیت کو فراموش کر دیا اور شدید لسانی تعصب رونما ہو گیا۔

(۵) صرف اردو یونیورسٹی کے فوری قیام سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ یہ ثانوی مسئلہ ہے پہلے اردو کی بقا کا انتظام ہونا چاہیے اور ان علاقوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی اکثریت ہے اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیا جانا چاہیے۔

(۶) ہم اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے اپنے اخبار کے ذریعہ اردو کے حق میں رائے عامہ کو باشعور بنا کر ہموار کر رہے ہیں اور متواتر حکومت کو متوجہ کر رہے ہیں کہ وہ اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور حق تلفیوں کو ختم کرے اور اسکا صحیح مقام دینے کے لیے زبانی وعدوں کے بجائے قانونی اقدام کرے اور اس کی ترقی میں حائل رکاوٹوں کو دور کرے۔

مرشدی

حکیم
اجمل خاں
ایڈیٹر
میوگزٹ
نگینہ

ضلع گوڑگاؤں (ہریانہ)

(۱) سرکار اور اردو پسند حلقے اردو زبان کی تعلیم و ترقی کے لیے کم از کم اتنا ضرور کریں، جتنا آزادی سے قبل اس کے لیے کیا جاتا رہا ہے

(۲) بعض دوسری زبانوں کی ترویج و ترقی کے لیے مرکزی و ریاستی سرکاریں کثرت میں بے پناہ رقومات مخصوص کرتی ہیں۔ مگر اردو کی ترقی کے لیے محض چند ادیب یا شاعروں کو انعام دے کر جو بھاری اردو نوازی کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ وہ اردو زبان کے ساتھ ایک مذاق ہے۔

(۳) اردو پسند عوام جن کی تعداد ملک میں مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق تین کروڑ بتائی گئی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ بھاری احساس کمتری و مایوسی کا شکار رہے ہیں انہوں نے مرکزی و صوبائی سرکاروں کی توجہات اس سلسلہ میں متقل طور پر مبذول کرائی ہیں مگر عمل نہیں ہوا۔

(۴) محض سیاسی مصالح کی بنا پر مرکزی و صوبائی سرکاروں کی طرف سے پالیسی اور پروگرام بنائے گئے مگر ان پر نیچے کی سرکاری مشینری نے عمل نہیں کیا۔

(۵) اردو زبان کی ترقی کے لیے بعض اردو پسند حضرات کی جانب سے اردو یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کیا جا رہا

- کیا آپ کے خیال میں اردو کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے؟
- اردو کو اس کا جائز حق دینے کے لیے حکومت اور اردو والوں کو کیا کرنا چاہیے؟
- کیا اردو کی ترقی کے لیے معروف شاعروں اور ادیبوں کو معاملات سے ہٹا کر یا دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے حکومت کا کوئی مالی امداد دینا کافی ہے؟
- ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو سب سے زیادہ نقصان کس نے پہنچایا؟
- کیا آپ کے خیال میں اردو یونیورسٹی کے فوری قیام کی ضرورت ہے۔ اور کیا صرف اردو یونیورسٹی کے قیام سے اردو کا مسئلہ حل ہو جائے گا؟
- آپ ذاتی طور پر اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

محمد اکبر الدین صدیقی۔ ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

(۱) اردو کے ساتھ ناانصافی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس کو بدقسمتی سے صرف مسلمانوں کی زبان کہا جاتا ہے اور وہ متعصب ہندو جو ارباب اقتدار بنے ہوئے ہیں یا بن جاتے ہیں اس کو ہر طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۲) حکومت نے اس سلسلے میں جو قوانین وضع کیے ہیں ان ارباب اقتدار کے نزدیک ان کی کوئی وقعت نہیں۔ حکومت کا قانون ہے کہ بچہ کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے۔ پیدائشوں کی تعداد پیش نظر نہیں رکھی جاتی اور اردو مادری زبان والے کو علاقائی زبانوں میں تعلیم کی ابتدا کرنی پڑتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ ارباب اقتدار کا عمل جو گویا اردو ختم کرنے پر پانی ڈالنے کے مترادف ہے۔ ملازمتوں میں علاقائی زبان کو اہمیت دی جاتی ہے یا پھر انگریزی کا چلن ہے۔ دفاتر میں صرف اردو جاننے والوں کو اخلاقی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کی شنوائی نہیں ہوتی۔

(۳) اردو اداروں کو جو امداد دی جاتی ہے وہ اتنی تھوڑی سی ہوتی ہے کہ وہ اس سے کام کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ حکومتی انعامات یا امداد میں جانبداری یا بے دردی کا دخل ہے۔ اس سے چند اردو والوں کا فائدہ تو ہو سکتا ہے لیکن وہ پڑھنے والے کہاں سے لائیں گے؟

(۴) ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو سب سے زیادہ نقصان مذہبی عصبیت نے پہنچایا۔ اس میں کچھ ایسے ابن الوقت قسم کے اردو بولنے والے بھی شامل ہیں جو ذاتی مفاد کے لیے ارباب اقتدار کے ہمنوا ہو جاتے ہیں۔

(۵) اردو یونیورسٹی کے قیام سے ملک اور بحیثیت مجموعی پوری قوم ترقی کرے گی بشرطیکہ انہیں ملک کی خدمت کیلئے مساویانہ مواقع دیے جائیں۔ اس سے مسئلہ حل ہو سکے گا کہ غیر زبانوں میں تعلیم کا حصول ذہنوں کو جلا دینے میں مدد نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اردو والے والوں کے لیے اردو یونیورسٹی ضروری ہے۔

(۶) اس کو جائز مقام دلانے کے لیے قانونی حدود میں رہ کر جد و جہد کیا جا رہا ہے۔ مطالبے پیش کیے جا رہے ہیں احتجاج ہو رہے ہیں۔ وفود مل رہے ہیں اور ایڈیٹر صاحبان اداریوں میں گلے شکوے کر رہے ہیں۔ دستوری اور قوانین کی دہائی دی جا رہی ہے لیکن جن ارباب اقتدار پر عصبیت کا بھوت سوار ہے وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے تو ایسے ہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جن سے کسی کی دل آزاری نہ ہو اور ہماری زبان کی بقا کے اسباب فراہم ہوں۔

ڈاکٹر ادیب رفیعہ

ڈاکٹر محمد حسن ایم اے پی ایچ ڈی۔ پروفیسر و ہیڈ پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ آف اردو۔ یونیورسٹی آف کشمیر۔ سری نگر

(۱) اردو کے ساتھ یقیناً ناانصافی ہو رہی ہے اس کی نوعیت بنیادی طور پر یہ ہے کہ

(الف) اردو کی تعلیم ابتدائی اور ثانوی درجات میں ختم کر دی گئی۔

(ب) اردو کو دفاتر اور عدالتوں سے نکال دیا گیا۔ باقی تمام ناانصافیاں انہی دو سے پیدا ہوئی ہیں۔

(۲) میرے نزدیک اردو کا جائز حق دینے کے لیے حکومت کو تمام ابتدائی اور ثانوی مدارس میں اردو مدرسین کا انتظام کرنا چاہیے اور تمام سرکاری ملازمتوں میں ہندی کی طرح اردو جاننا بھی لازمی قرار دینا چاہیے جو صورت ۱۹۴۷ء سے پہلے تھی یعنی ہندی والوں کو ساتویں درجے تک اردو سیکنڈ فارم یا ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھنی پڑتی تھی وہی پھر نافذ ہونا چاہیے اور اردو کو یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، آندھرا، ہماچل پردیش، میسور اور دلّی میں دوسری سرکاری زبان تسلیم کیا جانا چاہیے۔

اردو والوں کے دو فرائض ہیں ایک یہ کہ وہ اپنے جائز جمہوری مطالبے کے لیے رائے عامہ کو ہموار کریں اور اس کے لیے دوسری زبانوں میں بھی لکھیں اور دوسرے یہ کہ وہ حکومت پر دباؤ ڈالنے کے علاوہ اس سے بے نیاز ہو کر اپنے طور پر بھی مدرسے اور اسکول چلائیں۔ فعال جماعتیں ہر قصبے اور ہر شہر میں بنائیں اور اردو اسکولوں کا ایک جال سارے ملک میں بچھا دیں اور ان اسکولوں کو ایک مرکزی ٹرسٹ کے تحت لے آئیں۔ مالیات کی فراہمی بہت زیادہ دشوار نہیں اپنے وسائل کو یکجا کرنا اور بہترین صلاحیتوں والوں کو جمع کرنا ضروری ہے۔

(۳) یقیناً صرف ادیبوں کو انعامات دینے یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنے کے سلسلے میں حکومت کا مالی امداد دینا کافی نہیں ہے مگر اس کو بھی لینا چاہیے۔

(۴) ۱۹۴۷ء کے بعد سب سے زیادہ نقصان اردو والوں نے اردو کو پہنچایا ہے۔ یہ سب بے عمل رہے اور سوائے تقریروں کو دستخط جمع کرنے کے اور کچھ نہیں کیا گیا۔ اردو کے تحفظ کے لیے اقدام تو درکنار اردو کے بارے میں صحیح اعداد و شمار تک ہمارے پاس نہیں ہیں اردو اسکولوں کی تعداد ۱۹۴۷ء میں کتنی تھی اور آج کتنی ہے؟ اردو کس صوبے میں کتنے اسکولوں نے ہٹائی گئی؟ ہر صوبے اور ہر بڑے شہر میں اردو والوں کی تعداد کیا ہے؟ ملک میں اردو کی کتنی لائبریریاں ہیں؟ کتنے اساتذہ اور طلبہ ہیں؟ اس کے بارے میں بھی ہمارے پاس کوئی اعداد و شمار نہیں ہیں۔

اردو والوں کے بعد ہر حکومت کا ہے جس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

(۵) جی ہاں، اردو یونیورسٹیوں کا قیام فوری طور پر ضروری ہے کیونکہ ان کے قیام کی وجہ سے ہم ان تمام اردو اسکولوں اور کالجوں میں رابطہ پیدا کر سکیں گے جہاں آج بھی اردو کی تعلیم جاری ہے۔ خاص طور پر مہاراشٹر، آندھرا اور میسور میں جہاں ایسے اسکولوں اور کالجوں کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ صرف اردو یونیورسٹیوں کے قیام سے اردو کا پورا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ مگر اس مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

(۶) میں ذاتی طور پر اردو کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

(الف) اردو کے مطالبے کے جائز ہونے کے بارے میں انگریزی میں متعدد مضامین لکھ کر اردو کے مقدمے کو ملک کی جمہوری رائے عامہ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

(ب) اردو رسم خط دس گھنٹوں میں سکھانے کا ایک کورس تیار کرا کے اس کے ذریعے تدریس اردو کا تجربہ کرنا چاہتا ہوں میرے نزدیک آسان طریقے پر اردو رسم خط سکھانے کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

(ج) کشمیر اردو ایسوسی ایشن کو ایک فعال انجمن کی شکل دینا چاہتا ہوں۔

(د) اپنے بچوں کو حیات اللہ انصاری کے قاعدے "دس دن میں اردو" کی مدد سے اردو پڑھانا چاہتا ہوں۔

(ہ) تدریس اردو کے سلسلے میں ایک AUDIO VISUAL طریقہ اپنانا چاہتا ہوں تاکہ اردو قصہ ڈرامے اور اسی قسم کی تفریحات کے ذریعے بھی پڑھائی جا سکے۔

(و) غیر مادری زبان کی حیثیت سے اردو کی تدریس کے مسائل پر ایک سیمینار منعقد کرنا چاہتا ہوں۔

محمد حسن

حمیدہ سلطان۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ دہلی۔

(۱) اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا رہا ہے یوں تو

حکومت انجمن ترقی اردو کو مالی امداد دیتی ہے، ترقی اردو بورڈ بھی قائم کیا ہے لیکن اردو کی علاقائی حیثیت کو دلی میں ابھی تک تسلیم نہیں کیا گیا۔

(۲) حکومت کو ۱۹۵۸ء کے ایکٹ کو قانونی حیثیت دینی چاہیے۔ یہ بات بارہا انجمن ترقی اردو کی طرف سے وزارت داخلہ اور وزیر اعظم سے کہی گئی لیکن ابھی تک اس پر غور نہیں کیا گیا۔

(۳) اردو شاعروں، ادیبوں کو انعامات دینا اور دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنے کے علاوہ بے حد ضروری ہے کہ اردو کے نصاب کی کتابیں حکومت جلد از جلد چھاپے اور اردو کے اسکول ان علاقوں میں قائم کرے جہاں ایسے بچوں کی تعداد زیادہ ہے جن کی مادری زبان اردو ہے۔

(۴) ۱۹۴۷ء کے بعد حکومت کی سرد مہری اور اردو والوں کی بے عملی سے اردو کو نقصان پہنچا ہے۔

(۵) بہت جلد اردو یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت ہے اور اردو یونیورسٹی کے قائم ہونے سے اردو کا مسئلہ کافی آسان ہو جائے گا۔

(۶) انجمن ترقی اردو ـــــــ ہمیشہ اردو کو دلی میں علاقائی حیثیت دلوانے کیلئے کام کرتی رہی ہے وزیر اعظم اور وزارت داخلہ سے برابر اس سلسلے میں خط و کتابت کی جاتی ہے اور بار بار وفد بھیج کر خطوط کے ذریعے مرکزی حکومت سے کہا گیا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں جو ایکٹ مرکز وزارت داخلہ نے نکالا تھا اس کو آئینی حیثیت کم از کم دلی میں تو دی جائے لیکن حکومت اپنی مصلحت پسندی کی بدولت ابھی تک حیلے حوالے کر رہی ہے۔

حمیدہ سلطان

محمد جمیل الرحمٰن ایم۔پی

(۱) یقیناً ضرور ناانصافی ہو رہی ہے۔ صرف یہ کہ اردو زبان کی ترویج و ترقی اور پھلنے پھولنے کا عمل اب بڑی حد تک رک چکا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ نئی نوجوان نسل اس زبان کو سیکھنا اور پڑھنا اب تضیع اوقات تصور کرتی ہے۔ مختصر حالات حاضرہ کے پیش نظر اس ملک میں اردو کا مستقبل تاریک تر ہوتا جا رہا ہے بظاہر ہے کہ یہ ایک مستقبل کسی زبان کے لیے کیا اردو جو ہمارے ملک کی تہذیبی اور سماجی زندگی کا ایک مایہ ناز سرمایہ ہے سراسر ناانصافی ہے۔ حکومت اور سیاسی پارٹیوں کو اس ناانصافی کا ذمہ دار ٹھہرانا بڑی حد تک درست ہے۔ اور یہی اردو کے حامیوں کی روایتاً شکایت رہی ہے لیکن کیا محبان اردو بذات خود اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

(۲) ابھی تک اردو پسند حلقے صرف حکومت سے گلے شکوے کرتے رہے کہ اردو کو اس کا جائز حق ملنا چاہیے۔ اور انہوں نے اپنی کوتاہیوں کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کیا ہے

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ محبان اردو اپنی ـــ مدد آپ کریں اور اپنی ہی کوتاہیوں اور خامیوں کو دور کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

(۳) محض انعام و اکرام سے کسی زبان کی خدمت نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی اس کی آبیاری ہوتی ہے۔ اردو کی مخصوص پوزیشن کے پیش نظر اگر انعام و اکرام پانے والا اردو کا ایک بھی ادیب و شاعر ان کو لینے سے انکار کا برملا اعلان کرتا تو اردو کے حق میں عوامی رائے بنتی اور اس طرح اس زبان کی کچھ خدمت ہوتی۔

دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمے کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے مگر ظاہر ہے کہ اردو کے مستقبل کو روشن کرنے کے لیے اور بھی بہت ساری منزلیں ابھی طے کرنی ہیں۔

(۴) مجرم کا پتہ چلانے اور اس کو سزا دینے سے کہاں جرم ختم ہوتا ہے۔ یوں اردو دانوں کی عدالت میں بہت سارے مجرم پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن اس سے فائدہ ہی کیا آیئے ایسے حالات پیدا کریں جن میں زبان اردو کے نقصان دہندوں کی تعداد کم سے کمتر ہوتی جائے۔ اور اس طرح اردو ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

(۵) اردو یونیورسٹی کا قیام ایک مفید قدم ہوتا اگر یہ یونیورسٹی محض تسکین دل اور جذباتی خوشی کے لیے ہو گی تو بالکل بیکار ثابت ہو گی اردو کے حق میں حالیہ ناانصافیوں کے پیش نظر اگر یہ یونیورسٹی ابھی قائم کی گئی تو مجھے خطرہ ہے کہ اس طرح اردو کی مناسب خدمت نہیں ہو پائے گی پہلا قدم اردو کو مختلف ریاستوں میں علاقائی حیثیت دینا ہے اور اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کرنا ہے پھر دوسرا قدم اردو کی اہمیت اور اردو دانوں کی اس تحریک کو تسلیم کرنا ہے۔ ان اقدامات کے بعد ہی اردو یونیورسٹی اپنا خاطر خواہ رول ادا کر سکتی ہے۔

(۶) اردو میری مادری زبان ہے۔ اور اس طرح میرا مستقبل اس سے وابستہ ہے۔ اردو کا روشن مستقبل ملک میں سیکولر، سوشلسٹ اور جمہوری نظام کو استوار کرنے سے ہی ممکن ہے۔ میں اس لیے خاص طور پر چاہتا ہوں کہ ملک میں ایسا نظام صحیح طریقہ پر قائم کرنے میں ہر ممکن مدد کروں۔ ممبر پارلیمنٹ ہونے کی حیثیت سے اس فرض کی ادائیگی کا مجھے اور بھی پورا احساس ہے۔

کام تو بہت کرنے ہیں، اور حوصلہ بھی رکھتا ہوں لیکن اردو کی خدمت کا عظیم مشن انفرادی کام نہیں۔ آیئے ہم سب مل کر اس عظیم مشن کو پورا کرنے کے عمل کا آغاز کریں۔

محمد جمیل الرحمٰن

رضوان احمد
ایڈیٹر
ماہنامہ
"زیور" پٹنہ

(۱) آزادی سے قبل اردو کو جو مراعات حاصل تھیں، آزادی کے بعد اس کی چوتھائی بھی حاصل نہیں ہیں۔ گزشتہ سالوں سے اردو کے ساتھ مسلسل زیادتی ہو رہی ہے۔ اردو کے سب سے اہم صوبہ اتر پردیش میں اس کا بیدردی سے قتل ہوا اور حکومت کی یاد بھی نہ آئی۔

(۲) اردو کو اس کا جائز حق اسی وقت مل سکتا ہے جب اسے دلی، بہار، یوپی، پنجاب، ہماچل، آندھرا، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش میں دوسری سرکاری زبان یا علاقائی زبان کا درجہ دیا جائے ان حقوق کے حصول کے لیے جد و جہد مسلسل کی ضرورت ہے۔

(۳) اردو شعراء و ادباء کو انعامات دینے سے اردو کو کافی نقصان پہنچا ہے کیونکہ اس سے تخلیقی کام کی رفتار میں اضافہ ہونے کے بجائے آپسی رقابت کا مادہ بڑھا ہے اور بہت سے شعراء و ادباء نے انعامات و اعزازات کے لالچ میں افسر شاہی [illegible] کا شیوہ اپنا شعار بنا لیا ہے۔ کتابیں شائع کرنے کا بھی کوئی حاصل نہیں جب ان کو پڑھنے والے ہی نہ ہوں۔

(۴) ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو نقصان پہنچانے والوں کی فہرست طویل ہے افسوس تو یہ ہے کہ خود اردو والوں نے سب سے زیادہ اردو کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو سب سے زیادہ نقصان ترقی پسند ادباء و شعراء نے پہنچایا ہے۔ اردو کے لیے دیوناگری رسم الخط کا مطالبہ ان کی پہلی منزل تھی۔ جس سے اردو کو آج تک نقصان پہنچ رہا ہے

خوشی کی بات یہ ہے کہ نئی نسل بیدار ہے اس نے ان افراد کے چہروں کو پہچان لیا ہے لیکن ان لوگوں نے ذاتی مفاد کے لیے اردو کو جو نقصان پہنچایا اس کی تلافی فی الحال ممکن نہیں ہے

اردو نمبر

ہے تو اس معاملے میں، میں یہ کہوں گا کہ صدیقی صاحب!
آپ اردو کی ترقی اور بقا کے متعلق اردو پسندوں سے
کوئی امید نہ رکھئے۔ اردو کو لپیٹ کرنے والے سٹول تک
وہ اردو کی معشوق ہی رہے۔ عمل بھی کرتے ہیں اردو سے
نہیں دیتے۔ ان کی رباعیں جتنی شیریں ہیں اتنے دلوں میں
زہر بھرا ہوا ہے۔ موجودہ حالات میں ہمیں اردو پسندوں
کی نہیں بلکہ اردو پرستوں کی ضرورت ہے۔ کیا اردو بچانے
کیلئے کوئی وسیع حلقہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔؟ یہ سوال براہ راست
ایک خاص جذباتی احساس سے تعلق رکھتا ہے۔

(۳) اردو کی ترقی اس بات پر قطعی انحصار نہیں کرتی کہ
چند شاعروں یا ادیبوں کو انعامات سے نواز دیا جائے یا
دوسری زبانوں سے ترجموں کے لئے مالی امداد دی
جائے۔ کسی بھی زبان کی پائیدار بنیاد پر ترقی کے لئے یہ
اقدامات قطعی ناکافی ہیں۔ کھلونے دے کر بہلانے سے
بچے کی بھوک ختم نہیں ہو جاتی۔ ترجموں سے کسی زبان کی
تخلیقی توانائی اور علمی وقار میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں
ہو سکتا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ ایسے
اقدامات کئے جائیں جن سے اردو زبان میں کسی بیساکھی
کے بغیر، تخلیق اور علم کی بھرپور صلاحیت پیدا ہو۔

(۴) یہ سوال دراصل پہلے اور دوسرے سوال سے ہی
متعلق ہے۔ اردو کو نقصان پہنچانے والی ذہنیت
۱۹۴۷ء کے بعد پیدا نہیں ہوئی۔ یہ ذہنیت تو اسی وقت
جنم لے چکی تھی جبکہ ہندوستان میں علوم جدیدہ کے حصول
کا احساس لوگوں میں پیدا ہوا تھا۔ اور یہ سب کچھ انیسویں
صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ علوم جدیدہ کے حصول
کے جذبے نے اکثریتی فرقے کے تمدنی نقطہ نظر میں تبدیلی
کی۔ اسی زمانے میں انگریزی سازش سے اس ملک میں فرقہ
وارانہ فضا تیار کی گئی۔ اس فضا سے اردو بھی محفوظ
نہیں رہ سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند فرقہ پرست ہندوؤں
کو اردو پر اسلامی تمدن کی چھاپ پسند نہ آئی کیونکہ اس
سے ان کے ہندو قومی افتخار کے جذبے کو ٹھیس پہنچتی تھی۔
لہٰذا انہوں نے اردو کے مقابلے پر جدید ہندی کو پیش
کر کے اپنا رد عمل ظاہر کیا۔ مذہبی اور قومی برتری کے احساس
کے تحت ہندی کو ہندو مذہب اور ہندو تمدن کی علامت
قرار دیا۔ ہندی زبان کا رشتہ ہندو مذہب اور تمدن
سے وابستہ کر کے پیش کیا گیا۔ ہندی کے فروغ کے لئے منفی
طریقہ اختیار کرنے کے نتیجے میں اردو مخالف تحریکیں شروع
ہو گئیں۔ آپ جانتے ہیں کہ پنڈت نہرو، مولانا ابوالکلام
آزاد، اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے با اثر اور صاحب اقتدار
لوگ بھی اپنی حیات میں اردو کے مسئلے کو حل نہیں
کر سکے۔ اور اب اندرا گاندھی بھی اردو کو اس کے جائز حقوق
دلانے سے قاصر نظر آتی ہیں۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں
کہ آزادی کے بعد اردو کے مفاد کو اس ہندی پسند ذہنیت
نے نقصان پہنچایا جس کا خمیر انیسویں صدی کے نصف آخر
میں تیار ہوا تھا۔ اس کے علاوہ آزادی کے بعد سے آج تک
اردو کے حمایتیوں (یا آپ کے الفاظ میں اردو پسندوں)
نے کچھ کم بھی اردو کو نقصان پہنچایا ہے۔ ان لوگوں
کا صرف ایک ہی کام ہے۔ جلسوں میں اردو کی شیریں بیانی
کی تعریف کر کے اردو والوں کے دل خوش کرنا۔ یا اس
بات پر پوری طاقت صرف کر دینا کہ اردو ہندو مسلم اتحاد
کی علامت ہے اور یہ کہ اردو ہندو مسلم تمدن کے امتزاج
کی بہترین وارث ہے۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار صرف
اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ اردو کے مسائل کو اقلیتوں کے
مسائل سے وابستہ نہ کیا جا سکے اور اس طرح اردو، اپنے
تمام حقوق سے محروم ہوا چاہتی ہے۔ لیکن یہاں یہ
سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو والے ان پر فریب نعروں
کے اصل محرک کو سمجھ کیوں نہیں پا رہے؟ اس لحاظ سے
دیکھا جائے تو اردو کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے
والے خود اردو کے معصوم اور بے حس، نام لیوا ہی ہیں
اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اب تک اردو والوں میں اپنی
مدافعت کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی۔ ایسا لگتا
ہے کہ وہ اردو زبان کو اپنے تمدن سے وابستہ کرتے ہوئے
ہچکچاتے ہیں۔ اس کے پیچھے بھی ان کی بے علمی اور احساس کمتری
بھی کچھ ہے۔ زبانوں کو حکومت کی معاندانہ روش اتنا
نقصان نہیں پہنچاتی جتنی کہ ان کے علمبرداروں کی بے حسی
اور بے عملی پہنچاتی ہے۔ سرکاری امداد سے چلنے والی اردو
انجمنوں نے بھی ۲۵ سال کے اندر کوئی ایسا کارنامہ انجام
نہیں دیا جسے ہم اردو کی ترقی کی رفتار بتا کر کہہ سکیں۔ ۲۵ سال
کے باوجود کچھ نہ کرنا انتہا درجے کی غیر ذمہ داری ہے۔ میں
اس کو بھی اردو کا نقصان ہی کہوں گا۔ ناشرین نے اس
سارے عرصے میں یہ ہتھکنڈا اپنایا کہ اردو کی کتابوں کو قاری
نہیں ملتے۔ جس کے نتیجے میں اردو کتابوں کی قیمت میں روز
افزوں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قاری کو کتابوں سے
دور کر دینا بھی انتہائی سفاکانہ طرز عمل ہے۔ بہرحال
بہت سے عوامل ہیں جنہوں نے مل کر اردو کے مفاد کو
سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اردو پرست حلقوں کو ان
سب سے واقف ہونا ضروری ہے۔

(۵) اردو یونیورسٹی کے قیام کی مانگ سے مجھے کوئی
اختلاف نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ اردو یونیورسٹی
کے قائم ہوتے ہی اردو کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے خود
فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

(۶) آخری سوال کا جواب دینے والوں کو چکرا دینے والا
ہے۔ اگر میں کہوں کہ اردو کی ترقی کے لئے میں نے یہ کیا وہ کیا تو
جتلانے کے مترادف ہوگا۔ [illegible]
کرنے کی زحمت نہ کیجئے۔ اردو کا کوئی بھی مسئلہ کسی فرد واحد
کی کوششوں سے حل ہونے والا نہیں۔ یہ ایک بہت بڑا
جماعتی مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں اردو والوں کی طرف سے

جی ایم شمیم
ایڈیٹر نیا جہاں
انبالہ

(۱) اردو کے ساتھ ناانصافی تو ہو رہی ہے لیکن زیادہ
قصوروار وہ اردو دشمن حضرات ہیں جو اردو کو تعصب کی
عینک سے دیکھتے ہیں

(۲) اردو کو اس کا جائز مقام اور حق دلانے کے لیے
حکومت جو کچھ کر رہی ہے اس سے اتنا تو اطمینان ہوتا ہے کہ
سرکار کو اردو کی ترویج کا احساس ہے لیکن جس طرح اردو کے
لیے کرنا چاہیے وہ نہیں ہو رہا ہے۔ اردو مصنفین کو
اردو اکاڈمی کے ذریعے انعامات سے نواز کر یہ فرض پورا نہیں
ہو جاتا بلکہ اردو کی ترقی کے لیے اردو کو سرکاری سطح پر لا کر
اس کی تعلیم اور نشر و اشاعت کا مناسب انتظام کرنا چاہیئے۔

(۳) جیسا کہ دوسرے سوال کے جواب میں عرض کیا گیا اردو
مصنفین اور شعراء حضرات کو انعامات سے نواز کر حکومت اپنے
فرض سے سبکدوش نہیں ہو جاتی۔ یہ تو سب کچھ محض ایک رسم
پوری کی جاتی ہے

(۴) ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو سب سے زیادہ نقصان ہوا تو
اردو دشمن فرقہ پرست حضرات نے پہنچایا لیکن خالی یہ کہنا بھی
ٹھیک ہی ہوگا کہ اردو کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے
والے خود وہ اردو حضرات ہی ہیں جنکے اردو کے متعلق کچھ
دعوے محض زبان اور قلم تک محدود رہے اور عملی صورت میں
ان کا قدم ہمیشہ ہی پیچھے سرکتا رہا۔

(۵) اردو یونیورسٹی کے فوری قیام کی ضرورت تو ہے
لیکن اس کے قائم ہونے سے اردو کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔
اردو کا مسئلہ تو تب ہی حل ہو سکتا ہے جب کہ سرکار اپنے طور
سے ابتدائی اسکولوں سے اردو کی تعلیم کا بندوبست کرے۔

(۶) میں بذات خود اردو کے لیے جو چاہتا ہوں وہ کر بھی
رہا ہوں ایسے علاقوں میں جہاں پر غیر اردو سے نابلد لوگ
رہتے ہیں ان کے بچوں کے لیے اردو اسکول کھول کر اردو کو
زندہ رکھنے کو صرف بنیادی مسئلہ سمجھتا ہوں اور چار سال
سے اس سمت میں برابر عملی طور پر اردو کی تعلیم میں منہمک
ہوں۔

جی ایم شمیم

Registered with the Registrar of News Paper at R. N. No. 12786/61
Regd. No. D. 1645 'HUMA' Phone 8864
MONTHLY URDU DIGEST DELHI
Vol. 9 APRIL 1973 No. 81

انڈین فائن آرٹ پریس دہلی ۶